بیان فرمودہ

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی

مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام

جلد ششم

سورۃ المؤمنون تا سورۃ فاطر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

و علی عبدہ المسیح الموعود

عرض حال

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔

''میں قرآن شریف کے حقائق معارف بیان کرنے کا نشان دیا گیا ہوں کوئی نہیں کہ جو اس کا مقابلہ کر سکے۔'' (ضرورت الامام۔روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۴۹۶)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ۲۰؍جولائی ۱۹۰۰ء کو اپنے مخالفین کو قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کا چیلنج دیا مگر کوئی مدِّ مقابل نہ آیا۔ حضور علیہ السلام نے شرائط کے مطابق تفسیر لکھ کر شائع فرمائی اور فرمایا۔

''میں نے اس تفسیر کو اپنی طاقت سے نہیں لکھا۔ میں تو ایک کمزور بندہ ہوں اور اسی طرح میرا کلام بھی۔ لیکن یہ سب کچھ اللہ اور اس کے الطافِ کریمانہ ہیں کہ اس تفسیر کے خزانوں کی چابیاں مجھے دی گئی ہیں اور پھر اسی جناب سے مجھے اس کے دفینوں کے اَسرار عطا کئے گئے ہیں۔ میں نے اس میں طرح طرح کے معارف جمع کئے اور انہیں ترتیب دیا ہے۔'' (اعجاز المسیح۔ روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۵۵، ۵۶۔ اردو ترجمہ)

قرآن کریم کے حقائق و معارف جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بیان فرمائے آپؑ کی کتب و ملفوظات میں مذکور ہیں، ان کو یکجا کر کے تفسیر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نام سے طبع اوّل کتابی صورت میں ۸ جلدوں میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔

طبع دوم کی اشاعت کے وقت ۸ جلدوں کو ۴ جلدوں میں شائع کیا گیا۔ یہ جلدیں کتابت سے پرنٹ ہوئی تھیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے تفسیر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کمپیوٹرائزڈ ورژن کی اشاعت کی ہدایت و اجازت فرمائی ہے۔ نیز حضور کا منشائے مبارک

کہ چونکہ ۴ جلدوں کی صورت میں ہر کتاب بھاری ہوگئی ہے اور اس کو بسہولت ہاتھ میں سنبھال کر پڑھنا مشکل ہوجاتا ہے اور یہ کتاب مسلسل مطالعہ میں رہنے والی ہے، اس لئے اس کو ۸ جلدوں میں منقسم کرلیا جائے۔

۱۔ تمام اقتباسات کو حضرت مسیح موعودؑ کی کتب کے اوّل ایڈیشنز سے از سرِ نو تقابل کر کے متن کی صحت کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۔ حوالہ میں قبل ازیں کتاب کا نام اور صفحہ درج تھا۔ اب اس کے ساتھ روحانی خزائن اور ملفوظات کا بھی اضافہ کردیا گیا ہے۔

۳۔ اس عمل کے دوران بعض اور اقتباسات سامنے آئے ہیں، ان کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں۔

''حقیقی اور کامل نجات کی راہیں قرآن نے کھولیں اور باقی سب اس کے ظلّ تھے۔ سو تم قرآن کو تدبر سے پڑھو اور اس سے بہت ہی پیار کرو۔ ایسا پیار کہ تم نے کسی سے نہ کیا ہو کیونکہ جیسا کہ خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ اَلْخَیْرُ کُلُّہٗ فِی الْقُرْاٰنِ کہ تمام قسم کی بھلائیاں قرآن میں ہیں۔'' (کشتی نوح۔ روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۷)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضور علیہ السلام کی اس نصیحت کو حرزِ جان بنا کر اس پر عمل کرنے اور مداومت اختیار کرنے اور معارفِ قرآنی اور اَنوارِ روحانی سے اپنے دلوں کو منور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ نیز اس اشاعت کی تیاری میں جن مربیان کرام نے جو حصہ پایا انہیں اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

(طبع اوّل)

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ ! حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیان فرمودہ تفسیر قرآن کریم کی آٹھویں جلد جو اس سلسلہ کی آخری جلد ہے طبع ہوگئی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جب ۲۰؍جولائی ۱۹۰۰ء کو اپنے مخالفین کو تفسیر نویسی کا چیلنج دیا تو آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ

''قرآن شریف سے یہ ثابت ہے کہ جو لوگ درحقیقت خدا تعالیٰ کے راستباز بندے ہیں ان کے ساتھ تین طور سے خدا کی تائید ہوتی ہے۔

(ان میں سے ایک یہ ہے) کہ ان کو علمِ معارفِ قرآن دیا جاتا ہے اور غیر کو نہیں دیا جاتا جیسا کہ آیت لَا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَہَّرُوۡنَ اس کی شاہد ہے۔''

معارفِ قرآن کا یہ علم حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اُردو، عربی اور فارسی کی اَسّی[۸۰] سے زائد تصانیف اور ملفوظات میں جا بجا مذکور ہے۔ ۱۹۶۷ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث، مرزا ناصر احمد، رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام روح پروَر قرآنی معارف اور تفسیری نکات کو یکجا جمع کرنے کا ارشاد فرمایا چنانچہ مولوی سلطان احمد صاحب فاضل (پیرکوٹی) نے بہت تھوڑے وقت میں انتہائی محنت اور عرقریزی کے ساتھ یہ کام مکمل کر کے جنوری ۱۹۶۸ء میں مسودہ حضور کی خدمت میں پیش کر دیا۔

جون ۱۹۶۹ء میں اس سلسلہ کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی اور صد سالہ جشنِ تشکر کے موقع پر اس کی آخری جلد پیش ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ۷؍ مارچ ۱۹۸۰ء کو تحریک فرمائی تھی کہ ہر احمدی گھرانہ میں اس تفسیر کا سیٹ ضرور موجود ہونا چاہئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

مختصر فہرست مضامین جلد ششم

نمبر شمار	مضمون	صفحہ

نمبر شمار	مضمون	صفحہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست آیات جن کی تفسیر بیان ہوئی ہے

سورة الشعراء

سورة النمل

سورة القصص

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تفسیر سورۃ المؤمنون

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۳ وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۴ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝۵ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۶ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۷ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۸ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۹ وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۱۰ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۱ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۲ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝۱۳ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝۱۴ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝۱۵

خدا تعالیٰ نے اس سورۃ کے ابتدا میں جو سورۃ المؤمنون ہے جس میں یہ آیت فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ہے اس بات کو بیان فرمایا ہے کہ کیوں کر انسان مراتب ستہ کو طے کر کے جو اس کی تکمیل کے لئے

ضروری ہیں اپنے کمال روحانی اور جسمانی کو پہنچتا ہے۔ سو خدا نے دونوں قسم کی ترقیات کو چھ۶ چھ۶ مرتبہ پر تقسیم کیا ہے اور مرتبہ ششم کو کمال ترقی کا مرتبہ قرار دیا ہے اور یہ مطابقت روحانی اور جسمانی وجود کی ترقیات کی ایسے خارقِ عادت طور پر دکھلائی ہے کہ جب سے انسان پیدا ہوا ہے کبھی کسی انسان کے ذہن نے اس نکتہ معرفت کی طرف سبقت نہیں کی۔ اور اگر کوئی دعوے کرے کہ سبقت کی ہے تو یہ بار ثبوت اُس کی گردن پر ہوگا کہ یہ پاک فلاسفی کسی انسان کی کتاب میں سے دکھلاوے اور یہ یاد رہے کہ وہ ایسا ہرگز ثابت نہیں کر سکے گا۔ پس بدیہی طور پر یہ معجزہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے وہ عمیق مناسبت جو روحانی اور جسمانی وجود کی اُن ترقیات میں ہے جو وجود کامل کے مرتبہ تک پیش آتی ہیں ان آیات مبارکہ میں ظاہر کر دی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ظاہری اور باطنی صنعت ایک ہی ہاتھ سے ظہور پذیر ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔

بعض نادانوں نے یہ بھی اعتراض کیا تھا کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے نطفہ کی حالت سے لے کر اخیر تک جسمانی وجود کا قرآن شریف میں نقشہ کھینچا ہے یہ نقشہ اس زمانہ کی جدید تحقیقات طبی کی رُو سے صحیح نہیں ہے۔ لیکن اُن کی حماقت ہے کہ ان آیات کے معنی انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ گویا خدا تعالیٰ رحم کے اندر انسانی وجود کو اس طرح بناتا ہے کہ پہلے بکلّی ایک عضو سے فراغت کر لیتا ہے پھر دوسرا بناتا ہے۔ یہ آیات الٰہیہ کا منشا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے بچشم خود ملاحظہ کر لیا ہے اور مُضغہ سے لے کر ہر ایک حالت کے بچے کو دیکھ لیا ہے۔ خالق حقیقی رحم کے اندر تمام اعضاء اندرونی و بیرونی کو ایک ہی زمانہ میں بناتا ہے یعنی ایک ہی وقت میں سب بنتے ہیں تاخیر تقدیم نہیں۔ البتہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے تمام وجود انسان کا ایک جما ہوا خون ہوتا ہے اور پھر سارے کا سارا ایک ہی وقت میں مُضغہ بن جاتا ہے اور پھر ایک ہی وقت میں کچھ حصہ اس کا اپنے اپنے موقعہ پر ہڈیاں بن جاتا ہے اور پھر ایک ہی وقت میں اس تمام مجموعہ پر ایک زائد گوشت چڑھ جاتا ہے جو تمام بدن کی کھال کہلاتی ہے جس سے خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس مرتبہ پر جسمانی بناوٹ تمام ہو جاتی ہے اور پھر جان پڑ جاتی ہے۔ یہ وہ تمام حالتیں ہیں جو ہم نے بچشم خود دیکھ لی ہیں۔

اب ہم روحانی مراتب ستّہ کا ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

(۱) قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (۲) وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (۳) وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (۴) وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (۵) وَ الَّذِيْنَ هُمْ

لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (۶) وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ اور ان کے مقابل جسمانی ترقیات کے مراتب بھی چھ قرار دیئے ہیں جیسا کہ وہ ان آیات کے بعد فرماتا ہے (۱) ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ (۲) ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً (۳) فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً (۴) فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا (۵) فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا (۶) ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ظاہر ہے کہ پہلا مرتبہ روحانی ترقی کا یہ ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ یعنی وہ مومن نجات پا گئے جو اپنی نماز اور یادالٰہی میں خشوع اور فروتنی اختیار کرتے ہیں اور رقّت اور گدازش سے ذکر الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس کے مقابل پر پہلا مرتبہ جسمانی نشوونما کا جو اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے یہ ہے یعنی ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ یعنی پھر ہم نے انسان کو نطفہ بنایا اور وہ نطفہ ایک محفوظ جگہ میں رکھا۔ سو خدا تعالیٰ نے آدم کی پیدائش کے بعد پہلا مرتبہ انسانی وجود کا جسمانی رنگ میں نطفہ کو قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ نطفہ ایک ایسا تخم ہے جو اجمالی طور پر مجموعہ ان تمام قویٰ اور صفات اور اعضاء اندرونی اور بیرونی اور تمام نقش و نگار کا ہوتا ہے جو پانچویں درجہ پر مفصل طور پر ظاہر ہو جاتے ہیں اور چھٹے درجہ پر اتم اور اکمل طور پر اُن کا ظہور[۱] ہوتا ہے اور با ایں ہمہ نطفہ باقی تمام درجات سے زیادہ تر معرضِ خطر میں ہے۔ کیونکہ ابھی وہ اُس تخم کی طرح ہے جس نے ہنوز زمین سے کوئی تعلق نہیں پکڑا۔ اور ابھی وہ رحم کی کشش سے بہرہ ور نہیں ہوا ممکن ہے کہ وہ اندام نہانی میں پڑ کر ضائع ہو جائے جیسا کہ تخم بعض اوقات پتھریلی زمین پر پڑ کر ضائع ہو جاتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ وہ نطفہ بذاتہا ناقص ہو یعنی اپنے اندر ہی کچھ نقص رکھتا ہو اور قابل نشوونما نہ ہو۔ اور یہ استعداد اُس میں نہ ہو کہ رحم اس کو اپنی طرف جذب کر لے اور صرف ایک مُردہ کی طرح ہو جس میں کچھ حرکت نہ ہو۔ جیسا کہ ایک بوسیدہ تخم زمین میں بویا جائے۔ اور گو زمین عمدہ ہو مگر تاہم تخم بوجہ اپنے ذاتی نقص کے قابلِ نشوونما نہیں ہوتا اور ممکن ہے کہ بعض اور عوارض کی وجہ سے جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں نطفہ رحم میں تعلق پذیر نہ ہو سکے اور رحم اس کو اپنی کشش سے محروم رکھے۔ جیسا کہ تخم بعض اوقات پیروں کے نیچے کچلا جاتا ہے یا پرندے اس کو چُگ جاتے ہیں یا کسی اور حادثہ سے تلف ہو جاتا ہے۔

---

[۱] درجات سے مراد وہ درجے ہیں جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں۔ پانچواں درجہ وہ ہے جب قدرت صانع مطلق سے انسانی قالب تمام و کمال رحم میں تیار ہو جاتا ہے۔ اور ہڈیوں پر ایک خوشنما گوشت چڑھ جاتا ہے۔ اور چھٹا درجہ وہ ہے جب اس قالب میں جان پڑ جاتی ہے۔ اور جیسا کہ بیان کیا گیا ہے انسان کے روحانی وجود کا پہلا مرتبہ حالتِ خشوع اور عجز و نیاز اور سوز و گداز ہے اور در حقیقت وہ بھی اجمالی طور پر مجموعہ اُن تمام امور کا ہے جو بعد میں کھلے طور پر انسان کے روحانی وجود میں نمایاں ہوتے ہیں۔ منہ

یہی صفات مومن کے روحانی وجود کے اوّل مرتبہ کے ہیں اور اوّل مرتبہ مومن کے روحانی وجود کا وہ خشوع اور رقت اور سوز و گداز کی حالت ہے جو نماز اور یادالٰہی میں مومن کو میسر آتی ہے یعنی گدازش اور رقت اور فروتنی اور عجز و نیاز اور روح کا انکسار اور ایک تڑپ اور قلق اور تپش اپنے اندر پیدا کرنا۔ اور ایک خوف کی حالت اپنے پروردگار کے خدائے عزّوجلّ کی طرف دل کو جھکانا جیسا کہ اِس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۔یعنی وہ مومن مراد پا گئے جو اپنی نماز میں اور ہر ایک طور کی یادِ الٰہی میں فروتنی اور عجز و نیاز اختیار کرتے ہیں۔ اور رقت اور سوز و گداز اور قلق اور کرب اور دلی جوش سے اپنے ربّ کے ذکر میں مشغول ہوتے ہیں۔ یہ خشوع کی حالت جس کی تعریف کا اوپر اشارہ کیا گیا ہے روحانی وجود کی طیّاری کے لئے پہلا مرتبہ ہے یا یوں کہو کہ وہ پہلا تخم ہے جو عبودیت کی زمین میں بویا جاتا ہے اور وہ اجمالی طور پر ان تمام قویٰ اور صفات اور اعضاء اور تمام نقش و نگار اور حسن و جمال اور خط و خال اور شمائل روحانیہ پر مشتمل ہے۔ جو پانچویں اور چھٹے درجہ میں انسانِ کامل کے لئے نمودار طور پر ظاہر ہوتے اور اپنے دلکش پیرایہ میں تجلّی فرماتے ہیں[1] اور چونکہ وہ نطفہ کی طرح روحانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے اس لئے وہ آیت قرآنی میں نطفہ کی طرح پہلے مرتبہ پر رکھا گیا ہے اور نطفہ کے مقابل پر دکھلایا گیا ہے تا وہ لوگ جو قرآن شریف میں غور کرتے ہیں سمجھ لیں کہ نماز میں خشوع کی حالت روحانی وجود کے لئے ایک نطفہ ہے اور نطفہ کی طرح روحانی طور پر انسان کامل کے تمام قویٰ اور صفات اور تمام نقش و نگار اس میں مخفی ہیں۔ اور جیسا کہ نطفہ اُس وقت تک معرضِ خطر میں ہے جب تک کہ رحم سے تعلق نہ پکڑے۔ ایسا ہی روحانی وجود کی یہ ابتدائی حالت یعنی خشوع کی حالت اُس وقت تک خطرہ سے خالی نہیں جب تک کہ رحیم خدا سے تعلق نہ پکڑ لے۔ یاد رہے کہ جب خدا تعالیٰ کا فیضان بغیر توسط کسی عمل کے ہو تو وہ رحمانیت کی صفت سے ہوتا ہے جیسا کہ جو کچھ خدا نے زمین و آسمان وغیرہ انسان کے لئے بنائے یا خود انسان کو بنایا یہ سب فیضِ رحمانیت سے ظہور میں آیا لیکن جب کوئی فیض کسی عمل اور عبادت اور مجاہدہ اور ریاضت کے عوض میں ہو وہ رحیمیت کا فیض کہلاتا ہے۔ یہی

[1] پانچواں درجہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وہ ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۔ اور چھٹا درجہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وہ ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۔ اور یہ پانچواں درجہ جسمانی درجات کے پنجم درجہ کے مقابل پر ہوتا ہے جس کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے یعنی فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا اور چھٹا درجہ جسمانی درجات کے ششم درجہ کے مقابل پر پڑا ہے جس کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۔منہ

سنت اللہ بنی آدم کے لئے جاری ہے پس جب کہ انسان نماز اور یاد الٰہی میں خشوع کی حالت اختیار کرتا ہے تب اپنے تئیں رحیمیت کے فیضان کے لئے مستعد بناتا ہے۔ سو نطفہ میں اور روحانی وجود کے پہلے مرتبہ میں جو حالت خشوع ہے صرف فرق یہ ہے کہ نطفہ رحم کی کشش کا محتاج ہوتا ہے اور یہ رحیم کی کشش کی طرف احتیاج رکھتا ہے اور جیسا کہ نطفہ کے لئے ممکن ہے کہ وہ رحم کی کشش سے پہلے ہی ضائع ہو جائے۔ ایسا ہی رُوحانی وجود کے پہلے مرتبہ کے لئے یعنی حالت خشوع کے لئے ممکن ہے کہ وہ رحیم کی کشش اور تعلق سے پہلے ہی برباد ہو جائے۔ جیسا کہ بہت سے لوگ ابتدائی حالت میں اپنی نمازوں میں روتے اور وجد کرتے اور نعرے مارتے اور خدا کی محبت میں طرح طرح کی دیوانگی ظاہر کرتے ہیں اور طرح طرح کی عاشقانہ حالت دکھلاتے ہیں اور چونکہ اس ذات ذوالفضل سے جس کا نام رحیم ہے کوئی تعلق پیدا نہیں ہوتا اور نہ اُس کی خاص تجلی کے جذبہ سے اُس کی طرف کھینچے جاتے ہیں اس لئے ان کا وہ تمام سوز و گداز اور تمام وہ حالتِ خشوع بے بنیاد ہوتی ہے اور بسا اوقات ان کا قدم پھسل جاتا ہے یہاں تک کہ پہلی حالت سے بھی بدتر حالت میں جا پڑتے ہیں۔ پس یہ عجیب دلچسپ مطابقت ہے کہ جیسا کہ نطفہ جسمانی وجود کا اوّل مرتبہ ہے اور جب تک رحم کی کشش اُس کی دستگیری نہ کرے وہ کچھ چیز ہی نہیں ایسا ہی حالتِ خشوع روحانی وجود کا اوّل مرتبہ ہے اور جب تک رحیم خدا کی کشش اُس کی دستگیری نہ کرے وہ حالتِ خشوع کچھ بھی چیز نہیں۔ اِسی لئے ہزارہا ایسے لوگوں کو پاؤ گے کہ اپنی عمر کے کسی حصہ میں یادِ الٰہی اور نماز میں حالت خشوع سے لذّت اٹھاتے اور وجد کرتے اور روتے تھے اور پھر کسی ایسی لعنت نے اُن کو پکڑ لیا کہ یک مرتبہ نفسانی امور کی طرف گر گئے اور دنیا اور دنیا کی خواہشوں کے جذبات سے وہ تمام حالت کھو بیٹھے۔ یہ نہایت خوف کا مقام ہے کہ اکثر وہ حالتِ خشوع رحیمیت کے تعلق سے پہلے ہی ضائع ہو جاتی ہے اور قبل اس کے کہ رحیم خدا کی کشش اس میں کچھ کام کرے وہ حالت برباد اور نابود ہو جاتی ہے اور ایسی صورت میں وہ حالت جو روحانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے اس نطفہ سے مشابہت رکھتی ہے کہ جو رِحم سے تعلق پکڑنے سے پہلے ہی ضائع ہو جاتا ہے۔ غرض روحانی وجود کا پہلا مرتبہ جو حالتِ خشوع ہے اور جسمانی وجود کا پہلا مرتبہ جو نطفہ ہے باہم اس بات میں تشابہ رکھتے ہیں کہ جسمانی وجود کا پہلا مرتبہ یعنی نطفہ بغیر کششِ رحم کے ہیچ ہے اور روحانی وجود کا پہلا مرتبہ یعنی حالتِ خشوع بغیر جذبِ رحیم کے ہیچ اور جیسا کہ دنیا میں ہزارہا نطفے تباہ ہوتے ہیں اور نطفہ ہونے کی حالت میں ہی ضائع ہو جاتے ہیں اور رحم سے

تعلق نہیں پکڑتے۔ ایسا ہی دنیا میں ہزارہا خشوع کی حالتیں ایسی ہیں کہ رحیم خدا سے تعلق نہیں پکڑتیں اور ضائع جاتی ہیں۔ ہزارہا جاہل اپنے چندروزہ خشوع اور وجد اور گریہ وزاری پر خوش ہو کر خیال کرتے ہیں کہ ہم ولی ہوگئے، غوث ہوگئے، قطب ہوگئے اور ابدال میں داخل ہوگئے اور خدارسیدہ ہوگئے حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں ہنوز ایک نطفہ ہے۔ ابھی تو نام خدا ہے غنچہ صبا تو چھو بھی نہیں گئی ہے۔ افسوس کہ انہیں خام خیالیوں سے ایک دنیا ہلاک ہوگئی۔ اور یادرہے کہ یہ روحانی حالت کا پہلا مرتبہ جو حالتِ خشوع ہے طرح طرح کے اسباب سے ضائع ہوسکتا ہے جیسا کہ نطفہ جو جسمانی حالت کا پہلا مرتبہ ہے انواع اقسام کے حوادث سے تلف ہوسکتا ہے منجملہ ان کے ذاتی نقص بھی ہے۔ مثلاً اس خشوع میں کوئی مشرکانہ ملونی ہے یا کسی بدعت کی آمیزش ہے یا اور لغویات کا ساتھ اشتراک ہے۔ مثلاً نفسانی خواہشیں اور نفسانی ناپاک جذبات بجائے خود زور مار رہے ہیں یا سفلی تعلقات نے دل کو پکڑ رکھا ہے یا جیفۂ دنیا کی لغو خواہشوں نے زیر کر دیا ہے پس ان تمام ناپاک عوارض کے ساتھ حالت خشوع اس لائق نہیں ٹھہرتی کہ رحیم خدا اس سے تعلق پکڑ جائے جیسا کہ اس نطفہ سے رحم تعلق نہیں پکڑ سکتا جو اپنے اندر کسی قسم کا نقص رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو جوگیوں کی حالت خشوع اور عیسائی پادریوں کی حالت انکساران کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور گو وہ سوز وگداز میں اس قدر ترقی کریں کہ اپنے جسم کو بھی ساتھ ہی استخوان بے پوست کر دیں تب بھی رحیم خدا اُن سے تعلق نہیں کرتا کیونکہ اُن کی حالت خشوع میں ایک ذاتی نقص ہے ایسا ہی وہ بدعتی فقیر اسلام کے جو قرآن شریف کی پیروی چھوڑ کر ہزاروں بدعات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بھنگ، چرس اور شراب پینے سے بھی شرم نہیں کرتے اور دوسرے فسق و فجور بھی اُن کے لئے شیر مادر ہوتے ہیں چونکہ وہ ایسی حالت رکھتے ہیں کہ رحیم خدا سے اور اُس کے تعلق سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے بلکہ رحیم خدا کے نزدیک وہ تمام حالتیں مکروہ ہیں اس لئے وہ باوجود اپنے طور کے وجد اور رقص اور اشعار خوانی اور سرود وغیرہ کے رحیم خدا کے تعلق سے سخت بے نصیب ہوتے ہیں اور اُس نطفہ کی طرح ہوتے ہیں جو آتشک کی بیماری یا جذام کے عارضہ سے جل جائے اور اس قابل نہ رہے کہ رحم اس سے تعلق پکڑ سکے پس رحم اور رحیم کا تعلق یا عدم تعلق ایک ہی بنا پر ہے صرف روحانی اور جسمانی عوارض کا فرق ہے۔ اور جیسا کہ نطفہ بعض اپنے ذاتی عوارض کی رُو سے اس لائق نہیں رہتا کہ رحم اس سے تعلق پکڑ سکے اور اس کو اپنی طرف کھینچ سکے ایسا ہی حالت خشوع جو نطفہ کے درجہ پر ہے بعض اپنے عوارض ذاتیہ کی وجہ

سے جیسے تکبر اور عُجب اور ریا یا اور کسی قسم کی ضلالت کی وجہ سے یا شرک سے اس لائق نہیں رہتی کہ رحیم خدا اس سے تعلق پکڑ سکے پس نطفہ کی طرح تمام فضیلت روحانی وجود کے اوّل مرتبہ کی جو حالت خشوع ہے رحیم خدا کے ساتھ حقیقی تعلق پیدا کرنے سے وابستہ ہے جیسا کہ تمام فضیلت نطفہ کی رحم کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے وابستہ ہے پس اگر اس حالت خشوع کو اس رحیم خدا کے ساتھ حقیقی تعلق نہیں اور نہ حقیقی تعلق پیدا ہوسکتا ہے تو وہ حالت اُس گندے نطفہ کی طرح ہے جس کو رحم کے ساتھ حقیقی تعلق پیدا نہیں ہوسکتا اور یاد رکھنا چاہیئے کہ نماز اور یادالٰہی میں جو کبھی انسان کو حالتِ خشوع میسر آتی ہے اور وجد اور ذوق پیدا ہوجاتا ہے یا لذّت محسوس ہوتی ہے یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس انسان کو رحیم خدا سے حقیقی تعلق ہے جیسا کہ اگر نطفہ اندام نہانی کے اندر داخل ہوجائے اور لذّت بھی محسوس ہو تو اس سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ اُس نطفہ کو رحم سے تعلق ہو گیا ہے بلکہ تعلق کے لئے علیحدہ آثار اور علامات ہیں۔ پس یادالٰہی میں ذوق شوق جس کو دوسرے لفظوں میں حالتِ خشوع کہتے ہیں نطفہ کی اُس حالت سے مشابہ ہے جب وہ ایک صورتِ انزال پکڑ کر اندام نہانی کے اندر گر جاتا ہے اور اِس میں کیا شک ہے کہ وہ جسمانی عالم میں ایک کمال لذّت کا وقت ہوتا ہے لیکن تاہم فقط اُس قطرہ منی کا اندر گرنا اس بات کو مستلزم نہیں کہ رِحم سے اُس نطفہ کا تعلق بھی ہوجائے اور وہ رحم کی طرف کھینچا جائے۔ پس ایسا ہی روحانی ذوق شوق اور حالتِ خشوع اس بات کو مستلزم نہیں کہ رحیم خدا سے ایسے شخص کا تعلق ہوجائے اور اس کی طرف کھینچا جائے۔ بلکہ جیسا کہ نطفہ کبھی حرامکاری کے طور پر کسی رنڈی کے اندام نہانی میں پڑتا ہے تو اس میں بھی وہی لذّت نطفہ ڈالنے والے کو حاصل ہوتی ہے جیسا کہ اپنی بیوی کے ساتھ۔ پس ایسا ہی بُت پرستوں اور مخلوق پرستوں کا خشوع وخضوع اور حالتِ ذوق اور شوق رنڈی بازوں سے مشابہ ہے یعنی خشوع اور خضوع مشرکوں اور اُن لوگوں کا جو محض اغراض دنیویہ کی بنا پر خدا تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اس نطفہ سے مشابہت رکھتا ہے جو حرامکار عورتوں کے اندام نہانی میں جا کر باعثِ لذّت ہوتا ہے۔ بہرحال جیسا کہ نطفہ میں تعلق پکڑنے کی استعداد ہے حالتِ خشوع میں بھی تعلق پکڑنے کی استعداد ہے مگر صرف حالتِ خشوع اور رِقّت اور سوز اس بات پر دلیل نہیں ہے کہ وہ تعلق ہو بھی گیا ہے جیسا کہ نطفہ کی صورت میں جو اس روحانی صورت کے مقابل پر ہی مشاہدہ ظاہر کر رہا ہے اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے صحبت کرے اور منی عورت کے اندام نہانی میں داخل ہوجائے اور اس کو اس فعل سے کمال لذّت حاصل ہو تو یہ لذّت اس بات پر دلالت نہیں

کرے گی کہ حمل ضرور ہو گیا ہے۔ پس ایسا ہی خشوع اور سوز و گداز کی حالت گو وہ کیسی ہی لذّت اور سرور کے ساتھ ہو خدا سے تعلق پکڑنے کے لئے کوئی لازمی علامت نہیں ہے [۱]۔ یعنی کسی شخص میں نماز اور یاد الٰہی کی حالت میں خشوع اور سوز و گداز اور گریہ وزاری پیدا ہونا لازمی طور پر اس بات کو مستلزم نہیں کہ اس شخص کو خدا سے تعلق بھی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سب حالات کسی شخص میں موجود ہوں مگر ابھی اس کو خدا تعالیٰ سے تعلق نہ ہو۔ جیسا کہ مشاہدہ صریحہ اس بات پر گواہ ہے کہ بہت سے لوگ پند و نصیحت کی مجلسوں اور وعظ و تذکیر کی محفلوں یا نماز اور یاد الٰہی کی حالت میں خوب روتے اور وجد کرتے اور نعرے مارتے اور سوز و گداز ظاہر کرتے ہیں اور آنسو اُن کے رخساروں پر پانی کی طرح رواں ہو جاتے ہیں بلکہ بعض کا رونا تو مُنہ پر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ ایک بات سنی اور وہیں رو دیا۔ مگر تاہم لغویات سے وہ کنارہ کش نہیں ہوتے اور بہت سے لغو کام اور لغو باتیں اور لغو سیر و تماشے اُن کے گلے کا ہار ہو جاتے ہیں۔ جن سے سمجھا جاتا ہے کہ کچھ بھی اُن کو خدا تعالیٰ سے تعلق نہیں اور نہ خدا تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت کچھ اُن کے دلوں میں ہے۔ پس یہ عجیب تماشا ہے کہ ایسے گندے نفسوں کے ساتھ بھی خشوع اور سوز و گداز کی حالت جمع ہو جاتی ہے۔ اور یہ عبرت کا مقام ہے اور اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مجرد خشوع اور گریہ وزاری کہ جو بغیر ترک لغویات ہو کچھ فخر کرنے کی جگہ نہیں اور نہ یہ قرب الٰہی اور تعلق باللہ کی کوئی علامت ہے۔ بہت سے ایسے فقیر مَیں نے بچشم خود دیکھے ہیں اور ایسا ہی بعض دوسرے لوگ بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ کسی دردناک شعر کے پڑھنے یا دردناک نظارہ دیکھنے یا دردناک قصہ کے سننے سے اس جلدی سے ان کے آنسو گرنے شروع ہو جاتے ہیں جیسا کہ بعض بادل اس قدر جلدی سے اپنے موٹے موٹے قطرے برساتے ہیں کہ باہر سونے والوں کو رات کے وقت فرصت نہیں دیتے کہ اپنا بستر بغیر تر

---

[۱] ابتدائی حالت میں خشوع اور رِقّت کے ساتھ ہر طرح کے لغو کام جمع ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ بچہ میں رونے کی عادت بہت ہوتی ہے اور بات بات میں ڈر جاتا اور خشوع اور انکسار اختیار کرتا ہے مگر با ایں ہمہ بچپن کے زمانہ میں طبعاً انسان بہت سے لغویات میں مبتلا ہوتا ہے اور سب سے پہلے لغو باتوں اور لغو کاموں کی طرف ہی رغبت کرتا ہے اور اکثر لغو حرکات اور لغو طور پر کودنا اور اچھلنا ہی اس کو پسند آتا ہے جس میں بسا اوقات اپنے جسم کو بھی کوئی صدمہ پہنچا دیتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ انسان کی زندگی کی راہ میں فطرتاً پہلے لغویات ہی آتے ہیں اور بغیر اس مرتبہ کے طے کرنے کے دوسرے مرتبہ تک وہ پہنچ ہی نہیں سکتا۔ پس طبعاً پہلا زینہ بلوغ کا بچپن کے لغویات سے پرہیز کرنا ہے سو اس سے ثابت ہے کہ سب سے پہلا تعلق انسانی سرشت کو لغویات سے ہی ہوتا ہے۔ منہ

ہونے کے اندر لے جا سکیں لیکن مَیں اپنی ذاتی شہادت سے گواہی دیتا ہوں کہ اکثر ایسے شخص میں نے بڑے مکّار بلکہ دنیاداروں سے آگے بڑھے ہوئے پائے ہیں اور بعض کو میں نے ایسے خبیث طبع اور بد دیانت اور ہر پہلو سے بدمعاش پایا ہے کہ مجھے اُن کی گریہ وزاری کی عادت اور خشوع وخضوع کی خصلت دیکھ کر اس بات سے کراہت آتی ہے کہ کسی مجلس میں ایسی رقت اور سوز وگداز ظاہر کروں۔ ہاں کسی زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ یہ نیک بندوں کی علامت تھی مگر اب تو اکثر یہ پیرایہ مکّاروں اور فریب دہ لوگوں کا ہو گیا ہے سبز کپڑے، بال سر کے لمبے، ہاتھ میں تسبیح، آنکھوں سے دمبدم آنسو جاری، لبوں میں کچھ حرکت گویا ہر وقت ذکر الٰہی زبان پر جاری ہے اور ساتھ اس کے بدعت کی پابندی۔ یہ علامتیں اپنے فقر کی ظاہر کرتے ہیں۔ مگر دلِ مجذوم محبتِ الٰہی سے محروم۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ راستباز لوگ میری اس تحریر سے مستثنٰی ہیں جن کی ہر ایک بات بطور جوش اور حال کے ہوتی ہے نہ بطور تکلّف اور قال کے، بہرحال یہ تو ثابت ہے کہ گریہ وزاری اور خشوع اور خضوع نیک بندوں کے لئے کوئی مخصوص علامت نہیں بلکہ یہ بھی انسان کے اندر ایک قوت ہے جو محل اور بے محل دونوں صورتوں میں حرکت کرتی ہے۔ انسان بعض اوقات ایک فرضی قصہ پڑھتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ فرضی اور ایک ناول کی قسم ہے مگر تاہم جب اس کے ایک دردناک موقعہ پر پہنچتا ہے تو اس کا دل اپنے قابو سے نکل جاتا ہے اور بے اختیار آنسو جاری ہوتے ہیں جو تھمتے نہیں۔ ایسے دردناک قصے یہاں تک مؤثر پائے گئے ہیں کہ بعض وقت خود ایک انسان ایک پُرسوز قصہ بیان کرنا شروع کرتا ہے اور جب بیان کرتے کرتے اس کے ایک پُردرد موقعہ پر پہنچتا ہے تو آپ ہی چشم پُرآب ہو جاتا ہے اور اس کی آواز بھی ایک رونے والے شخص کے رنگ میں ہو جاتی ہے آخر اس کا رونا اچھل پڑتا ہے اور جو رونے کے اندر ایک قسم کی سرور اور لذّت ہے وہ اس کو حاصل ہو جاتی ہے اور اس کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ جس بنا پر وہ روتا ہے وہ بنا ہی غلط اور ایک فرضی قصہ ہے۔ پس کیوں اور کیا وجہ کہ ایسا ہوتا ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ سوز وگداز اور گریہ وزاری کی قوت جو انسان کے اندر موجود ہے اُس کو ایک واقعہ کے صحیح یا غلط ہونے سے کچھ کام نہیں بلکہ جب اس کے لئے ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو اس قوت کو حرکت دینے کے قابل ہوتے ہیں تو خواہ نخواہ وہ رقّت حرکت میں آجاتی ہے اور ایک قسم کا سرور اور لذّت ایسے انسان کو پہنچ جاتا ہے گو وہ مومن ہو یا کافر۔ اسی وجہ سے غیر مشروع مجالس میں بھی جو طرح طرح کی بدعات پر مشتمل ہوتی ہیں بے قید لوگ جو فقیروں کے لباس میں

اپنے تئیں ظاہر کرتے ہیں مختلف قسم کی کافیوں اور شعروں کے سننے اور سُرود کی تاثیر سے رقص اور وجد اور گریہ وزاری شروع کر دیتے ہیں اور اپنے رنگ میں لذّت اُٹھاتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ ہم خدا کو مل گئے ہیں۔ مگر یہ لذّت اُس لذّت سے مشابہ ہے جو ایک زانی کو حرامکار عورت سے ہوتی ہے۔

اور پھر ایک اور مشابہت خشوع اور نطفہ میں ہے اور وہ یہ کہ جب ایک شخص کا نطفہ اس کی بیوی یا کسی اور عورت کے اندر داخل ہوتا ہے تو اس نطفہ کا اندام نہانی کے اندر داخل ہونا اور انزال کی صورت پکڑ کر رواں ہو جانا بعینہٖ رونے کی صورت پر ہوتا ہے جیسا کہ خشوع کی حالت کا نتیجہ بھی رونا ہی ہوتا ہے اور جیسے بے اختیار نطفہ اُچھل کر صورت انزال اختیار کرتا ہے۔ یہی صورت کمال خشوع کے وقت میں رونے کی ہوتی ہے کہ رونا آنکھوں سے اُچھلتا ہے اور جیسی انزال کی لذّت کبھی حلال طور پر ہوتی ہے جب کہ اپنی بیوی سے انسان صحبت کرتا ہے اور کبھی حرام طور پر جب کہ انسان کسی حرام کار عورت سے صحبت کرتا ہے۔ یہی صورت خشوع اور سوز وگداز اور گریہ وزاری کی ہے یعنی کبھی خشوع اور سوز وگداز محض خدائے واحد لاشریک کے لئے ہوتا ہے جس کے ساتھ کسی بدعت اور شرک کا رنگ نہیں ہوتا۔ پس وہ لذّت سوز وگداز کی ایک لذّت حلال ہوتی ہے مگر کبھی خشوع اور سوز وگداز اور اس کی لذّت بدعات کی آمیزش سے یا مخلوق کی پرستش اور بتوں اور دیویوں کی پوجا میں بھی حاصل ہوتی ہے مگر وہ لذّت حرامکاری کے جماع سے مشابہ ہوتی ہے۔ غرض مجرد خشوع اور سوز وگداز اور گریہ وزاری اور اس کی لذّتیں تعلق باللہ کو مستلزم نہیں بلکہ جیسا کہ بہت سے ایسے نطفے ہیں جو ضائع جاتے ہیں اور رحم اُن کو قبول نہیں کرتا۔ ایسا ہی بہت سے خشوع اور تضرع اور زاری ہیں جو محض آنکھوں کو کھونا ہے اور رحیم خدا ان کو قبول نہیں کرتا۔ غرض حالتِ خشوع کو جو روحانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے نطفہ ہونے کی حالت سے جو جسمانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے ایک کھلی کھلی مشابہت ہے جس کو ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں اور یہ مشابہت کوئی معمولی امر نہیں ہے بلکہ صانع قدیم جلّ شانہٗ کے خاص ارادہ سے ان دونوں میں اکمل اور اتم مشابہت ہے یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کی کتاب میں بھی لکھا گیا ہے کہ دوسرے جہان میں بھی یہ دونوں لذّتیں ہوں گی۔ مگر مشابہت میں اس قدر ترقی کر جائیں گی کہ ایک ہی ہو جائیں گی یعنی اُس جہان میں جو ایک شخص اپنی بیوی سے محبت اور اختلاط کرے گا وہ اس بات میں فرق نہیں کر سکے گا کہ وہ اپنی بیوی سے محبت اور اختلاط کرتا ہے یا محبت الٰہیہ کے دریائے بے پایاں میں غرق ہے اور واصلانِ حضرتِ عزت پر اِسی جہان میں یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو اہلِ دنیا اور محجوبوں کے لئے ایک امر فوق الفہم ہے۔

اب ہم یہ تو بیان کر چکے کہ روحانی وجود کا پہلا مرتبہ جو حالتِ خشوع ہے جسمانی وجود کے پہلے مرتبہ سے جو نطفہ ہے مشابہت تام رکھتا ہے۔ اس کے بعد یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ روحانی وجود کا دوسرا مرتبہ بھی جسمانی وجود کے دوسرے مرتبہ سے مشابہ اور مماثل ہے۔ اِس کی تفصیل یہ ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ رُوحانی وجود کا دوسرا مرتبہ وہ ہے جو اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ یعنی مومن وہ ہیں جو لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو حرکتوں اور لغو مجلسوں اور لغو صحبتوں اور لغو تعلقات سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے مقابل پر جسمانی وجود کا دوسرا مرتبہ وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اپنے کلام عزیز میں عَلَقَه کے نام سے موسوم فرمایا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً یعنی پھر ہم نے نطفہ کو عَلَقَه بنایا۔ یعنی ہم نے اُس کو لغو طور پر ضائع ہونے سے بچا کر رحم کی تاثیر اور تعلق سے عَلَقَه بنا دیا۔ اس سے پہلے وہ معرض خطر میں تھا اور کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ انسانی وجود بنے یا ضائع جائے۔ لیکن وہ رحم کے تعلق کے بعد ضائع ہونے سے محفوظ ہو گیا اور اس میں ایک تغیر پیدا ہو گیا جو پہلے نہ تھا۔ یعنی وہ ایک جمے ہوئے خون کی صورت میں ہو گیا۔ اور قوام بھی غلیظ ہو گیا اور رحم سے اس کا ایک علاقہ ہو گیا اس لئے اس کا نام عَلَقَه رکھا گیا اور ایسی عورت حاملہ کہلانے کی مستحق ہو گئی۔ اور بوجہ اس علاقہ کے رحم اس کا سرپرست بن گیا اور اس کے زیر سایہ نطفہ کا نشوونما ہونے لگا۔ مگر اس حالت میں نطفہ نے کچھ زیادہ پاکیزگی حاصل نہیں کی۔ صرف ایک خون جما ہوا بن گیا اور رحم کے تعلق کی وجہ سے ضائع ہونے سے بچ گیا اور جس طرح اور صورتوں میں ایک نطفہ لغو طور پر پھیلتا اور بیہودہ طور پر اندر سے بہ نکلتا اور کپڑوں کو پلید کرتا تھا اب اس تعلق کی وجہ سے بیکار جانے سے محفوظ رہ گیا۔ لیکن ہنوز وہ ایک جما ہوا خون تھا جس نے ابھی نجاست خفیفہ کی آلودگی سے پاکی حاصل نہیں کی تھی۔ اگر رحم سے یہ تعلق اس کا پیدا نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ اندام نہانی میں داخل ہو کر بھی رحم میں قرار نہ پا سکتا اور باہر کی طرف بہ جاتا۔ مگر رحم کی قوت مدبّرہ نے اپنے خاص جذب سے اُس کو تھام لیا اور پھر ایک جمے ہوئے خون کی شکل پر بنا دیا۔ تب جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس تعلق کی وجہ سے عَلَقَه کہلایا اور اس سے پہلے رحم نے اُس پر کوئی اپنا خاص اثر ظاہر نہیں کیا تھا اور اسی اثر نے اس کو ضائع ہونے سے روکا اور اسی اثر سے نطفہ کی طرح اُس میں رقّت بھی باقی نہ رہی یعنی اس کا قوام رکیک اور پتلا نہ رہا بلکہ کسی قدر گاڑھا ہو گیا۔

اور اس علقہ کے مقابل پر جو جسمانی وجود کا دوسرا مرتبہ ہے روحانی وجود کا دوسرا مرتبہ وہ ہے جس کا ابھی ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں جس کی طرف قرآن شریف کی یہ آیت اشارہ کرتی ہے وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ یعنی رہائی یافتہ مومن وہ لوگ ہیں جو لغو کاموں اور لغو باتوں اور لغو حرکتوں اور لغو مجلسوں اور لغو صحبتوں سے اور لغو تعلقات سے اور لغو جوشوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور ایمان ان کا اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اس قدر کنارہ کشی اُن پر سہل ہو جاتی ہے کیونکہ بوجہ ترقی ایمان کے کسی قدر تعلق اُن کا خدائے رحیم سے ہو جاتا ہے جیسا کہ علقہ ہونے کی حالت میں جب نطفہ کا تعلق کسی قدر رحم سے ہو جاتا ہے تو وہ لغو طور پر گر جانے یا بہ جانے یا اور طور پر ضائع ہو جانے سے امن میں آ جاتا ہے اِلَّا ماشاء اللہ ۔ سو روحانی وجود کے اس مرتبہ دوم میں خدائے رحیم سے تعلق بعینہٖ اُس تعلق سے مشابہ ہوتا ہے جو جسمانی وجود کے دوسرے مرتبہ پر عَلَقَه کو رحم سے تعلق ہو جاتا ہے اور جیسا کہ قبل ظہور دوسرے مرتبہ وجود روحانی کے لغو تعلقات اور لغو شغلوں سے رہائی پانا غیر ممکن ہوتا ہے اور صرف وجود روحانی کا پہلا مرتبہ یعنی خشوع اور عجز و نیاز کی حالت اکثر برباد بھی چلی جاتی ہے اور انجام بد ہوتا ہے۔ ایسا ہی نطفہ بھی جو جسمانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے عَلَقَه بننے کی حالت سے پہلے بسا اوقات صدہا مرتبہ لغو طور پر ضائع ہو جاتا ہے پھر جب ارادہ الٰہی اس بات کے متعلق ہوتا ہے کہ لغو طور پر ضائع ہونے سے اس کو بچائے تو اُس کے امر اور اذن سے وہی نطفہ رحم میں عَلَقَه بن جاتا ہے تب وہ وجود جسمانی کا دوسرا مرتبہ کہلاتا ہے غرض دوسرا مرتبہ روحانی وجود کا جو تمام لغو باتوں اور تمام کاموں سے پرہیز کرنا اور لغو باتوں اور لغو تعلقات اور لغو جوشوں سے کنارہ کش ہونا ہے یہ مرتبہ بھی اسی وقت میسّر آتا ہے کہ جب خدائے رحیم سے انسان کا تعلق پیدا ہو جائے۔ کیونکہ یہ تعلق میں ہی طاقت اور قوت ہے کہ دوسرے تعلق کو توڑتا ہے اور ضائع ہونے سے بچاتا ہے اور گو انسان کو اپنی نماز میں حالت خشوع میسر آ جائے جو روحانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے پھر بھی وہ خشوع لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو جوشوں سے روک نہیں سکتا۔ جب تک کہ خدا سے وہ تعلق نہ ہو جو روحانی وجود کے دوسرے مرتبہ پر ہوتا ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ گو ایک انسان اپنی بیوی سے ہر روز کئی دفعہ صحبت کرے تاہم وہ نطفہ ضائع ہونے سے رُک نہیں سکتا جب تک کہ رحم سے اس کا تعلق پیدا نہ ہو جائے۔

پس خدا تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ اس کے یہی معنے ہیں کہ مومن وہی ہیں جو لغو تعلقات سے اپنے تئیں الگ کرتے ہیں اور لغو تعلقات سے اپنے تئیں الگ کرنا خدا تعالیٰ کے تعلق کا موجب

ہے [۱] گویا لغو باتوں سے دل کو چھڑانا خدا سے دل کو لگا لینا ہے کیونکہ انسان تعبّد ابدی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور طبعی طور پر اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت موجود ہے پس اسی وجہ سے انسان کی روح کو خدا تعالیٰ سے ایک تعلق ازلی ہے۔ جیسا کہ آیت اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی (الاعراف : ۱۷۳) سے ظاہر ہوتا ہے اور وہ تعلق جو انسان کو رحیمیّت کے پرتوہ کے نیچے آ کر یعنی عبادات کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ سے حاصل ہوتا ہے جس تعلق کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ خدا پر ایمان لا کر ہر ایک لغو بات اور لغو کام اور لغو مجلس اور لغو حرکت اور لغو تعلق اور لغو جوش سے کنارہ کشی کی جائے۔ وہ اُسی ازلی تعلق کو مَکمن قوت سے حیّزِ فعل میں لانا ہے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں انسان کے روحانی وجود کا پہلا مرتبہ جو نماز اور یادِالٰہی میں حالتِ خشوع اور رقّت اور سوز و گداز ہے یہ مرتبہ اپنی ذات میں صرف اطلاق کی حیثیت رکھتا ہے یعنی نفس خشوع کے لئے یہ لازمی امر نہیں ہے کہ ترکِ لغویات بھی ساتھ ہی ہو یا اس سے بڑھ کر کوئی اخلاقِ فاضلہ اور عاداتِ مہذبہ ساتھ ہوں بلکہ ممکن ہے کہ جو شخص نماز میں خشوع اور رقّت وسوز اور گریہ وزاری اختیار کرتا ہے خواہ اس قدر کہ دوسرے پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے ہنوز لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو حرکتوں اور لغو مجلسوں اور لغو تعلقوں اور لغو نفسانی جوشوں سے اس کا دل پاک نہ ہو یعنی ممکن ہے کہ ہنوز معاصی سے اس کو رستگاری نہ ہو کیونکہ خشوع کی حالت کا کبھی کبھی دل پر وارد ہونا یا نماز میں ذوق اور سرور حاصل ہونا یہ اور چیز ہے اور طہارتِ نفس اور چیز۔ اور گو کسی سالک کا خشوع اور عجز و نیاز اور سوز و گداز بدعت اور شرک کی آمیزش سے پاک بھی ہوتا ہم ایسا آدمی جس کا وجود روحانی ابھی مرتبہ دوم تک نہیں پہنچا ابھی صرف قبلۂ رُوحانی کا قصد کر رہا ہے اور راہ میں سرگردان ہے اور ہنوز اُس کی راہ میں طرح طرح کے دشت و بیابان اور خارستان اور کوہستان اور بحرِ عظیم پُر طوفان اور

---

[۱] لغو تعلقات سے الگ ہونا خدا تعالیٰ کے تعلق کا اس لئے موجب ہے کہ خدا تعالیٰ نے انہیں آیات میں اَفۡلَحَ کے لفظ کے ساتھ وعدہ فرمایا ہے کہ جو شخص خدا کی طلب میں کوئی کام کرے گا وہ بقدر محنت کشی اور بقدر اپنی سعی کے خدا کو پائے گا۔ اور اس سے تعلق پیدا کر لے گا۔ پس جو شخص خدا کا تعلق حاصل کرنے کے لئے لغو کام چھوڑتا ہے اس کو اس وعدہ کے موافق جو لفظ اَفۡلَحَ میں ہے ایک خفیف سا تعلق خدا تعالیٰ سے ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو اس نے کام کیا ہے وہ بھی بڑا بھاری کام نہیں صرف ایک خفیف تعلق کو جو اس کو لغویات سے تھا چھوڑ دیا ہے اور یاد رہے کہ جیسا کہ لفظ اَفۡلَحَ اول آیت میں موجود ہے یعنی اس آیت میں کہ قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ یہی لفظ عطف کے طور پر تمام آئندہ آیتوں سے وعدہ کے طور پر متعلق ہے۔ پس یہ آیت کہ وَ الَّذِیۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ یہی معنی رکھتی ہے کہ قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ اور افلاح یعنی اَفۡلَحَ کا لفظ ہر یک مرتبہ ایمان پر ایک خاص معنی رکھتا ہے اور ایک خاص تعلّق کا وعدہ دیتا ہے۔ منہ

درندگان دشمن ایمان و دشمن جان قدم قدم پر بیٹھے ہیں تا وقتیکہ وجود روحانی کے دوسرے مرتبہ تک نہ پہنچ جائے۔

یاد رہے کہ خشوع اور عجز و نیاز کی حالت کو یہ بات ہرگز لازم نہیں ہے کہ خدا سے سچا تعلق ہو جائے بلکہ بسا اوقات شریر لوگوں کو بھی کوئی نمونہ قہر الٰہی دیکھ کر خشوع پیدا ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ سے ان کو کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا اور نہ لغو کاموں سے ابھی رہائی ہوتی ہے۔ مثلاً وہ زلزلہ جو چار اپریل ۱۹۰۵ء کو آیا تھا اُس کے آنے کے وقت لاکھوں دلوں میں ایسا خشوع اور سوز و گداز ہوا تھا کہ بجز خدا کے نام لینے اور رونے کے اور کوئی کام نہ تھا یہاں تک کہ دہریوں کو بھی اپنا دہریہ پن بھول گیا تھا۔ اور پھر جب وہ وقت جاتا رہا اور زمین ٹھہر گئی تو حالتِ خشوع نابود ہو گئی یہاں تک کہ میں نے سنا ہے کہ بعض دہریوں نے جو اس وقت خدا کے قائل ہو گئے تھے بڑی بے حیائی اور دلیری سے کہا کہ ہمیں غلطی لگ گئی تھی کہ ہم زلزلہ کے رعب میں آ گئے ورنہ خدا نہیں ہے۔ غرض جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں خشوع کی حالت کے ساتھ بہت گند جمع ہو سکتے ہیں البتہ وہ تمام آئندہ کمالات کے لئے تخم کی طرح ہے مگر اسی حالت کو کمال سمجھنا اپنے نفس کو دھوکہ دینا ہے۔ بلکہ بعد اس کے ایک اور مرتبہ ہے جس کی تلاش مومن کو کرنی چاہیئے اور کبھی آرام نہیں لینا چاہیئے اور سست نہیں ہونا چاہیئے جب تک وہ رتبہ حاصل نہ ہو جائے اور وہ وہی مرتبہ ہے جس کو کلامِ الٰہی نے ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ یعنی مومن صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو نماز میں خشوع اختیار کرتے اور سوز و گداز ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر وہ مومن ہیں کہ جو باوجود خشوع اور سوز و گداز کے تمام لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو تعلقوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور اپنی خشوع کی حالت کو بیہودہ کاموں اور لغو باتوں کے ساتھ ملا کر ضائع اور برباد ہونے نہیں دیتے اور طبعاً تمام لغویات سے علیحدگی اختیار کرتے ہیں اور بیہودہ باتوں اور بیہودہ کاموں سے ایک کراہت اُن کے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے اور یہ اس بات پر دلیل ہوتی ہے کہ ان کو خدا تعالیٰ سے کچھ تعلق ہو گیا ہے کیونکہ ایک طرف سے انسان تب ہی منہ پھیرتا ہے جب دوسری طرف اس کا تعلق ہو جاتا ہے۔ پس دنیا کی لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو سیر و تماشا اور لغو صحبتوں سے واقعی طور پر اُسی وقت انسان کا دل ٹھنڈا ہوتا ہے جب دل کا خدائے رحیم سے تعلق ہو جائے اور دل پر اس کی عظمت اور ہیبت غالب آ جائے۔ ایسا ہی نطفہ بھی اسی وقت لغو طور پر ضائع ہو جانے سے محفوظ ہوتا ہے جب رحم سے اس کا تعلق ہو جائے اور رحم کا اثر اس پر غالب آ جائے اور اس تعلق کے وقت نطفہ کا نام علقہ ہو جاتا ہے۔ پس اسی طرح

روحانی وجود کا دوسرا مرتبہ بھی جو مومن کا مُعرض عن اللغو ہونا ہے روحانی طور پر علقہ ہے کیونکہ اسی مرتبہ پر مومن کے دل پر ہیبت اور عظمت الٰہی وارد ہو کر اس کو لغو باتوں اور لغو کاموں سے چھڑاتی ہے اور ہیبت اور عظمتِ الٰہی سے متاثر ہو کر ہمیشہ کے لئے لغو باتوں اور لغو کاموں کو چھوڑ دینا یہی وہ حالت ہے جس کو دوسرے لفظوں میں تعلق باللہ کہتے ہیں لیکن یہ تعلق جو صرف لغویات کے ترک کرنے کی وجہ سے خدا تعالیٰ سے ہوتا ہے یہ ایک خفیف تعلق ہے کیونکہ اس مرتبہ پر مومن صرف لغویات سے تعلق توڑتا ہے لیکن نفس کی ضروری چیزوں سے اور ایسی باتوں سے جن پر معیشت کی آسودگی کا حصہ ہے ابھی اس کے دل کا تعلق ہوتا ہے اس لئے ہنوز ایک حصہ پلیدی کا اس کے اندر رہتا ہے۔ اِسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے وجودِ روحانی کے اس مرتبہ کو علقہ سے مشابہت دی ہے اور علقہ خون جما ہوا ہوتا ہے جس میں بباعث خون ہونے کے ایک حصہ پلیدی کا باقی ہوتا ہے اور اس مرتبہ میں یہ نقص اس لئے رہ جاتا ہے کہ ایسے لوگ پورے طور پر خدا تعالیٰ سے ڈرتے نہیں اور پورے طور پر ان کے دلوں میں حضرت عزّت جلّ شانہٗ کی عظمت اور ہیبت نہیں بیٹھی اس لئے صرف نکمی اور لغو باتوں کے چھوڑنے پر قادر ہو سکتے ہیں نہ اور باتوں پر۔ پس ناچار اس قدر پلیدی اُن کے نفوس ناقصہ میں رہ جاتی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے ایک خفیف سا تعلق پیدا کر کے لغویات سے تو کنارہ کش ہو جاتے ہیں لیکن وہ ان کاموں کو چھوڑ نہیں سکتے جن کا چھوڑنا نفس پر بہت بھاری ہے یعنی وہ خدا تعالیٰ کے لئے ان چیزوں کو چھوڑ نہیں سکتے جو نفسانی لذّات کے لئے لوازم ضروریہ ہیں اِس بیان سے ظاہر ہے کہ محض لغویات سے منہ پھیرنا ایسا امر نہیں ہے جو بہت قابلِ تحسین ہو بلکہ یہ مومن کی ایک ادنیٰ حالت ہے ہاں خشوع کی حالت سے ایک درجہ ترقی پر ہے۔

اور جسمانی وجود کے تیسرے درجہ کے مقابل پر روحانی وجود کا تیسرا درجہ واقع ہوا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ جسمانی وجود کا تیسرا مرتبہ یہ ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے **فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً** یعنی پھر بعد اس کے ہم نے علقہ کو بوٹی بنایا۔ یہ وہ مرتبہ ہے جس میں وجود جسمانی انسان کا ناپاکی سے باہر آتا ہے اور پہلے سے اس میں کسی قدر شدت اور صلابت بھی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ نطفہ اور خون جما ہوا جو علقہ ہے وہ دونوں ایک نجاستِ خفیفہ اپنے اندر رکھتے ہیں اور اپنے قوام کے رو سے بھی بہ نسبت مضغہ کے نرم اور رقیق ہیں مگر مضغہ جو ایک گوشت کا ٹکڑہ ہوتا ہے پاک حالت اپنے اندر پیدا کرتا ہے اور بہ نسبت نطفہ اور علقہ کے قوام میں بھی ایک حد تک سختی پیدا کر لیتا ہے۔ یہی حالت روحانی وجود کے تیسرے درجہ کی ہے اور روحانی

وجود کا تیسرا درجہ وہ ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ وہ مومن کہ جو پہلی دو حالتوں سے بڑھ کر قدم رکھتا ہے وہ صرف بیہودہ اور لغو باتوں سے ہی کنارہ کش نہیں ہوتا بلکہ بخل کی پلیدی کو دُور کرنے کے لئے جو طبعاً ہر ایک انسان کے اندر ہوتی ہے زکوٰۃ بھی دیتا ہے یعنی خدا کی راہ میں ایک حصہ اپنے مال کا خرچ کرتا ہے۔ زکوٰۃ کا نام اسی لئے زکوٰۃ ہے کہ انسان اس کی بجا آوری سے یعنی اپنے مال کو جو اس کو بہت پیارا ہے لِلّٰہ دینے سے بخل کی پلیدی سے پاک ہو جاتا ہے۔ اور جب بخل کی پلیدی جس سے انسان طبعاً بہت تعلق رکھتا ہے انسان کے اندر سے نکل جاتی ہے تو وہ کسی حد تک پاک بن کر خدا سے جو اپنی ذات میں پاک ہے ایک مناسبت پیدا کر لیتا ہے ؎

کوئی اُس پاک سے جو دل لگاوے کرے پاک آپ کو تب اُس کو پاوے

اور یہ مرتبہ پہلی دو حالتوں میں پایا نہیں جاتا۔ کیونکہ صرف خشوع اور عجز و نیاز یا صرف لغو باتوں کو ترک کرنا ایسے انسان سے بھی ہو سکتا ہے جس میں ہنوز بخل کی پلیدی موجود ہے لیکن جب انسان خدا تعالیٰ کے لئے اپنے اس مال عزیز کو ترک کرتا ہے جس پر اس کی زندگی کا مدار اور معیشت کا انحصار ہے اور جو محنت اور تکلیف اور عرق ریزی سے کمایا گیا ہے تب بخل کی پلیدی اس کے اندر سے نکل جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایمان میں بھی ایک شدت اور صلابت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ دونوں حالتیں مذکورہ بالا جو پہلے اس سے ہوتی ہیں اُن میں یہ پاکیزگی حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایک چھپی ہوئی پلیدی ان کے اندر رہتی ہے۔ اس میں حکمت یہی ہے کہ لغویات سے منہ پھیرنے میں صرف ترکِ شر ہے اور شر بھی ایسی جس کی زندگی اور بقا کے لئے کچھ ضرورت نہیں اور نفس پر اس کے ترک کرنے میں کوئی مشکل نہیں لیکن اپنا محنت سے کمایا ہوا مال محض خدا کی خوشنودی کے لئے دینا یہ کسبِ خیر ہے جس سے وہ نفس کی ناپاکی جو سب ناپاکیوں سے بدتر ہے یعنی بخل دُور ہوتا ہے لہٰذا یہ ایمانی حالت کا تیسرا درجہ ہے جو پہلے دو درجوں سے اشرف اور افضل ہے اور اس کے مقابل پر جسمانی وجود کے تیار ہونے میں مضغہ کا درجہ ہے جو پہلے دو درجوں نطفہ اور علقہ سے فضیلت میں بڑھ کر ہے اور پاکی میں خصوصیت رکھتا ہے کیونکہ نطفہ اور علقہ دونوں نجاست خفیفہ سے ملوث ہیں مگر مضغہ پاک حالت میں ہے اور جس طرح رحم میں مضغہ کو بہ نسبت نطفہ اور علقہ کے ایک ترقی یافتہ حالت اور پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے اور بہ نسبت نطفہ اور علقہ کے رحم سے اس کا تعلق بھی زیادہ ہو جاتا ہے اور شدت اور صلابت بھی زیادہ ہو جاتی ہے یہی حالت وجود روحانی کی مرتبہ سوم کی ہے جس کی تعریف خدا تعالیٰ نے یہ فرمائی ہے

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ یعنی مومن وہ ہیں جو اپنے نفس کو بخل سے پاک کرنے کے لئے اپنا عزیز مال خدا کی راہ میں دیتے ہیں اور اس فعل کو وہ آپ اپنی مرضی سے اختیار کرتے ہیں۔ پس وجود رُوحانی کی اس مرتبہ سوم میں وہی تین[۳] خوبیاں پائی جاتی ہیں جو وجود جسمانی کے مرتبہ سوم میں یعنی مضغہ ہونے کی حالت میں پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ یہ حالت جو بخل سے پاک ہونے کے لئے اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنا اور اپنی محنت سے حاصل کردہ سرمایہ محض لِلّٰہ دوسرے کو دینا بہ نسبت اس حالت کے جو محض لغو باتوں اور لغو کاموں سے پرہیز کرنا ہے ایک ترقی یافتہ حالت ہے اور اس میں صریح اور بدیہی طور پر بخل کی پلیدی سے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور خدائے رحیم سے تعلق بڑھتا ہے کیونکہ اپنے مال عزیز کو خدا کے لئے چھوڑنا بہ نسبت لغو باتوں کے چھوڑنے کے زیادہ تر نفس پر بھاری ہے اس لئے اس زیادہ تکلیف اٹھانے کے کام سے خدا سے تعلق بھی زیادہ ہو جاتا ہے اور بباعث ایک مشقت کا کام بجالانے کے ایمانی شدت اور صلابت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

اب اس کے بعد روحانی وجود کا چوتھا درجہ وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ یعنی تیسرے درجہ سے بڑھ کر مومن وہ ہیں جو اپنے تئیں نفسانی جذبات اور شہوات ممنوعہ سے بچاتے ہیں۔ یہ درجہ تیسرے درجہ سے اس لئے بڑھ کر ہے کہ تیسرے درجہ کا مومن تو صرف مال کو جو اُس کے نفس کو نہایت پیارا اور عزیز ہے خدا تعالیٰ کی راہ میں دیتا ہے لیکن چوتھے درجہ کا مومن وہ چیز خدا تعالیٰ کی راہ میں نثار کرتا ہے جو مال سے بھی زیادہ پیاری اور محبوب ہے یعنی شہوات نفسانیہ۔ کیونکہ انسان کو اپنی شہواتِ نفسانیہ سے اس قدر محبت ہے کہ وہ اپنی شہوات کے پورا کرنے کے لئے اپنے مال عزیز کو پانی کی طرح خرچ کرتا ہے اور ہزار ہا روپیہ شہوات کے پورا کرنے کے لئے برباد کر دیتا ہے اور شہوات کے حاصل کرنے کے لئے مال کو کچھ بھی چیز نہیں سمجھتا۔ جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ ایسے نجس طبع اور بخیل لوگ جو ایک محتاج بھوکے اور ننگے کو بباعث سخت بخل کے ایک پیسہ بھی دے نہیں سکتے شہوات نفسانیہ کے جوش میں بازاری عورتوں کو ہزار ہا روپیہ دے کر اپنا گھر ویران کر لیتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ سیلاب شہوت ایسا تُند اور تیز ہے کہ بخل جیسی نجاست کو بھی بہا لے جاتا ہے۔ اس لئے یہ بدیہی امر ہے کہ بہ نسبت اس قوت ایمانی کے جس کے ذریعہ سے بخل دور ہوتا ہے اور انسان اپنا عزیز مال خدا کے لئے دیتا ہے یہ قوتِ ایمانی جس کے ذریعہ سے انسان شہواتِ نفسانیہ کے طوفان سے بچتا ہے نہایت زبردست اور شیطان کا مقابلہ کرنے میں

نہایت سخت اور نہایت دیر پا ہے کیونکہ اس کا کام یہ ہے کہ نفسِ امّارہ جیسے پرانے اژدہا کو اپنے پیروں کے نیچے کچل ڈالتی ہے۔ اور بخل تو شہوات نفسانیہ کے پورا کرنے کے جوش میں اور نیز ریا اور نمود کے وقتوں میں بھی دُور ہو سکتا ہے مگر یہ طوفان جو نفسانی شہوات کے غلبہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ نہایت سخت اور دیر پا طوفان ہے جو کسی طرح بجز رحم خداوندی کے دور ہو ہی نہیں سکتا اور جس طرح جسمانی وجود کے تمام اعضاء میں سے ہڈی نہایت سخت ہے اور اس کی عمر بھی بہت لمبی ہے اسی طرح اس طوفان کے دور کرنے والی قوتِ ایمانی نہایت سخت اور عمر بھی لمبی رکھتی ہے تا ایسے دشمن کا دیر تک مقابلہ کر کے پامال کر سکے اور وہ بھی خدا تعالیٰ کے رحم سے کیونکہ شہواتِ نفسانیہ کا طوفان ایک ایسا ہولناک اور پُرآشوب طوفان ہے کہ بجز خاص رحم حضرت احدیت کے فرو نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے حضرت یوسف کو کہنا پڑا وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ (یوسف: ۵۴) یعنی میں اپنے نفس کو بَری نہیں کرتا نفس نہایت درجہ بدی کا حکم دینے والا ہے اور اس کے حملہ سے مَخلصی غیر ممکن ہے مگر یہ کہ خود خدا تعالیٰ رحم فرماوے۔ اس آیت میں جیسا کہ فقرہ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ہے طوفان نوح کے ذکر کے وقت بھی اسی کے مشابہ الفاظ ہیں کیونکہ وہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ (ھود: ۴۴) پس یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ طوفان شہواتِ نفسانیہ اپنی عظمت اور ہیبت میں نوح کے طوفان سے مشابہ ہے۔

اور اس درجہ روحانی کے مقابل پر جو وجودِ روحانی کا چوتھا درجہ ہے جسمانی وجود کا درجہ چہارم ہے جس کے بارے میں قرآن شریف میں یہ آیت ہے فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا یعنی پھر ہم نے مُضغہ سے ہڈیاں بنائیں۔ اور ظاہر ہے کہ ہڈیوں میں بہ نسبت مضغہ یعنی بوٹی کے زیادہ صلابت اور سختی پیدا ہو جاتی ہے اور نیز ہڈی بہ نسبت مضغہ کے بہت دیر پا ہے اور ہزاروں برس تک اس کا نشان رہ سکتا ہے پس وجود روحانی کے درجہ چہارم اور وجود جسمانی کے درجہ چہارم میں مشابہت ظاہر ہے کیونکہ وجود روحانی کے درجہ چہارم میں بہ نسبت وجود روحانی کے درجہ سوم کے ایمانی شدّت اور صلابت زیادہ ہے اور خدائے رحیم سے تعلق بھی زیادہ۔ ایسا ہی وجود جسمانی کے درجہ چہارم میں جو استخوان کا پیدا ہونا ہے بہ نسبت درجہ سوم وجود جسمانی کے جو محض مضغہ یعنی بوٹی ہے جسمانی طور پر شدت اور صلابت زیادہ ہے اور رحم سے تعلق بھی زیادہ۔

پھر چہارم درجہ کے بعد پانچواں درجہ وجود روحانی کا وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ یعنی پانچویں درجہ کے مومن جو چوتھے درجہ سے

بڑھ گئے ہیں وہ ہیں جو صرف اپنے نفس میں یہی کمال نہیں رکھتے جو نفسِ امّارہ کی شہوات پر غالب آ گئے ہیں اوراس کے جذبات پر اُن کو فتح عظیم حاصل ہوگئی ہے بلکہ وہ حتی الوسع خدا اوراس کی مخلوق کی تمام امانتوں اور تمام عہدوں کے ہر ایک پہلو کا لحاظ رکھ کر تقویٰ کی باریک راہوں پر قدم مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جہاں تک طاقت ہے اس راہ پر چلتے ہیں۔ خدا کے عہدوں سے مراد وہ ایمانی عہد ہیں جو بیعت اور ایمان لانے کے وقت مومن سے لئے جاتے ہیں جیسے شرک نہ کرنا، خونِ ناحق نہ کرنا وغیرہ۔

لفظ رٰعُوْنَ جو اس آیت میں آیا ہے جس کے معنے ہیں رعایت رکھنے والے۔ یہ لفظ عرب کے محاورہ کے موافق اُس جگہ بولا جاتا ہے جہاں کوئی شخص اپنی قوت اور طاقت کے مطابق کسی امر کی باریک راہ پر چلنا اختیار کرتا ہے اوراس امر کے تمام دقائق بجالانا چاہتا ہے اور کوئی پہلو اس کا چھوڑنا نہیں چاہتا۔ پس اس آیت کا حاصل مطلب یہ ہوا کہ وہ مومن جو وجودِ روحانی کے پنجم درجہ پر ہیں حتی الوسع اپنی موجودہ طاقت کے موافق تقویٰ کی باریک راہوں پر قدم مارتے ہیں اور کوئی پہلو تقویٰ کا جو امانتوں یا عہد کے متعلق ہے خالی چھوڑنا نہیں چاہتے اور سب کی رعایت رکھنا اُن کا ملحوظِ نظر ہوتا ہے اوراس بات پر خوش نہیں ہوتے کہ موٹے طور پر اپنے تئیں امین اور صادق العہد قرار دے دیں بلکہ ڈرتے رہتے ہیں کہ در پردہ اُن سے کوئی خیانت ظہور پذیر نہ ہو۔ پس طاقت کے موافق اپنے تمام معاملات میں توجہ سے غور کرتے رہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ اندرونی طور پر اُن میں کوئی نقص اور خرابی ہو اوراسی رعایت کا نام دوسرے لفظوں میں تقویٰ ہے۔

خلاصہ مطلب یہ کہ وہ مومن جو وجودِ رُوحانی میں پنجم درجہ پر ہیں وہ اپنے معاملات میں خواہ خدا کے ساتھ ہیں خواہ مخلوق کے ساتھ بے قید اور خلیع الرسن نہیں ہوتے بلکہ اس خوف سے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک کسی اعتراض کے نیچے نہ آ جاویں اپنی امانتوں اور عہدوں میں دُور دُور کا خیال رکھ لیتے ہیں اور ہمیشہ اپنی امانتوں اور عہدوں کی پڑتال کرتے رہتے ہیں اور تقویٰ کی دُوربین سے اس کی اندرونی کیفیت کو دیکھتے رہتے ہیں تا ایسا نہ ہو کہ در پردہ اُن کی امانتوں اور عہدوں میں کچھ فتور ہو اور جو امانتیں خدا تعالیٰ کی اُن کے پاس ہیں جیسے تمام قویٰ اور تمام اعضاء اور جان اور مال اور عزت وغیرہ ان کو حتی الوسع اپنی بپابندی تقویٰ بہت احتیاط سے اپنے اپنے محل پر استعمال کرتے رہتے ہیں اور جو عہد ایمان لانے کے وقت خدا تعالیٰ سے کیا ہے کمال صدق سے حتی المقدور اس کے پورا کرنے کے لئے کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ایسا ہی جو امانتیں مخلوق کی اُن کے پاس ہوں یا ایسی چیزیں جو امانتوں کے حکم میں ہوں اُن سب میں تا بمقدور تقویٰ کی پابندی سے کاربند ہوتے

ہیں۔اگر کوئی تنازع واقع ہو تو تقویٰ کو مدّنظر رکھ کر اس کا فیصلہ کرتے ہیں گو اس فیصلہ میں نقصان اٹھا لیں۔ یہ درجہ چوتھے درجہ سے اس لئے بڑھ کر ہے کہ اس میں حتی الوسع تمام اعمال میں تقویٰ کی باریک راہوں سے کام لینا پڑتا ہے اور حتی الوسع جمیع امور میں ہر ایک قدم تقویٰ کی رعایت سے اٹھانا پڑتا ہے مگر چوتھا درجہ صرف ایک ہی موٹی بات ہے اور وہ یہ کہ زنا سے اور بدکاریوں سے پرہیز کرنا اور ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ زنا ایک بہت بے حیائی کا کام ہے اور اس کا مرتکب شہواتِ نفس سے اندھا ہو کر ایسا ناپاک کام کرتا ہے جو انسانی نسل کے حلال سِلسلہ میں حرام کو ملا دیتا ہے اور تضیع نسل کا موجب ہوتا ہے۔ اِسی وجہ سے شریعت نے اس کو ایسا بھاری گناہ قرار دیا ہے کہ اِسی دنیا میں ایسے انسان کے لئے حدِ شرعی مقرر ہے۔ پس ظاہر ہے کہ مومن کی تکمیل کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ زنا سے پرہیز کرے کیونکہ زنا نہایت درجہ مفسد طبع اور بے حیا انسانوں کا کام ہے اور یہ ایک ایسا موٹا گناہ ہے جو جاہل سے جاہل اس کو بُرا سمجھتا ہے اور اس پر بجز کسی بے ایمان کے کوئی بھی دلیری نہیں کر سکتا۔ پس اِس کا ترک کرنا ایک معمولی شرافت ہے کوئی بڑے کمال کی بات نہیں لیکن انسان کی تمام روحانی خوبصورتی تقویٰ کی تمام باریک راہوں پر قدم مارنا ہے[1] تقویٰ کی باریک راہیں رُوحانی خوبصورتی کے لطیف نقوش اور خوشنما خط و خال ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی امانتوں اور ایمانی عہدوں[2] کی حتی الوسع رعایت کرنا اور سر سے پیر تک جتنے قویٰ اور اعضاء ہیں جن میں ظاہری طور پر آنکھیں اور کان اور ہاتھ اور پیر اور دوسرے اعضاء ہیں اور باطنی طور پر دل اور دوسری قوتیں اور اخلاق ہیں۔ ان کو جہاں تک طاقت ہو ٹھیک ٹھیک محل ضرورت پر استعمال کرنا اور ناجائز مواضع سے روکنا اور ان کے

---

[1] ایمان کے لئے خشوع کی حالت مثل بیج کے ہے اور پھر لغو باتوں کے چھوڑنے سے ایمان اپنا نرم نرم سبزہ نکالتا ہے اور پھر اپنا مال بطور زکوٰۃ دینے سے ایمانی درخت کی ٹہنیاں نکل آتی ہیں جو اس کو کسی قدر مضبوط کرتی ہیں اور پھر شہواتِ نفسانیہ کا مقابلہ کرنے سے ان ٹہنیوں میں خوب مضبوطی اور سختی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اپنے عہد اور امانتوں کی تمام شاخوں کی محافظت کرنے سے درخت ایمان کا اپنے مضبوط تنہ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر پھل لانے کے وقت ایک اور طاقت کا فیضان اس پر ہوتا ہے کیونکہ اس طاقت سے پہلے نہ درخت کو پھل لگ سکتا ہے نہ پھول۔ وہی طاقت روحانی پیدائش کے مرتبہ ششم میں خلق آخر کہلاتی ہے اور اسی مرتبہ ششم پر انسانی کمالات کے پھل اور پھول ظاہر ہونے شروع ہوتے ہیں اور انسانی درخت کی روحانی شاخیں نہ صرف مکمل ہو جاتی ہیں بلکہ اپنے پھل بھی دیتی ہیں۔ منہ

[2] ایمانی عہدوں سے مراد وہ عہد ہیں جو انسان بیعت اور ایمان لانے کے وقت ان کا اقرار کرتا ہے جیسے یہ کہ وہ خون نہیں کرے گا۔ چوری نہیں کرے گا۔ جھوٹی گواہی نہیں دے گا۔ خدا سے کسی کو شریک نہیں ٹھہرائے گا اور اسلام اور پیروی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مرے گا۔

پوشیدہ حملوں سے متنبہ رہنا اور اسی کے مقابل پر حقوق عباد کا بھی لحاظ رکھنا یہ وہ طریق ہے جو انسان کی تمام روحانی خوبصورتی اس سے وابستہ ہے اور خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں تقویٰ کو لباس کے نام سے موسوم کیا ہے۔ چنانچہ لِبَاسُ التَّقْوٰى قرآن شریف کا لفظ ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ روحانی خوبصورتی اور روحانی زینت تقویٰ سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور تقویٰ یہ ہے کہ انسان خدا کی تمام امانتوں اور ایمانی عہد اور ایسا ہی مخلوق کی تمام امانتوں اور عہد کی حتی الوسع رعایت رکھے یعنی ان کے دقیق در دقیق پہلوؤں پر تا بمقدور کاربند ہو جائے۔

یہ تو وجودِ روحانی کا پانچواں درجہ ہے اور اس کے مقابل پر جسمانی وجود کا پانچواں درجہ وہ ہے جس کا اس آیت کریمہ میں ذکر ہے فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا۔ یعنی پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت مڑھ دیا اور جسمانی بناوٹ کی کسی قدر خوبصورتی دکھلا دی۔ یہ عجیب مطابقت ہے کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے ایک جگہ روحانی طور پر تقویٰ کو لباس قرار دیا ہے ایسا ہی كَسَوْنَا کا لفظ جو کسوت سے نکلا ہے وہ بھی بتلا رہا ہے کہ جو گوشت ہڈیوں پر مڑھا جاتا ہے وہ بھی ایک لباس ہے جو ہڈیوں پر پہنایا جاتا ہے۔ پس یہ دونوں لفظ دلالت کر رہے ہیں کہ جیسی خوبصورتی کا لباس تقویٰ پہناتی ہے ایسا ہی وہ کسوت جو ہڈیوں پر چڑھائی جاتی ہے ہڈیوں کے لئے ایک خوبصورتی کا پیرایہ بخشتی ہے۔ وہاں لباس کا لفظ ہے اور یہاں کسوت کا اور دونوں کے معنے ایک ہیں اور نص قرآنی بآواز بلند پکار رہی ہے کہ دونوں کا مقصد خوبصورتی ہے اور جیسا کہ انسان کی رُوح پر سے اگر تقویٰ کا لباس اتار دیا جائے تو روحانی بدشکلی اس کی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر وہ گوشت و پوست جو حکیم مطلق نے انسان کی ہڈیوں پر مڑھا ہے اگر ہڈیوں پر سے اتار دیا جائے تو انسان کی جسمانی شکل نہایت مکروہ نکل آتی ہے مگر اس درجہ پنجم میں خواہ درجہ پنجم وجود جسمانی کا ہے اور خواہ درجہ پنجم وجود روحانی کا ہے کامل خوبصورتی پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ ابھی رُوح کا اُس پر فیضان نہیں ہوا۔ یہ امر مشہود و محسوس ہے کہ ایک انسان گو کیسا ہی خوبصورت ہو جب وہ مر جاتا ہے اور اُس کی رُوح اس کے اندر سے نکل جاتی ہے تو ساتھ ہی اس حُسن میں بھی فرق آ جاتا ہے جو اُس کو قدرتِ قادر نے عطا کیا تھا۔ حالانکہ تمام اعضاء اور تمام نقوش موجود ہوتے ہیں مگر صرف ایک رُوح کے نکلنے سے انسانی قالب کا گھر ایک ویران اور سُنسان سا معلوم ہوتا ہے اور آب و تاب کا نشان نہیں رہتا۔ یہی حالت رُوحانی وجود کے پانچویں درجہ کی ہے کیونکہ یہ امر بھی مشہود و محسوس ہے کہ جب تک کسی مومن میں خدا تعالیٰ کی طرف سے اُس رُوح کا فیضان نہ ہو جو وجود رُوحانی کے چھٹے درجہ

پر ملتی ہے اور ایک فوق العادت طاقت اور زندگی بخشتی ہے تب تک خدا کی امانتوں کے ادا کرنے اور اُن کے ٹھیک طور پر استعمال کرنے اور صدق کے ساتھ اس کا ایمانی عہد پورا کرنے اور ایسا ہی مخلوق کے حقوق اور عہدوں کے ادا کرنے میں وہ آب و تاب تقویٰ پیدا نہیں ہوتی جس کا حُسن اور خوبی دلوں کو اپنی طرف کھینچے اور جس کی ہر ایک ادا فوق العادت اور اعجاز کے رنگ میں معلوم ہو بلکہ قبل اس رُوح کے تقویٰ کے ساتھ تکلّف اور بناوٹ کی ایک ملونی رہتی ہے کیونکہ اس میں وہ رُوح نہیں ہوتی جو حُسنِ روحانی کی آب و تاب دکھلا سکے اور یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ ایسے مومن کا قدم جو ابھی اس رُوح سے خالی ہے پورے طور پر نیکی پر قائم نہیں رہ سکتا بلکہ جیسا کہ ایک ہَوا کے دھکّا سے مُردہ کا کوئی عضو حرکت کر سکتا ہے اور جب ہوا دُور ہو جائے تو پھر مُردہ اپنی حالت پر آ جاتا ہے ایسا ہی وجود رُوحانی کے پنجم درجہ کی حالت ہوتی ہے کیونکہ صرف عارضی طور پر خدا تعالیٰ کی نسیمِ رحمت اس کو نیک کاموں کی طرف جنبش دیتی رہتی ہے اور اس طرح تقویٰ کے کام اُس سے صادر ہوتے ہیں۔ لیکن ابھی نیکی کی رُوح اس کے اندر آباد نہیں ہوتی اس لئے وہ حسنِ معاملہ اس میں پیدا نہیں ہوتا جو اس رُوح کے داخل ہونے کے بعد اپنا جلوہ دکھلاتا ہے۔

غرض پنجم مرتبہ وجود روحانی کا گو ایک ناقص مرتبہ حُسن تقویٰ کا حاصل کر لیتا ہے مگر کمال اس حُسن کا وجودِ روحانی کے درجہ ششم پر ہی ظاہر ہوتا ہے جب کہ خدا تعالیٰ کی اپنی محبتِ ذاتیہ روحانی وجود کے لئے ایک رُوح کی طرح ہو کر انسان کے دل پر نازل ہوتی اور تمام نقصانوں کا تدارک کرتی ہے اور انسان محض اپنی قوتوں کے ساتھ کبھی کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ رُوح خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل نہ ہو۔ جیسا کہ حافظ شیرازی نے فرمایا ہے

ما بدان منزلِ عالی نتوانیم رسید ہاں مگر لطف تو چوں پیش نہد گامے چند

پھر درجہ پنجم کے بعد چھٹا درجہ وجود روحانی کا وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اِس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا ہے وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ یعنی چھٹے درجہ کے مومن جو پانچویں درجہ سے بڑھ گئے ہیں وہ ہیں جو اپنی نمازوں پر آپ محافظ اور نگہبان ہیں یعنی وہ کسی دوسرے کی تذکیر اور یاد دہانی کے محتاج نہیں رہے بلکہ کچھ ایسا تعلّق ان کو خدا سے پیدا ہو گیا ہے اور خدا کی یاد کچھ اس قسم کی محبوب طبع اور مدارِ آرام اور مدارِ زندگی ان کے لئے ہو گئی ہے کہ وہ ہر وقت اس کی نگہبانی میں لگے رہتے ہیں اور ہر دم ان کا یادِ الٰہی میں گزرتا ہے اور نہیں چاہتے کہ ایک دم بھی خدا کے ذکر سے الگ ہوں۔

اب ظاہر ہے کہ انسان اسی چیز کی محافظت اور نگہبانی میں تمام تر کوشش کر کے ہر دم لگا رہتا ہے جس کے گم ہونے میں اپنی ہلاکت اور تباہی دیکھتا ہے جیسا کہ ایک مسافر جو ایک بیابان بے آب و دانہ میں سفر کر رہا ہے جس کے صد ہا کوس تک پانی اور روٹی ملنے کی کوئی امید نہیں وہ اپنے پانی اور روٹی کی جو ساتھ رکھتا ہے بہت محافظت کرتا ہے اور اپنی جان کے برابر اس کو سمجھتا ہے کیونکہ وہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے ضائع ہونے میں اس کی موت ہے۔ پس وہ لوگ جو اُس مسافر کی طرح اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں اور گو مال کا نقصان ہو یا عزت کا نقصان ہو یا نماز کی وجہ سے کوئی ناراض ہو جائے نماز کو نہیں چھوڑتے اور اس کے ضائع ہونے کے اندیشہ میں سخت بے تاب ہوتے اور پیچ و تاب کھاتے گویا مر ہی جاتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ایک دم بھی یادِ الٰہی سے الگ ہوں۔ وہ درحقیقت نماز اور یادِ الٰہی کو اپنی ایک ضروری غذا سمجھتے ہیں جس پر ان کی زندگی کا مدار ہے اور یہ حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب خدا تعالیٰ اُن سے محبت کرتا ہے اور اس کی محبتِ ذاتیہ کا ایک افروختہ شعلہ جس کو روحانی وجود کے لئے ایک رُوح کہنا چاہیئے اُن کے دل پر نازل ہوتا ہے اور ان کو حیاتِ ثانی بخش دیتا ہے اور وہ رُوح ان کے تمام وجود روحانی کو روشنی اور زندگی بخشتی ہے۔ تب وہ نہ کسی تکلّف اور بناوٹ سے خدا کی یاد میں لگے رہتے ہیں بلکہ وہ خدا جس نے جسمانی طور پر انسان کی زندگی روٹی اور پانی پر موقوف رکھی ہے وہ ان کی رُوحانی زندگی کو جس سے وہ پیار کرتے ہیں اپنی یاد کی غذا سے وابستہ کر دیتا ہے۔ اس لئے وہ اس روٹی اور پانی کو جسمانی روٹی اور پانی سے زیادہ چاہتے ہیں۔ اور اس کے ضائع ہونے سے ڈرتے ہیں اور یہ اس رُوح کا اثر ہوتا ہے جو ایک شعلہ کی طرح اُن میں ڈالی جاتی ہے۔ جس سے عشقِ الٰہی کی کامل مستی اُن میں پیدا ہو جاتی ہے اس لئے وہ یادِ الٰہی سے ایک دم الگ ہونا نہیں چاہتے۔ وہ اس کے لئے دکھ اُٹھاتے اور مصائب دیکھتے ہیں مگر اس سے ایک لحظہ بھی جدا ہونا نہیں چاہتے اور پاس انفاس کرتے ہیں۔ اور اپنی نمازوں کے محافظ اور نگہبان رہتے ہیں۔ اور یہ اَمر اُن کے لئے طبعی ہے کیونکہ درحقیقت خدا نے اپنی محبت سے بھری ہوئی یاد کو جس کو دوسرے لفظوں میں نماز کہتے ہیں ان کے لئے ایک ضروری غذا مقرر کر دیا ہے اور اپنی محبتِ ذاتیہ سے اُن پر تجلی فرما کر یادِ الٰہی کی ایک دلکش لذّت ان کو عطا کی ہے۔ پس اس وجہ سے یادِ الٰہی جان کی طرح بلکہ جان سے بڑھ کر ان کو عزیز ہو گئی ہے اور خدا کی ذاتی محبت ایک نئی رُوح ہے جو شعلہ کی طرح ان کے دلوں پر پڑتی ہے اور ان کی نماز اور یادِ الٰہی کو ایک غذا کی طرح ان کے لئے بنا دیتی ہے۔ پس وہ یقین رکھتے ہیں کہ اُن کی زندگی روٹی اور پانی سے نہیں بلکہ نماز اور یادِ الٰہی سے جیتے ہیں۔

غرض محبت سے بھری ہوئی یادالٰہی جس کا نام نماز ہے وہ درحقیقت ان کی غذا ہو جاتی ہے جس کے بغیر وہ جی ہی نہیں سکتے اور جس کی محافظت اور نگہبانی بعینہٖ اس مسافر کی طرح وہ کرتے رہتے ہیں جو ایک دشت بے آب و دانہ میں اپنی چند روٹیوں کی محافظت کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں اور اپنے کسی قدر پانی کو جان کے ساتھ رکھتا ہے جو اس کی مشک میں ہے۔ واہب مطلق نے انسان کی روحانی ترقیات کے لئے یہ بھی ایک مرتبہ رکھا ہوا ہے جو محبت ذاتی اور عشق کے غلبہ اور استیلا کا آخری مرتبہ ہے اور درحقیقت اس مرتبہ پر انسان کے لئے محبت سے بھری ہوئی یادالٰہی جس کا شرعی اصطلاح میں نماز نام ہے غذا کے قائم مقام ہو جاتی ہے بلکہ وہ بار بار جسمانی رُوح کو بھی اس غذا پر فدا کرنا چاہتا ہے وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا جیسا کہ مچھلی بغیر پانی کے زندہ نہیں رہ سکتی اور خدا سے علیحدہ ایک دم بھی بسر کرنا اپنی موت سمجھتا ہے۔ اور اس کی رُوح آستانہ الٰہی پر ہر وقت سجدہ میں رہتی ہے اور تمام آرام اُس کا خدا ہی میں ہو جاتا ہے اور اس کو یقین ہوتا ہے کہ مَیں اگر ایک طرفۃ العین بھی یادالٰہی سے الگ ہوا تو بس میں مرا۔ اور جس طرح روٹی سے جسم میں تازگی اور آنکھ اور کان وغیرہ اعضاء کی قوتوں میں توانائی آجاتی ہے۔ اِسی طرح اس مرتبہ پر یادالٰہی جو عشق اور محبت کے جوش سے ہوتی ہے مومن کی روحانی قوتوں کو ترقی دیتی ہے یعنی آنکھ میں قوتِ کشف نہایت صاف اور لطیف طور پر پیدا ہو جاتی ہے اور کان خدا تعالیٰ کے کلام کو سُنتے ہیں اور زبان پر وہ کلام نہایت لذیذ اور اجلیٰ اور اصفٰی طور پر جاری ہو جاتا ہے اور رؤیاءِ صادقہ بکثرت ہوتے ہیں[1] جو فلق صبح کی طرح ظہور میں آجاتے ہیں اور بباعث علاقہ صافیہ محبت جو حضرت عزت سے ہوتا ہے مبشر خوابوں سے بہت سا حصہ اُن کو ملتا ہے۔ یہی وہ مرتبہ ہے

---

[1] بہت سے نادان اس وہم میں گرفتار ہیں کہ ہمیں بھی بعض اوقات سچی خواب آجاتی ہے یا سچا الہام ہو جاتا ہے تو ہم میں اور ایسے اعلیٰ مرتبہ کے لوگوں میں فرق کیا ہوا اور ان عالی مرتبہ لوگوں کی کیا خصوصیت باقی رہی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قدر طاقت خواب دیکھنے یا الہام کی اس غرض سے عام لوگوں کی فطرت میں رکھی گئی ہے کہ تا ان کے پاس بھی ان باریک باتوں کا کسی قدر نمونہ ہو جو اس جہان سے وراء الوراء باتیں ہیں۔ اور اس طرح پر وہ اپنے پاس ایک نمونہ دیکھ کر دولتِ قبول سے محروم نہ رہیں اور ان پر اتمام حجت ہو جائے۔ ورنہ اگر انسانوں کی یہ حالت ہوتی کہ وحی اور رؤیا صادقہ کی حقیقت سے وہ بالکل بے خبر ہوتے تو بجز انکار کے کیا کر سکتے تھے اور اس حالت میں کسی قدر معذور تھے۔ پھر جبکہ باوجود موجود ہونے اس نمونے کے زمانہ حال کے فلسفی اب تک وحی اور رؤیا صادقہ کا انکار کرتے ہیں تو اس وقت عام لوگوں کا کیا حال ہوتا جب کہ ان کے پاس کوئی بھی نمونہ نہ ہوتا۔ اور یہ خیال کہ ہمیں بھی بعض اوقات سچی خوابیں آجاتی ہیں یا کوئی سچے الہام ہو جاتے ہیں اس سے رسولوں اور نبیوں کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ ایسے لوگوں کے رؤیا اور الہام شکوک اور شبہات کے دُخان سے خالی نہیں ہوتے اور باایں ہمہ مقدار میں بھی کم ہوتے ہیں۔ پس جیسا کہ ایک مفلس ایک پیسہ کے ساتھ ایک بادشاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس بھی مال ہے اور اس کے پاس بھی ایسا ہی یہ مقابلہ بھی ہیچ اور سراسر حماقت ہے۔ منہ

جس مرتبہ پر مومن کو محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی محبت اس کے لئے روٹی اور پانی کا کام دیتی ہے۔ یہ نئی پیدائش اس وقت ہوتی ہے جب پہلے روحانی قالب تمام تیار ہو چکتا ہے۔ اور پھر وہ رُوح جو محبتِ ذاتیہ الٰہیہ کا ایک شعلہ ہے ایسی مومن کے دل پر آ پڑتا ہے اور یک دفعہ طاقت بالا نشیمن بشریت سے بلند تر اُس کو لے جاتی ہے۔ اور یہ مرتبہ وہ ہے جس کو روحانی طور پر خَلقِ آخر کہتے ہیں۔ اس مرتبہ پر خدا تعالیٰ اپنی ذاتی محبت کا ایک افروختہ شعلہ جس کو دوسرے لفظوں میں روح کہتے ہیں مومن کے دل پر نازل کرتا ہے اور اس سے تمام تاریکیوں اور آلائشوں اور کمزوریوں کو دُور کر دیتا ہے۔ اور اس رُوح کے پھونکنے کے ساتھ ہی وہ حُسن جو ادنیٰ مرتبہ پر تھا کمال کو پہنچ جاتا ہے اور ایک روحانی آب و تاب پیدا ہو جاتی ہے اور گندی زندگی کی کبودگی بکلّی دُور ہو جاتی ہے اور مومن اپنے اندر محسوس کر لیتا ہے کہ ایک نئی رُوح اس کے اندر داخل ہوگئی ہے جو پہلے نہیں تھی۔ اُس رُوح کے ملنے سے ایک عجیب سکینت اور اطمینان مومن کو حاصل ہو جاتی ہے اور محبتِ ذاتیہ ایک فوّارہ کی طرح جوش مارتی اور عبودیت کے پودہ کی آبپاشی کرتی ہے اور وہ آگ جو پہلے ایک معمولی گرمی کی حد تک تھی اس درجہ پر وہ تمام و کمال افروختہ ہو جاتی ہے اور انسانی وجود کے تمام خس و خاشاک کو جلا کر الوہیت کا قبضہ اس پر کر دیتی ہے۔ اور وہ آگ تمام اعضاء پر احاطہ کر لیتی ہے۔ تب اُس لوہے کی مانند جو نہایت درجہ آگ میں تپایا جائے یہاں تک کہ سُرخ ہو جائے اور آگ کے رنگ پر ہو جائے۔ اس مومن سے اُلوہیت کے آثار اور افعال ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ لوہا بھی اس درجہ پر آگ کے آثار اور افعال ظاہر کرتا ہے مگر یہ نہیں کہ وہ مومن خدا ہو گیا ہے بلکہ محبتِ الٰہیہ کا کچھ ایسا ہی خاصہ ہے جو اپنے رنگ میں ظاہر وجود کو لے آتی ہے اور باطن میں عبودیت اور اس کا ضعف موجود ہوتا ہے۔ اس درجہ پر مومن کی روٹی خدا ہوتا ہے جس کے کھانے پر اس کی زندگی موقوف ہے اور مومن کا پانی بھی خدا ہوتا ہے جس کے پینے سے وہ موت سے بچ جاتا ہے۔ اور اس کی ٹھنڈی ہوا بھی خدا ہی ہوتا ہے جس سے اس کے دل کو راحت پہنچتی ہے۔ اور اس مقام پر استعارہ کے رنگ میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خدا اس مرتبہ کے مومن کے اندر داخل ہوتا اور اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کرتا اور اس کے دل کو اپنا تخت گاہ بنا لیتا ہے۔ تب وہ اپنی رُوح سے نہیں بلکہ خدا کی رُوح سے دیکھتا اور خدا کی رُوح سے سُنتا اور خدا کی رُوح سے بولتا اور خدا کی رُوح سے چلتا اور خدا کی رُوح سے دشمنوں پر حملہ کرتا ہے کیونکہ وہ اس مرتبہ پر نیستی اور استہلاک کے مقام میں ہوتا ہے اور خدا کی رُوح اس پر اپنی محبتِ ذاتیہ کے ساتھ تجلی فرما کر حیاتِ ثانی اس کو بخشتی ہے۔ پس اس وقت روحانی طور پر اس پر یہ آیت صادق آتی

ہے ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

یہ تو وجود روحانی کا مرتبہ ششم ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور اس کے مقابل پر جسمانی پیدائش کا مرتبہ ششم ہے اور اس جسمانی مرتبہ کے لئے بھی وہی آیت ہے جو روحانی مرتبہ کے لئے اوپر ذکر ہو چکی ہے یعنی ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب ہم ایک پیدائش کو طیار کر چکے تو بعد اس کے ہم نے ایک اور پیدائش سے انسان کو پیدا کیا۔ اَور کے لفظ سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ وہ ایسی فوق الفہم پیدائش ہے جس کا سمجھنا انسان کی عقل سے بالاتر ہے اور اُس کے فہم سے بہت دُور یعنی رُوح جو قالب کی طیاری کے بعد جسم میں ڈالی جاتی ہے وہ ہم نے انسان میں روحانی اور جسمانی دونوں طور پر ڈال دی جو مجہول الکنہ ہے اور جس کی نسبت تمام فلسفی اور اس مادی دنیا کے تمام مقلّد حیران ہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔ اور جب کہ حقیقت تک اُن کو راہ نہ ملی تو اپنی اٹکل سے ہر ایک نے تکّیں لگائیں۔ کسی نے روح کے وجود سے ہی انکار کیا۔ اور کسی نے اس کو قدیم اور غیر مخلوق سمجھا۔ پس اللہ تعالیٰ اس جگہ فرماتا ہے کہ ''روح'' بھی خدا کی پیدائش ہے مگر دنیا کے فہم سے بالاتر ہے اور جیسا کہ اس دنیا کے فلاسفر اس رُوح سے بے خبر ہیں جو وجود جسمانی کے چھٹے مرتبہ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے جسم پر فائض ہوتی ہے ویسا ہی وہ لوگ اس رُوح سے بھی بے علم رہے کہ جو وجود رُوحانی کے چھٹے مرتبہ پر مومن صادق کو خدا تعالیٰ سے ملتی ہے اور اس بارے میں بھی مختلف راہیں اختیار کیں۔ بہتوں نے ایسے لوگوں کی پوجا شروع کر دی جن کو وہ رُوح بھی دی گئی تھی اور ان کو قدیم اور غیر مخلوق اور خدا سمجھ لیا اور بہتوں نے اس سے انکار کر دیا کہ اس مرتبہ کے لوگ بھی ہوتے ہیں اور ایسی رُوح بھی انسان کو ملتی ہے۔

لیکن اس بات کو بہت جلد ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ جب کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور خدا نے زمین کے تمام پرند و چرند پر اس کو بزرگی دے کر اور سب پر حکومت بخش کر اور عقل و فہم عنایت فرما کر اور اپنی معرفت کی ایک پیاس لگا کر اپنے ان تمام افعال سے جتلا دیا ہے کہ انسان خدا کی محبت اور عشق کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو پھر اس سے کیوں انکار کیا جائے کہ انسان محبتِ ذاتیہ کے مقام تک پہنچ کر اس درجہ تک پہنچ جائے کہ اس کی محبت پر خدا کی محبت ایک رُوح کی طرح وارد ہو کر تمام کمزوریاں اس کی دُور کر دے۔ اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وجود رُوحانی کے ششم مرتبہ کے بارے میں فرمایا ہے وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ایسا ہی دائمی حضور اور سوز و گداز اور عبودیت انسان سے سرزد ہو اور اس طرح پر وہ اپنے وجود کی علّتِ غائی کو

پورا کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات: ۵۷) یعنی مَیں نے پرستش کے لئے ہی جِنّ و اِنس کو پیدا کیا ہے۔ ہاں یہ پرستش اور حضرت عزّت کے سامنے دائمی حضور کے ساتھ کھڑا ہونا بجز محبتِ ذاتیہ کے ممکن نہیں۔ اور محبت سے مراد یک طرفہ محبت نہیں بلکہ خالق اور مخلوق کی دونوں محبتیں مراد ہیں تا بجلی کی آگ کی طرح جو مرنے والے انسان پر گرتی ہے اور جو اُس وقت اس انسان کے اندر سے نکلتی ہے بشریت کی کمزوریوں کو جلا دیں اور دونوں مل کر تمام رُوحانی وجود پر قبضہ کر لیں۔

یہی وہ کامل صورت ہے جس میں انسان ان امانتوں اور عہد کو جن کا ذکر وجود روحانی کے مرتبہ پنجم میں تحریر ہے کامل طور پر اپنے اپنے موقع پر ادا کر سکتا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ مرتبہ پنجم میں انسان صرف تقویٰ کے لحاظ سے خدا اور مخلوق کی امانتوں اور عہد کا لحاظ رکھتا ہے اور اس مرتبہ پر محبت ذاتی کے تقاضا سے جو خدا کے ساتھ اس کو ہوگئی ہے جس کی وجہ سے خدا کی مخلوق کی محبت بھی اُس میں جوش زن ہوگئی ہے اور اس رُوح کے تقاضا سے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس پر نازل ہوتی ہے ان تمام حقوق کو طبعاً بوجہ احسن ادا کرتا ہے اور اس صورت میں وہ حسن باطنی جو حسنِ ظاہری کے مقابل پر ہے بوجہ احسن اس کو نصیب ہو جاتا ہے کیونکہ وجود روحانی کے مرتبہ پنجم میں تو ابھی وہ رُوح انسان میں داخل نہیں ہوئی تھی جو محبتِ ذاتیہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے جلوۂ حُسن بھی ابھی کمال پر نہیں تھا مگر رُوح کے داخل ہونے کے بعد وہ حسن کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مُردہ خوبصورت اور زندہ خوبصورت یکساں آب و تاب نہیں رکھتے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں انسان کی پیدائش میں دو قسم کے حُسن ہیں۔ ایک حُسنِ معاملہ اور وہ یہ کہ انسان خدا تعالیٰ کی تمام امانتوں اور عہد کے ادا کرنے میں یہ رعایت رکھے کہ کوئی امر حتی الوسع اُن کے متعلق فوت نہ ہو۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں رَاعُون کا لفظ اِسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایسا ہی لازم ہے کہ انسان مخلوق کی امانتوں اور عہد کی نسبت بھی یہی لحاظ رکھے یعنی حقوق اللہ اور حقوق عباد میں تقویٰ سے کام لے۔ یہ حُسنِ معاملہ ہے یا یُوں کہو کہ روحانی خوبصورتی ہے جو درجہ پنجم وجود روحانی میں نمایاں ہوتی ہے مگر ہنوز پورے طور پر چمکتی نہیں اور وجود رُوحانی کے درجہ ششم میں بوجہ کامل ہونے پیدائش اور رُوح کے داخل ہو جانے کے یہ خوبصورتی اپنی تمام آب و تاب دکھلا دیتی ہے۔ اور یاد رہے کہ مرتبہ ششم وجود روحانی میں رُوح سے مراد وہ محبتِ ذاتیہ الٰہیہ ہے جو انسان کی محبتِ ذاتیہ پر ایک شعلہ کی طرح پڑتی اور تمام اندرونی تاریکی دُور کرتی اور روحانی زندگی بخشتی ہے اور اس کے لوازم میں سے رُوح القدس کی تائید بھی کامل طور پر ہے۔

دوسرا حُسن انسان کی پیدائش میں حُسنِ بشرہ ہے۔ اور یہ دونوں حُسن اگر چہ رُوحانی اور جسمانی پیدائش درجہ پنجم میں نمودار ہو جاتے ہیں لیکن آب و تاب اُن کی فیضانِ رُوح کے بعد ظاہر ہوتی ہے اور جیسا کہ جسمانی وجود کی رُوح جسمانی قالب طیار ہونے کے بعد جسم میں داخل ہوتی ہے ایسا ہی روحانی وجود کی رُوح روحانی قالب طیار ہونے کے بعد انسان کے رُوحانی وجود میں داخل ہوتی ہے۔ یعنی اُس وقت جب کہ انسان شریعت کا تمام جُوا اپنی گردن پر لے لیتا ہے اور مشقت اور مجاہدہ کے ساتھ تمام حدودِ الٰہیہ کے قبول کرنے کے لئے طیار ہوتا ہے اور ورزش شریعت اور بجا آوری احکامِ کتاب اللہ سے اس لائق ہو جاتا ہے کہ خُدا کی روحانیت اس کی طرف توجہ فرماوے اور سب سے زیادہ یہ کہ اپنی محبتِ ذاتیہ سے اپنے تئیں خدا تعالیٰ کی محبتِ ذاتیہ کا مستحق ٹھہرا لیتا ہے جو برف کی طرح سفید اور شہد کی طرح شیریں ہے۔ اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وجود رُوحانی خشوع کی حالت سے شروع ہوتا ہے اور روحانی نشو و نما کے چھٹے مرتبہ پر یعنی اس مرتبہ پر کہ جب کہ رُوحانی قالب کے کامل ہونے کے بعد محبتِ ذاتیہ الٰہیہ کا شعلہ انسان کے دل پر ایک رُوح کی طرح پڑتا ہے اور دائمی حضور کی حالت اس کو بخش دیتا ہے کمال کو پہنچتا ہے اور تبھی روحانی حُسن اپنا پورا جلوہ دکھاتا ہے۔ لیکن یہ حُسن جو روحانی حُسن ہے جس کو حُسنِ معاملہ کے ساتھ موسوم کر سکتے ہیں یہ وہ حُسن ہے جو اپنی قوی کششوں کے ساتھ حُسنِ بشرہ سے بہت بڑھ کر ہے۔ کیونکہ حُسنِ بشرہ صرف ایک یا دو شخص کے فانی عشق کا موجب ہوگا جو جلد زوال پذیر ہو جائے گا اور اس کی کشش نہایت کمزور ہوگی۔ لیکن وہ روحانی حُسن جس کو حُسنِ معاملہ سے موسوم کیا گیا ہے وہ اپنی کششوں میں ایسا سخت اور زبردست ہے کہ ایک دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور زمین و آسمان کا ذرّہ ذرّہ اس کی طرف کھنچا جاتا ہے اور قبولیت دُعا کی بھی درحقیقت فلاسفی یہی ہے کہ جب ایسا رُوحانی حُسن والا انسان جس میں محبتِ الٰہیہ کی رُوح داخل ہو جاتی ہے جب کسی غیر ممکن اور نہایت مشکل امر کے لئے دُعا کرتا ہے اور اُس دُعا پر پورا پورا زور دیتا ہے تو چونکہ وہ اپنی ذات میں حُسنِ رُوحانی رکھتا ہے اس لئے خدا تعالیٰ کے امر اور اذن سے اس عالم کا ذرّہ ذرّہ اس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ پس ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں جو اس کی کامیابی کے لئے کافی ہوں۔ تجربہ اور خدا تعالیٰ کی پاک کتاب سے ثابت ہے کہ دنیا کے ہر ایک ذرّہ کو طبعاً ایسے شخص کے ساتھ ایک عشق ہوتا ہے اور اُس کی دُعائیں اُن تمام ذرّات کو ایسا اپنی طرف کھینچتی ہیں جیسا کہ آہن رُبا لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ پس غیر معمولی باتیں جن کا ذکر کسی علمِ طبعی اور فلسفہ میں نہیں اس کشش کے باعث ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اور وہ کشش طبعی ہوتی ہے۔

جب سے کہ صانع مطلق نے عالمِ اجسام کو ذرّات سے ترکیب دی ہے ہر ایک ذرّے میں وہ کشش رکھی ہے اور ہر ایک ذرّہ رُوحانی حُسن کا عاشق صادق ہے اور ایسا ہی ہر ایک سعید رُوح بھی۔ کیونکہ وہ حُسن تجلّی گاہِ حق ہے۔ وہی حُسن تھا جس کے لئے فرمایا گیا اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ (البقرۃ: ۳۵) اور اب بھی بہتیرے ابلیس ہیں جو اِس حُسن کو شناخت نہیں کرتے مگر وہ حسن بڑے بڑے کام دکھلا تا رہا ہے۔

نوح میں وہی حُسن تھا جس کی پاس خاطر حضرت عزت جلّ شانہٗ کو منظور ہوئی اور تمام منکروں کو پانی کے عذاب سے ہلاک کیا گیا۔ پھر اس کے بعد موسیٰ بھی وہی حُسن رُوحانی لے کر آیا جس نے چند روز تکلیفیں اٹھا کر آخر فرعون کا بیڑا غرق کیا۔ پھر سب کے بعد سیّد الانبیاء وخیر الوریٰ مولانا وسیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم الشان روحانی حُسن لے کر آئے جس کی تعریف میں یہی آیت کریمہ کافی ہے دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰی (النجم: ۹، ۱۰) یعنی وہ نبی جنابِ الٰہی سے بہت نزدیک چلا گیا اور پھر مخلوق کی طرف جُھکا اور اس طرح پر دونوں حقوں کو جو حق اللہ اور حق العباد ہے ادا کر دیا۔ اور دونوں قسم کا حُسن رُوحانی ظاہر کیا۔ اور دونوں قوسوں میں وتر کی طرح ہو گیا۔ یعنی دونوں قوسوں میں جو ایک درمیانی خط کی طرح ہو اور اس طرح اس کا وجود واقع ہوا جیسے یہ۔ (خالق قوس | مخلوق قوس — درمیانی خط آنحضرتؐ) اس حُسن کو ناپاک طبع اور اندھےلوگوں نے نہ دیکھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡكَ وَ هُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ (الاعراف: ۱۹۹) یعنی تیری طرف وہ دیکھتے ہیں مگر تو انہیں دکھائی نہیں دیتا۔ آخر وہ سب اندھے ہلاک ہو گئے۔

اس جگہ بعض جاہل کہتے ہیں کہ کیوں کامل لوگوں کی بعض دُعائیں منظور نہیں ہوتیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اُن کی تجلّی حُسن کو خدا تعالیٰ نے اپنے اختیار میں رکھا ہوا ہے۔ پس جس جگہ یہ تجلّی عظیم ظاہر ہو جاتی ہے اور کسی معاملہ میں اُن کا حُسن جوش میں آتا ہے اور اپنی چمک دکھلاتا ہے تب اس چمک کی طرف ذرّاتِ عالم کھنچے جاتے ہیں اور غیر ممکن باتیں وقوع میں آتی ہیں جن کو دوسرے لفظوں میں معجزہ کہتے ہیں۔ مگر یہ جوشِ روحانی ہمیشہ اور ہر جگہ ظہور میں نہیں آتا اور تحریکات خارجیہ کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ جیسا کہ خدائے کریم بے نیاز ہے اس نے اپنے برگزیدوں میں بھی بے نیازی کی صفت رکھ دی ہے۔ سو وہ خدا کی طرح سخت بے نیاز ہوتے ہیں اور جب تک کوئی پوری خاکساری اور اخلاص کے ساتھ اُن کے رحم کے لئے ایک تحریک پیدا نہ کرے وہ قوت اُن کی جوش نہیں مارتی اور عجیب تر یہ کہ وہ لوگ تمام دنیا سے زیادہ تر رحم کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ مگر اُس کی تحریک اُن کے اختیار میں نہیں ہوتی گو وہ بار ہا چاہتے بھی ہیں کہ وہ قوت ظہور میں

آوے مگر بجز ارادہ الٰہیہ کے ظاہر نہیں ہوتی۔ بالخصوص وہ منکروں اور منافقوں اور سُست اعتقاد لوگوں کی کچھ بھی پروا نہیں رکھتے اور ایک مرے ہوئے کیڑے کی طرح اُن کو سمجھتے ہیں اور وہ بے نیازی ان کی ایک ایسی شان رکھتی ہے جیسا کہ ایک معشوق نہایت خوبصورت برقع میں اپنا چہرہ چھپائے رکھے۔ اور اِسی بے نیازی کا ایک شعبہ یہ ہے کہ جب کوئی شریر انسان اُن پر بدظنی کرے تو بسا اوقات بے نیازی کے جوش سے اُس بدظنی کو اور بھی بڑھا دیتے ہیں۔ کیونکہ تخلّق باخلاق اللّٰہ رکھتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (البقرۃ:۱۱) جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ کوئی معجزہ اُن سے ظاہر ہو تو اُن کے دلوں میں ایک جوش پیدا کر دیتا ہے اور ایک امر کے حصول کے لئے سخت کرب اور قلق اُن کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے تب وہ بے نیازی کا برقع اپنے مُنہ پر سے اُتار لیتے ہیں اور وہ حُسن اُن کا جو بجز خدا تعالیٰ کے کوئی نہیں دیکھتا وہ آسمان کے فرشتوں پر اور ذرّہ ذرّہ پر نمودار ہو جاتا ہے۔ اور اُن کا مُنہ پر سے برقع اٹھانا یہ ہے کہ وہ اپنے کامل صدق اور صفا کے ساتھ اور اِس رُوحانی حُسن کے ساتھ جس کی وجہ سے وہ خدا کے محبوب ہو گئے ہیں اس خدا کی طرف ایک ایسا خارق عادت رجوع کرتے ہیں اور ایک ایسے اقبال علی اللہ کی اُن میں حالت پیدا ہو جاتی ہے جو خدا تعالیٰ کی فوق العادت رحمت کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ساتھ ہی ذرّہ ذرّہ اس عالم کا کھنچا چلا آتا ہے۔ اور اُن کی عاشقانہ حرارت کی گرمی آسمان پر جمع ہوتی اور بادلوں کی طرح فرشتوں کو بھی اپنا چہرہ دکھا دیتی ہے اور اُن کی دردیں جو رعد کی خاصیت اپنے اندر رکھتی ہیں ایک سخت شور ملاءِ اعلیٰ میں ڈال دیتی ہیں تب خدا تعالیٰ کی قدرت سے وہ بادل پیدا ہو جاتے ہیں جن سے رحمت الٰہی کا وہ مینہ برستا ہے جس کی وہ خواہش کرتے ہیں۔ اُن کی روحانیت جب اپنے پورے سوز وگداز کے ساتھ کسی عقدہ کشائی کے لئے توجہ کرتی ہے تو وہ خدا تعالیٰ کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ بباعث اس کے جو خدا سے ذاتی محبت رکھتے ہیں محبوبانِ الٰہی میں داخل ہوتے ہیں۔ تب ہر ایک چیز جو خدا تعالیٰ کے زیرِ حکم ہے۔ اُن کی مدد کے لئے جوش مارتی ہے [1] اور رحمت الٰہی محض اُن کی مراد پوری کرنے کے لئے ایک خلق جدید کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ اور وہ امور ظاہر ہوتے ہیں جو اہل دنیا کی نظر میں غیر ممکن معلوم ہوتے ہیں اور جن سے سفلی علوم محض نا آشنا ہیں۔ ایسے لوگوں کو خدا تو نہیں کہہ سکتے مگر قرب اور علاقہ محبت اُن کا کچھ ایسا صدق اور صفا کے ساتھ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے

[1] کافر اور دشمن بھی ایک قسم کی ان کی مدد کرتے ہیں کہ ایذاء اور ظلم کے ساتھ ان کے دل کو دکھ دیتے اور ان کی روحانیت کو جوش میں لاتے ہیں ؎

تا دل مرد خدا نامد بدرد ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد۔ منه

گویا خدا اُن میں اُتر آتا ہے۔ اور آدم کی طرح خدائی رُوح اُن میں پھُونکی جاتی ہے مگر یہ نہیں کہ وہ خدا ہیں لیکن درمیان میں کچھ ایسا تعلق ہے جیسا کہ لوہے کو جب کہ سخت طور پر آگ سے افروختہ ہو جائے اور آگ کا رنگ اُس میں پیدا ہو جائے آگ سے تعلق ہوتا ہے۔ اس صورت میں تمام چیزیں جو خدا تعالیٰ کے زیرِ حکم ہیں اُن کے زیرِ حکم ہو جاتی ہیں۔ اور آسمان کے ستارے اور سورج اور چاند سے لے کر زمین کے سمندروں اور ہوا اور آگ تک اُن کی آواز کو سُنتے اور ان کو شناخت کرتے اور اُن کی خدمت میں لگے رہتے ہیں اور ہر ایک چیز طبعاً اُن سے پیار کرتی ہے اور عاشقِ صادق کی طرح اُن کی طرف کھنچی جاتی ہے۔ بجز شریر انسانوں کے جو شیطان کا اوتار ہیں۔ عشق مجازی تو ایک منحوس عشق ہے کہ ایک طرف پیدا ہوتا اور ایک طرف مر جاتا ہے۔ اور نیز اس کی بنا اُس حُسن پر ہے جو قابلِ زوال ہے۔ اور نیز اُس حُسن کے اثر کے نیچے آنے والے بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ مگر یہ کیا حیرت انگیز نظارہ ہے کہ وہ حسن روحانی جو حُسن معاملہ اور صدق وصفا اور محبتِ الٰہیہ کی تجلّی کے بعد انسان میں پیدا ہوتا ہے اس میں ایک عالمگیر کشش پائی جاتی ہے وہ مستعد دلوں کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے کہ جیسے شہد چیونٹیوں کو۔ اور نہ صرف انسان بلکہ عالم کا ذرّہ ذرّہ اس کی کشش سے متاثر ہوتا ہے۔ صادق المحبت انسان جو سچی محبت خدا تعالیٰ سے رکھتا ہے وہ وہ یوسف ہے جس کے لئے ذرّہ ذرّہ اس عالم کا زلیخا صفت ہے۔ اور ابھی حسن اُس کا اس عالم میں ظاہر نہیں کیونکہ یہ عالم اس کی برداشت نہیں کرتا۔ خدا تعالیٰ اپنی پاک کتاب میں جو فرقان مجید ہے فرماتا ہے کہ مومنوں کا نور اُن کے چہروں پر دوڑتا ہے۔ اور مومن اس حُسن سے شناخت کیا جاتا ہے جس کا نام دوسرے لفظوں میں نور ہے۔

اور مجھے ایک دفعہ عالمِ کشف میں پنجابی زبان میں اِسی علامت کے بارہ میں یہ موزوں فقرہ سُنایا گیا۔ ”عِشق الٰہی وَسّے مُنہ پر ولیاں ایہہ نشانی“ مومن کا نور جس کا قرآن شریف میں ذکر کیا گیا ہے وہ وہی روحانی حُسن و جمال ہے جو مومن کو وجودِ رُوحانی کے مرتبہ ششم پر کامل طور پر عطا کیا جاتا ہے۔ جسمانی حُسن کا ایک شخص یا دو شخص خریدار ہوتے ہیں مگر یہ عجیب حُسن ہے جس کے خریدار کروڑ ہا رُوحیں ہو جاتی ہیں۔ اِسی روحانی حُسن کی بنا پر بعض نے سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ[1] کی نعت میں یہ شعر کہے ہیں اور اُن کو ایک نہایت درجہ حسین اور خوبصورت قرار دیا ہے اور وہ اشعار یہ ہیں ؎

[1] فطرتاً بعض طبائع کو بعض طبائع سے مناسبت ہوتی ہے۔ اسی طرح میری روح اور سید عبدالقادر کی روح کو خمیر فطرت سے باہم ایک مناسبت ہے جس پر کشوفِ صحیحہ صریحہ سے مجھ کو اطلاع ملی ہے۔ اس بات پر تیئس ۲۳ برس کے قریب زمانہ گزر گیا ہے کہ جب

آن تُرکِ عجم چون زِ مئِ عشق طرب کرد　غارت گرِ یئ کوفہ و بغداد و حلب کرد

صد لالہ رُخے بود بصد حُسنِ شگفتہ　نازان ہمہ را زِیر قدم کرد عجب کرد

اور شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بھی اس بارہ میں ایک شعر کہا ہے جو حُسنِ روحانی پر بہت منطبق ہوتا ہے اور وہ یہ ہے

صورت گر دیبائے چیں روصورتِ زیباش بین　یا صورتے برکش چنیں یا توبہ کن صورت گری

اب یہ بھی یاد رہے کہ بندہ تو حُسنِ معاملہ دکھلا کر اپنے صدق سے بھری ہوئی محبت ظاہر کرتا ہے مگر خدا تعالیٰ اس کے مقابلہ پر حد ہی کر دیتا ہے اس کی تیز رفتار کے مقابل پر برق کی طرح اس کی طرف دوڑتا چلا آتا ہے اور زمین و آسمان سے اس کے لئے نشان ظاہر کرتا ہے اور اس کے دوستوں کا دوست اور اس کے دشمنوں کا دشمن بن جاتا ہے اور اگر پچاس کروڑ انسان بھی اُس کی مخالفت پر کھڑا ہو تو ان کو ایسا ذلیل اور بے دست و پا کر دیتا ہے جیسا کہ ایک مرا ہوا کیڑا۔ اور محض ایک شخص کی خاطر کے لئے ایک دنیا کو ہلاک کر دیتا ہے اور اپنی زمین و آسمان کو اس کے خادم بنا دیتا ہے اور اس کے کلام میں برکت ڈال دیتا ہے اور اس کے تمام درودیوار پر نور کی بارش کرتا ہے اور اُس کی پوشاک میں اور اُس کی خوراک میں اور اس مٹی میں بھی جس پر اس کا قدم پڑتا ہے ایک برکت رکھ دیتا ہے اور اس کو نامراد ہلاک نہیں کرتا۔ اور ہر ایک اعتراض جو اس پر ہو اُس کا آپ جواب دیتا ہے۔ وہ اُس کی آنکھیں ہو جاتا ہے جن سے وہ دیکھتا ہے اور اُس کے کان ہو جاتا ہے جن سے وہ سنتا ہے اور اُس کی زبان ہو جاتا ہے جس سے وہ بولتا ہے اور اُس کے پاؤں ہو جاتا ہے جن سے وہ چلتا ہے اور اُس کے ہاتھ ہو جاتا ہے جن سے وہ دشمنوں پر حملہ کرتا ہے۔ وہ اُس کے دشمنوں کے مقابل پر آپ نکلتا ہے اور

ایک رات مجھے خدا نے اطلاع دی کہ اُس نے مجھے اپنے لئے اختیار کر لیا ہے۔ تب یہ عجیب اتفاق ہوا کہ اُسی رات ایک بڑھیا کو خواب آئی جس کی عمر قریباً اسی برس کی تھی اور اُس نے صبح مجھ کو آ کر کہا کہ میں نے رات سید عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا ہے اور ساتھ ان کے ایک اور بزرگ تھے اور دونوں سبز پوش تھے اور رات کے پچھلے حصہ کا وقت تھا۔ دوسرا بزرگ عمر میں اُن سے کچھ چھوٹا تھا۔ پہلے انہوں نے ہماری جامع مسجد میں نماز پڑھی اور پھر مسجد کے باہر کے صحن میں نکل آئے اور میں اُن کے پاس کھڑی تھی اتنے میں مشرق کی طرف سے ایک چمکتا ہوا ستارہ نکلا تب اس ستارہ کو دیکھ کر سید عبد القادر بہت خوش ہوئے اور ستارہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا السلام علیکم اور ایسا ہی ان کے رفیق نے السلام علیکم کہا۔ اور وہ ستارہ میں تھا۔ المؤمن یَرٰی و یُرٰی لہ۔ منہ

شریروں پر جو اُس کو دُکھ دیتے ہیں آپ تلوار کھینچتا ہے۔ ہر میدان میں اس کو فتح دیتا ہے اور اپنی قضاء وقدر کے پوشیدہ راز اس کو بتلاتا ہے۔ غرض پہلا خریدار اس کے رُوحانی حُسن و جمال کا جو حُسنِ معاملہ اور محبتِ ذاتیہ کے بعد پیدا ہوتا ہے خدا ہی ہے۔ پس کیا ہی بدقسمت وہ لوگ ہیں جو ایسا زمانہ پاویں اور ایسا سورج اُن پر طلوع کرے اور وہ تاریکی میں بیٹھے رہیں۔

بعض نادان یہ اعتراض بار بار پیش کرتے ہیں کہ محبوبانِ الٰہی کی یہ علامت ہے کہ ہر ایک دُعا اُن کی سُنی جاتی ہے۔ اور جس میں یہ علامت نہیں پائی جاتی وہ محبوبانِ الٰہی میں سے نہیں ہے [۱]۔ مگر افسوس کہ یہ لوگ مُنہ سے تو ایک بات نکال لیتے ہیں مگر اعتراض کرنے کے وقت یہ نہیں سوچتے کہ ایسے جاہلانہ اعتراض خدا تعالیٰ کے تمام نبیوں اور رسولوں پر وارد ہوتے ہیں۔ مثلاً ہر ایک نبی کی یہ مراد تھی کہ تمام کفّار ان کے زمانہ کے جو ان کی مخالفت پر کھڑے تھے مسلمان ہو جائیں۔ مگر یہ مراد اُن کی پوری نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (الشعراء:۴) یعنی ''کیا تو اِس غم سے اپنے تئیں ہلاک کر دے گا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے ایمان لانے کے لئے اس قدر جانکاہی اور سوز و گداز سے دُعا کرتے تھے کہ اندیشہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس غم سے خود ہلاک نہ ہو جاویں اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان لوگوں کے لئے اس قدر غم نہ کر اور اس قدر اپنے دل کو دردوں کا نشانہ مت بنا کیونکہ یہ لوگ ایمان لانے سے لاپروا ہیں اور ان کے اغراض اور مقاصد اَور ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ فرمایا ہے کہ اے نبی (علیہ السلام)! جس قدر تو عقد ہمت اور کامل توجہ اور سوز و گداز اور اپنی رُوح کو مشقت میں ڈالنے سے ان لوگوں کی ہدایت کے لئے دُعا کرتا ہے تیری دعاؤں کے پُرتاثیر ہونے میں کچھ کمی نہیں ہے لیکن شرط قبولیت دُعا یہ ہے کہ جس کے حق میں دعا کی جاتی ہے سخت متعصب اور لاپروا اور

---

[۱] یاد رہے کہ مومن کے ساتھ خدا تعالیٰ دوستانہ معاملہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کبھی تو وہ مومن کے ارادہ کو پورا کرے اور کبھی مومن اس کے ارادہ پر راضی ہو جائے۔ پس ایک جگہ تو مومن کو مخاطب کر کے فرماتا ہے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المؤمن:۶۱) یعنی دعا کرو کہ میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ اس جگہ تو مومن کی خواہش پوری کرنا چاہتا ہے۔ اور دوسری جگہ اپنی خواہش مومن سے منوانا چاہتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرۃ ۱۵۶،۱۵۷) افسوس کہ نادان آدمی صرف ایک پہلو کو دیکھتا ہے اور دونوں پہلوؤں پر نظر نہیں ڈالتا۔ منہ

گندی فطرت کا انسان نہ ہو ورنہ دُعا قبول نہیں ہوگی اور جہاں تک مجھے خدا تعالیٰ نے دعاؤں کے بارے میں علم دیا ہے وہ یہ ہے کہ دُعا کے قبول ہونے کے لئے تین شرطیں ہیں ؛

اوّل۔ دُعا کرنے والا کامل درجہ پر متقی ہو کیونکہ خدا تعالیٰ کا مقبول وہی بندہ ہوتا ہے جس کا شعار تقویٰ ہو اور جس نے تقویٰ کی باریک راہوں کو مضبوط پکڑا ہوا اور جو امین اور متقی اور صادق العہد ہونے کی وجہ سے منظور نظر الٰہی ہو اور محبتِ ذاتیہ الٰہیہ سے معمور اور پُر ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اس کی عقدِ ہمت اور توجہ اس قدر ہو کہ گویا ایک شخص کے زندہ کرنے کے لئے ہلاک ہو جائے اور ایک شخص کو قبر سے باہر نکالنے کے لئے آپ گور میں داخل ہو۔ اس میں راز یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو اپنے مقبول بندے اس سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں جیسا کہ ایک خوبصورت بچہ جو ایک ہی ہو اس کی ماں کو پیارا ہوتا ہے۔ پس جب کہ خدائے کریم و رحیم دیکھتا ہے کہ ایک مقبول و محبوب اُس کا ایک شخص کی جان بچانے کے لئے روحانی مشقتوں اور تضرعات اور مجاہدات کی وجہ سے اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ قریب ہے کہ اُس کی جان نکل جائے تو اُس کو علاقۂ محبت کی وجہ سے ناگوار گزرتا ہے کہ اسی حال میں اُس کو ہلاک کر دے۔ تب اس کے لئے اس دوسرے شخص کا گناہ بخش دیتا ہے جس کے لئے وہ پکڑا گیا تھا پس اگر وہ کسی مہلک بیماری میں گرفتار ہے یا اور کسی بلا میں اسیر و لاچار ہے تو اپنی قدرت سے ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے جس سے رہائی ہو جائے اور بسا اوقات اُس کا ارادہ ایک شخص کے قطعی طور پر ہلاک کرنے یا برباد کرنے پر قرار یافتہ ہوتا ہے لیکن جب ایک مصیبت زدہ کی خوش قسمتی سے ایسا شخص پُر درد تضرعات کے ساتھ درمیان میں آ پڑتا ہے جس کو حضرت عزت میں وجاہت ہے تو وہ مثل مقدمہ جو سزا دینے کے لئے مکمل اور مرتب ہو چکی ہے چاک کرنی پڑتی ہے کیونکہ اب بات اغیار سے یار کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور یہ کیونکر ہو سکے کہ خدا اپنے سچے دوستوں کو عذاب دے۔

۳۔ تیسری شرط استجابتِ دُعا کے لئے ایک ایسی شرط ہے جو تمام شرطوں سے مشکل تر ہے کیونکہ اس کا پورا کرنا خدا کے مقبول بندوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اُس شخص کے ہاتھ میں ہے جو دعا کرانا چاہتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نہایت صدق اور کامل اعتقاد اور کامل یقین اور کامل ارادت اور کامل غلامی کے ساتھ دُعا کا خواہاں ہو اور یہ دل میں فیصلہ کر لے کہ اگر دُعا قبول بھی نہ ہو تاہم اس کے اعتقاد اور ارادت میں فرق نہیں آئے گا۔ اور دُعا کرانا آزمائش کے طور پر نہ ہو بلکہ سچے اعتقاد کے طور پر ہو اور نہایت نیازمندی سے اس کے دروازے پر

کرے اور جہاں تک اس کے لئے ممکن ہے مال سے، خدمت سے، ہر ایک طور کی اطاعت سے ایسا قرب پیدا کرے کہ اس کے دل کے اندر داخل ہو جائے اور با ایں ہمہ نہایت درجہ پر نیک ظن ہو اور اُس کو نہایت درجہ کا متقی سمجھے اور اس کی مقدس شان کے برخلاف ایک خیال بھی دل میں لانا کفر خیال کرے اور اس قسم کی طرح طرح کی جاں نثاری دکھلا کر سچے اعتقاد کو اُس پر ثابت اور روشن کر دے اور اس کی مثل دنیا میں کسی کو بھی نہ سمجھے اور جان سے، مال سے، آبرو سے اُس پر فدا ہو جائے۔ اور کوئی کلمہ کسر شان کا کسی پہلو سے اس کی نسبت زبان پر نہ لائے اور نہ دل میں۔ اور اس بات کو اس کی نظر میں بپایۂ ثبوت پہنچا دے کہ درحقیقت وہ ایسا ہی معتقد اور مرید ہے اور با ایں ہمہ صبر سے انتظار کرے اور اگر پچاس دفعہ بھی اپنے کام میں نامراد رہے پھر بھی اعتقاد اور یقین میں سُست نہ ہو۔ کیونکہ یہ قوم سخت نازک دل ہوتی ہے اور اُن کی فراست چہرہ کو دیکھ کر پہچان سکتی ہے کہ یہ شخص کس درجہ کا اخلاص رکھتا ہے اور یہ قوم باوجود نرم دل ہونے کے نہایت بے نیاز ہوتی ہے۔ اُن کے دل خدا نے ایسے بے نیاز پیدا کئے ہیں کہ متکبّر اور خودغرض اور منافق طبع انسان کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ اس قوم سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو اس قدر غلامانہ اطاعت اُن کی اختیار کرتے ہیں کہ گویا مر ہی جاتے ہیں۔ مگر وہ شخص جو قدم قدم پر بدظنی کرتا ہے اور دل میں کوئی اعتراض رکھتا ہے اور پوری محبت اور ارادت نہیں رکھتا وہ بجائے فائدہ کے ہلاک ہوتا ہے۔

اب ہم اس تقریر کے بعد کہتے ہیں کہ یہ جو اللہ تعالیٰ نے مومن کے وجود روحانی کے مراتب سِتّہ بیان کر کے ان کے مقابل پر وجودِ جسمانی کے مراتبِ سِتّہ دکھلائے ہیں یہ ایک علمی معجزہ ہے اور جس قدر کتابیں دنیا میں کُتب سماوی کہلاتی ہیں یا جن حکیموں نے نفس اور الٰہیات کے بارے میں تحریریں کی ہیں اور یا جن لوگوں نے صوفیوں کی طرز پر معارف کی باتیں لکھی ہیں کسی کا ذہن ان میں سے اس بات کی طرف سبقت نہیں لے گیا کہ یہ مقابلہ جسمانی اور روحانی وجود کا دکھلاتا۔ اگر کوئی شخص میرے اس دعوے سے منکر ہو اور اس کا گمان ہو کہ یہ مقابلہ روحانی اور جسمانی کِسی اَور نے بھی دکھلایا ہے تو اس پر واجب ہے کہ اس علمی معجزہ کی نظیر کسی اَور کتاب میں سے پیش کر کے دکھلاوے۔ اور مَیں نے تو توریت اور انجیل اور ہندوؤں کے وید کو بھی دیکھا ہے۔ مگر مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اِس قسم کا علمی معجزہ میں نے بجز قرآن شریف کے کسی کتاب میں نہ پایا۔ اور صرف اِسی معجزہ پر حصر نہیں بلکہ تمام قرآن شریف ایسے ہی علمی معجزات سے پُر ہے جن پر ایک عقل مند نظر ڈال کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ اُسی خدائے قادرِ مطلق کا کلام ہے جس کی قدرتیں زمین و آسمان کی مصنوعات میں

ظاہر ہیں۔ وہی خدا جو اپنی باتوں اور کاموں میں بے مثل و مانند ہے پھر جب ہم ایک طرف ایسے ایسے معجزات قرآن شریف میں پاتے ہیں اور دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمیّت کو دیکھتے ہیں اور اس بات کو اپنے تصور میں لاتے ہیں کہ آپ نے ایک حرف بھی کسی اُستاد سے نہیں پڑھا تھا اور نہ آپ نے طبعی اور فلسفہ سے کچھ حاصل کیا تھا بلکہ آپ ایک ایسی قوم میں پیدا ہوئے تھے کہ جو سب کی سب اُمی اور ناخواندہ تھی اور ایک وحشیانہ زندگی رکھتی تھی اور باایں ہمہ آپ نے والدین کی تربیت کا زمانہ بھی نہیں پایا تھا۔ تو ان سب باتوں کو مجموعی نظر کے ساتھ دیکھنے سے قرآن شریف کے منجانب اللہ ہونے پر ایک ایسی چمکتی ہوئی بصیرت ہمیں ملتی ہے اور اس کا علمی معجزہ ہونا ایسے یقین کے ساتھ ہمارے دل میں بھر جاتا ہے کہ گویا ہم اس کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کو دیکھ لیتے ہیں۔ غرض جب کہ بدیہی طور پر ثابت ہے کہ سورۃ المؤمنون کی یہ تمام آیات جو ابتدائے سورۃ سے لے کر آیت فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ تک ہیں علمی معجزہ ہیں۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ آیت فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ علمی معجزہ کی ایک جزو ہے اور بباعث معجزہ کے جزو ہونے کے معجزہ میں داخل ہے اور یہی ثابت کرنا تھا۔

اور یاد رہے کہ یہ علمی معجزہ مذکورہ بالا ایک ایسی صاف اور کھلی کھلی اور روشن اور بدیہی سچائی ہے کہ اب خدا تعالیٰ کی کلام کی رہبری اور یاددہانی کے بعد عقل بھی اپنے معقولی علوم میں بہت فخر کے ساتھ اس کو داخل کرنے کے لئے طیار ہے۔

کیونکہ عندالعقل یہ بات ظاہر ہے کہ سب سے پہلے جو ایک سعید الفطرت آدمی کے نفس کو خدا تعالیٰ کی طرف اس کی طلب میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے۔ وہ خشوع اور انکسار ہے اور خشوع سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے لئے فروتنی اور تواضع اور تضرع کی حالت اختیار کی جائے اور جو اس کے مقابل پر اخلاقِ ردّیہ ہیں جیسے تکبّر اور عُجب اور ریا اور لاپروائی اور بے نیازی ان سب کو خدا تعالیٰ کے خوف سے چھوڑ دیا جائے اور یہ بات بدیہی ہے کہ جب تک انسان اپنے اخلاق ردّیہ کو نہیں چھوڑتا اس وقت تک اُن اخلاق کے مقابل پر جو اخلاق فاضلہ ہیں جو خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں اُن کو قبول نہیں کر سکتا کیونکہ دو ضدّیں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اِسی کی طرف اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے جیسا کہ سورۂ بقر کی ابتدا میں اس نے فرمایا هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یعنی قرآن شریف ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو متقی ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو تکبّر نہیں کرتے اور خشوع اور انکسار سے خدا تعالیٰ کے کلام میں غور کرتے ہیں وہی ہیں جو آخر کو ہدایت پاتے

ہیں۔اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ ان آیات میں چھ۶ جگہ اَفْلَحَ کا لفظ ہے۔پہلی آیت میں صریح طور پر جیسا کہ فرمایا ہے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ اور بعد کی آیتوں میں عطف کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے۔اور اَفلَح کے لُغت میں یہ معنے ہیں اُصِيْرَ اِلَى الفَلَاحِ یعنی فوز مرام کی طرف پھیرا گیا اور حرکت دیا گیا۔پس ان معنوں کی رُو سے مومن کا نماز میں خشوع اختیار کرنا فوزِ مرام کے لئے پہلی حرکت ہے جس کے ساتھ تکبّر اور عُجب وغیرہ چھوڑنا پڑتا ہے۔اوراس میں فوزِ مرام یہ ہے کہ انسان کا نفس خشوع کی سیرت اختیار کر کے خدائے تعالیٰ سے تعلق پکڑنے کے لئے مستعد اور طیار ہو جاتا ہے۔

دوسرا کام مومن کا یعنی وہ کام جس سے دوسرے مرتبہ تک قوّتِ ایمانی پہنچتی ہے اور پہلے کی نسبت ایمان کچھ قوی ہو جاتا ہے عقلِ سلیم کے نزدیک یہ ہے کہ مومن اپنے دل کو جو خشوع کے مرتبہ تک پہنچ چکا ہے لغو خیالات اور لغو شغلوں سے پاک کرے کیونکہ جب تک مومن یہ ادنیٰ قوت حاصل نہ کرلے کہ خدا کے لئے لغو باتوں اور لغو کاموں کو ترک کر سکے جو کچھ بھی مشکل نہیں اور صرف گناہ بے لذّت ہے اُس وقت تک یہ طمع خام ہے کہ مومن ایسے کاموں سے دست بردار ہو سکے جن سے دست بردار ہونا نفس پر بہت بھاری ہے اور جن کے ارتکاب میں نفس کو کوئی فائدہ یا لذّت ہے۔پس اِس سے ثابت ہے کہ پہلے درجہ کے بعد کہ ترکِ تکبّر ہے دوسرا درجہ ترکِ لغویات ہے۔اور اس درجہ پر وعدہ جو لفظ اَفْلَحَ سے کیا گیا ہے یعنی فوزِ مرام اس طرح پر پورا ہوتا ہے کہ مومن کا تعلق جب لغو کاموں اور لغو شغلوں سے ٹوٹ جاتا ہے تو ایک خفیف سا تعلق خدا تعالیٰ سے اس کو ہو جاتا ہے اور قوت ایمانی بھی پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی ہے اور خفیف تعلق اس لئے ہم نے کہا کہ لغویات سے تعلق بھی خفیف ہی ہوتا ہے پس خفیف تعلق چھوڑنے سے خفیف تعلق ہی ملتا ہے۔

پھر تیسرا کام مومن کا جس سے تیسرے درجے تک قوتِ ایمانی پہنچ جاتی ہے عقلِ سلیم کے نزدیک یہ ہے کہ وہ صرف لغو کاموں اور لغو باتوں کو ہی خدا تعالیٰ کے لئے نہیں چھوڑتا بلکہ اپنا عزیز مال بھی خدا تعالیٰ کے لئے چھوڑتا ہے۔اور ظاہر ہے کہ لغو کاموں کے چھوڑنے کی نسبت مال کا چھوڑنا نفس پر زیادہ بھاری ہے کیونکہ وہ محنت سے کمایا ہوا اور ایک کار آمد چیز ہوتی ہے۔جس پر خوش زندگی اور آرام کا مدار ہے اس لئے مال کا خدا کے لئے چھوڑنا بہ نسبت لغو کاموں کے چھوڑنے کے قوتِ ایمانی کو زیادہ چاہتا ہے اور لفظ اَفْلَحَ کا جو آیات میں وعدہ ہے اس کے اس جگہ یہ معنی ہوں گے کہ دوسرے درجہ کی نسبت اس مرتبہ میں قوت ایمانی اور تعلق بھی خدا تعالیٰ سے زیادہ ہو جاتی ہے اور نفس کی پاکیزگی اس سے پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اپنے ہاتھ سے اپنا محنت

سے کمایا ہوا مال محض خدا کے خوف سے نکالنا بجز نفس کی پاکیزگی کے ممکن نہیں۔

پھر چوتھا کام مومن کا جس سے چوتھے درجہ تک قوت ایمانی پہنچ جاتی ہے عقلِ سلیم کے نزدیک یہ ہے کہ وہ صرف مال کو خدا تعالیٰ کی راہ میں ترک نہیں کرتا بلکہ وہ چیز جس سے وہ مال سے بھی بڑھ کر پیار کرتا ہے یعنی شہوات نفسانیہ اُن کا وہ حصہ جو حرام کے طور پر ہے چھوڑ دیتا ہے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہر ایک انسان اپنی شہواتِ نفسانیہ کو طبعاً مال سے عزیز تر سمجھتا ہے اور مال کو ان کی راہ میں فدا کرتا ہے۔ پس بلا شبہ مال کے چھوڑنے سے خدا کے لئے شہوات کو چھوڑنا بہت بھاری ہے اور لفظ اَفْلَحَ جو اس آیت سے بھی تعلق رکھتا ہے اُس کے اِس جگہ یہ معنی ہیں کہ جیسے شہواتِ نفسانیہ سے انسان کو طبعاً شدید تعلق ہوتا ہے ایسا ہی ان کے چھوڑنے کے بعد وہی شدید تعلق خدا تعالیٰ سے ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو شخص کوئی چیز خدا تعالیٰ کی راہ میں کھوتا ہے اُس سے بہتر پالیتا ہے۔ ؎

لُطفِ او ترک طالبان نہ کند کس بہ کارِ رہش زیان نہ کند
ہر کہ آن راہ جُست یافتہ است تافت آن رو کہ سرنتافتہ است

پھر پانچواں کام مومن کا جس سے پانچویں درجہ تک قوتِ ایمانی پہنچ جاتی ہے عند العقل یہ ہے کہ صرف ترک شہواتِ نفس ہی نہ کرے بلکہ خدا کی راہ میں خود نفس کو ہی ترک کر دے اور اس کے فدا کرنے پر طیار رہے۔ یعنی نفس جو خدا کی امانت ہے اسی مالک کو واپس دے دے اور نفس سے صرف اس قدر تعلق رکھے جیسا کہ ایک امانت سے تعلق ہوتا ہے اور دقائق تقویٰ ایسے طور پر پوری کرے کہ گویا اپنے نفس[1] اور مال اور تمام چیزوں کو خدا کی راہ میں وقف کر چکا ہے۔ اِسی طرف یہ آیت اشارہ فرماتی ہے وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ پس جبکہ انسان کے جان و مال اور تمام قسم کے آرام خدا کی امانت ہے جس کو واپس دینا امین ہونے کے لئے شرط ہے لہٰذا ترکِ نفس وغیرہ کے یہی معنے ہیں کہ یہ امانت خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر کے اس طور سے یہ قربانی ادا کر دے اور دوسرے یہ کہ جو خدا تعالیٰ کے ساتھ ایمان کے وقت اس کا عہد تھا اور جو عہد اور امانتیں مخلوق کی اس کی گردن پر ہیں اُن سب کو ایسے طور سے تقویٰ کی رعایت سے بجالاوے کہ

---

[1] جیسا کہ نفس خدا تعالیٰ کی امانت ہے ایسا ہی مال بھی خدا تعالیٰ کی امانت ہے۔ پس جو شخص صرف اپنے مال میں سے زکوٰۃ دیتا ہے وہ مال کو اپنا مال سمجھتا ہے مگر جو شخص مال کو خدا تعالیٰ کی امانت سمجھتا ہے وہ اپنے تمام مال کو خدا تعالیٰ کا مال جانتا ہے اور ہر ایک وقت خدا کی راہ میں دیتا ہے گو کوئی زکوٰۃ اس پر واجب نہ ہو۔ منہ

وہ بھی ایک سچی قربانی ہوجاوے کیونکہ دقائقِ تقویٰ کو انتہا تک پہنچانا یہ بھی ایک قسم کی موت ہے۔ اور لفظ اَفۡلَحَ کا جو اس آیت سے بھی تعلق رکھتا ہے اِس کے اس جگہ یہ معنے ہیں کہ جب اس درجہ کا مومن خدا تعالیٰ کی راہ میں بذلِ نفس کرتا ہے اور تمام دقائقِ تقویٰ بجالاتا ہے۔ تب حضرتِ احدیت سے انوارِ الٰہیہ اُس کے وجود پر محیط ہوکر روحانی خوبصورتی اُس کو بخشتے ہیں جیسے کہ گوشت ہڈیوں پر چڑھ کر ان کو خوبصورت بنا دیتا ہے اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں اِن دونوں حالتوں کا نام خدا تعالیٰ نے لباس ہی رکھا ہے۔ تقویٰ کا نام بھی لباس ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لِبَاسُ التَّقْوٰى اور جو گوشت ہڈیوں پر چڑھتا ہے وہ بھی لباس ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا کیونکہ كَسَوْتُ جس سے كَسَوْنَا کا لفظ نکلا ہے لباس کو ہی کہتے ہیں۔

اب یاد رہے کہ منتہا سلوک کا پنجم درجہ ہے۔ اور جب پنجم درجہ کی حالت اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اس کے بعد چھٹا درجہ ہے جو محض ایک موہبت کے طور پر ہے اور جو بغیر کسب اور کوشش کے مومن کو عطا ہوتا ہے اور کسب کا اس میں ذرّہ دخل نہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ جیسے مومن خدا کی راہ میں اپنی رُوح کھوتا ہے ایک رُوح اس کو عطا کی جاتی ہے۔ کیونکہ ابتدا سے یہ وعدہ ہے کہ جو کوئی خدا تعالیٰ کی راہ میں کچھ کھوئے گا وہ اُسے پائے گا۔ اس لئے رُوح کو کھونے والے رُوح کو پاتے ہیں۔ پس چونکہ مومن اپنی محبتِ ذاتیہ سے خدا کی راہ میں اپنی جان وقف کرتا ہے اس لئے خدا کی محبت ذاتیہ کی رُوح کو پاتا ہے جس کے ساتھ رُوح القدس شامل ہوتا ہے۔ خدا کی محبتِ ذاتیہ ایک رُوح ہے اور رُوح کا کام مومن کے اندر کرتی ہے اس لئے وہ خود رُوح ہے اور رُوح القدس اس سے جُدا نہیں۔ کیونکہ اس محبت اور رُوح القدس میں کبھی انفکاک ہو ہی نہیں سکتا۔ اِسی وجہ سے ہم نے اکثر جگہ صرف محبتِ ذاتیہ الٰہیہ کا ذکر کیا ہے اور رُوح القدس کا نام نہیں لیا کیونکہ ان کا باہم تلازم ہے اور جب رُوح کسی مومن پر نازل ہوتی ہے تو تمام بوجھ عبادات کا اس کے سر پر سے ساقط ہو جاتا ہے اور اُس میں ایک ایسی قوت اور لذت آجاتی ہے جو وہ قوت تکلّف سے نہیں بلکہ طبعی جوش سے یادِ الٰہی اُس سے کراتی ہے اور عاشقانہ جوش اُس کو بخشتی ہے۔ پس ایسا مومن جبرائیل علیہ السلام کی طرح ہر وقت آستانہ الٰہی کے آگے حاضر رہتا ہے اور حضرت عزت کی دائمی ہمسائیگی اس کے نصیب ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ اِس درجہ کے بارے میں فرماتا ہے وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ یعنی مومن کامل وہ لوگ ہیں کہ ایسا دائمی حضور اُن کو میسّر آتا ہے کہ ہمیشہ وہ اپنی نماز کے آپ نگہبان رہتے ہیں۔ یہ اس حالت کی طرف اشارہ ہے کہ اس درجہ کا مومن اپنی رُوحانی بقا کے لئے نماز کو ایک ضروری چیز سمجھتا ہے اور اس کو اپنی غذا قرار دیتا

ہے جس کے بغیر وہ جی ہی نہیں سکتا۔ یہ درجہ بغیر اس رُوح کے حاصل نہیں ہوسکتا جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مومن پر نازل ہوتی ہے کیونکہ جب کہ مومن خدا تعالیٰ کے لئے اپنی جان کو ترک کر دیتا ہے تو ایک دوسری جان پانے کا مستحق ہوتا ہے۔

اِس تمام تقریر سے ثابت ہے کہ یہ مراتبِ سِتّہ عقلِ سلیم کے نزدیک اُس مومن کی راہ میں پڑے ہیں جو اپنے وجود روحانی کو کمال تک پہنچانا چاہتا ہے اور ہر ایک انسان تھوڑے سے غور کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ ضرور مومن پر اس کے سلوک کے وقت چھ حالتیں آتی ہیں۔ وجہ یہ کہ جب تک انسان خدا تعالیٰ سے کامل تعلّق نہیں پکڑتا تب تک اُس کا نفس ناقص پانچ خراب حالتوں سے پیار کرتا ہے اور ہر ایک حالت کا پیار دُور کرنے کے لئے ایک ایسے سبب کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس پیار پر غالب آ جائے۔ اور نیا پیار پہلے پیار کا علاقہ توڑ دے۔

چنانچہ پہلی حالت جس سے وہ پیار کرتا ہے یہ ہے کہ وہ ایک غفلت میں پڑا ہوتا ہے اور اس کو بالکل خدا تعالیٰ سے بُعد اور دُوری ہوتی ہے اور نفس ایک کفر کے رنگ میں ہوتا ہے اور غفلت کے پردے تکبّر اور لا پروائی اور سنگدلی کی طرف اس کو کھینچتے ہیں اور خشوع اور خضوع اور تواضع اور فروتنی اور انکسار کا نام و نشان اس میں نہیں ہوتا اور اسی اپنی حالت سے وہ محبت کرتا ہے اور اس کو اپنے لئے بہتر سمجھتا ہے اور پھر جب عنایتِ الٰہیہ اس کی اصلاح کی طرف توجہ کرتی ہے تو کسی واقعہ کے پیدا ہونے سے یا کسی آفت کے نازل ہونے سے خدا تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت اور جبروت کا اس کے دل پر اثر پڑتا ہے اور اس اثر سے اُس پر ایک حالت خشوع پیدا ہو جاتی ہے جو اُس کے تکبّر اور گردن کشی اور غفلت کی عادت کو کالعدم کر دیتی ہے اور اس سے علاقہ محبت توڑ دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو ہر وقت دنیا میں مشاہدہ میں آتی رہتی ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ جب ہیبتِ الٰہی کا تازیانہ کسی خوفناک لباس میں نازل ہوتا ہے تو بڑے بڑے شریروں کی گردن جھکا دیتا ہے اور خوابِ غفلت سے جگا کر خشوع اور خضوع کی حالت بنا دیتا ہے یہ وہ پہلا مرتبہ رجوع الی اللہ کا ہے جو عظمت اور ہیبت الٰہی کے مشاہدہ کے بعد یا کسی اور طور سے ایک سعید الفطرت کو حاصل ہو جاتا ہے اور گو وہ پہلے اپنی غافلانہ اور بے قید زندگی سے محبت ہی رکھتا تھا۔ مگر جب مخالف اثر اُس پہلے اثر سے قوی تر پیدا ہوتا ہے تو اس حالت کو بہرحال چھوڑنا پڑتا ہے۔

پھر اس کے بعد دوسری حالت یہ ہے کہ ایسے مومن کو خدا تعالیٰ کی طرف کچھ رجوع تو ہو جاتا ہے مگر اس

رجوع کے ساتھ لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو شغلوں کی پلیدی لگی رہتی ہے جس سے وہ اُنس اور محبت رکھتا ہے۔ ہاں کبھی نماز میں خشوع کے حالات بھی اس سے ظہور میں آتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف لغو حرکات بھی اس کے لازم حال رہتی ہیں اور لغو تعلقات اور لغو مجلسیں اور لغو ہنسی ٹھٹھا اس کے گلے کا ہار رہتا ہے۔ گویا وہ دو رنگ رکھتا ہے کبھی کچھ کبھی کچھ ؎

واعظاں کیں جلوہ برمحراب ومنبر مے کنند   چوں بخلوت مے روند آن کارِ دیگر مے کنند

پھر جب عنایتِ الٰہیہ اس کو ضائع کرنا نہیں چاہتی تو پھر ایک اَور جلوہ عظمت اور ہیبت اور جبروتِ الٰہی کا اُس کے دل پر نازل ہوتا ہے جو پہلے جلوہ سے زیادہ تیز ہوتا ہے اور قوتِ ایمانی اُس سے تیز ہو جاتی ہے اور ایک آگ کی طرح مومن کے دل پر پڑ کر تمام خیالات لغو اس کے ایک دم میں بھسم کر دیتی ہے۔ اور یہ جلوہ عظمت اور جبروتِ الٰہی کا اس قدر حضرتِ عزت کی محبت اُس کے دل میں پیدا کرتا ہے کہ لغو کاموں اور لغو شغلوں کی محبت پر غالب آ جاتا ہے اور ان کو دفع اور دُور کر کے اُن کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور تمام بیہودہ شغلوں سے دل کو سرد کر دیتا ہے تب لغو کاموں سے دل کو ایک کراہت پیدا ہو جاتی ہے۔

پھر لغو شغلوں اور لغو کاموں کے دُور ہونے کے بعد ایک تیسری خراب حالت مومن میں باقی رہ جاتی ہے جس سے وہ دوسری حالت کی نسبت بہت محبت رکھتا ہے یعنی طبعاً مال کی محبت اس کے دل میں ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی اور آرام کا مدار مال کو ہی سمجھتا ہے اور نیز اس کے حاصل ہونے کا ذریعہ صرف اپنی محنت اور مشقت خیال کرتا ہے۔ پس اس وجہ سے اس پر خدا تعالیٰ کی راہ میں مال کا چھوڑنا بہت بھاری اور تلخ ہوتا ہے۔

پھر جب عنایتِ الٰہیہ اس ورطۂ عظیمہ سے اُس کو نکالنا چاہتی ہے تو رازقیتِ الٰہیہ کا علم اُس کو عطا کیا جاتا ہے اور توکّل کا بیج اُس میں بویا جاتا ہے اور ساتھ اس کے ہیبتِ الٰہیہ بھی کام کرتی ہے اور دونوں تجلیات جمالی اور جلالی اُس کے دل کو اپنے قابو میں لے آتی ہیں۔ تب مال کی محبت بھی دل میں سے بھاگ جاتی ہے اور مال دینے والے کی محبت کا تخم دل میں بویا جاتا ہے اور ایمان قوی کیا جاتا ہے۔ اور یہ قوتِ ایمانی درجہ سوم کی قوت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ کیونکہ اس جگہ مومن صرف لغو باتوں کو ہی ترک نہیں کرتا بلکہ اُس مال کو ترک کرتا ہے جس پر اپنی خوش زندگی کا سارا مدار سمجھتا ہے۔ اور اگر اس کے ایمان کو قوتِ توکّل عطا نہ کی جاتی اور رازقِ حقیقی کی طرف آنکھ کا دروازہ نہ کھولا جاتا تو ہرگز ممکن نہ تھا کہ بخل کی بیماری دُور ہو سکتی۔ پس یہ قوتِ ایمانی نہ صرف

لغو کاموں سے چھڑاتی ہے بلکہ خدا تعالیٰ کے رازق ہونے پر ایک قوی ایمان پیدا کر دیتی ہے۔ اور نورِ توکّل دل میں ڈال دیتی ہے۔ تب مال جو ایک پارۂ جگر سمجھا جاتا ہے بہت آسانی اور شرح صدر سے مومن اس کو خدا تعالیٰ کی راہ میں دیتا ہے اور وہ ضعف جو بخل کی حالت میں نومیدی سے پیدا ہوتا ہے۔ اب خدا تعالیٰ پر بہت سی امیدیں ہو کر وہ تمام ضعف جاتا رہتا ہے۔ اور مال دینے والے کی محبت مال کی محبت سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

پھر بعد اس کے چوتھی حالت ہے جس سے نفسِ امّارہ بہت ہی پیار کرتا ہے اور جو تیسری حالت سے بدتر ہے کیونکہ تیسری حالت میں تو صرف مال کا اپنے ہاتھ سے چھوڑنا ہے۔ مگر چوتھی حالت میں نفس امّارہ کی شہواتِ محرّمہ کو چھوڑنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مال کا چھوڑنا بہ نسبت شہوات کے چھوڑنے کے انسان پر طبعاً سہل ہوتا ہے۔ اس لئے یہ حالت بہ نسبت حالات گذشتہ کے بہت شدید اور خطرناک ہے اور فطرتاً انسان کو شہوات نفسانیہ کا تعلق بہ نسبت مال کے تعلق کے بہت پیارا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مال کو جو اُس کے نزدیک مدارِ آسائش ہے بڑی خوشی سے شہوات نفسانیہ کی راہ میں فدا کر دیتا ہے۔ اور اس حالت کے خوفناک جوش کی شہادت میں یہ آیت کافی ہے وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (یوسف: ۲۵) یعنی یہ ایسا مُنہ زور جوش ہے جو اِس کا فرو ہونا کسی برہانِ قوی کا محتاج ہے۔ پس ظاہر ہے کہ درجہ چہارم پر قوتِ ایمانی بہ نسبت درجہ سوم کے بہت قوی اور زبردست ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت اور جبروت کا مشاہدہ بھی پہلے کی نسبت اُس میں زیادہ ہوتا ہے اور نہ صرف اس قدر بلکہ یہ بھی اس میں نہایت ضروری ہے کہ جس لذّت ممنوعہ کو دُور کیا گیا ہے اس کے عوض میں روحانی طور پر کوئی لذت بھی حاصل ہو۔ اور جیسا کہ بخل کے دُور کرنے کے لئے خدا تعالیٰ کی رازقیت پر قوی ایمان درکار ہے۔ اور خالی جیب ہونے کی حالت میں ایک قوی توکّل کی ضرورت ہے تا بخل بھی دُور ہو اور غیبی فتوح پر اُمید بھی پیدا ہو جائے۔ ایسا ہی شہوات ناپاک نفسانیہ کے دُور کرنے کے لئے اور آتشِ شہوت سے مخلصی پانے کے لئے اس آگ کے وجود پر قوی ایمان ضروری ہے جو جسم اور رُوح دونوں کو عذاب شدید میں ڈالتی ہے اور نیز ساتھ اس کے اُس رُوحانی لذّت کی ضرورت ہے جو ان کثیف لذّتوں سے بے نیاز اور مستغنی کر دیتی ہے۔ جو شخص شہوات نفسانیہ محرّمہ کے پنجہ میں اسیر ہے وہ ایک اژدہا کے مُنہ میں ہے جو نہایت خطرناک زہر رکھتا ہے۔ پس اس سے ظاہر ہے کہ جیسا کہ لغو حرکات کی بیماری سے بخل کی بیماری بڑھ کر ہے اِسی طرح بخل کی بیماری کے مقابل پر شہوات نفسانیہ محرّمہ کے پنجہ میں

اسیر ہونا سب بلاؤں سے زیادہ بلا ہے جو خدائے تعالیٰ کے ایک خاص رحم کی محتاج ہے اور جب خدا تعالیٰ کسی کو اس بلا سے نجات دینا چاہتا ہے تو اپنی عظمت اور ہیبت اور جبروت کی ایسی تجلی اس پر کرتا ہے جس سے شہواتِ نفسانیہ محرّمہ پارہ پارہ ہو جاتی ہیں اور پھر جمالی رنگ میں اپنی لطیف محبت کا ذوق اس کے دل میں ڈالتا ہے اور جس طرح شیر خوار بچہ دودھ چھوڑنے کے بعد صرف ایک رات تلخی میں گزارتا ہے بعد اس کے اس دودھ کو ایسا فراموش کر دیتا ہے کہ چھاتیوں کے سامنے بھی اگر اس کے مُنہ کو رکھا جائے تب بھی دودھ پینے سے نفرت کرتا ہے۔ یہی نفرت شہواتِ محرّمہ نفسانیہ سے اُس راستباز کو ہو جاتی ہے جس کو نفسانی دودھ چھڑا کر ایک روحانی غذا اس کے عوض میں دی جاتی ہے۔

پھر چوتھی حالت کے بعد پانچویں حالت ہے جس کے مفاسد سے نہایت سخت اور شدید محبت نفسِ امّارہ کو ہے۔ کیونکہ اس مرتبہ پر صرف ایک لڑائی باقی رہ جاتی ہے اور وہ وقت قریب آ جاتا ہے کہ حضرت عزّت جلّ شانہٗ کے فرشتے اس وجود کی تمام آبادی کو فتح کر لیں اور اُس پر اپنا پورا تصرّف اور دخل کر لیں اور تمام نفسانی سِلسلہ کو درہم برہم کر دیں۔ اور نفسانی قویٰ کے قریہ کو ویران کر دیں۔ اور اس کے نمبرداروں کو ذلیل اور پست کر کے دکھلا دیں اور پہلی سلطنت پر ایک تباہی ڈال دیں۔ اور انقلاب سلطنت پر ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (النمل: ۳۵) اور یہ مومن کے لئے ایک آخری امتحان اور آخری جنگ ہے جس پر اُس کے تمام مراتب سلوک ختم ہو جاتے ہیں اور اس کا سِلسلہ ترقیات جو کسب اور کوشش سے ہے انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ اور انسانی کوششیں اپنے اَخیر نقطہ تک منزل طے کر لیتی ہیں۔ پھر بعد اس کے صرف موہبت اور فضل کا کام باقی رہ جاتا ہے جو خلق آخر کے متعلق ہے۔ اور یہ پانچویں۵ حالت چوتھی۴ حالت سے مشکل تر ہے کیونکہ چوتھی حالت میں تو صرف مومن کا کام یہ ہے کہ شہوات محرّمہ نفسانیہ کو ترک کرے مگر پانچویں حالت میں مومن کا کام یہ ہے کہ نفس کو بھی ترک کر دے اور اس کو خدا تعالیٰ کی امانت سمجھ کر خدا تعالیٰ کی طرف واپس کرے اور خدا کے کاموں میں اپنے نفس کو وقف کر کے اس سے خدمت لے اور خدا کی راہ میں بذل نفس کرنے کا ارادہ رکھے اور اپنے نفس کی نفی وجود کے لئے کوشش کرے۔ کیونکہ جب تک نفس کا وجود باقی ہے گناہ کرنے کے لئے جذبات بھی باقی ہیں جو تقویٰ کے برخلاف ہیں۔ اور نیز جب تک وجود نفس باقی ہے ممکن نہیں کہ انسان تقویٰ کی باریک راہوں پر قدم مار سکے یا پورے طور پر خدا کی امانتوں اور عہدوں یا مخلوق کی امانتوں اور عہدوں کو ادا کر سکے۔ لیکن جیسا کہ بخل

بغیر توکّل اور خدا کی رازقیت پر ایمان لانے کے ترک نہیں ہوسکتا اور شہوات نفسانیہ محرّمہ بغیر استیلاء ہیبت اور عظمتِ الٰہی اور لذاتِ روحانیہ کے چھوٹ نہیں سکتیں ایسا ہی یہ مرتبہ عظمٰی کہ ترکِ نفس کر کے تمام امانتیں خدا تعالیٰ کی اس کو واپس دی جائیں کبھی حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ ایک تیز آندھی عشقِ الٰہی کی چل کر کسی کو اس کی راہ میں دیوانہ نہ بنا دے۔ یہ تو درحقیقت عشقِ الٰہی کے مستوں اور دیوانوں کے کام ہیں دنیا کے عقلمندوں کے کام نہیں ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اسی کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (الاحزاب: ۷۳) ہم نے اپنی امانت کو جو امانت کی طرح واپس دینی چاہیئے تمام زمین و آسمان کی مخلوق پر پیش کیا۔ پس سب نے اُس امانت کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈرے کہ امانت کے لینے سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو مگر انسان نے اس امانت کو اپنے سر پر اٹھا لیا کیونکہ وہ ظلوم اور جہول تھا۔ یہ دونوں لفظ انسان کے لئے محل مدح میں ہیں نہ محل مذمت میں اور ان کے معنے یہ ہیں کہ انسان کی فطرت میں ایک صفت تھی کہ وہ خدا کے لئے اپنے نفس پر ظلم اور سختی کر سکتا تھا۔ اور ایسا خدا تعالیٰ کی طرف جھک سکتا تھا کہ اپنے نفس کو فراموش کر دے اس لئے اُس نے منظور کیا کہ اپنے تمام وجود کو امانت کی طرح پاوے اور پھر خدا کی راہ میں خرچ کر دے۔

اور اس پانچویں مرتبہ کے لئے یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ یعنی مومن وہ ہیں جو اپنی امانتوں اور عہدوں کی رعایت رکھتے ہیں یعنی ادائے امانت اور ایفائے عہد کے بارے میں کوئی دقیقہ تقویٰ اور احتیاط کا باقی نہیں چھوڑتے۔ یہ اس امانت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کا نفس اور اس کے تمام قویٰ اور آنکھ کی بینائی اور کانوں کی شنوائی اور زبان کی گویائی اور ہاتھوں پیروں کی قوت یہ سب خدا تعالیٰ کی امانتیں ہیں جو اُس نے دی ہیں اور جس وقت وہ چاہے اپنی امانتوں کو واپس لے سکتا ہے۔ پس ان تمام امانتوں کا رعایت رکھنا یہ ہے کہ باریک در باریک تقویٰ کی پابندی سے خدا تعالیٰ کی خدمت میں نفس اور اُس کے تمام قویٰ اور جسم اور اس کے تمام قویٰ اور جوارح کو لگایا جائے اِس طرح پر کہ گویا یہ تمام چیزیں اُس کی نہیں بلکہ خدا کی ہو جائیں اور اُس کی مرضی سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی کے موافق ان تمام قویٰ اور اعضاء کا حرکت اور سکون ہو اور اس کا ارادہ کچھ بھی نہ رہے بلکہ خدا کا ارادہ اُن میں کام کرے اور خدا تعالیٰ

کے ہاتھ میں اس کا نفس ایسا ہو جیسا کہ مُردہ زندہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور یہ خود رائی سے بے دخل ہو اور خدا تعالیٰ کا پورا تصرّف اس کے وجود پر ہو جائے یہاں تک کہ اُسی سے دیکھے اور اُسی سے سُنے اور اُسی سے بولے اور اُسی سے حرکت یا سکون کرے اور نفس کی دقیق در دقیق آلائشیں جو کسی خورد بین سے بھی نظر نہیں آسکتیں دُور ہو کر فقط رُوح رہ جائے۔ غرض مہیمنت خدا کی اس پر احاطہ کر لے اور اپنے وجود سے اس کو کھو دے اور اُس کی حکومت اپنے وجود پر کچھ نہ رہے اور سب حکومت خدا کی ہو جائے اور نفسانی جوش سب مفقود ہو جائیں اور الوہیت کے ارادے اُس کے وجود میں جوش زن ہو جائیں۔ پہلی حکومت بالکل اُٹھ جائے اور دوسری حکومت دل میں قائم ہو اور نفسانیت کا گھر ویران ہو اور اُس جگہ پر حضرت عزت کے خیمے لگائے جائیں اور ہیبت اور جبروت الٰہی تمام اُن پودوں کو جن کی آب پاشی گندے چشمۂ نفس سے ہوتی تھی اس پلید جگہ سے اکھیڑ کر رضا جوئی حضرتِ عزّت کی پاک زمین میں لگا دئے جائیں اور تمام آرزوئیں اور تمام ارادے اور تمام خواہشیں خدا میں ہو جائیں اور نفسِ امّارہ کی تمام عمارتیں منہدم کر کے خاک میں ملا دی جائیں اور ایک ایسا پاک محل تقدس اور تطہّر کا دل میں طیار کیا جاوے جس میں حضرت عزّت نازل ہو سکے اور اس کی رُوح اس میں آباد ہو سکے اس قدر تکمیل کے بعد کہا جائے گا کہ وہ امانتیں جو منعم حقیقی نے انسان کو دی تھیں وہ واپس کی گئیں۔ تب ایسے شخص پر یہ آیت صادق آئے گی وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ اس درجہ پر صرف ایک قالب تیار ہوتا ہے اور تجلی الٰہی کی رُوح جس سے مراد محبتِ ذاتیہ حضرت عزّت ہے بعد اس کے مع رُوح القدس ایسے مومن کے اندر داخل ہوتی اور نئی حیات اُس کو بخشتی ہے اور ایک نئی قوت اس کو عطا کی جاتی ہے اور اگرچہ یہ سب کچھ رُوح کے اثر سے ہی ہوتا ہے لیکن ہنوز رُوح مومن سے صرف ایک تعلّق رکھتی ہے اور ابھی مومن کے دل کے اندر آباد نہیں ہوتی۔

پھر بعد اس کے وجود رُوحانی کا مرتبہ ششم ہے یہ وہی مرتبہ ہے جس میں مومن کی محبتِ ذاتیہ اپنے کمال کو پہنچ کر اللہ جلّ شانہٗ کی محبتِ ذاتیہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے تب خدا تعالیٰ کی وہ محبت ذاتی مومن کے اندر داخل ہوتی ہے اور اس پر احاطہ کرتی ہے جس سے ایک نئی اور فوق العادت طاقت مومن کو ملتی ہے اور وہ ایمانی طاقت ایمان میں ایک ایسی زندگی پیدا کرتی ہے جیسے ایک قالبِ بے جان میں رُوح داخل ہو جاتی ہے بلکہ وہ مومن میں داخل ہو کر درحقیقت ایک رُوح کا کام کرتی ہے۔ تمام قویٰ میں اس سے ایک نُور پیدا ہوتا ہے۔ اور رُوح القدس کی تائید ایسے مومن کے شامل حال ہوتی ہے کہ وہ باتیں اور وہ علوم جو انسانی طاقت سے برتر ہیں وہ اس درجہ کے

مومن پر کھولے جاتے ہیں اور اس درجہ کا مومن ایمانی ترقیات کے تمام مراتب طے کر کے ان ظلّی کمالات کی وجہ سے جو حضرت عزت کے کمالات سے اُس کو ملتے ہیں آسمان پر خلیفۃ اللہ کا لقب پاتا ہے کیونکہ جیسا کہ ایک شخص جب آئینہ کے مقابل پر کھڑا ہوتا ہے تو تمام نقوش اس کے مُنہ کے نہایت صفائی سے آئینہ میں منعکس ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی اس درجہ کا مومن جو نہ صرف ترک نفس کرتا ہے بلکہ نفیٔ وجود اور ترکِ نفس کے کام کو اس درجہ کے کمال تک پہنچاتا ہے کہ اس کے وجود میں سے کچھ بھی نہیں رہتا اور صرف آئینہ کے رنگ میں ہو جاتا ہے۔ تب ذاتِ الٰہی کے تمام نقوش اور تمام اخلاق اس میں مندرج ہو جاتے ہیں اور جیسا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ آئینہ جو ایک سامنے کھڑے ہونے والے مُنہ کے تمام نقوش اپنے اندر لے کر اس مُنہ کا خلیفہ ہو جاتا ہے اسی طرح ایک مومن بھی ظلّی طور پر اخلاق اور صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اندر لے کر خلافت کا درجہ اپنے اندر حاصل کرتا ہے اور ظلّی طور پر الٰہی صورت کا مظہر ہو جاتا ہے اور جیسا کہ خدا غیب الغیب ہے اور اپنی ذات میں وراء الوراء ہے ایسا ہی یہ مومن کامل اپنی ذات میں غیب الغیب اور وراء الوراء ہوتا ہے۔ دنیا اس کی حقیقت تک پہنچ نہیں سکتی۔ کیونکہ وہ دنیا کے دائرہ سے بہت ہی دُور چلا جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ خدا جو غیر متبدل اور حیّ وقیّوم ہے وہ مومن کامل کی اُس پاک تبدیلی کے بعد جب کہ مومن خدا کے لئے اپنا وجود بالکل کھو دیتا ہے اور ایک نیا چولا پاک تبدیلی کا پہن کر اُس میں سے اپنا سر نکالتا ہے۔ تب خدا بھی اس کے لئے اپنی ذات میں ایک تبدیلی کرتا ہے مگر یہ نہیں کہ خدا کی ازلی ابدی صفات میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔ نہیں بلکہ وہ قدیم سے اور ازل سے غیر متبدل ہے۔ لیکن یہ صرف مومن کامل کے لئے جلوۂ قدرت ہوتا ہے اور ایک تبدیلی جس کی ہم کُنہ نہیں سمجھ سکتے مومن کی تبدیلی کے ساتھ خدا میں بھی ظہور میں آ جاتی ہے مگر اس طرح پر کہ اُس کی غیر متبدل ذات پر کوئی گرد و غبار حدوث کا نہیں بیٹھتا۔ وہ اسی طرح غیر متبدل ہوتا ہے جس طرح وہ قدیم سے ہے لیکن یہ تبدیلی جو مومن کی تبدیلی کے وقت ہوتی ہے یہ اس قسم کی ہے جیسا کہ لکھا ہے کہ جب مومن خدائے تعالیٰ کی طرف حرکت کرتا ہے تو خدا اس کی نسبت تیز حرکت کے ساتھ اُس کی طرف آتا ہے اور ظاہر ہے کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ تبدیلیوں سے پاک ہے ایسا ہی وہ حرکتوں سے بھی پاک ہے۔ لیکن یہ تمام الفاظ استعارہ کے رنگ میں بولے جاتے ہیں اور بولنے کی اس لئے ضرورت پڑتی ہے کہ تجربہ شہادت دیتا ہے کہ جیسے ایک مومن خدائے تعالیٰ کی راہ میں نیستی اور فنا اور اِستہلاک کر کے اپنے تئیں ایک نیا وجود بناتا ہے اس کی ان تبدیلیوں کے مقابل پر خدا بھی اس کے لئے ایک نیا ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہ معاملات

کرتا ہے جو دوسرے کے ساتھ کبھی نہیں کرتا۔ اور اس کو اپنے ملکوت اور اسرار کا وہ سَیر کراتا ہے جو دوسرے کو ہرگز نہیں دکھلاتا۔ اور اس کے لئے وہ کام اپنے ظاہر کرتا ہے جو دوسروں کے لئے ایسے کام کبھی ظاہر نہیں کرتا۔ اور اس قدر اس کی نصرت اور مدد کرتا ہے کہ لوگوں کو تعجب میں ڈالتا ہے۔ اس کے لئے خوارق دکھلاتا ہے اور معجزات ظاہر کرتا اور ہر ایک پہلو سے اس کو غالب کر دیتا ہے اور اس کی ذات میں ایک قوتِ کشش رکھ دیتا ہے جس سے ایک جہان اُس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اور وہی باقی رہ جاتے ہیں جن پر شقاوتِ ازلی غالب ہے۔

پس اِن تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ مومن کامل کی پاک تبدیلی کے ساتھ خدا تعالیٰ بھی ایک نئی صورت کی تجلی سے اُس پر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اُس نے انسان کو اپنے لئے پیدا کیا ہے کیونکہ جب انسان خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا شروع کرے تو اُسی دن سے بلکہ اُسی گھڑی سے بلکہ اُسی دم سے خدا تعالیٰ کا رجوع اُس کی طرف شروع ہو جاتا ہے۔ اور وہ اُس کا متولّی اور متکفّل اور حامی اور ناصر بن جاتا ہے۔ اور اگر ایک طرف تمام دنیا ہو اور ایک طرف مومنِ کامل تو آخر غلبہ اُسی کو ہوتا ہے کیونکہ خدا اپنی محبت میں صادق ہے اور اپنے وعدوں میں پورا۔ وہ اس کو جو درحقیقت اُس کا ہو جاتا ہے ہرگز ضائع نہیں کرتا۔ ایسا مومن آگ میں ڈالا جاتا ہے اور گلزار میں سے نکلتا ہے۔ وہ ایک گرداب میں دھکیل دیا جاتا ہے اور ایک خوشنما باغ میں سے نمودار ہو جاتا ہے۔ دشمن اس کے لئے بہت منصوبے کرتے اور اس کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن خدا ان کے تمام مکروں اور منصوبوں کو پاش پاش کر دیتا ہے کیونکہ وہ اس کے ہر قدم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے آخر اُس کی ذلّت چاہنے والے ذلّت کی مار سے مرتے ہیں اور نامرادی اُن کا انجام ہوتا ہے۔ لیکن وہ جو اپنے تمام دل اور تمام جان اور تمام ہمت کے ساتھ خدا کا ہو گیا ہے وہ نامراد ہرگز نہیں مرتا اور اُس کی عمر میں برکت دی جاتی ہے اور ضرور ہے کہ وہ جیتا رہے جب تک اپنے کاموں کو پورا کر لے۔ تمام برکتیں اخلاص میں ہیں اور تمام اخلاص خدا کی رضا جوئی میں اور تمام خدا کی رضا جوئی اپنی رضا کے چھوڑنے میں۔ یہی موت ہے جس کے بعد زندگی ہے مبارک وہ جو اس زندگی میں سے حصّہ لے۔

اب واضح ہو کہ جہاں تک ہم نے سورۃ المؤمنون کی آیات ممدوحہ بالا کے معجزہ ہونے کی نسبت لکھنا تھا وہ سب ہم لکھ چکے اور بخوبی ثابت کر چکے کہ سورۃ موصوفہ کی ابتدا میں مومن کے وجود رُوحانی کے چھ ۶ مراتب قرار دیئے ہیں اور مرتبہ ششم خلق آخر کا رکھا ہے۔ یہی مراتبِ ستّہ سورۃ موصوفہ بالا میں جسمانی پیدائش کے بارہ

میں بعد ذکر پیدائش روحانی بیان فرمائے گئے ہیں۔ اور یہ ایک علمی اعجاز ہے۔ اور یہ علمی نکتہ قرآن شریف سے پہلے کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے۔ پس ان آیات کا آخری حصہ یعنی فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ بلاشبہ ایک علمی معجزہ کی جڑ ہے کیونکہ وہ ایک اعجازی موقعہ پر چسپاں کیا گیا ہے۔ اور انسان کے لئے یہ بات ممکن نہیں کہ اپنے بیان میں ایسی اعجازی صورت پیدا کرے اور پھر اس پر آیت فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ چسپاں کرے۔ اور اگر کوئی کہے کہ اِس پر کیا دلیل ہے کہ آیات مذکورہ بالا میں جو مقابلہ انسان کے مراتب پیدائش روحانی اور پیدائش جسمانی میں دکھلایا گیا ہے وہ علمی معجزہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ معجزہ اس کو کہتے ہیں کہ کوئی انسان اس کے مثل بنانے پر قادر نہ ہو سکے یا گذشتہ زمانہ میں قادر نہ ہو سکا ہو اور نہ بعد میں قادر ہونے کا ثبوت ہو۔ پس ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ یہ بیان انسانی پیدائش کی دقیق فلاسفی کا جو قرآن شریف میں مندرج ہے یہ ایک ایسا بے مثل و مانند بیان ہے کہ اس کی نظیر پہلے اس سے کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ نہ اس زمانہ میں ہم نے سُنا کہ کسی ایسے شخص کو جو قرآن شریف کا علم نہیں رکھتا اس فلاسفی کے بیان کرنے میں قرآن شریف سے توارد ہوا ہو۔ اور جب کہ قرآن شریف اپنے جمیع معارف اور نشانوں اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ آیات قرآن شریف کا ایک حصّہ ہیں جو دعویٰ اعجاز میں داخل ہے پس اس کا بے مثل و مانند ثابت ہونا باوجود دعویٰ اعجاز اور طلبِ مقابلہ کے بلاشبہ معجزہ ہے۔

(براہینِ احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۱۸۵ تا ۲۴۴)

جب تک انسان کتاب اللہ کو مقدم نہیں کرتا اور اس کے مطابق عمل درآمد نہیں کرتا۔ تب تک اس کی نمازیں محض وقت کا ضائع کرنا ہے۔ قرآن مجید میں تو صاف طور پر لکھا ہے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ یعنی جب دعا کرتے کرتے انسان کا دل پگھل جائے اور آستانۂ الوہیت پر ایسے خلوص اور صدق سے گر جاوے کہ بس اسی میں محو ہو جاوے اور سب خیالات کو مٹا کر اسی سے فیض اور استعانت طلب کرے اور ایسی یکسوئی حاصل ہو جائے کہ ایک قسم کی رقت اور گداز پیدا ہو جائے تب فلاح کا دروازہ کھل جاتا ہے جس سے دنیا کی محبت ٹھنڈی ہو جاتی ہے کیونکہ دو محبتیں ایک جگہ جمع نہیں رہ سکتیں جیسے لکھا ہے ؎

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں — ایں خیال است و محال است و جنوں

اسی لئے اس کے بعد ہی خدا فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ یہاں لغو سے مراد دنیا ہے یعنی

جب انسان کو نمازوں میں خشوع اور خضوع حاصل ہونے لگ جاتا ہے تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی محبت اس کے دل سے ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ پھر وہ کاشتکاری، تجارت، نوکری وغیرہ چھوڑ دیتا ہے بلکہ وہ دنیا کے ایسے کاموں سے جو دھوکہ دینے والے ہوتے ہیں اور جو خدا سے غافل کر دیتے ہیں اعرض کرنے لگ جاتا ہے اور ایسے لوگوں کی گریہ وزاری اور تضرع اور ابتہال اور خدا کے حضور عاجزی کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص دین کی محبت کو دنیا کی محبت، حرص، لالچ اور عیش وعشرت سب پر مقدم کر لیتا ہے کیونکہ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ ایک نیک فعل دوسرے نیک فعل کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور ایک بدفعل دوسرے بدفعل کو ترغیب دیتا ہے جب وہ لوگ اپنی نمازوں میں خشوع خضوع کرتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبعاً وہ لغو سے اعراض کرتے ہیں اور اس گندی دنیا سے نجات پا جاتے ہیں اور اس دنیا کی محبت ٹھنڈی ہو کر خدا کی محبت ان میں پیدا ہو جاتی ہے جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ یعنی وہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور یہ ایک نتیجہ ہے عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ کا۔ کیونکہ جب دنیا سے محبت ٹھنڈی ہو جائے گی تو اس کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ وہ خدا کی راہ میں خرچ کریں گے اور خواہ قاروں کے خزانے بھی ایسے لوگوں کے پاس جمع ہوں وہ پرواہ نہیں کریں گے اور خدا کی راہ میں دینے سے نہیں جھجکیں گے۔ ہزاروں آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتے یہاں تک کہ ان کی قوم کے بہت سے غریب اور مفلس آدمی تباہ اور ہلاک ہو جاتے ہیں مگر وہ ان کی پرواہ بھی نہیں کرتے حالانکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر ایک چیز پر زکوٰۃ دینے کا حکم ہے یہاں تک کہ زیور پر بھی۔ ہاں جواہرات وغیرہ چیزوں پر نہیں۔ اور جو امیر، نواب اور دولت مند لوگ ہوتے ہیں ان کو حکم ہے کہ وہ شرعی احکام کے بموجب اپنے خزانوں کا حساب کر کے زکوٰۃ دیں لیکن وہ نہیں دیتے اس لئے خدا فرماتا ہے کہ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ کی حالت تو ان میں تب پیدا ہوگی جب وہ زکوٰۃ بھی دیں گے گویا زکوٰۃ کا دینا لغو سے اعراض کرنے کا ایک نتیجہ ہے۔

پھر اس کے بعد وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ فرمایا یعنی جب وہ لوگ اپنی نمازوں میں خشوع خضوع کریں گے۔ لغو سے اعراض کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ اپنے سوراخوں کی حفاظت کریں گے کیونکہ جب ایک شخص دین کو دنیا پر مقدم رکھتا ہے اور اپنے مال کو خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے وہ کسی اور کے مال کو ناجائز طریقہ سے کب حاصل کرنا چاہتا ہے اور کب چاہتا ہے کہ میں کسی دوسرے کے حقوق کو دبا لوں اور جب وہ مال جیسی عزیز چیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتا

تو پھر آنکھ، ناک، کان زبان وغیرہ کو غیر محل پر کب استعمال کرنے لگا کیونکہ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب ایک شخص اول درجہ کی نیکیوں کی نسبت اس قدر محتاط ہوتا ہے تو ادنیٰ درجہ کی نیکیاں خود بخود عمل میں آتی جاتی ہیں۔ مثلاً جب خشوع خضوع سے دعا مانگنے لگا تو پھر اس کے ساتھ ہی لغو سے بھی اعراض کرنا پڑا اور جب لغو سے اعراض کیا تو پھر زکوٰۃ کے ادا کرنے میں دلیر ہونے لگا اور جب اپنے مال کی نسبت وہ اس قدر محتاط ہو گیا تو پھر غیروں کے حقوق چھیننے سے بدرجہ اولیٰ بچنے لگا اس لئے اس کے آگے فرمایا وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ کیونکہ جو شخص دوسرے کے حق میں دست اندازی نہیں کرتا اور جو حقوق اس کے ذمہ ہیں ان کو ادا کرتا ہے اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے عہدوں کا پکا ہو اور دوسرے کی امانتوں میں خیانت کرنے سے بچنے والا ہو اس لئے بطور نتیجہ کے فرمایا کہ جب ان لوگوں میں یہ وصف پائے جاتے ہوں تو پھر لازمی بات ہے کہ وہ اپنے عہدوں کے بھی پکے ہوں گے۔ پھر ان سب باتوں کے بعد فرمایا وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ یعنی ایسے ہی لوگ ہیں جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں اور کبھی ناغہ نہیں کرتے اور انسان کی پیدائش کی اصل غرض بھی یہی ہے کہ وہ نماز کی حقیقت سیکھے جیسے فرمایا وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات: ۵۷)　　(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳ مورخہ ۱۰؍جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ یعنی ایماندار وہ لوگ ہیں جو لغو کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنا وقت بیہودہ کاموں میں نہیں کھوتے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۰۴، ۲۱۴ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

لغو سے اعراض کرنا مومن کی شان ہے۔　　(الحکم جلد ۶ نمبر ۸ مورخہ ۲۸؍فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

مومن وہ ہوتے ہیں جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷؍نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

ایک اور اعتراض ہے جو بعض ناواقف آریہ پیش کیا کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (یونس: ۴) یعنی خدا نے جو تمہارا رب ہے زمین اور آسمانوں کو چھ دن میں بنایا اور پھر عرش پر ٹھہرا یہ چھ دن کی کیوں تخصیص ہے یہ تو تسلیم کیا کہ خدا تعالیٰ کے کام اکثر تدریجی ہیں جیسا کہ اب بھی اس کی خالقیت جو جمادات اور نباتات اور حیوانات میں اپنا کام کر رہی ہے تدریجی طور پر ہی ہر ایک چیز کو اس کی خلقت کاملہ تک پہنچاتی ہے لیکن چھ

دن کی تخصیص کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔

اما الجواب پس واضح ہو کہ یہ چھ دن کا ذکر درحقیقت مراتب تکوینی کی طرف اشارہ ہے یعنی ہر یک چیز جو بطور خلق صادر ہوئی ہے اور جسم اور جسمانی ہے خواہ وہ مجموعہ عالم ہے اور خواہ ایک فرد از افراد عالم اور خواہ وہ عالم کبیر ہے جو زمین و آسمان و مافیہا سے مراد ہے اور خواہ وہ عالم صغیر جو انسان سے مراد ہے وہ بحکمت و قدرت باری تعالیٰ پیدائش کے چھ مرتبے طے کر کے اپنے کمال خلقت کو پہنچتی ہے اور یہ عام قانون قدرت ہے کچھ ابتدائی زمانہ سے خاص نہیں چنانچہ اللہ جلّ شانہٗ ہر ایک انسان کی پیدائش کی نسبت بھی انہیں مراتب ستہ کا ذکر فرماتا ہے جیسا کہ قران کریم کے اٹھارویں سیپارے سورۃ المؤمنون میں یہ آیت ہے وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۪ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ یعنی پہلے تو ہم نے انسان کو اس مٹی سے پیدا کیا جو زمین کے تمام انواع اور اقسام کا لُب لباب تھا اور اس کی تمام قوتیں اپنے اندر رکھتا تھا تا وہ باعتبار جسم بھی عالم صغیر ٹھہرے اور زمین کی تمام چیزوں کی اس میں قوت اور خاصیت ہو جیسا کہ وہ برطبق آیت فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (الحجر: ۳۰) باعتبار روح عالم صغیر ہے اور بلحاظ شیون وصفات کاملہ وظلیّت تام روح الٰہی کا مظہر تام ہے۔ پھر بعد اس کے انسان کو ہم نے دوسرے طور پر پیدا کرنے کے لئے یہ طریق جاری کیا جو انسان کے اندر نطفہ پیدا کیا اور اس نطفہ کو ہم نے ایک مضبوط تھیلی میں جو ساتھ ہی رحم میں بنتے جاتے ہی جگہ دی۔ (قرار مکین کا لفظ اس لئے اختیار کیا گیا کہ تا رحم اور تھیلی دونوں پر اطلاق پاسکے) اور پھر ہم نے نطفہ سے علقہ بنایا اور علقہ سے مضغہ اور مضغہ کے بعض حصوں میں سے ہڈیاں اور ہڈیوں پر پوست پیدا کیا پھر اس کو ایک اور پیدائش دی یعنی روح اس میں ڈال دی۔ پس کیا ہی مبارک ہے وہ خدا جو اپنی صنعت کاری میں تمام صناعوں سے بلحاظ حسن صنعت وکمال عجائبات خلقت بڑا ہوا ہے۔

اب دیکھو کہ خدا تعالیٰ نے اس جگہ بھی اپنا قانون قدرت یہی بیان فرمایا کہ انسان چھ طور کے خلقت کے مدارج طے کر کے اپنے کمال انسانیت کو پہنچتا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ عالم صغیر اور عالم کبیر میں نہایت شدید تشابہ ہے اور قرآن سے انسان کا عالم صغیر ہونا ثابت ہے اور آیت لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین: ۵) اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ تقویم عالم کی متفرق خوبیوں اور حسنوں کا ایک ایک حصہ

انسان کو دے کر بوجہ جامعیت جمیع شمائل وشیون عالم اس کو احسن ٹھہرایا گیا ہے پس اب بوجہ تشابہ عالمین اور نیز بوجہ ضرورت تناسب افعال صانع واحد ماننا پڑتا ہے کہ جو عالم صغیر میں مراتب تکوین موجود ہیں وہی مراتب تکوین عالم کبیر میں بھی ملحوظ ہوں اور ہم صریح اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ یہ عالم صغیر جو انسان کے اسم سے موسوم ہے اپنی پیدائش میں چھ طریق رکھتا ہے اور کچھ شک نہیں کہ یہ عالم عالم کبیر کے کوائف مخفیہ کی شناخت کے لئے ایک آئینہ کا حکم رکھتا ہے پس جب کہ اس کی پیدائش کے چھ مرتبے ثابت ہوئے تو قطعی طور پر یہ حکم دے سکتے ہیں کہ عالم کبیر کے بھی مراتب تکوین چھ ہی ہیں جو بلحاظ موثرات ستّہ یعنی تجلیات ستّہ جن کے آثار باقیہ نجوم ستہ میں محفوظ رہ گئے ہیں معقولی طور پر متحقق ہوتے ہیں۔ اور نجوم ستہ کا اب بھی علوم حکمیہ میں جنین کی تکمیل کے لئے تعلق مانا جاتا ہے چنانچہ سدیدی میں اس کے متعلق ایک مبسوط بحث لکھی ہے۔ بعض نادان اس جگہ اس آیت کی نسبت یہ اعتراض پیش کرتے ہیں کہ حال کی طبی تحقیقاتوں کی رو سے یہ طرز بچہ کے بننے کی جو رحم عورت میں بنتا ہے ثابت نہیں ہوتی بلکہ برخلاف اس کے ثابت ہوتا ہے لیکن یہ اعتراض سخت درجہ کی کم فہمی یا صریح تعصب پر مبنی ہے اس بات کے تجربہ کے لئے کسی ڈاکٹر یا طبیب کی حاجت نہیں خود ہر یک انسان اس آزمائش کے لئے وقت خرچ کر کے اوران بچوں کو دیکھ کر جو تام خلقت یا ناتمام خلقت کی حالت میں پیدا ہوتے ہیں یا سقوط حمل کے طور پر گرتے ہیں۔ حقیقت واقعیہ تک پہنچ سکتا ہے اور جیسا کہ ہم اپنے ذاتی مشاہدہ سے جانتے ہیں بلاشبہ یہ بات صحیح ہے کہ جب خدا تعالیٰ انسانی نطفہ سے کسی بچہ کو رحم میں بنانے کے لئے ارادہ فرماتا ہے تو پہلے مرد اور عورت کا نطفہ رحم میں ٹھہرتا ہے اور صرف چند روز تک ان دونوں منیوں کے امتزاج سے کچھ تغیر طاری ہو کر جمے ہوئے خون کی طرح ایک چیز ہو جاتی ہے جس پر ایک نرم سی جھلی ہوتی ہے یہ جھلی جیسے جیسے بچہ بڑھتا ہے بڑھتی جاتی ہے یاں تک کہ خاکی رنگ کی ایک تھیلی سی ہو جاتی ہے جو گٹھڑی کی طرح نظر آتی ہے اور اپنی تکمیل خلقت کے دنوں تک بچہ اسی میں ہوتا ہے قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے اور حال کی تحقیقاتیں بھی اس کی مصدّق ہیں کہ عالم کبیر بھی اپنے کمال خلقت کے وقت تک ایک گٹھڑی کی طرح تھا جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے اَوَ لَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (الانبیاء:۳۱) الجزو نمبر ۷ یعنی فرماتا ہے کہ کیا کافروں نے آسمان اور زمین کو نہیں دیکھا کہ گٹھڑی کی طرح آپس میں بندھے ہوئے تھے اور ہم نے ان کو کھول دیا۔ سو کافروں نے تو آسمان اور زمین بنتا نہیں دیکھا اور نہ ان کی گٹھڑی دیکھی لیکن اس جگہ روحانی

آسمان اور روحانی زمین کی طرف اشارہ ہے جس کی گھڑی کفار عرب کے روبرو کھل گئی اور فیضان سماوی زمین پر جاری ہو گئے اب پھر ہم اپنے پہلے کلام کی طرف عود کر کے کہتے ہیں کہ نطفتین مرد اور عورت کے جو آپس میں مل جاتے ہیں وہ اول مرتبہ تکوین کا ہے۔ اور پھر ان میں ایک جوش آ کر وہ مجموعہ نطفتین جو قوت عاقدہ اور منعقدہ اپنے اندر رکھتا ہے سرخی کی طرف مائل ہو جاتا ہے گویا وہ منی جو پہلے خون سے بنی تھی پھر اپنے اصلی رنگ کی طرف جو خونی ہے عود کر آتی ہے یہ دوسرا درجہ ہے پھر وہ خون جما ہوا جس کا نام علقہ ہے ایک گوشت کا مضغہ ہو جاتا ہے جو انسانی شکل کا کچھ خاکہ نہایت دقیق طور پر اپنے اندر رکھتا ہے یہ تیسرا درجہ ہے اور اس درجہ پر اگر بچہ ساقط ہو جائے تو اس کے دیکھنے سے غور کی نظر سے کچھ خطوط انسان بننے کے اس میں دکھائی دیتے ہیں چنانچہ اکثر بچے اس حالت میں بھی ساقط ہو جاتے ہیں جن عورتوں کو کبھی یہ اتفاق پیش آیا ہے یا وہ دایہ کا کام کرتی ہیں وہ اس حال سے خوب واقف ہیں پھر چوتھا درجہ وہ ہے جب مضغہ سے ہڈیاں بنائی جاتی ہیں جیسا کہ آیت فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا بیان فرما رہی ہے۔ مگر المضغہ پر جو الف لام ہے وہ تخصیص کے لئے ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ تمام مضغہ ہڈی نہیں بن جاتا بلکہ جہاں جہاں ہڈیاں درکار ہیں باذنہٖ تعالیٰ وہی نرم گوشت کسی قدر صلب ہو کر ہڈی کی صورت بن جاتا ہے اور کسی قدر بدستور نرم گوشت رہتا ہے۔ اور اس درجہ پر انسانی شکل کا کھلا کھلا خاکہ طیار ہو جاتا ہے جس کے دیکھنے کے لئے کسی خورد بین کی ضرورت نہیں اس خاکہ میں انسان کا اصل وجود جو کچھ بننا چاہئے تھا بن چکتا ہے لیکن وہ ابھی اس لحم سے خالی ہوتا ہے جو انسان کے لئے بطور ایک موٹے اور شاندار اور چمکیلے لباس کے لئے ہے۔ جس سے انسان کے تمام خط و خال ظاہر ہوتے ہیں اور بدن پر تازگی آتی ہے اور خوبصورتی نمایاں ہو جاتی ہے اور تناسب اعضا پیدا ہوتا ہے پھر بعد اس کے پانچواں درجہ وہ ہے کہ جب اس خاکہ پر لحم یعنی موٹا گوشت برعایت مواضع مناسبہ چڑھایا جاتا ہے یہ وہی گوشت ہے کہ جب انسان تپ وغیرہ سے بیمار رہتا ہے تو فاقہ اور بیماری کی تکالیف شاقہ سے وہ گوشت تحلیل ہو جاتا ہے اور بسا اوقات انسان ایسی لاغری کی حالت پر پہنچ جاتا ہے جو وہی پانچویں درجہ کا خاکہ یعنی مشت استخوان رہ جاتا ہے جیسے مدقوقوں اور مسلولوں اور اصحاب ذیابیطس میں مرض کے انتہائی درجہ میں یہ صورت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور اگر کسی کی حیات مقدر ہوتی ہے تو پھر خدا تعالیٰ اس کے بدن پر گوشت چڑھاتا ہے غرض یہ وہی گوشت ہے جس سے خوبصورتی اور تناسب اعضا اور رونق بدن پیدا ہوتی ہے اور کچھ شک نہیں کہ یہ گوشت خاکہ طیار ہونے کے بعد آہستہ آہستہ جنین پر چڑھتا رہتا ہے۔ اور

جب جنین ایک کافی حصہ اس کا لے لیتا ہے۔ تب باذنہٖ تعالیٰ اس میں جان پڑ جاتی ہے تب وہ نباتی حالت سے جو صرف نشوونما ہے منتقل ہو کر حیوانی حالت کی خاصیت پیدا کر لیتا ہے اور پیٹ میں حرکت کرنے لگتا ہے غرض یہ ثابت شدہ بات ہے کہ بچہ اپنی نباتی صورت سے حیوانی صورت کو کامل طور پر اس وقت قبول کرتا ہے کہ جب کہ عام طور پر موٹا گوشت اس کے بدن پر مناسب کمی بیشی کے ساتھ چڑھ جاتا ہے یہی بات ہے جس کو آج تک انسان کے مسلسل تجارب اور مشاہدات نے ثابت کیا ہے یہ وہی تمام صورت ہے جو قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے اور مشاہدات کے ذریعہ سے بتواتر ثابت ہے پھر اس پر اعتراض کرنا اگر نادانوں کا کام نہیں تو اور کس کا ہے؟

اب پھر ہم اپنے کلام کی طرف رجوع کر کے لکھتے ہیں کہ چونکہ عالم صغیر میں جو انسان ہے سنت اللہ یہی ثابت ہوئی ہے کہ اس کے وجود کی تکمیل چھ مرتبوں کے طے کرنے کے بعد ہوتی ہے تو اسی قانون قدرت کی رہبری سے ہمیں معقولی طور پر یہ راہ ملتی ہے کہ دنیا کی ابتدا میں جو اللہ جلّ شانہٗ نے عالم کبیر کو پیدا کیا تو اس کی طرز پیدائش میں بھی یہی مراتب ستّہ ملحوظ رکھے ہوں گے اور ہر یک مرتبہ کو تفریق اور تقسیم کی غرض سے ایک دن یا ایک وقت سے مخصوص کیا ہوگا جیسا کہ انسان کی پیدائش کے مراتب ستّہ چھ وقتوں سے خاص ہیں اور دنیا کی تمام قوموں کا سات دنوں پر اتفاق ہونا اور ایک دن تعطیل کا نکال کر چھ دنوں کو کاموں کے لئے خاص کرنا اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ چھ دن ان چھ دنوں کی یادگار چلے آتے ہیں کہ جن میں زمین وآسمان اور جو کچھ ان میں ہے بنایا گیا تھا۔ اور اگر کوئی اب بھی تسلیم نہ کرے اور انکار سے باز نہ آوے تو ہم کہتے ہیں کہ ہم نے تو عالم کبیر کے لئے عالم صغیر کی پیدائش کے مراتب ستّہ کا ثبوت دے دیا اور جو کام کرنے کے دن بالاتفاق ہر یک قوم میں مسلّم ہیں ان کا چھ ہونا بھی ظاہر کر دیا اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ خدا تعالیٰ کے تمام پیدائشی کام اس دنیا میں تدریجی ہیں تو پھر اگر منکر کی نظر میں یہ دلیل کافی نہیں تو اس پر واجب ہوگا کہ وہ بھی تو اپنے اس دعوٰے پر کوئی دلیل پیش کرے کہ خدا تعالیٰ نے یہ عالم جسمانی صرف ایک دم میں پیدا کر دیا تھا تدریجی طور پر پیدا نہیں کیا تھا۔ ہر یک شخص جانتا ہے کہ وہی خدا اب بھی ہے جو پہلے تھا اور وہی خالقیت کا سلسلہ اب بھی جاری ہے جو پہلے جاری تھا۔ اور صاف بدیہی طور پر نظر آ رہا ہے کہ خدا تعالیٰ ہر یک مخلوق کو تدریجی طور پر اپنے کمال وجود تک پہنچاتا ہے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ پہلے وہ قوی تھا اور جلد کام کر لیتا تھا اور اب ضعیف ہے اور دیر سے کرتا ہے بلکہ یہی کہیں گے کہ اس کا قانون قدرت ہی ابتدا سے یہی ہے کہ وہ ہر یک

مخلوق کو بتدریج پیدا کرتا ہے سو حال کے افعال الٰہی ہمیں بتلا رہے ہیں کہ گزشتہ اور ابتدائی زمانہ میں بھی یہی تدریج ملحوظ تھی جواب ہے ہم سخت نادان ہوں گے اگر ہم حال کے آئینہ میں گزشتہ کی صورت نہ دیکھ لیں اور حال کی طرز خالقیت پر نظر ڈال کر صرف اتنا ہی ثابت نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ اپنی پیدائش کے سلسلہ کو تدریج سے کمال وجود تک پہنچاتا ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر یک مخلوق کی پیدائش میں چھ ہی مرتبے رکھے ہیں اور حکمت الٰہی نے ہر یک مخلوق کی پیدائش میں یہی تقاضا کیا کہ اس کے پیدا ہونے کے چھ مرتبے ہوں جو چھ وقتوں میں انجام پذیر ہوں کسی مخلوق پر نظر ڈال کر دیکھ لو یہی چھ مراتب اس میں متحقق ہوں گے یعنی بنظر تحقیق یہ ثابت ہوگا کہ ہر یک جسمانی مخلوق کے وجود کی تکمیل چھ مرتبوں کے طے کرنے کے بعد ہوتی ہے اور انسان پر کچھ موقوف نہیں زمین پر جو ہزار ہا حیوانات ہیں ان کے وجود کی تکمیل بھی انہیں مراتب ستّہ پر موقوف پاؤ گے۔

پھر ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ سلسلہ مراتب ستّہ تکوین کا صرف جسمانی مخلوق میں ہی محدود نہیں بلکہ روحانی امور میں بھی اس کا وجود پایا جاتا ہے مثلاً تھوڑے سے غور سے معلوم ہوگا کہ انسان کی روحانی پیدائش کے مراتب بھی چھ[۶] ہی ہیں پہلے وہ نطفہ کی صورت پر صرف حق کے قبول کرنے کی ایک استعداد بعیدہ اپنے اندر رکھتا ہے اور پھر جب اس استعداد کے ساتھ ایک قطرہ رحمت الٰہی مل جاتا ہے اسی طرز کے موافق کہ جب عورت کے نطفہ میں مرد کا نطفہ پڑتا ہے تو تب انسان کی باطنی حالت نطفہ کی صورت سے علقہ کی صورت میں آجاتی ہے اور کچھ رشتہ باری تعالیٰ سے پیدا ہونے لگتا ہے جیسا کہ علقہ کے لفظ سے تعلق کا لفظ مفہوم ہوتا ہے اور پھر وہ علقہ اعمال صالحہ کے خون کی مدد سے مضغہ بنتا ہے اسی طرز سے کہ جیسے خون حیض کی مدد سے علقہ مضغہ بن جاتا ہے اور مضغہ کی طرح ابھی اس کے اعضا ناتمام ہوتے ہیں جیسا کہ مضغہ میں ہڈی والے عضو ابھی ناپدید ہوتے ہیں ایسا ہی اس میں بھی شدت لِلّٰہ اور ثبات لِلّٰہ اور استقامت لِلّٰہ کے عضو ابھی کما حقہ پیدا نہیں ہوتے گو تواضع اور نرمی موجود ہوتی ہے اور اگرچہ پوری شدت اور صلابت اس مرتبہ میں پیدا نہیں ہوتی مگر مضغہ کی طرح کسی قدر قضا و قدر کی مضغ کے لائق ہو جاتا ہے یعنی کسی قدر اس لائق ہو جاتا ہے کہ قضا و قدر کا دانت اس پر چلے اور وہ اس کے نیچے ٹھہر سکے کیونکہ علقہ جو ایک سیال رطوبت کے قریب قریب ہے وہ تو اس لائق ہی نہیں کہ دانتوں کے نیچے پیسا جاوے اور ٹھہرا رہے لیکن مضغہ مضغ کے لائق ہے اسی لئے اس کا نام مضغہ ہے سو مضغہ ہونے کی وہ حالت ہے کہ جب کچھ چاشنی محبت الٰہی کی دل میں پڑ جاتی

ہے اور تجلی جلالی توجہ فرماتی ہے کہ بلاؤں کے ساتھ اس کی آزمائش کرے تب وہ مضغہ کی طرح قضاوقدر کے دانتوں میں پیسا جاتا ہے اور خوب قیمہ کیا جاتا ہے غرض تیسرا درجہ سالک کے وجود کا مضغہ ہونے کی حالت ہے اور پھر چوتھا درجہ وہ ہے کہ جب انسان استقامت اور بلاؤں کی برداشت کی برکت سے آزمائے جانے کے بعد نقوش انسانی کا پورے طور پر انعام پاتا ہے یعنی روحانی طور پر اس کے لئے ایک صورت انسانی عطا ہوتی ہے اور انسان کی طرح اس کو دو آنکھیں دو کان اور دل اور دماغ اور تمام ضروری قویٰ اور اعضا عطا کئے جاتے ہیں اور بمقتضائے آیت اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح : ۳۰) سختی اور نرمی مواضع مناسبہ میں ظاہر ہو جاتی ہے یعنی ہر یک خلق اس کا اپنے اپنے محل پر صادر ہوتا ہے اور آداب طریقت تمام محفوظ ہوتے ہیں اور ہر یک کام اور کلام حفظ حدود کے لحاظ سے بجالاتا ہے یعنی نرمی کی جگہ پر نرمی اور سختی کی جگہ پر سختی اور تواضع کی جگہ پر تواضع اور ترفع کی جگہ پر ترفع ایسا ہی تمام قویٰ سے اپنے اپنے محل پر کام لیتا ہے یہ درجہ جنین کے اس درجہ سے مشابہت رکھتا ہے کہ جب وہ مضغہ کی حالت سے ترقی کر کے انسان کی صورت کا ایک پورا خاکہ حاصل کر لیتا ہے اور ہڈی کی جگہ پر ہڈی نمودار ہو جاتی ہے اور گوشت کی جگہ پر گوشت باقی رہتا ہے ہڈی نہیں بنتی اور تمام اعضا میں باہم تمیز کلّی پیدا ہو جاتی ہے لیکن ابھی خوبصورتی اور تازگی اور تناسب اعضا نہیں ہوتا صرف خاکہ ہوتا ہے جو نظر دقیق سے دکھائی دیتا ہے پھر بعد اس کے عنایت الٰہی توفیقات متواترہ سے موفق کر کے اور تزکیہ نفس کے کمال تک پہنچا کر اور فنا فی اللہ کے انتہائی نقطہ تک کھینچ کر اس کے خاکہ کے بدن پر انواع اقسام کی برکات کا گوشت بھر دیتی ہے اور اس گوشت سے اس کی شکل کو چمکیلی اور اس کی تمام ہیکل کو آبدار کر دیتی ہے تب اس کے چہرہ پر کاملیّت کا نور برستا ہے اور اس کے بدن پر کمال تام کی آب و تاب نظر آتی ہے اور یہ درجہ پیدائش کا جسمانی پیدائش کے اس درجہ سے مشابہ ہوتا ہے کہ جب جنین کے خاکہ کی ہڈیوں پر گوشت چڑھایا جاتا ہے اور خوبصورتی اور تناسب اعضا ظاہر کیا جاتا ہے۔ پھر بعد اس کے روحانی پیدائش کا چھٹا درجہ ہے جو مصداق ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ کا ہے۔ وہ مرتبہ بقا ہے جو فنا کے بعد ملتا ہے جس میں روح القدس کامل طور پر عطا کیا جاتا ہے اور ایک روحانی زندگی کی روح انسان کے اندر پھونک دی جاتی ہے۔ ایسا ہی یہ چھ مراتب خدا تعالیٰ کی پاک کلام میں بھی جمع ہیں۔ اول حروف کا مرتبہ جو حامل کلام الٰہی اور کلمات کتاب اللہ کے لئے بطور تخم کے ہیں جن کو معانی مقصودہ سے کچھ بھی حصہ نہیں ہاں ان کے حصول کے لئے ایک استعداد بعیدہ رکھتے ہیں دوم کلمات کا مرتبہ جو اس تخم کے ذریعہ سے ظہور خارجی کے رنگ میں

آئے جن کو معانی مقصودہ سے کچھ حصہ نہیں مگر ان کے حصول کے لئے ایک ذریعہ قریبہ ہیں سوم ان فقرات ناتمام کا مرتبہ جو ابھی کلام مقصودہ کے پورے درجہ تک نہیں پہنچے تھے کیونکہ ہنوز تنزیل کا سلسلہ ناتمام تھا اور خدا تعالیٰ کے کلام نے ابھی اپنا کامل چہرہ نہیں دکھلایا تھا مگر ان فقرات کو معانی مقصودہ سے ایک وافر حصہ تھا اس لئے وہ کلام تام الٰہی کے لئے بطور بعض اعضا کے ٹھہرے جن کا نام بلحاظ قلّت و کثرت آیتیں اور سورتیں رکھا گیا چہارم اس کا کلام جامع تام مفصل ممیز کا مرتبہ جو سب نازل ہو چکا اور جمیع مضامین مقصودہ اور علوم حکمیہ وقصص واخبار واحکام وقوانین وضوابط وحدود ومواعید وانذارات وتبشیرات اور درشتی اور نرمی اور شدّت اور رحم اور حقائق ونکات پر بالاستیفا مشتمل ہے پنجم بلاغت وفصاحت کا مرتبہ جو زینت اور آرائش کے لئے اس کلام پر ازل سے چڑھائی گئی ششم برکت اور تاثیر اور کشش کی روح کا مرتبہ جو اس پاک کلام میں موجود ہے جس نے تمام کلام پر اپنی روشنی ڈالی اور اس کو زندہ اور منور کلام ثابت کیا۔

اسی طرح ہر یک عاقل اور فصیح منشی کے کلام میں یہی چھ مراتب جمع ہو سکتے ہیں گو وہ کلام اعجازی حد تک نہیں پہنچتا کیونکہ جن حروف میں کوئی کلام لکھا جائے گا خواہ وہ عربی ہوں یا انگریزی یا ہندی پہلے ان کا وجود ضروری ہے سو یہ تو پہلا مرتبہ ہوا جو مضامین مقصودہ کے اظہار کے لئے ایک ذریعہ بعیدہ ہے مگر ان سے کچھ حصہ نہیں رکھتا پھر بعد اس کے دوسرا مرتبہ کلمات کا ہے جو حروف قرار دادہ سے پیدا ہوں گے جن کو معانی و مضامین مقصودہ سے ابھی کچھ حصہ نہیں مگر ان کے حصول کے لئے ایک ذریعہ قریبہ ہیں۔ پھر اس کے بعد تیسرا مرتبہ فقرات کا ہے جو ابھی معانی مقصودہ کے پورے جامع تو نہیں مگر ان میں سے کچھ حصہ رکھتے ہیں اور اس مضمون کے لئے جو منشی کے ذہن میں ہے بطور بعض اعضا کے ہیں۔ پھر چوتھا مرتبہ کلام جامع تام کا ہے جو منشی کے دل میں سے نکل کر بہ تمام وکمال کاغذ پر اندراج پا گیا ہے اور تمام معانی اور مضامین مقصودہ کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے پھر پانچواں مرتبہ یہ ہے کہ ان سادہ فقرات اور عبارتوں پر بلاغت اور فصاحت کا رنگ چڑھایا جائے اور خوش بیانی کے نمک سے ملیح کیا جائے پھر چھٹا مرتبہ جو بلاتوقف اس مرتبہ کے تابع ہے یہ ہے کہ کلام میں اثر اندازی کی ایک جان پیدا ہو جائے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیوے اور طبیعتوں میں گھر کر لیوے۔ اب غور کر کے دیکھ لو کہ یہ مراتب ستہ بکلّی ان مراتب ستہ کی مانند اور ان کی مثیل ہیں جن کا قرآن کریم میں نطفہ، علقہ، مضغہ اور کچھ مضغہ اور کچھ عظام یعنی انسان کی شکل کا خاکہ اور انسان کی پوری شکل اور جاندار انسان نام رکھا ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۷۲ تا ۲۱۱ حاشیہ در حاشیہ)

ہر یک قسم کی کجی اور بے راہی سے باز آکر اور بالکل رو بخدا ہو کر راہِ راست کو اختیار کرنا یہ وہی سخت گھاٹی ہے جس کو دوسرے لفظوں میں فنا سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ امورِ مالوفہ اور معتادہ کو یک لخت چھوڑ دینا اور نفسانی خواہشوں کو جو ایک عمر سے عادت ہو چکی ہے یک دفعہ ترک کرنا اور ہر ایک ننگ اور ناموس اور عجب اور ریا سے منہ پھیر کر اور تمام ماسوا اللہ کو کالعدم سمجھ کر سیدھا خدا کی طرف رخ کر لینا حقیقت میں ایک ایسا کام ہے جو موت کے برابر ہے اور یہ موت روحانی پیدائش کا مدار ہے اور جیسے دانہ جب تک خاک میں نہیں ملتا اور اپنی صورت کو نہیں چھوڑتا تب تک نیا دانہ وجود میں آنا غیر ممکن ہے۔ اسی طرح روحانی پیدائش کا جسم اس فنا سے تیار ہوتا ہے۔ جوں جوں بندہ کا نفس شکست پکڑتا جاتا ہے اور اس کا فعل اور ارادت اور رو بخلق ہونا فنا ہوتا جاتا ہے توں توں پیدائشِ روحانی کے اعضاء بنتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب فناء اتم حاصل ہو جاتی ہے تو وجودِ ثانی کی خلعت عطا کی جاتی ہے اور ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ کا وقت آجاتا ہے اور چونکہ یہ فناء اتم بغیر نصرت و توفیق و توجہ خاص قادرِ مطلق کے ممکن نہیں اس لئے یہ دعا تعلیم کی یعنی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ جس کے یہ معنی ہیں کہ اے خدا ہم کو راہِ راست پر قائم کر اور ہر یک طور کی کجی اور بے راہی سے نجات بخش۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۰۵ تا ۶۰۹ حاشیہ نمبر ۱۱)

اگر یہ وسواس دل میں گزرے کہ پھر اللہ جل شانہ نے مسیح ابن مریم کی نسبت اس قصہ میں جہاں پرندہ بنانے کا ذکر ہے تخلق کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے جس کے بظاہر یہ معنی ہیں کہ تو پیدا کرتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ حضرت عیسٰی کو خالق قرار دینا بطور استعارہ ہے جیسا کہ اس دوسری آیت میں فرمایا ہے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ بلاشبہ حقیقی اور سچا خالق خدا تعالیٰ ہے اور جو لوگ مٹی یا لکڑی کے کھلونے بناتے ہیں وہ بھی خالق ہیں مگر جھوٹے خالق جن کے فعل کی اصلیت کچھ بھی نہیں۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۲۶۰ حاشیہ)

ابتدائی تقویٰ جس کے حصول سے متقی کا لفظ انسان پر صادق آسکتا ہے وہ ایک فطرتی حصہ ہے کہ جو سعیدوں کی خلقت میں رکھا گیا ہے اور ربوبیتِ اولیٰ اس کی مربی اور وجود بخش ہے جس سے متقی کا پہلا تولد ہے مگر وہ اندرونی نور جو روح القدس سے تعبیر کیا گیا ہے وہ عبودیتِ خالصہ تامہ اور ربوبیتِ کاملہ مستجمعہ کے پورے جوڑ و اتصال سے بطرز ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ کے پیدا ہوتا ہے اور یہ ربوبیت ثانیہ ہے جس سے متقی تولد ثانی پاتا ہے اور ملکوتی مقام پر پہنچتا ہے اور اس کے بعد ربوبیت ثالثہ کا درجہ ہے جو خلق جدید سے موسوم

ہے جس سے متقی لاہوتی مقام پر پہنچتا ہے اور تولد ثالث پاتا ہے۔فَتَدَبَّرْ۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۵۵۹، ۵۶۰، حاشیہ)

خدا تعالیٰ کا پاک کلام ہمیں سمجھاتا ہے کہ روح اس قالب میں سے ہی ظہور پذیر ہوجاتی ہے جو نطفہ سے رحم میں تیار ہوتا ہے جیسا کہ وہ قرآن شریف میں فرماتا ہے ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ یعنی پھر ہم اس جسم کو جو رحم میں تیار ہوا تھا ایک اور پیدائش کے رنگ میں لاتے ہیں اور ایک اور خلقت اس کی ظاہر کرتے ہیں جو روح کے نام سے موسوم ہے اور خدا بہت برکتوں والا ہے اور ایسا خالق ہے کہ کوئی اس کے برابر نہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ ہم اسی جسم میں سے ایک اور پیدائش ظاہر کرتے ہیں یہ ایک گہرا راز ہے جو روح کی حقیقت دکھا رہا ہے اور ان نہایت مستحکم تعلقات کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو روح اور جسم کے درمیان واقعہ ہیں اور یہ اشارہ ہمیں اس بات کی بھی تعلیم دیتا ہے کہ انسان کے جسمانی اعمال اور اقوال اور تمام طبعی افعال جب خدا تعالیٰ کے لئے اور اس کی راہ میں ظاہر ہونے شروع ہوں تو ان سے بھی یہی الٰہی فلاسفی متعلق ہے یعنی ان مخلصانہ اعمال میں بھی ابتداء ہی سے ایک روح مخفی ہوتی ہے جیسا کہ نطفہ میں مخفی تھی اور جیسے جیسے ان اعمال کا قالب تیار ہوتا جائے وہ روح چمکتی جاتی ہے اور جب وہ قالب پورا تیار ہوچکتا ہے تو یک دفعہ وہ روح اپنی کامل تجلی کے ساتھ چمک اٹھتی ہے اور اپنی روحی حیثیت سے اپنے وجود کو دکھا دیتی ہے اور زندگی کی صریح حرکت شروع ہوجاتی ہے جبھی کہ اعمال کا پورا قالب تیار ہوجاتا ہے۔معاً بجلی کی طرح ایک چیز اندر سے اپنی کھلی کھلی چمک دکھلانا شروع کر دیتی ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۲۱، ۳۲۲)

فَانْظُرْ اَنَّ الْاِنْسَانَ اِذَا قُلِّبَ فِيْ مَرَاتِبِ الْخِلْقَةِ۔ وَ اُخْرِجَ اِلٰى حَيِّزِ الْفِعْلِ مِنَ الْقُوَّةِ۔ وَاُعْطِيَ صُوَرًا فِي الْمَجَالِي الطَّبْعِيَّةِ وَقَفَّا بَعْضُهَا بَعْضًا بِالتَّمَايُزِ وَالتَّفْرِقَةِ۔ فَجُمِعَتْ هٰهُنَا مَدَارِجُ تَقْتَضِيْ لِاَنْفُسِهَا الْاَسْمَآءَ فَاَعْطَتْهَا الْعَرَبِيَّةُ وَاَكْمَلَتِ الْعَطَآءَ۔ كَالْاَسْخِيَآءِ الْمُتَمَوِّلِيْنَ۔

پس تو دیکھ کہ جب انسان پیدائش کے مراتب میں پھیرا گیا اور حیز فعل سے قوت کی طرف لایا گیا اور طبعی جلوہ گاہوں میں قسم قسم کی صورتیں دیا گیا اور بعض قسم پیدائش بعض کے پیچھے آئیں اور ان میں باہم تفرقہ اور تمیز ہوا پس اس جگہ کئی مدارج پیدا ہوئے جو اپنے لئے ناموں کو چاہتے تھے پس عربی نے ان کو ان کے نام عطا کئے اور اپنے عطیہ کو کامل کیا جیسے سخی اور مالدار لوگوں کا کام ہوتا ہے اور اس

وَتَفْصِيْلُهٗ اَنَّ اللّٰهَ اِذَا اَرَادَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ. فَبَدَءَ خَلْقَهٗ مِنْ سُلَالَةِ طِيْنٍ مُّطَهَّرٍ مِّنَ الْاَدْرَانِ فَلِذٰلِكَ سَمَّاهُ اٰدَمَ عِنْدَ الْخِطَابِ وَ فِي الْكِتَابِ لِمَا خَلَقَهٗ مِنَ التُّرَابِ وَ لِمَا جَمَعَ فِيْهِ فَضَآئِلَ الْعَالَمِيْنَ. وَ كَذٰلِكَ خَمَّرَ فِيْ طِيْنِهٖ اُنْسَانِ. اُنْسٌ مَا خُلِقَ مِنْهُ وَاُنْسُ الْخَالِقِ الرَّحْمَانِ كَمَا يُوْجَدُ اُنْسُ الْاُمِّ وَالْاَبِ فِي الصِّبْيَانِ. فَدَعَاهُ بِاسْمِ الْاِنْسَانِ. وَهٰذَا مَبْنِيٌّ عَلَى التَّثْنِيَّةِ مِنَ الْمَنَّانِ. لِيَدُلَّ لَفْظُ الْاُنْسَيْنِ عَلٰى كِلْتَى الصِّفَتَيْنِ اِلَى انْقِطَاعِ الزَّمَانِ وَيَكُوْنُ مِنَ الْمُتَذَكِّرِيْنَ. ثُمَّ بَدَّلَ قَانُوْنَ الْقُدْرَةِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذِی الْعِزَّةِ وَالْحِكْمَةِ وَخَلَقَ الْاِنْسَانَ بَعْدَ تَغَيُّرَاتٍ فِيْ اَرْحَامِ اُمَّهَاتٍ. فَسَمَّى التَّغَيُّرَ الْاُوْلٰى مَآءً دَافِقًا وَ نُطْفَةً. وَالثَّانِي الَّذِيْ يَزْدَادُ فِيْهِ اَثَرُ الْحَيَاتِ عَلَقَةً وَالثَّالِثُ الَّذِيْ زَادَ اِلٰى قَدْرِ الْمُضْغِ شِدَّةً وَضَاهَا فِيْ قَدْرِهٖ لُقْمَةً فَسَمّٰى لِهٰذَا مُضْغَةً وَالرَّابِعُ الَّذِيْ زَادَ مِنْ قَدْرِ اللُّقْمَةِ. وَ مَعَ ذٰلِكَ بَلَغَ اِلٰى مُنْتَهَى الصَّلَابَةِ وَ اَوْدَعَهَا اللّٰهُ حِكَمًا عَظِيْمَةً خِلْقَةً وَّنِظَامًا فَسَمَّاهَا عِظَامًا بِمَا بَلَغَتِ الْعَظْمَةَ وَ زَادَتْ شَرْفًا وَّ كَمًّا وَّمَقَامًا وَّ بِمَا رُكِّبَ بَعْضُهَا بِالْعِظَامِ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ. وَالْخَامِسُ اللَّحْمُ الَّذِيْ زَادَ عَلَيْهَا كَالْحُلَّةِ وَصَارَ

کی تفصیل یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنا چاہا تو اس کو اس مٹی سے پیدا کیا جو زمین کے تمام قویٰ کا عطر تھا اور میلوں سے پاک تھا اس کا نام خطاب اور کتاب میں آدم رکھا اس لئے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا اور سارے جہان کی خوبیاں اس میں بھر دیں اور نیز اس کی طینت میں دو اُنس رکھ دیئے ایک تو اُسی شے کا اُنس جس سے وہ مخلوق ہوا دوسرا خالق رحمان کا اُنس جیسے بچوں میں ماں باپ کا اُنس پایا جاتا ہے اس لئے اس کا نام انسان رکھا۔ یہ اسم تثنیہ ہے تاکہ ہمیشہ کے لئے ان دو اُنسوں کا لفظ ان دو صفتوں کو بتاتا رہے پھر خدا تعالیٰ کے ارادہ سے قانون قدرت میں یوں تبدیلی واقع ہوئی کہ کئی تغیرات کے بعد ماؤں کے رحموں کے معرفت اس کی آفرینش ہونے لگی سو پہلے تغیر کا نام ماء دافق اور نطفہ رکھا۔ اور دوسرے کا نام جس میں زندگی کا نشان ترقی کرتا ہے علقہ رکھا اور تیسرے کا نام جو درشتی میں ایک لقمہ کے اندازہ کی مانند ہوا مضغہ رکھا اور چوتھا تغیر جو صلابت اور قدر میں لقمہ سے ترقی کر گیا اور بڑی بڑی حکمتوں پر اس کا نظام خلقت مشتمل ہوا وہ عظام کے نام سے موسوم ہوا اس لئے وہ عظمت اور شرف اور قدر و مقام میں انتہا کو پہنچ گیا اور اس لئے بھی کہ ہڈیوں سے اس کے بعض حصے ترکیب پذیر ہوئے اور پانچویں کا نام لحم ہوا اس لئے کہ لحم عربی میں

سَبَبُ كَمَالِ الْحُسْنِ وَالزِّيْنَةِ فَسُمِّيَ لَحْمًا بِمَا لُوْحِمَ بِالْعِظَامِ الصُّلْبَةِ وَصَارَبِهَا كَذَوِي اللَّحْمَةِ وَالسَّادِسُ خَلْقٌ اٰخَرَ وَ سُمِّيَ نَفْسًا لِنَفَاسَتِهَا وَلَطَافَتِهَا وَ سَرَائِتِهَا فِي الْاَعْضَاءِ وَعِزَّتِهَا۔ وَسُمِّيَ جَمِيْعُهَا بِاسْمِ الْجَنِيْنِ۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

(منن الرحمن، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۲۴۴ تا ۲۴۶)

ایک چیز کے پیوند اور لحوق کو کہتے ہیں جب وہ چیز دوسرے سے ملتی اور پیوند کرتی ہے سو گوشت کپڑا کی طرح باقی جسم پر ملتا ہے اور نیز اس لئے بھی کہ گوشت سخت ہڈیوں سے ملتا ہے اور ان کو باہم ملاتا ہے اور خویشی قرابت ان میں بخشتا ہے اور چھٹے کو خلق آخر کہا اور اسے کمال نفاست اور اعضاء میں سرایت کرنے کے سبب سے نفس بھی کہا اور پھر اس سارے مجموعہ کا نام جنین ہوا۔ (ترجمہ اصل کتاب سے)

قرآن شریف کی سورۂ عصر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یہ زمانہ حضرت آدم علیہ السلام سے ہزار ششم پر واقع ہے یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے یہ چھٹا ہزار جاتا ہے اور ایسا ہی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ آدم سے لے کر اخیر تک دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے لہٰذا آخر ہزار ششم وہ آخری حصہ اس دنیا کا ہوا جس سے ہر ایک جسمانی اور روحانی تکمیل وابستہ ہے کیونکہ خدائی کارخانۂ قدرت میں چھٹے دن اور چھٹے ہزار کو الٰہی فعل کی تکمیل کے لئے قدیم سے مقرر فرمایا گیا ہے۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام چھٹے دن میں یعنی بروز جمعہ دن کے اخیر حصے میں پیدا ہوئے یعنی آپ کے وجود کا تمام وکمال پیرایہ چھٹے دن ظاہر ہوا گو خمیر آدم کا آہستہ آہستہ تیار ہو رہا تھا اور تمام جمادی، نباتی، حیوانی پیدائشوں کے ساتھ بھی شریک تھا لیکن کمال خلقت کا دن چھٹا دن تھا اور قرآن شریف بھی گو آہستہ آہستہ پہلے سے نازل ہو رہا تھا مگر اس کا کامل وجود بھی چھٹے دن ہی بروز جمعہ اپنے کمال کو پہنچا اور آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ نازل ہوئی اور انسانی نطفہ بھی اپنے تغیرات کے چھٹے مرتبہ ہی خلقتِ بشری سے پورا حصہ پاتا ہے جس کی طرف آیت ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ میں اشارہ ہے اور مراتب ستہ یہ ہیں ۱۔ نطفہ ۲۔ علقہ ۳۔ مضغہ ۴۔ عظام ۵ لحم محیط العظام ۶۔ خلق آخر۔ اس قانونِ قدرت سے جو روز ششم اور مرتبہ ششم کی نسبت معلوم ہو چکا ہے ماننا پڑتا ہے کہ دنیا کی عمر کا ہزار ششم بھی یعنی اس کا آخری حصہ بھی جس میں ہم ہیں کسی آدم کے پیدا ہونے کا وقت اور کسی دینی تکمیل کے ظہور کا زمانہ ہے۔

(تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۲۴۵ تا ۲۵۱)

وحی الٰہی عَفَتِ الدِّيَارُ مَحَلُّهَا وَ مَقَامُهَا یعنی یہ وہ کلام ہے جو آج سے تیرہ سو برس پہلے خدا تعالیٰ نے

لبید بن ربیعہ العامری کے دل میں ڈالا تھا جو اس کے اس قصیدہ کا اول مصرع ہے جو سبعہ معلقہ کا چوتھا قصیدہ ہے اور لبید نے زمانہ اسلام کا پایا تھا اور مشرف باسلام ہو گیا تھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں داخل تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے اس کے کلام کو یہ عزت دی کہ جو آخری زمانہ کی نسبت ایک عظیم الشان پیشگوئی تھی کہ ایسی ایسی تباہیاں ہوں گی جن سے ایک ملک تباہ ہوگا وہ اسی کے مصرع کے الفاظ میں بطور وحی فرمائی گئی جو اس کے منہ سے نکلی تھی۔ پس یہ تعجب سخت نادانی ہے کہ ایک کلام جو مسلمان کے منہ سے نکلا ہے وہ کیوں وحیِ الٰہی میں داخل ہوا کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں وہ کلام جو عبداللہ بن ابی سرح کے منہ سے نکلا تھا یعنی فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ وہی قرآن شریف میں نازل ہوا جس کی وجہ سے عبداللہ بن ابی سرح مرتد ہو کر مکہ کی طرف بھاگ گیا۔ پس جبکہ خدا تعالیٰ کے کلام کا ایک مرتد کے کلام سے توارد ہوا تو اس سے کیوں تعجب کرنا چاہیے کہ لبید جیسے صحابی بزرگوار کے کلام سے اس کلام کا توارد ہو جائے۔ خدا تعالیٰ جیسے ہر ایک چیز کا وارث ہے ہر ایک پاک کلام کا بھی وارث ہے ہر ایک پاک کلام اسی کی توفیق سے منہ سے نکلتا ہے۔ پس اگر ایسا کلام بطور وحی نازل ہو جائے تو اس بارے میں وہی شخص شک کرے گا جس کو اسلام میں شک ہو۔

(براہینِ احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۱۶۲)

خود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض ایسے فقرے وحی الٰہی کے نازل ہو چکے ہیں جو پہلے وہ کسی آدمی کے منہ سے نکلے تھے۔ جیسا کہ یہ فقرہ وحی فرقانی یعنی فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔ یہ فقرہ پہلے عبداللہ بن ابی سرح کی زبان سے نکلا تھا۔ اور وہی فقرہ وحی قرآنی میں نازل ہوا۔ دیکھو تفسیر کبیر الجزء السادس صفحہ ۲۷۶ مطبوعہ مصر۔ اصل عبارت یہ ہے رَوَى الْكَلْبِيُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا۔ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنِ سَعْدِ بْنِ اَبِيْ سَرَحٍ كَانَ يَكْتُبُ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا انْتَهٰى اِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى خَلْقًا اٰخَرَ عَجِبَ مِنْ ذَالِكَ فَقَالَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُكْتُبْ فَهٰكَذَا نَزَلَتْ، فَشَكَّ عَبْدُ اللّٰهِ وَقَالَ اِنْ كَانَ مُحَمَّدٌ صَادِقًا فِيْمَا يَقُوْلُ فَاِنَّهٗ يُوْحٰى اِلَيَّ كَمَا يُوْحٰى اِلَيْهِ وَاِنْ كَانَ كَاذِبًا فَلَا خَيْرَ فِيْ دِيْنِهٖ فَهَرَبَ اِلٰى مَكَّةَ فَقِيْلَ اِنَّهٗ مَاتَ عَلَى الْكُفْرِ وَقِيْلَ اِنَّهٗ اَسْلَمَ يَوْمَ الْفَتْحِ۔ ترجمہ یہ ہے کہ کلبی نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ ابن ابی سرح قرآن شریف کی آیات لکھا کرتا تھا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے روبرو جیسی آیت نازل ہوتی تھی اُس سے لکھواتے تھے۔ پس جب وہ آیت لکھوائی گئی جو خَلْقًا اٰخَرَ

تک ختم ہوتی ہے تو عبد اللہ اس آیت سے تعجب میں پڑ گیا۔ اور عبد اللہ نے کہا فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہی لکھ لے کیونکہ خدا نے بھی یہی فقرہ جو تیرے منہ سے نکلا ہے یعنی فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ نازل کر دیا ہے۔ پس عبد اللہ شک میں پڑ گیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو میری زبان کا کلمہ ہے وہی خدا کا کلمہ ہو گیا۔ اور اُس نے کہا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعوے میں صادق ہے تو مجھے بھی وہی وحی ہوتی ہے جو اُسے ہوتی ہے اور اگر کاذب ہے تو اس کے دین میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ پھر وہ مکّہ کی طرف بھاگ گیا۔ پس ایک روایت یہ ہے کہ وہ کفر پر مر گیا اور ایک یہ بھی روایت ہے کہ وہ فتح مکہ کے وقت مسلمان ہو گیا۔

اب دیکھو عبد اللہ ابن ابی سرح کے کلام سے خدا تعالیٰ کے کلام کا توارد ہوا یعنی عبد اللہ کے مُنہ سے بھی یہ فقرہ نکلا تھا فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ اور خدا تعالیٰ کی وحی میں بھی یہی آیا۔ اور اگر کہو کہ پھر خدا تعالیٰ کے کلام اور انسان کے کلام میں مابہ الامتیاز کیا ہوا؟ تو اوّل تو ہم اس کا یہی جواب دیتے ہیں کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے آپ قرآن شریف میں فرمایا ہے مابہ الامتیاز قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ کلام جو غیر کا کلام کہلاتا ہے قرآنی سورتوں میں سے کسی سورت کے برابر ہو۔ کیونکہ اعجاز کے لئے اسی قدر معتبر سمجھا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (البقرۃ : ۲۴) یہ نہیں فرمایا کہ فَاْتُوْا بِاٰيَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ یا فَاْتُوْا بِكَلِمَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۔ اور درحقیقت یہ سچ ہے کہ خدا کے کلمات علیحدہ علیحدہ تو وہی کلمات ہیں جو کفار کی زبان پر بھی جاری تھے۔ پھر رنگینی عبارت اور نظم کلام اور دیگر لوازم کے لحاظ سے وہی کلمات بحیثیت مجموعی ایک معجزہ کے رنگ میں ہو گئے اور جو معجزہ خدا تعالیٰ کے افعال میں پایا جاتا ہے اس کی بھی یہی شان ہے یعنی وہ بھی اپنی حیثیت مجموعی سے معجزہ بنتا ہے جیسا کہ کلام اپنی حیثیت مجموعی سے معجزہ بنتا ہے۔ ہاں خدا تعالیٰ کے منہ سے جو چھوٹے چھوٹے فقرے نکلتے ہیں وہ اپنے مطالب عالیہ کے لحاظ سے جو اُن کے اندر ہوتے ہیں انسانی فقرات سے امتیاز کلّی رکھتے ہیں۔ یہ امر دیگر ہے کہ انسان ان کے پوشیدہ حقائق معارف تک نہ پہنچے مگر ضرور ان کے اندر انوارِ مخفیہ ہوتے ہیں جو ان کلمات کی رُوح ہوتے ہیں۔ جیسا کہ یہی کلمہ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ اپنی گذشتہ آیات کے ساتھ تعلق کی وجہ سے ایک امتیازی رنگ اپنے اندر رکھتا ہے۔ یعنی اس قسم کی روحانی فلاسفی اس کے اندر بھری ہوئی ہے کہ وہ بجائے خود ایک معجزہ ہے جس کی نظیر انسانی کلام میں نہیں ملتی۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۱۸۳ تا ۱۸۵)

قرآن شریف رُوحوں کو ازلی ابدی نہیں ٹھہراتا ہے اُن کو مخلوق بھی مانتا ہے اور فانی بھی۔ جیسا کہ وہ روحوں کے مخلوق ہونے کے بارے میں صاف طور پر فرماتا ہے کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ یعنی جب قالب تیار ہو جاتا ہے تو اس کی تیاری کے بعد اُسی قالب میں سے ہم ایک نئی پیدائش کر دیتے ہیں یعنی روح۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۶۴)

ثابت شدہ واقعات یقینی اور قطعی طور پر شہادت دے رہے ہیں کہ خود نطفہ مرد اور عورت کا بغیر اِس کے کہ اُس پر شبنم کی طرح آسمان کی فضا سے رُوح گرے رُوح پیدا ہونے کی اپنے اندر استعداد رکھتا ہے۔ پھر جب مرد اور عورت کا نطفہ باہم مل جاتا ہے تو وہ استعداد بہت قوی ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ وہ استعداد بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ جب بچہ کا پورا قالب طیار ہو جاتا ہے تو خدا تعالیٰ کی قدرت اور امر سے اُسی قالب میں سے رُوح پیدا ہو جاتی ہے یہ وہ واقعات ہیں جو مشہود اور محسوس ہیں۔ اسی کو ہم کہتے ہیں کہ نیستی سے ہستی ہوئی کیونکہ ہم روح کو جسم اور جسمانی نہیں کہہ سکتے اور یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ رُوح اُسی مادہ میں سے پیدا ہوتی ہے جو بعد اجتماع دونوں نطفوں کے رحم مادر میں آہستہ آہستہ قالب کی صورت پیدا کرتا ہے اور اس مادہ کے لئے ضروری نہیں کہ ساگ پات کی کسی قسم پر رُوح شبنم کی طرح گرے اور اس سے رُوح کا نطفہ پیدا ہو بلکہ وہ مادہ گوشت سے بھی پیدا ہو سکتا ہے خواہ وہ گوشت بکرہ کا ہو یا مچھلی کا یا ایسی مٹی ہو جو زمین کی نہایت عمیق تہ کے نیچے ہوتی ہے جس سے مینڈکیں وغیرہ کیڑے مکوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں بلاشبہ یہ خدا کی قدرت کا ایک راز ہے کہ وہ جسم میں سے ایک ایسی چیز پیدا کرتا ہے کہ وہ نہ جسم ہے اور نہ جسمانی۔ پس واقعات موجودہ مشہودہ محسوسہ ظاہر کر رہے ہیں کہ آسمان سے رُوح نہیں گرتی بلکہ یہ ایک نئی رُوح ہوتی ہے جو ایک مرکب نطفہ میں سے بقدرت قادر پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ یعنی جب رحم میں قالب انسانی تیار ہو جاتا ہے تو پھر ہم ایک نئی پیدائش سے اُس کو مکمل کرتے ہیں یعنی ہم اس مادّہ کے اندر سے جس سے قالب تیار ہوا ہے رُوح پیدا کر دیتے ہیں۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۲۳، ۱۲۴)

(روح کے ذکر پر فرمایا)

جس شے نے پیدا ہونا ہوتا ہے تو روح کی استعداد اس شے میں ساتھ ساتھ چلی آتی ہے۔ جیسے جیسے وہ طیار ہوتی جاتی ہے اور جب وہ عین لائق ہوتا ہے تو خدا اس پر فیضان کرتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے ثُمَّ

اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۔ میں نے ایک انڈے کو ایک دفعہ پیالی میں ڈالا۔ دیکھا تو اس کی زردی اور سفیدی پانی کی طرح ہوئی ہوئی تھی اور اس کے درمیان میں ایک نقطہ خون کا خشخاس کے دانہ کی طرح تھا اور اس کی کئی تاریں کوئی کسی طرف کو اور کوئی کسی طرف کو نکلی ہوئی تھیں اور سوائے اس نقطہ کے اور کوئی حرکت اس میں نہ تھی تو میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ خلق اشیاء کا سلسلہ ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ اوّل سر بنایا پھر ہاتھ پھر پاؤں وغیرہ بلکہ اس کی کارروائی یکساں ہوتی ہے اور سب کچھ پہلے ہی سے ہوتا ہے صرف نشوونما پاتا جاتا ہے۔ میں نے بعض دائیوں کو کہا ہوا تھا کہ جو بچے اسقاط ہوا کریں تو دکھایا کرو تو میں نے بعض بچے دیکھے ان کے بھی سب اعضاء وغیرہ بنے بنائے تھے۔ خدا کا یہ خلق معمار کی طرح نہیں ہوتا کہ اول دیواریں بنائیں پھر چوبارہ بنایا پھر اوپر کچھ اور بنایا بلکہ چار ماہ کے بعد جب روح کی تکمیل ہوتی ہے تو اس وقت اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ اس پر صادق آتا ہے تو بچہ حرکت کرنے لگتا ہے۔

جیسے دنیا کے سات دن ہیں۔ یہ اشارہ اسی طرف ہے کہ دنیا کی عمر بھی سات ہزار برس ہے اور یہ کہ خدا نے دنیا کو چھ دن میں بنا کر ساتویں دن آرام کیا۔ اس سے یہ بھی نکلتا ہے کہ ہر ایک شے چھ مراتب ہی طے کر کے مرتبہ تکمیل کا حاصل کرتی ہے۔ نطفہ میں بھی اسی طرح چھ مراتب ہیں کہ انسان اول سلسلہ میں طِیْن ہوتا۔ پھر نُطْفَه ۔ پھر عَلَقَه۔ پھر مُضْغَه ۔ پھر عِظَامًا ۔ پھر لَحْم۔ پھر سب کے بعد اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے کچھ نہیں آتا بلکہ اندر ہی سے ہر ایک شے نشوونما ہوتی رہتی ہے۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۱۱ مورخہ ۹ ؍جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۴، ۸۵)

روح ایک مخلوق چیز ہے۔ اسی عنصری مادے سے خدا تعالیٰ اسے بھی پیدا کرتا ہے ... روحِ انسانی باریک اور مخفی طور سے نطفہء انسانی میں ہی موجود ہوتی ہے اور وہ بھی نطفہ کے ساتھ ساتھ ہی آہستگی سے نشوونما کرتی اور ترقی پاتی پاتی چوتھے مہینے کے انجام اور پانچویں مہینے کی ابتداء میں ایک بین تغیر اور نشوونما پا کر ظہور پذیر ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ اپنی کلامِ پاک میں فرماتا ہے کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۵ مورخہ ۳۰ ؍مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵، ۶)

وہ اندرونی نور جو روح القدس سے تعبیر کیا گیا ہے وہ عبودیتِ خالصہ تامہ اور ربوبیتِ کاملہ مستجمعہ کے پورے جوڑ و اتصال سے بطرز ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ کے پیدا ہوتا ہے اور یہ ربوبیتِ ثانیہ ہے جس سے متقی تولد ثانی پاتا ہے اور ملکوتی مقام پر پہنچتا ہے اور اس کے بعد ربوبیت ثالثہ کا درجہ ہے جو خلق جدید سے موسوم

ہے جس سے متقی لاہوتی مقام پر پہنچتا ہے اور تولد ثالث پاتا ہے۔ (مجموعہ اشتہارات جلد اول صفحہ ۱۶۳ حاشیہ)

اللہ تعالیٰ نے جس قدر قویٰ عطا فرمائے وہ ضائع کرنے کے لئے نہیں دیئے گئے۔ ان کی تعدیل اور جائز استعمال کرنا ہی ان کی نشوونما ہے اس واسطے اسلام نے قویٰ رجولیت یا آنکھ نکالنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ ان کا جائز استعمال اور تزکیہ نفس کرایا جیسے فرمایا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ، ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۸، ۴۹)

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۶﴾

یعنی اول رفتہ رفتہ خدائے تعالیٰ تم کو کمال تک پہنچاتا ہے اور پھر تم اپنا کمال پورا کرنے کے بعد زوال کی طرف میل کرتے ہو یہاں تک کہ مر جاتے ہو یعنی تمہارے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے یہی قانونِ قدرت ہے۔ کوئی بشر اس سے باہر نہیں۔ اے خداوند قدیر اپنے اس قانونِ قدرت کے سمجھنے کے لئے ان لوگوں کو بھی آنکھ بخش جو مسیح ابن مریم کو اس سے باہر سمجھتے ہیں۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۳۰)

مَوْت کا لفظ قرآن کریم میں ذوالوجوہ ہے۔ کافر کا نام بھی مردہ رکھا ہے اور ہوا و ہوس سے مرنا بھی ایک قسم کی موت ہے اور قریب الموت کا نام بھی میت ہے اور یہی تینوں وجوہ استعمال حیات میں بھی پائی جاتی یعنی حیات بھی تین قسم کی ہیں۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۴۵)

ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۷﴾

یعنی تم مرنے کے بعد قیامت کے دن اُٹھائے جاؤ گے۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۴۵)

وہ آیات جن میں لکھا ہے کہ فوت شدہ لوگ پھر دنیا میں نہیں آتے ازاں جملہ یہ آیت ہے... ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ... کوئی انسان راحت یا رنج عالمِ معاد کے چکھ کر پھر دنیا میں ہرگز نہیں آتا۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۶۱۹، ۶۲۰ حاشیہ در حاشیہ)

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۹﴾

یہ وہ زمانہ ہے جو اس عاجز پر کشفی طور پر ظاہر ہوا جو کمال طغیان اس کا اس سنِ ہجری میں شروع ہوگا جو

آیت اِنَّا عَلٰی ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ میں بحساب جمل مخفی ہے یعنی ۱۲۷۴۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۵۵)

مسیح موعود کے ظہور کی خصوصیت کے ساتھ یہ علامت ہے کہ دجال معہود کے خروج کے بعد نازل ہو کیونکہ یہ ایک واقعہ مسلمہ ہے کہ دجال معہود کے خروج کے بعد آنے والا وہی سچا مسیح ہے جو مسیح موعود کے نام سے موسوم ہے جس کا مسلم کی حدیث میں وجہ تسمیہ مسیح ہونے کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ مومنوں کی شدت اور محنت اور ابتلاء کا غبار جو دجال کی وجہ سے ان کے طاری حال ہوگا ان کے چہروں سے پونچھ دے گا یعنی دلیل اور حجت سے ان کو غالب کر دکھائے گا سو اس لئے وہ مسیح کہلائے گا کیونکہ مسح پونچھنے کو کہتے ہیں جس سے مسیح مشتق ہے اور ضرور ہے کہ وہ دجال معہود کے بعد نازل ہو۔ سو یہ عاجز دجال معہود کے خروج کے بعد آیا ہے۔ پس اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ دجال معہود یہی پادریوں اور عیسائی متکلموں کا گروہ ہے جس نے زمین کو اپنے ساحرانہ کاموں سے تہ و بالا کر دیا ہے اور جو ٹھیک ٹھیک اس وقت سے زور کے ساتھ خروج کر رہا ہے اور جو اعداد آیت اِنَّا عَلٰی ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ سے سمجھا جاتا ہے یعنی ۱۸۵۷ کا زمانہ تو ساتھ ہی اس عاجز کا مسیح موعود ہونا بھی ثابت ہو جائے گا۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۸۸، ۴۸۹)

آیت اِنَّا عَلٰی ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ میں ۱۸۵۷ء کی طرف اشارہ ہے جس میں ہندوستان میں ایک مفسدہ عظیم ہو کر آثار باقیہ اسلامی سلطنت کے ملک ہند سے ناپدید ہو گئے تھے کیونکہ اس آیت کے اعداد بحساب جمل ۱۲۷۴ ہیں اور ۱۲۷۴ کے زمانہ کو جب عیسوی تاریخ میں دیکھنا چاہیں تو ۱۸۵۷ء ہوتا ہے۔ سو درحقیقت ضعف اسلام کا زمانہ ابتدائی یہی ۱۸۵۷ء ہے جس کی نسبت خدائے تعالیٰ آیت موصوفہ بالا میں فرماتا ہے کہ جب وہ زمانہ آئے گا تو قرآن زمین پر سے اٹھایا جائے گا۔ سو ایسا ہی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی حالت ہو گئی تھی..... پس اس حکیم و علیم کا قرآن کریم میں یہ بیان فرمانا کہ ۱۸۵۷ء میں میرا کلام آسمان پر اُٹھایا جائے گا یہی معنے رکھتا ہے کہ مسلمان اس پر عمل نہیں کریں گے جیسا کہ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا۔ ..... کتابِ الٰہی کی غلط تفسیروں نے انہیں بہت خراب کیا ہے اور ان کے دلی اور دماغی قویٰ پر بہت بُرا اثر ان سے پڑا ہے۔ اس زمانہ میں بلاشبہ کتاب الٰہی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ایک نئی اور صحیح تفسیر کی جائے کیونکہ حال میں جن تفسیروں کی تعلیم دی جاتی ہے وہ نہ اخلاقی حالت کو درست کر سکتی ہیں اور نہ ایمانی حالت پر نیک اثر ڈالتی ہیں بلکہ فطرتی سعادت اور نیک روشنی کی مزاحم ہو رہی ہیں۔ کیوں مزاحم ہو رہی ہیں؟ اس کی

وجہ یہ ہے کہ وہ دراصل اپنے اکثر زوائد کی وجہ سے قرآن کریم کی تعلیم نہیں ہے قرآنی تعلیم ایسے لوگوں کے دلوں سے مٹ گئی ہے کہ گویا قرآن آسمان پر اٹھایا گیا ہے۔ وہ ایمان جو قرآن نے سکھلایا تھا اس سے لوگ بے خبر ہیں وہ عرفان جو قرآن نے بخشا تھا اس سے لوگ غافل ہو گئے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ قرآن پڑھتے ہیں مگر قرآن اُن کے حلق کے نیچے نہیں اُترتا۔ انہیں معنوں سے کہا گیا ہے کہ آخری زمانہ میں قرآن آسمان پر اُٹھایا جائے گا۔ پھر انہیں حدیثوں میں لکھا ہے کہ پھر دوبارہ قرآن کو زمین پر لانے والا ایک مرد فارسی الاصل ہوگا جیسا کہ فرمایا ہے لو کان الایمان معلقًا عند الثریا لنالہ رجل من فارس۔ یہ حدیث درحقیقت اسی زمانہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جو آیت اِنَّا عَلٰی ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ میں اشارۃً بیان کیا گیا ہے۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۸۹ تا ۴۹۳ حاشیہ)

مسیح ابن مریم کی آخری زمانہ میں آنے کی قرآن شریف میں پیشگوئی موجود ہے۔ قرآن شریف نے جو مسیح کے نکلنے کی چودہ سو[۱۴۰۰] برس تک مدّت ٹھہرائی ہے بہت سے اولیاء بھی اپنے مکاشفات کی رُو سے اس مدت کو مانتے ہیں اور آیت وَ اِنَّا عَلٰی ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ جس کے بحساب جمل ۱۲۷۴ عدد ہیں۔ اسلامی چاند کی سلخ کی راتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں نئے چاند کے نکلنے کی اشارت چھپی ہوئی ہے جو غلام احمد قادیانی کے عددوں میں بحساب جمل پائی جاتی ہے (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۶۴)

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚۖ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝۲۵

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ.... ہم نے اپنے بزرگوں میں یعنی اولیاءِ سَلف میں یہ نہیں سنا۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۶۹، ۶۷۰ حاشیہ در حاشیہ)

فَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ

مِنْهُمْ ۚ وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۸﴾

اِصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم سے کشتی بنا۔

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ ٹائٹل پیج)

اسی طرح براہینِ احمدیہ کے حصص سابقہ میں خدا تعالیٰ نے میرا نام نوح بھی رکھا ہے اور میری نسبت فرمایا ہے وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ یعنی میری آنکھوں کے سامنے کشتی بنا اور ظالموں کی شفاعت کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کر کہ میں ان کو غرق کروں گا۔ خدا نے نوحؑ کے زمانہ میں ظالموں کو قریباً ایک ہزار سال تک مہلت دی تھی اور اب بھی خیر القرون کی تین صدیوں کو علیحدہ رکھ کر ہزار برس ہی ہوجاتا ہے۔ اس حساب سے اب یہ زمانہ اس وقت پر آ پہنچتا ہے جبکہ نوحؑ کی قوم عذاب سے ہلاک کی گئی تھی اور خدا تعالیٰ نے مجھے فرمایا اِصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ یعنی میری آنکھوں کے روبرو اور میرے حکم سے کشتی بنا وہ لوگ جو تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ نہ تجھ سے بلکہ خدا سے بیعت کرتے ہیں یہ خدا کا ہاتھ ہے جو ان کے ہاتھوں پر ہے۔

(براہینِ احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۱۱۳)

اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۸﴾

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب کا کیا حال تھا۔ کوئی بدی ایسی نہ تھی جو ان میں نہ پائی جاتی ہو جیسے کوئی ہر صیغہ اور امتحان کو پاس کر کے کامل استاد ہر فن کا ہوجاتا ہے اسی طرح پر وہ بدیوں اور بدکاریوں میں ماہر اور پورے تھے۔ شرابی، زانی، یتیموں کا مال کھانے والے، قمار باز غرض ہر برائی میں سب سے بڑھے ہوئے تھے بلکہ اپنی بدکاریوں پر فخر کرنے والے تھے۔ ان کا قول تھا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا۔ ہماری زندگی اسی قدر ہے کہ یہاں ہی مرتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں۔ حشر نشر کوئی چیز نہیں۔ قیامت کچھ نہیں۔ جنت کیا اور جہنم کیا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ / مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

اصل میں بہت سے عرب دہریہ تھے جیسا کہ قرآن شریف کی آیت ذیل سے معلوم ہوتا ہے

اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۸ / جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا تَتۡرَا ؕ کُلَّمَا جَآءَ اُمَّۃً رَّسُوۡلُهَا کَذَّبُوۡهُ فَاَتۡبَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ بَعۡضًا وَّ جَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِیۡثَ ۚ فَبُعۡدًا لِّقَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۵﴾

پھر پیچھے سے ہم نے اپنے رسول پے درپے بھیجے۔ پس ان تمام آیات (زیرتفسیر اور بعض اور آیات جن کا اس سے پہلے ذکر کیا گیا ہے) سے ظاہر ہے کہ عادت اللہ یہی ہے کہ وہ اپنی کتاب بھیج کر پھر اس کی تائید اور تصدیق کے لئے ضرور انبیاء بھیجا کرتا ہے چنانچہ توریت کی تائید کے لئے ایک ایک وقت میں چار چار سو نبی بھی آیا جن کے آنے پر اب تک بائبل شہادت دے رہی ہے۔

(شہادت القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۴۱)

وَ جَعَلۡنَا ابۡنَ مَرۡیَمَ وَ اُمَّہٗۤ اٰیَۃً وَّ اٰوَیۡنٰهُمَاۤ اِلٰی رَبۡوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیۡنٍ ﴿۵۱﴾

ہم نے عیسیٰ اور اس کی والدہ کو ایک ایسے ٹیلہ پر جگہ دی جو آرام کی جگہ تھی اور پانی صاف یعنی چشموں کا پانی وہاں تھا۔ سو اس میں خدا تعالیٰ نے کشمیر کا نقشہ کھینچ دیا ہے اور اٰوٰی کا لفظ لغت عرب میں کسی مصیبت یا تکلیف سے پناہ دینے کے لئے آتا ہے اور صلیب سے پہلے عیسیٰ اور اس کی والدہ پر کوئی زمانہ مصیبت کا نہیں گزرا جس سے پناہ دی جاتی۔ پس متعین ہوا کہ خدا تعالیٰ نے عیسیٰ اور اس کی والدہ کو واقعہ صلیب کے بعد اس ٹیلے پر پہنچایا تھا۔ (کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۱۷ حاشیہ)

وَّ اٰوَیۡنٰهُمَاۤ اِلٰی رَبۡوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیۡنٍ میں اللہ تعالیٰ یہ بات ہمیں سمجھاتا ہے کہ صلیب کے واقعہ کے بعد ہم نے عیسیٰ مسیح کو صلیبی بلا سے رہائی دے کر اس کو اور اس کی ماں کو ایک ایسے اونچے ٹیلے پر جگہ دی تھی کہ وہ آرام کی جگہ تھی اور اس میں چشمے جاری تھے یعنی سری نگر کشمیر۔ (کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۷۵ حاشیہ)

وَمِنَ الْمَعْلُوْمِ أَنَّ بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ فِيْ عَهْدِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانُوْا مُتَفَرِّقِيْنَ مُنْتَشِرِيْنَ فِيْ بِلَادِ الْهِنْدِ وَفَارِسَ وَ كَشْمِيْرَ. فَكَانَ فَرْضُهٗ أَنْ يُّدْرِكَهُمْ وَيُلَاقِيَهُمْ وَيَهْدِيَهُمْ إِلٰى صِرَاطِ الرَّبِّ الْقَدِيْرِ.

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ہندوستان، فارس اور کشمیر کے ممالک میں پھیلے ہوئے تھے، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرض تھا کہ وہ ان کے پاس پہنچیں اور ان سے ملیں اور انہیں رب قدیر کی راہ دکھائیں۔ اور فرض کا

وَتَرْكُ الْفَرْضِ مَعْصِيَّةٌ. وَالْإِعْرَاضُ عَنْ قَوْمٍ مُّنْتَظِرِيْنَ ضَالِّيْنَ جَرِيْمَةٌ كَبِيْرَةٌ. تَعَالٰى شَأْنُ الْأَنْبِيَآءِ الْمَعْصُوْمِيْنَ مِنْ هٰذِهِ الْجَرَآئِمِ. الَّتِيْ هِيَ أَشْنَعُ الذَّمَآئِمِ.....

لَا شَكَّ وَلَا شُبْهَةَ وَلَا رَيْبَ أَنَّ عِيْسٰى لَمَّا مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ بِتَخْلِيْصِهٖ مِنْ بَلِيَّةِ الصَّلِيْبِ. هَاجَرَ مَعَ أُمِّهٖ وَبَعْضِ صَحَابَتِهٖ إِلٰى كَشْمِيْرَ وَرَبْوَتِهِ الَّتِيْ كَانَتْ ذَاتَ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ وَّمَجْمَعَ الْأَعَاجِيْبِ. وَإِلَيْهِ أَشَارَ رَبُّنَا نَاصِرُ النَّبِيِّيْنَ. وَمُعِيْنُ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ. فِيْ قَوْلِهٖ وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّ اٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ. وَّلَا شَكَّ أَنَّ الْإِيْوَآءَ لَا يَكُوْنُ اِلَّا بَعْدَ مُصِيْبَةٍ. وَّتَعَبٍ وَّ كُرْبَةٍ. وَّلَا يُسْتَعْمَلُ هٰذَا اللَّفْظُ اِلَّا بِهٰذَا الْمَعْنٰى. وَهٰذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ غَيْرِ شَكٍّ وَّشُبْهَةٍ. وَلَا يَتَحَقَّقُ هٰذِهِ الْحَالَةُ الْمُقَلْقِلَةُ فِيْ سَوَانِحِ الْمَسِيْحِ اِلَّا عِنْدَ وَاقِعَةِ الصَّلِيْبِ. وَلَيْسَتْ رَبْوَةٌ فِي الْاِرْتِفَاعِ فِيْ جَمِيْعِ الدُّنْيَا مِنَ الْبَعِيْدِ وَالْقَرِيْبِ. كَمِثْلِ ارْتِفَاعِ جِبَالِ كَشْمِيْرَ وَ كَمِثْلِ مَا يَتَعَلَّقُ بِشُعُبِهَا عِنْدَ الْعَلِيْمِ الْأَرِيْبِ. وَلَا يَسَعُ لَكَ تَخْطِئَةُ هٰذَا الْكَلَامِ مِنْ غَيْرِ التَّصْوِيْبِ. وَأَمَّا لَفْظُ "الْقَرَارِ" فِي الْاٰيَةِ فَيَدُلُّ عَلَى

ترک کرنا اور ایسے گمراہ لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا جو کسی ہادی کے منتظر ہوں بہت بڑا گناہ ہے، ایسے سنگین جرائم سے انبیاء معصومین کی شان بالاتر ہوتی ہے.....

اس میں کچھ شک وشبہ نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب کی مصیبت سے نجات بخشی تو آپ نے اپنی والدہ نیز اپنے چند ساتھیوں سمیت کشمیر کے بلند وبالا علاقہ کی طرف ہجرت کی جو چشموں سے شاداب اور مجمع عجائبات تھا اور ہمارے رب نے جو انبیاء کا مددگار اور کمزوروں کا دستگیر ہے اس کی طرف اپنے قول میں وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّ اٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ میں اشارہ فرمایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایواء کا لفظ مصیبت اور پریشان کن حالت سے نجات کے بعد ہی بولا جاتا ہے۔ اور یہ لفظ عربی زبان میں ہمیشہ انہیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور پریشان اور بے چین کرنے والی حالت حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی میں صرف صلیب کے واقعہ کے وقت ہی پیش آئی تھی اور ہر ذی علم جانتا ہے کہ تمام دنیا میں کشمیر کے بلند وبالا اور سرسبز وشاداب پہاڑوں جیسا اور کوئی پہاڑ نہیں۔ اور اہل تحقیق کے لئے اس کلام کی تصدیق کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

آیت مذکورہ میں قرار کا لفظ مسیح علیہ السلام کے

الْاِسْتِقْرَارِ فِيْ تِلْكَ الْخِطَّةِ بِالْأَمْنِ وَالْعَافِيَةِ۔ مِنْ غَيْرِ مُزَاحَمَةِ الْكَفَرَةِ الْفَجَرَةِ۔ وَلَا شَكَّ أَنَّ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ مَا كَانَ لَهٗ قَرَارٌ فِيْ أَرْضِ الشَّامِ۔ وَكَانَ يُخْرِجُهٗ مِنْ أَرْضٍ إِلٰى أَرْضٍ الْيَهُوْدُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنَ الْأَشْقِيَآءِ وَاللِّئَامِ۔ فَمَا رَاٰى قَرَارًا اِلَّا فِيْ خِطَّةِ كَشْمِيْرَ۔ وَإِلَيْهِ أَشَارَ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ رَبُّنَا الْخَبِيْرُ۔ وَأَمَّا الْمَاءُ الْمُعِيْنُ فَهِيَ إِشَارَةٌ إِلٰى عُيُوْنٍ صَافِيَةٍ وَيَنَابِيْعَ مُنْفَجِرَةٍ تُوْجَدُ فِيْ هٰذِهِ الْخِطَّةِ۔ وَلِذَالِكَ شَبَّهَ النَّاسُ تِلْكَ الْأَرْضِ بِالْجَنَّةِ۔

(الھدیٰ و التبصرۃ لمن یرٰی ، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۳۶۶ تا ۳۶۹)

خطہ کشمیر میں امن و عافیت کے ساتھ بغیر کسی مخالف کی مزاحمت کے اندیشے کے رہائش اختیار کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ملکِ شام میں کوئی آرام کی جگہ نہ تھی اور بد بخت کمینے یہودی آپ کو ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف نکلنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ پس خطہ کشمیر کے سوا انہیں کہیں امن و عافیت کی جگہ نہ ملی اور اسی کی طرف ہمارے رب خبیر نے مذکورہ آیت میں اشارہ فرمایا ہے۔ ماءمعین کے الفاظ سے ان صاف و شفاف اور بہنے والے چشموں کی طرف اشارہ ہے جو اس علاقے میں پائے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے لوگوں نے کشمیر کو جنت نظیر قرار دیا ہے۔ (ترجمہ از مرتب)

اِعْلَمْ اَنَّ لَفْظَ الْاِيْوَآءِ بِاَحَدٍ مِّنْ مُشْتَقَاتِهٖ قَدْجَآءَ فِيْ كَثِيْرٍمِّنْ مَّوَاضِعِ الْقُرْاٰنِ۔ وَكُلُّهَا ذَكَرَ فِيْ مَحَلِّ الْعَصْمِ مِنَ الْبَلَآءِ بِطَرِيْقِ الْاِمْتِنَانِ۔ كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى۔ [1] وَمَا اَرَادَ مِنْهُ اِلَّا الْاِرَاحَةَ بَعْدَ الْاَذٰى۔ وَقَالَ فِيْ مَقَامٍ اٰخَرَ۔ اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ۔ [2] فَانْظُرُوْا كَيْفَ صَرَّحَ حَقِيْقَةَ الْاِيْوَآءِ وَ بِهَا دَاوَاكُمْ۔ وَقَالَ حِكَايَةً عَنِ

جاننا چاہیے کہ لفظ ایواء اپنے اشتقاق کے لحاظ سے قرآن کریم میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور سب جگہ بطریق احسان بلاء سے نجات دینے کے معنے میں آیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۔ اس آیت میں اٰوٰی کے لفظ میں تکلیف کے بعد آرام پہنچانے کے معنے ہی مراد ہیں۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ ۔ دیکھو۔ اس آیت میں کس طرح ایواء کے لفظ کی حقیقت کھول کر بتا دی گئی ہے اور تمہارے شک

[1] الضحیٰ ۷ [2] الانفال ۲۷

ابْنِ نُوْحٍ سَاٰوِیْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ۔[1] فَمَا كَانَ قَصْدُهٗ جَبَلًا رَفِيْعًا اِلَّا بَعْدَ رُؤْيَةِ الْبَلَآءِ۔ فَبَيِّنُوْا لَنَا اَیُّ بَلَآءٍ نَزَلَ عَلَى ابْنِ مَرْيَمَ وَمَعَهٗ عَلٰى اُمِّهٖ اَشَدُّ مِنْ بَلَآءِ الصَّلِيْبِ۔ ثُمَّ اَیُّ مَكَانٍ اٰوَاهُمَا اللّٰهُ اِلَيْهِ مِنْ دُوْنِ رَبْوَةِ كَشْمِيْرَ بَعْدَ ذَالِكَ الْيَوْمِ الْعَصِيْبِ۔

کا علاج کر دیا گیا ہے۔ پھر نوح علیہ السلام کے بیٹے کے قول کا ذکر کیا گیا ہے کہ اس نے کہا سَاٰوِیْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ۔ اور اس کا بلند و بالا پہاڑ کی طرف جانے کا ارادہ مصیبت کو دیکھ لینے کے بعد ہی ہوا تھا۔ اب خود ہی بتائیں کہ مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ پر صلیب کے ابتلاء سے بڑھ کر اور کون سی بڑی مصیبت نازل ہوئی تھی اور کشمیر کے ٹیلے کے سوا اور کون سی جگہ ہے جس میں اس کٹھن وقت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو پناہ دی۔ (ترجمہ از مرتب)

(الهدیٰ و التبصرة لمن یریٰ، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۳۶۸ حاشیہ)

خدا تو کہتا ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد عیسیٰ اور اُس کی ماں کو ہم نے ایک ٹیلہ پر جگہ دی جس میں صاف پانی بہتا تھا یعنی چشمے جاری تھے بہت آرام کی جگہ تھی اور جنت نظیر تھی جیسا کہ فرماتا ہے وَ اٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ یعنی ہم نے واقعہ صلیب کے بعد جو ایک بڑی مصیبت تھی عیسیٰ اور اُس کی ماں کو ایک بڑے ٹیلہ پر جگہ دی جو بڑے آرام کی جگہ اور پانی خوشگوار تھا یعنی خطۂ کشمیر۔ اب اگر آپ لوگوں کو عربی سے کچھ بھی مس ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اٰوی کا لفظ اُسی موقعہ پر آتا ہے کہ جب کسی مصیبت پیش آمدہ سے بچا کر پناہ دی جاتی ہے یہی محاورہ تمام قرآن شریف میں اور تمام اقوال عرب میں اور احادیث میں موجود ہے اور خدا تعالیٰ کے کلام سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی تمام عمر میں صرف صلیب کی ہی مصیبت پیش آئی تھی۔ اور حدیث سے ثابت ہے کہ مریم کو تمام عمر میں اسی واقعہ سے سخت غم پہنچا تھا۔ پس یہ آیت بلند آواز سے پکار رہی ہے کہ اس واقعہ صلیب کے بعد خدا تعالیٰ نے اس آفت سے حضرت عیسیٰ کو نجات دے کر اس موذی ملک سے کسی دوسرے ملک میں پہنچا دیا تھا جہاں پانی صاف کے چشمے بہتے تھے اور اونچا ٹیلہ تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا آسمان پر بھی کوئی چشمہ دار ٹیلہ ہے جس پر خدا تعالیٰ نے واقعہ صلیب کے بعد حضرت مسیح کو جا بٹھایا اور ماں کو بھی۔ اور حضرت مسیح کے سوانح میں غور کر کے کوئی نظیر تو پیش کرو کہ کسی مصیبت کے بعد اُنہیں ایسے ملک میں جگہ دی گئی ہو جو آرام گاہ اور جنت نظیر ہو اور بڑا ٹیلہ ہو تمام دنیا سے بلند۔ اور چشمے جاری ہوں۔ پس آپ کے خیال کے رُو سے خدا تعالیٰ نعوذ باللہ صریح جھوٹا ٹھہرتا ہے کہ وہ تو صلیب کے بعد

[1] ھود ۴۴

ٹیلہ کا ذکر کرتا ہے جس میں عیسیٰ اور اُس کی ماں کو جگہ دی گئی اور آپ لوگ خواہ مخواہ اُس کو آسمان پر بٹھاتے ہیں اور محض بیکار۔ بھلا بتلاؤ تو سہی کہ نبی ہو کر اتنی مُدت کیوں بیکار بیٹھ رہا ہے۔

(اعجازِ احمدی، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۱۲۷، ۱۲۸)

اٰوَیْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیْنٍ یعنی اس مصیبت کے بعد جو صلیب کی مصیبت تھی ہم نے مسیح اور اس کی ماں کو ایسے ملک میں پہنچا دیا جس کی زمین بہت اونچی تھی اور صاف پانی تھا اور بڑے آرام کی جگہ تھی۔ اور احادیث میں آیا ہے کہ اس واقعہ کے بعد عیسیٰؑ ابن مریم نے ایک سو بیس برس عمر پائی اور پھر فوت ہو کر اپنے خدا کو جاملا اور دوسرے عالم میں پہنچ کر یحییٰؑ کا ہم نشین ہوا کیونکہ اس کے واقعہ اور یحییٰ نبی کے واقعہ کو باہم مشابہت تھی۔ (تذکرۃ الشہادتین، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۲۹)

اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کشمیر کی طرف سفر کرنا ایسا امر نہیں ہے کہ جو بے دلیل ہو، بلکہ بڑے بڑے دلائل سے یہ امر ثابت کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ خود لفظ کشمیر بھی اس پر دلیل ہے کیونکہ لفظ کشمیر وہ لفظ ہے جس کو کشمیری زبان میں کشیر کہتے ہیں۔ ہر ایک کشمیری اس کو کشیر بولتا ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ لفظ عبرانی ہے کہ جو کاف اور اشیر کے لفظ سے مرکب ہے اور اشیر عبرانی زبان میں شام کے ملک کو کہتے ہیں اور کاف مماثلت کے لئے آتا ہے۔ پس صورت اس لفظ کی کَاَشِیْر تھی یعنی کاف الگ اور آشِیر الگ۔ جس کے معنے تھے مانند ملک شام یعنی شام کے ملک کی طرح اور چونکہ یہ ملک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہجرت گاہ تھا اور وہ سرد ملک کے رہنے والے تھے اس لئے خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو تسلی دینے کے لئے اِس ملک کا نام کَاَشِیْر رکھ دیا۔ جس کے معنے ہیں اَشِیر کے ملک کی طرح۔ پھر کثرت استعمال سے الف ساقط ہو گیا۔ اور کشیر رہ گیا۔ پھر بعد اس کے غیر قوموں نے جو کشیر کے باشندے نہ تھے اور نہ اِس ملک کی زبان رکھتے تھے ایک میم اِس میں زیادہ کر کے کشمیر بنا دیا۔ مگر یہ خدا تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہے کہ کشمیری زبان میں اب تک کشیر ہی بولا جاتا اور لکھا جاتا ہے۔

ماسوا اس کے کشمیر کے ملک میں اور بہت سی چیزوں کے اب تک عبرانی نام پائے جاتے ہیں بلکہ بعض پہاڑوں پر نبیوں کے نام استعمال پا گئے ہیں جن سے سمجھا جاتا ہے کہ عبرانی قوم کسی زمانہ میں ضرور اس جگہ آباد رہ چکی ہے جیسا کہ سلیمان نبی کے نام سے ایک پہاڑ کشمیر میں موجود ہے اور ہم اس مدعا کے ثابت کرنے کے لئے ایک لمبی فہرست اپنی بعض کتابوں میں شائع کر چکے ہیں جو عبرانی الفاظ اور اسرائیلی نبیوں کے نام پر

مشتمل ہے جو کشمیر میں اب تک پائے جاتے ہیں۔اور کشمیر کی تاریخی کتابیں جو ہم نے بڑی محنت سے جمع کی ہیں جو ہمارے پاس موجود ہیں ان سے بھی مفصلاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں جو اس وقت شمار کی رو سے دو ہزار برس کے قریب گزر گیا ہے ایک اسرائیلی نبی کشمیر میں آیا تھا جو بنی اسرائیل میں سے تھا اور شاہزادہ نبی کہلاتا تھا۔اس کی قبر محلہ خان یار میں ہے جو یوز آسف کی قبر کر کے مشہور ہے۔اب ظاہر ہے کہ یہ کتابیں تو میری پیدائش سے بہت پہلے کشمیر میں شائع ہو چکی ہیں۔پس کیوں کر کوئی خیال کر سکتا ہے کہ کشمیریوں نے افترا کے طور پر یہ کتابیں لکھی تھیں۔ان لوگوں کو اس افترا کی کیا ضرورت تھی اور کس غرض کے لئے انہوں نے ایسا افترا کیا؟ اور عجیب تر یہ کہ وہ لوگ اب تک اپنی کمال سادہ لوحی سے دوسرے مسلمانوں کی طرح یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر مع جسم عنصری چلے گئے تھے

اور پھر باوجود اس اعتقاد کے پورے یقین سے اس بات کو جانتے ہیں کہ ایک اسرائیلی نبی کشمیر میں آیا تھا کہ جو اپنے تئیں شہزادہ نبی کر کے مشہور کرتا تھا۔اور ان کی کتابیں بتلاتی ہیں کہ شمار کی رو سے اس زمانہ کو اب انیس سو برس سے کچھ زیادہ برس گزر گئے ہیں۔اس جگہ کشمیریوں کی سادہ لوحی سے ہمیں یہ فائدہ حاصل ہوا ہے کہ اگر وہ اس بات کا علم رکھتے کہ شاہزادہ نبی بنی اسرائیل میں کون تھا اور وہ نبی کون ہے جس کو اب انیس سو برس گزر گئے تو وہ کبھی ہمیں یہ کتابیں نہ دکھلاتے۔اس لئے میں کہتا ہوں کہ ہم نے ان کی سادہ لوحی سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ماسوا اس کے وہ لوگ شہزادہ نبی کا نام یوز آسف بیان کرتے ہیں یہ لفظ صریح معلوم ہوتا ہے کہ یسوع آسف کا بگڑا ہوا ہے۔آسف عبرانی زبان میں اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو قوم کو تلاش کرنے والا ہو چونکہ حضرت عیسیٰ اپنی اس قوم کو تلاش کرتے کرتے جو بعض فرقے یہودیوں میں سے گم تھے کشمیر میں پہنچے تھے اس لئے انہوں نے اپنا نام یسوع آسف رکھا تھا اور یوز آسف کی کتاب میں صریح لکھا ہے کہ یوز آسف پر خدا تعالیٰ کی طرف سے انجیل اتری تھی۔پس باوجود اس قدر دلائل واضحہ کے کیوں کر اس بات سے انکار کیا جائے کہ یوز آسف دراصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہے ورنہ یہ بار ثبوت ہمارے مخالفوں کی گردن پر ہے کہ وہ کون شخص ہے جو اپنے تئیں شاہزادہ نبی ظاہر کرتا تھا جس کا زمانہ حضرت عیسیٰ کے زمانہ سے بالکل مطابق ہے اور یہ پتہ بھی ملا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ کشمیر میں آئے تو اس زمانہ کے بدھ مذہب والوں نے اپنی پُستکوں میں ان کا کچھ ذکر کیا ہے۔

ایک اور قوی دلیل اس بات پر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اٰوَيۡنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبۡوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيۡنٍ۔

یعنی ہم نے عیسیٰ اور اس کی ماں کو ایک ایسے ٹیلے پر پناہ دی جو آرام کی جگہ تھی اور ہر ایک دشمن کی دست درازی سے دور تھی اور پانی اُس کا بہت خوشگوار تھا۔

یاد رہے کہ اٰوٰی کا لفظ عربی زبان میں اس جگہ بولا جاتا ہے جب ایک مصیبت کے بعد کسی شخص کو پناہ دیتے ہیں ایسی جگہ میں جو دارالامان ہوتا ہے پس وہ دارالامان ملک شام نہیں ہوسکتا کیونکہ ملک شام قیصر روم کی عملداری میں تھا۔ اور حضرت عیسیٰ قیصر کے باغی قرار پاچکے تھے۔ پس وہ کشمیر ہی تھا جو شام کے ملک سے مشابہ تھا اور قرار کی جگہ تھی۔ یعنی امن کی جگہ تھی یعنی قیصر روم کو اس سے کچھ تعلق نہ تھا۔

(براہینِ احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۴۰۲ تا ۴۰۵)

اٰوٰی کا لفظ عرب کی زبان میں اس موقع پر استعمال پاتا ہے جبکہ کسی قدر تکلیف کے بعد کسی شخص کو اپنی پناہ میں لیا جائے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (الضُّحٰى : ۷) اور جیسا کہ فرماتا ہے اٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ ○ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۹۷ حاشیہ)

خدا کا کلام قرآن شریف گواہی دیتا ہے کہ وہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ ناقل) مر گیا اور اس کی قبر سرینگر کشمیر میں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ یعنی ہم نے عیسیٰ اور اس کی ماں کو یہودیوں کے ہاتھوں سے بچا کر ایک ایسے پہاڑ میں پہنچا دیا جو آرام اور خوشحالی کی جگہ تھی اور مصفا پانی کے چشمے اس میں جاری تھے سو وہی کشمیر ہے۔ اسی وجہ سے حضرت مریم کی قبر زمینِ شام میں کسی کو معلوم نہیں اور کہتے ہیں کہ وہ بھی حضرت عیسیٰ کی طرح مفقود ہے۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۰۴ حاشیہ)

ہم نے عیسیٰ اور اس کی ماں کو بعد اس کے جو یہودیوں نے ان پر ظلم کیا اور حضرت عیسیٰ کو سولی دینا چاہا ہم نے عیسیٰ اور اس کی ماں کو پناہ دی اور دونوں کو ایک ایسے پہاڑ پر پہنچا دیا جو سب پہاڑوں سے اونچا تھا یعنی کشمیر کا پہاڑ جس میں خوشگوار پانی تھا اور بڑی آسائش اور آرام کی جگہ تھی۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۲۴۳)

اٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ کے متعلق بعض کہتے ہیں کہ وہ شام ہی میں تھا میں کہتا ہوں یہ بالکل غلط ہے۔ قرآن شریف خود اس کے مخالف ہے اس لئے کہ اٰوٰی کا لفظ تو اس جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں ایک مصیبت کے بعد نجات ملے اور پناہ دی جاوے۔ یہ بات اس رومی سلطنت میں رہ کر نہیں کب حاصل

ہوسکتی تھی۔ وہ تو وہاں رہ سکتے ہی نہ تھے۔ اس لئے لازمی طور پر انہوں نے ہجرت کی۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۵۲

پاک چیزیں کھاؤ اور پاک عمل کرو۔ اس آیت میں حکم جسمانی صلاحیت کے انتظام کے لئے ہے جس کے لئے كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ کا ارشاد ہے اور دوسرا حکم روحانی صلاحیت کے انتظام کے لئے ہے جس کے لئے وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا کا ارشاد ہے اور ان دونوں کے مقابلہ سے ہمیں یہ دلیل ملتی ہے کہ بدکاروں کے لئے عالم آخرت کی سزا ضروری ہے کیونکہ جبکہ ہم دنیا میں جسمانی پاکیزگی کے قواعد کو ترک کر کے فی الفور کسی بلا میں گرفتار ہوجاتے ہیں اس لئے یہ امر بھی یقینی ہے کہ اگر ہم روحانی پاکیزگی کے اصول کو ترک کریں گے تو اسی طرح موت کے بعد بھی کوئی عذاب مولم ضرور ہم پر وارد ہوگا۔ جو وباء کی طرح ہمارے ہی اعمال کا نتیجہ ہوگا۔

(ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۳۳۸)

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفارہ کچھ چیز نہیں بلکہ جیسا کہ ہم اپنے جسمانی بدطریقوں سے وباء کو اپنے پر لے آتے ہیں اور پھر حفظِ صحت کے قواعد کی پابندی سے اس سے نجات پاتے ہیں۔ یہی قانونِ قدرت ہمارے روحانی عذاب اور نجات سے وابستہ ہے۔ (ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۳۳۸ حاشیہ)

قرآن شریف تو كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ کی تعلیم دے اور یہ لوگ طیب عمدہ چیز میں خاک ڈال کر غیر طیب بنا دیں۔ اس قسم کے مذاہب اسلام کے بہت عرصہ بعد پیدا ہوئے ہیں۔ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اضافہ کرتے ہیں۔ ان کو اسلام سے اور قرآن کریم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ خود اپنی شریعت الگ قائم کرتے ہیں۔ میں اس کو سخت حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسوہ حسنہ ہیں۔ ہماری بھلائی اور خوبی یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آپؐ کے نقشِ قدم پر چلیں اور اس کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھائیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝۵۳

فطرت ایسی چیز نہیں جو مستقل طور پر ہادی ہو سکے کیونکہ وہ شیطان کے قائم مقام مضل بھی تو ہوجاتی ہے۔

فطرت میں توہمات کے داخل ہوجانے سے جو بعض نقص پیدا ہوجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ کہا گیا ہے۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝ وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس کو جنون ہے؟ نہیں۔ بلکہ بات تو یہ ہے کہ خدا نے ان کی طرف حق بھیجا اور وہ حق کے قبول کرنے سے کراہت کر رہے ہیں اور اگر خدا ان کی خواہشوں کی پیروی کرتا تو زمین اور آسمان اور جو کچھ ان میں ہے سب بگڑ جاتا بلکہ ہم ان کے لئے وہ ہدایت لائے ہیں جس کے وہ محتاج ہیں۔ سو جس ہدایت کے وہ محتاج ہیں اسی سے کنارہ کش ہیں۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۴۵، ۲۴۶ حاشیہ نمبر ۱۱)

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝

اگر زمین آسمان میں بجز اس ایک ذات جامع صفات کاملہ کے کوئی اور بھی خدا ہوتا تو وہ دونوں بگڑ جاتے۔ کیونکہ ضرور تھا کہ کبھی وہ جماعت خدائیوں کی ایک دوسرے کے خلاف کام کرتے۔ پس اسی پھوٹ اور اختلاف سے عالم میں فساد راہ پاتا اور نیز الگ الگ خالق ہوتے تو ہر واحد ان میں سے اپنی ہی مخلوق کی بھلائی چاہتا اور ان کے آرام کے لئے دوسروں کا برباد کرنا روا رکھتا۔ پس یہ بھی موجب فساد عالم ٹھہرتا۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۱۸، ۵۱۹ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

وَ اِنَّا عَلٰۤى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ۝

اور ہم اس بات پر قادر ہیں کہ جو کچھ ہم ان کی نسبت وعدہ کرتے ہیں وہ تجھے دکھلا دیں۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۴ حاشیہ نمبر ۱۱)

اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ السَّیِّئَۃَ ؕ نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَصِفُوۡنَ ﴿۹۷﴾

خدا تعالیٰ قرآن شریف میں پیش دستی کر کے لڑائی کرنا ایک سخت مجرمانہ فعل قرار دیتا ہے بلکہ مومنوں کو جا بجا صبر کا حکم دیا ہے جیسا کہ وہ اس آیت میں فرماتا ہے اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَ بَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۵) یعنی تیرا دشمن جو تجھ سے بدی کرتا ہے اس کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کر۔ اگر تو نے ایسا کیا تو وہ تیرا ایسا دوست ہو جائے گا کہ گویا رشتہ دار بھی ہے۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۹۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ۱۳ برس تک جور و ستم سہنے پڑے اور پھر مدافعت کا حکم دیا گیا۔ اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا (الحج: ۴۰) سے ظاہر ہے کہ پہلے جواب تک دینے کا بھی حکم نہیں تھا اس لئے دو اصل فرمائے ایک تو وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰہِلِیۡنَ جن لوگوں میں جہالت کا مادہ ہو۔ جو تکبر سے بھرے ہوئے جھگڑالو ہوں۔ ان سے اعراض کرنا چاہیے۔ ان کی باتوں کا جواب ہی نہ دیا جاوے دوم اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ یعنی بدی کے مقابلہ میں نیکی کرنا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوست بن جاتا ہے اور وہ دوست بھی ایسا کہ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۱۵ مورخہ ۱۱/اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَہُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ رَبِّ ارۡجِعُوۡنِ ﴿۱۰۰﴾ۙ لَعَلِّیۡۤ اَعۡمَلُ صَالِحًا فِیۡمَا تَرَکۡتُ کَلَّا ؕ اِنَّہَا کَلِمَۃٌ ہُوَ قَآئِلُہَا ؕ وَ مِنۡ وَّرَآئِہِمۡ بَرۡزَخٌ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾

یعنی جب کافروں میں سے ایک کو موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے میرے رب مجھ کو پھر دنیا میں بھیج تا ہو کہ میں نیک عمل کروں اور تدارک مافات مجھ سے ہو سکے تو اس کو کہا جاتا ہے کہ یہ ہرگز نہیں ہو گا۔ یہ صرف اس کا قول ہے یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے ابتداء سے کوئی بھی وعدہ نہیں کہ مردہ کو پھر دنیا میں بھیجے اور پھر آگے فرمایا کہ جو لوگ مر چکے ہیں ان میں اور دنیا میں ایک پردہ ہے جس کی وجہ سے وہ قیامت تک دنیا کی طرف رجوع نہیں کر سکتے۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۶۱۹ حاشیہ در حاشیہ)

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَلَاۤ اَنۡسَابَ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَئِذٍ وَّ لَا یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾

خدا تعالیٰ کی آواز تو ہمیشہ آتی ہے مگر مردوں کی نہیں آتی۔ اگر کبھی کسی مردے کی آواز آتی ہے تو خدا تعالیٰ

کی معرفت ۔یعنی خدا تعالیٰ کوئی خبر ان کے متعلق دے دیتا ہے۔اصل یہ ہے کہ کوئی ہو خواہ نبی ہو یا صدیق یہ حال ہے کہ آں را خبر شد خبرش باز نیامد۔اللہ تعالیٰ ان کے درمیان اور اہل وعیال کے درمیان ایک حجاب رکھ دیتا ہے۔وہ سب تعلق قطع ہو جاتے ہیں۔اسی لئے فرمایا ہے فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷/اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تفسیر سورۃ النُّور

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَ لْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۳

بعض وقت انسان مار کھانے سے درست ہوتا ہے اور بعض وقت مار دیکھنے سے۔ زنا کی سزا کے لئے بھی خدا نے کہا ہے کہ لوگوں کو دکھا کر دی جائے۔ اسی طرح دوسروں کو تازیانہ پڑ رہا ہے اور ہماری جماعت دیکھ رہی ہے۔ بہت سے آدمی تھے جنہوں نے ہمارے منشاء اور ارادہ کو آج تک نہیں سمجھا تھا مگر اب خدا ان کو دوسروں کو تازیانہ لگا کر سمجھا رہا ہے طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طائفہ میں کوئی کسر ہوگی۔ اس کی اصلاح اس طرح سے ہو جائے گی کہ وہ دوسرے کو اصلاح ملتی دیکھ کر اپنی اصلاح کریں گے اور اس میں کل مومنوں کو بھی نہیں کہا بلکہ ایک طائفہ کو کہا ہے۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۵، ۶ مورخہ ۲۸ ؍نومبر۔ ۵ ؍دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۵)

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ

جَلۡدَةً وَّلَا تَقۡبَلُوۡا لَهُمۡ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۙ۝۵

جولوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں اوراس تہمت کے ثابت کرنے کے لئے چار گواہ نہ لا سکیں تو ان کو اسی درے مارو اور آئندہ کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو اور یہ لوگ آپ ہی بدکار ہیں۔ اس جگہ مُحۡصَنٰت کے لفظ کے وہی معنے ہیں جو آیت گذشتہ میں بَرِی کے لفظ کے معنے ہیں۔ اب اگر بموجب قول مولوی محمد حسین ایڈیٹر اشاعۃ السنۃ کے بَرِی کے لفظ کا مصداق صرف وہ شخص ہوسکتا ہے کہ جس پر اول فردقرارداد جرم لگائی جاوے اور پھر گواہوں کی شہادت سے اس کی صفائی ثابت ہوجائے اور استغاثہ کا ثبوت ڈیفنس کے ثبوت سے ٹوٹ جائے تو اس صورت میں یعنی اگر بَرِی کے لفظ میں جو آیت ثُمَّ یَرۡمِ بِهٖ بَرِیۡٓئًا (النساء: ۱۱۳) میں ہے یہی منشاء قرآن کا ہے۔ تو کسی عورت پر مثلاً زنا کی تہمت لگانا کوئی جرم نہ ہوگا بجز اس صورت کے کہ اس نے معتمد گواہوں کے ذریعہ سے عدالت میں ثابت کردیا ہو کہ وہ زانیہ نہیں اور اس سے یہ لازم آئے گا کہ ہزارہا مستورالحال عورتیں جن کی بدچلنی ثابت نہیں حتی کہ نبیوں کی عورتیں اور صحابہؓ کی عورتیں اور اہلِ بیت میں سے عورتیں تہمت لگانے والوں سے بجز اس صورت کے مخلصی نہ پاسکیں اور نہ بری کہلانے کی مستحق ٹھہر سکیں جب تک کہ عدالتوں میں حاضر ہوکر اپنی عفت کا ثبوت نہ دیں حالانکہ ایسی تمام عورتوں کی نسبت جن کی بدچلنی ثابت نہ ہو خدا تعالیٰ نے بارِ ثبوت الزام لگانے والوں پر رکھا ہے اوران کو بری اور مُحۡصَنٰت کے نام سے پکارا ہے جیسا کہ اسی آیت ثُمَّ لَمۡ یَاۡتُوۡا بِاَرۡبَعَةِ شُهَدَآءَ سے سمجھا جاتا ہے۔

(تریاق القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۳۱۸، ۳۱۹)

جولوگ ایسی عورتوں پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں جن کا زنا کار ہونا ثابت نہیں ہے بلکہ مستورالحال ہیں اگر وہ لوگ چار گواہ سے اپنے اس الزام کو ثابت نہ کریں تو ان کو اسی درے مارنے چاہئیں۔ اب دیکھو کہ ان عورتوں کا نام خدا نے بری رکھا ہے جن کا زانیہ ہونا ثابت نہیں۔ پس بری کے لفظ کی یہ تشریح بعینہٖ ڈسچارج کے مفہوم سے مطابق ہے کیونکہ اگر بری کا لفظ جو قرآن نے آیت یَرۡمِ بِهٖ بَرِیۡٓئًا میں استعمال کیا ہے صرف ایسی صورت پر بولا جاتا ہے کہ جبکہ کسی کو مجرم ٹھہرا کر اس پر فردقرارداد جرم لگائی جائے۔ اور پھر وہ گواہوں کی شہادت سے اپنی صفائی ثابت کرے اور استغاثہ کا ثبوت ڈیفنس کے ثبوت سے ٹوٹ جائے تو اس صورت میں ہر ایک شریر کو آزادی ہوگی کہ ایسی تمام عورتوں پر زنا کا الزام لگاوے جنہوں نے معتمد گواہوں کے ذریعہ

سے عدالت میں ثابت نہیں کر دیا کہ وہ زانیہ نہیں ہیں خواہ وہ رسولوں اور نبیوں کی عورتیں ہوں اور خواہ صحابہؓ کی اور خواہ اولیاء اللہ کی اور خواہ اہلِ بیت کی عورتیں ہوں اور ظاہر ہے کہ آیت یَرۡمِ بِهٖ بَرِيۡٓـًٔا میں بری کے لفظ کے ایسے معنے کرنے صاف الحاد ہے جو ہرگز خدا تعالیٰ کا منشاء نہیں ہے۔

(تریاق القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۴۴۲، ۴۴۳)

وَ الَّذِيۡنَ يَرۡمُوۡنَ اَزۡوَاجَهُمۡ وَ لَمۡ يَكُنۡ لَّهُمۡ شُهَدَآءُ اِلَّاۤ اَنۡفُسُهُمۡ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمۡ اَرۡبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ۞ وَ الۡخَامِسَةُ اَنَّ لَعۡنَتَ اللّٰهِ عَلَيۡهِ اِنۡ كَانَ مِنَ الۡكٰذِبِيۡنَ ۞

شخص ملزم چار قسمیں خدا کی کھائے کہ وہ سچا ہے اور پانچویں قسم میں یہ کہے کہ اس پر خدا کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹا ہے۔

(مجموعہ اشتہارات، جلد دوم صفحہ ۶۲۵)

وَ لَا يَاۡتَلِ اُولُوا الۡفَضۡلِ مِنۡكُمۡ وَ السَّعَةِ اَنۡ يُّؤۡتُوۡۤا اُولِى الۡقُرۡبٰى وَ الۡمَسٰكِيۡنَ وَ الۡمُهٰجِرِيۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۖ وَ لۡيَـعۡفُوۡا وَ لۡيَـصۡفَحُوۡا ؕ اَلَا تُحِبُّوۡنَ اَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَـكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۞

جیسے خدا تعالیٰ نے اپنے اخلاق میں یہ داخل کر رکھا ہے کہ وہ وعید کی پیشگوئی کو توبہ و استغفار اور دعا اور صدقہ سے ٹال دیتا ہے اسی طرح انسان کو بھی اس نے یہی اخلاق سکھائے ہیں جیسا کہ قرآن شریف اور حدیث سے یہ ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نسبت جو منافقین نے محض خباثت سے خلافِ واقعہ تہمت لگائی تھی اس تذکرہ میں بعض سادہ لوح صحابہؓ بھی شریک ہو گئے تھے ایک صحابیؓ ایسے تھے کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر سے دو وقتہ روٹی کھاتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کی اس خطا پر قسم کھائی تھی اور وعید کے طور پر عہد کر لیا تھا کہ میں اس بیجا حرکت کی سزا میں اس کو کبھی روٹی نہ دوں گا اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی وَ لۡيَـعۡفُوۡا وَ لۡيَـصۡفَحُوۡا ؕ اَلَا تُحِبُّوۡنَ اَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَـكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ تب حضرت ابوبکرؓ نے اپنے اس عہد کو توڑ دیا اور بدستور روٹی لگا دی۔ اسی بناء پر اسلامی اخلاق میں یہ داخل ہے کہ اگر وعید کے طور پر

کوئی عہد کیا جائے تو اس کا توڑ نا حسنِ اخلاق میں داخل ہے۔ مثلاً اگر کوئی اپنے خدمتگار کی نسبت قسم کھائے کہ میں اس کو ضرور پچاس جوتے ماروں گا تو اس کی توبہ اور تضرع پر معاف کرنا سنتِ اسلام ہے تا تخلق باخلاق ہو جائے مگر وعدہ کا تخلف جائز نہیں۔ ترکِ وعدہ پر باز پُرس ہوگی مگر ترکِ وعید پر نہیں۔

(براہینِ احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۱۸۱)

لوگوں کے گناہ بخشو اور ان کی زیادتیوں اور قصوروں کو معاف کرو کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا بھی تمہیں معاف کرے اور تمہارے گناہ بخشے اور وہ تو غفور الرحیم ہے۔

اور انجیل نے بھی صبر اور عفو کی تعلیم دی ہے مگر اکثر لوگوں کو شاید یہ بات یاد نہیں ہوگی کہ حضرت عیسیٰ انجیل میں فرماتے ہیں کہ مجھے دوسری قوموں سے سروکار نہیں میں صرف بنی اسرائیل کی بھیڑوں کے لئے آیا ہوں۔ یعنی میری ہمدردی صرف یہودیوں تک محدود ہے مگر قرآن شریف میں صاف لکھا ہے کہ دوسری قوموں سے بھی ہمدردی کرو جیسا کہ اپنی قوم کے لئے اور دوسری قوموں کو بھی معاف کرو جیسا کہ اپنی قوم کو۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۸۷)

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَ الطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَ الطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۷﴾

انبیاء علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے مامور خبیث اور ذلیل بیماریوں سے محفوظ رکھے جاتے ہیں مثلاً جیسے آتشک ہو جذام ہو یا اور کوئی ایسی ہی ذلیل مرض، یہ بیماریاں خبیث لوگوں ہی کو ہوتی ہیں اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ۔ اس میں عام لفظ رکھا ہے اور نکات بھی عام ہیں اس لئے ہر خبیث مرض سے اپنے ماموروں اور برگزیدوں کو بچا لیتا ہے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مومن پر جھوٹا الزام لگایا جاوے اور وہ بری نہ کیا جاوے خصوصاً مصلح اور مامور، یہی وجہ ہے کہ مصلح یا مامور حسب نسب کے لحاظ سے بھی ایک اعلیٰ درجہ رکھتا ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۶ مورخہ ۱۷؍فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۸)

مرد اگر پارسا طبع نہ ہو تو عورت کب صالح ہو سکتی ہے ہاں اگر مرد خود صالح بنے تو عورت بھی صالح بن سکتی ہے۔ قول سے عورت کو نصیحت نہ دینی چاہیے بلکہ فعل سے اگر نصیحت دی جاوے تو اس کا اثر ہوتا ہے۔ عورت تو درکنار اور بھی کون ہے جو صرف قول سے کسی کی مانتا ہے اگر مرد کوئی کجی یا خامی اپنے اندر رکھے گا تو عورت ہر

وقت کی اس پر گواہ ہے۔ اگر وہ رشوت لے کر گھر آیا ہے تو اس کی عورت کہے گی کہ جب خاوند لایا ہے تو میں کیوں حرام کہوں۔ غرضیکہ مرد کا اثر عورت پر ضرور پڑتا ہے اور وہ خود ہی اسے خبیث اور طیب بناتا ہے۔ اس لئے لکھا ہے اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ .... وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ اس میں یہی نصیحت ہے کہ تم طیب بنو ورنہ ہزاروں ٹکریں مارو کچھ نہ بنے گا جو شخص خدا سے خود نہیں ڈرتا تو عورت اس سے کیسے ڈرے۔ نہ ایسے مولویوں کا وعظ اثر کرتا ہے نہ خاوند کا۔ ہر حال میں عملی نمونہ اثر کیا کرتا ہے۔ بھلا جب خاوند راتوں کو اُٹھ کر دعا کرتا ہے، روتا ہے تو عورت ایک دن دو دن تک دیکھے گی آخر ایک دن اسے بھی خیال آوے گا اور ضرور مؤثر ہو گی۔ عورت میں مؤثر ہونے کا مادہ بہت ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب خاوند عیسائی وغیرہ ہوتے ہیں تو عورتیں ان کے ساتھ عیسائی وغیرہ ہو جاتی ہیں۔ ان کی درستی کے واسطے کوئی مدرسہ بھی کفایت نہیں کر سکتا جتنا خاوند کا عملی نمونہ کفایت کرتا ہے۔ خاوند کے مقابلہ میں عورت کے بھائی بہن وغیرہ کا بھی اثر کچھ اس پر نہیں ہوتا۔

خدا نے مرد عورت دونوں کا ایک ہی وجود فرمایا ہے۔ یہ مردوں کا ظلم ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو ایسا موقع دیتے ہیں کہ وہ ان میں نقص پکڑیں ورنہ ان کو چاہیے کہ عورتوں کو ہرگز ایسا موقع نہ دیں کہ وہ یہ کہہ سکیں کہ تو فلاں بدی کرتا ہے بلکہ عورت ٹکر مار مار کر تھک جاوے اور کسی بدی کا پتہ اسے مل ہی نہ سکے تو اس وقت اس کو دینداری کا خیال ہوتا ہے اور وہ دین کو سمجھتی ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۹ مورخہ ۲۰ / مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۶۸)

مرد اپنے گھر کا امام ہوتا ہے پس اگر وہی بد اثر قائم کرتا ہے تو پھر کس قدر بد اثر پڑنے کی امید ہے۔ مرد کو چاہیے کہ اپنے قویٰ کو برمحل اور حلال موقع پر استعمال کرے۔ مثلاً ایک قوتِ غضبی ہے جب وہ اعتدال سے زیادہ ہو تو جنون کا پیش خیمہ ہوتی ہے جنون میں اور اس میں بہت تھوڑا فرق ہے جو آدمی شدید الغضب ہوتا ہے اس سے حکمت کا چشمہ چھین لیا جاتا ہے بلکہ اگر کوئی مخالف ہو تو اس سے بھی مغلوب الغضب ہو کر گفتگو نہ کرے۔ مرد کی ان تمام باتوں اور اوصاف کو عورت دیکھتی ہے اس طرح وہ دیکھتی ہے کہ میرے خاوند میں فلاں فلاں اوصاف تقویٰ کے ہیں جیسے سخاوت، حلم، صبر اور جیسے اسے پرکھنے کا موقع ملتا ہے وہ دوسرے کو مل نہیں سکتا اسی لئے عورت کو سارق بھی کہا ہے کیونکہ یہ اندر ہی اندر اخلاق کی چوری کرتی رہتی ہے حتی کہ آخر کار ایک وقت پورا اخلاق حاصل کر لیتی ہے۔

ایک شخص کا ذکر ہے کہ وہ ایک دفعہ عیسائی ہوا تو عورت بھی اس کے ساتھ عیسائی ہو گئی۔ شراب وغیرہ اول شروع کی پھر پردہ بھی چھوڑ دیا۔ غیر لوگوں سے بھی ملنے لگی۔ خاوند نے پھر اسلام کی طرف رجوع کیا تو اس

نے بیوی کو کہا کہ تو بھی میرے ساتھ مسلمان ہو۔ اس نے کہا کہ اب میرا مسلمان ہونا مشکل ہے۔ یہ عادتیں جو شراب وغیرہ اور آزادی کی پڑ گئی ہیں یہ نہیں چھوٹ سکتیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۰ مورخہ ۲۷/ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۳)

اِفک عائشہ رضی اللہ عنہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اول کوئی اطلاع نہ ہوئی۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ حضرت عائشہؓ اپنے والد کے گھر چلی گئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی کہا کہ اگر ارتکاب کیا ہے تو توبہ کر لے۔ ان واقعات کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کس قدر اضطراب تھا مگر یہ راز ایک وقت تک آپ پر نہ کھلا لیکن جب خدا تعالیٰ نے اپنی وحی سے تبریہ کیا اور فرمایا اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ .... وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ تو آپ کو افک کی حقیقت معلوم ہوئی۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰/ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ متقی کو ایسی مشکلات میں نہیں ڈالتا۔ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ .... وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ متقیوں کو اللہ تعالیٰ خود پاک چیزیں بہم پہنچاتا ہے اور خبیث چیزیں خبیث لوگوں کے لئے ہیں۔ اگر انسان تقویٰ اختیار کرے اور باطنی طہارت اور پاکیزگی حاصل کرے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں پاکیزگی ہے تو وہ ایسی ابتلاؤں سے بچا لیا جاوے گا۔ ایک بزرگ کی کسی بادشاہ نے دعوت کی اور بکری کا گوشت بھی پکایا اور خنزیر کا بھی۔ اور جب کھانا رکھا گیا تو عمداً سؤر کا گوشت اس بزرگ کے سامنے رکھ دیا اور بکری کا اپنے اور اپنے دوستوں کے آگے۔ جب کھانا رکھا گیا اور کہا کہ شروع کرو تو اللہ تعالیٰ نے اس بزرگ پر بذریعہ کشف اصل حال کھول دیا۔ انہوں نے کہا ٹھہرو یہ تقسیم ٹھیک نہیں اور یہ کہہ کر اپنے آگے کی رکابیاں ان کے آگے اور ان کے آگے کی اپنے آگے رکھتے جاتے تھے اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے کہ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ۔ الآیہ غرض جب انسان شرعی امور کو ادا کرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے اور بری اور مکروہ باتوں سے اس کو بچا لیتا ہے اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ (یوسف: ۵۴) کے یہ معنے ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰/ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰)

انسان اگر اپنے نفس کی پاکیزگی اور طہارت کی فکر کرے اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ کر گناہوں سے بچتا رہے تو اللہ تعالیٰ یہی نہیں کہ اس کو پاک کر دے گا بلکہ وہ اس کا متکفل اور متولی بھی ہو جائے گا اور ایسے خبیثات سے بچائے گا۔ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ کے یہی معنے ہیں۔ اندرونی معصیت، ریاکاری، عُجب، تکبر،

خوشامد، خود پسندی، بدظنی اور بدکاری وغیرہ وغیرہ خباثتوں سے بچنا چاہیے۔ اگر اپنے آپ کو ان خباثتوں سے بچاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو پاک ومطہر کر دے گا۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰؍مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

متقی کو تو کسی قسم کی تکلیف پیش نہیں آتی اور اسے حلال روزی پہنچانے کی ذمہ داری خود خدا نے لی ہے اور اس نے یہ وعدہ بھی فرمایا ہے کہ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ۔۔۔۔ وَ الطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ اس سے معلوم ہوا کہ خبیث اشیاء خبیث لوگوں کو بہم پہنچائی جاتی ہیں اور پاکیزہ چیزیں پاکیزہ لوگوں کو دی جاتی ہیں۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا ہے کہ ایک شخص نے ایک شخص کی دعوت کی اور بکری کا گوشت بھی پکایا اور سور کا بھی۔ جس کی دعوت کی وہ ایک پاکیزہ آدمی تھا اس کے آگے اس نے دیدہ ودانستہ سور کا گوشت رکھا اور اپنے آگے بکری کا۔ خدا تعالیٰ نے اس پر کشف سے یہ امر کھول دیا۔ جب بسم اللہ کا حکم ہوا تو اس نے کہا ٹھہرو یہ تقسیم ٹھیک نہیں ہے چنانچہ وہ اپنے آگے کی رکابیاں اُٹھا کر صاحبِ خانہ کے آگے اور اس کے آگے کی اُٹھا کر اپنے آگے رکھتا جاتا تھا اور یہی آیت پڑھتا تھا کہ اَلْخَبِيْثٰتُ الخ۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۹ مورخہ ۷؍اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۲۶)

قرآن تمہیں انجیل کی طرح یہ نہیں کہتا کہ بجز زنا کے اپنی بیوی کی ہر یک ناپاکی پر صبر کرو اور طلاق مت دو بلکہ وہ کہتا ہے اَلطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ قرآن کا یہ منشاء ہے کہ ناپاک پاک کے ساتھ رہ نہیں سکتا۔ پس اگر تیری بیوی زنا تو نہیں کرتی مگر شہوت کی نظر سے غیر لوگوں کو دیکھتی ہے اور ان سے بغل گیر ہوتی ہے اور زنا کے مقدمات اس سے صادر ہوتے ہیں گو ابھی تکمیل نہیں ہوئی اور غیر کو اپنی برہنگی دکھلا دیتی ہے اور مشرکہ اور مفسدہ ہے اور جس پاک خدا پر تو ایمان رکھتا ہے اس سے وہ بیزار ہے تو اگر وہ باز نہ آوے تو تو اسے طلاق دے سکتا ہے کیونکہ وہ اپنے اعمال میں تجھ سے علیحدہ ہوگئی۔ اب تیرے جسم کا ٹکڑہ نہیں رہی۔ پس تیرے لئے اب جائز نہیں ہے کہ تو دیوثی سے اس کے ساتھ بسر کرے کیونکہ اب وہ تیرے جسم کا ٹکڑہ نہیں ایک گندہ اور متعفن عضو ہے جو کاٹنے کے لائق ہے ایسا نہ ہو کہ وہ باقی عضو کو بھی گندہ کر دے اور تو مر جاوے۔

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۹)

اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ۔ یہ اس مقام کی آیت ہے کہ جہاں بےلوث اور بےگناہ ہونا ایک کا ایک وقت تک مشتبہ رہا پھر خدا نے اس کی طرف سے ڈیفنس پیش کر کے اس کی بریت کی۔

(تریاق القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۴۴۱)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓى

اَهۡلِهَا ؕ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۲۸﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فِيۡهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدۡخُلُوۡهَا حَتّٰى يُؤۡذَنَ لَكُمۡ ۚ وَاِنۡ قِيۡلَ لَكُمُ ارۡجِعُوۡا فَارۡجِعُوۡا هُوَ اَزۡكٰى لَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ ﴿۲۹﴾

دوسرے گھروں میں وحشیوں کی طرح خود بخود بے اجازت نہ چلے جاؤ اجازت لینا شرط ہے۔ اور جب تم دوسروں کے گھروں میں جاؤ تو داخل ہوتے ہی السلام علیکم کہو اور اگر ان گھروں میں کوئی نہ ہو تو جب تک کوئی مالکِ خانہ تمہیں اجازت نہ دے ان گھروں میں مت جاؤ اور اگر مالکِ خانہ یہ کہے کہ واپس چلے جاؤ تو تم واپس چلے جاؤ۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۳۶)

قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ وَيَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ ؕ ذٰلِكَ اَزۡكٰى لَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا يَصۡنَعُوۡنَ ﴿۳۱﴾

یہ خدا ہی کا کلام ہے جس نے اپنے کھلے ہوئے اور نہایت واضح بیان سے ہم کو ہمارے ہر یک قول اور فعل اور حرکت اور سکون میں حدود معینہ مشخصہ پر قائم کیا اور ادبِ انسانیت اور پاک روشنی کا طریقہ سکھلایا۔ وہی ہے جس نے آنکھ اور کان اور زبان وغیرہ اعضا کی محافظت کے لئے بکمال تاکید فرمایا قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ وَيَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ ؕ ذٰلِكَ اَزۡكٰى لَهُمۡ الجزو نمبر ۱۸۔ یعنی مومنوں کو چاہیے کہ وہ اپنی آنکھوں اور کانوں اور ستر گاہوں کو نامحرموں سے بچاویں۔ اور ہر یک نادیدنی اور ناشنیدنی اور ناکردنی سے پرہیز کریں کہ یہ طریقہ ان کی اندرونی پاکی کا موجب ہوگا یعنی ان کے دل طرح طرح کے جذباتِ نفسانیہ سے محفوظ رہیں گے کیونکہ اکثر نفسانی جذبات کو حرکت دینے والے اور قویٰ بہیمیہ کو فتنہ میں ڈالنے والے یہی اعضا ہیں۔ اب دیکھئے کہ قرآن شریف نے نامحرموں سے بچنے کے لئے کیسی تاکید فرمائی اور کیسے کھول کر بیان کیا کہ ایماندار لوگ اپنی آنکھوں اور کانوں اور ستر گاہوں کو ضبط میں رکھیں اور ناپاکی کے مواضع سے روکتے رہیں۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۰۹ حاشیہ)

مومنین کو کہہ دے کہ اپنی آنکھیں نامحرموں سے بند رکھیں اور اپنی ستر گاہوں کو اور کانوں کو نالائق امور سے بچاویں۔ یہی ان کی پاکیزگی کے لئے ضروری اور لازم ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر یک

مومن کے لئے منہیات سے پرہیز کرنا اور اپنے اعضا کو ناجائز افعال سے محفوظ رکھنا لازم ہے اور یہی طریق اس کی پاکیزگی کا مدار ہے۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۲۰۲ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

قرآن کی یہ تعلیم ہے کہ نہ تو شہوت سے اور نہ بغیر شہوت کے بیگانہ عورت کے منہ پر ہرگز نظر نہ ڈال اور ان کی باتیں مت سن اور ان کی آواز مت سن اور ان کے حسن کے قصے مت سن کہ ان امور سے پرہیز کرنا تجھے ٹھوکر کھانے سے بچائے گا۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ یعنی مومنوں کو کہہ دے کہ نامحرم کو دیکھنے سے اپنی آنکھوں کو بند رکھیں اور اپنے کانوں اور ستر گاہوں کی حفاظت کریں یعنی کان کو بھی ان کی نرم باتوں اور ان کی خوبصورتی کے قصوں سے بچاویں کہ یہ سب طریق ٹھوکر کھانے کے ہیں۔ (نور القرآن نمبر ۲، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۴۱۶)

جو شخص آزادی سے نامحرم عورتوں کو دیکھتا رہے گا آخر ایک دن بدنیتی سے بھی دیکھے گا کیونکہ نفس کے جذبات ہر یک طبیعت کے ساتھ لگے ہوئے ہیں اور تجربہ بلند آواز سے بلکہ چیخیں مار کر ہمیں بتلا رہا ہے کہ بیگانہ عورتوں کو دیکھنے میں ہرگز انجام بخیر نہیں ہوتا۔ یورپ جو زنا کاری سے بھر گیا اس کا کیا سبب ہے یہی تو ہے کہ نامحرم عورتوں کو بے تکلف دیکھنا عادت ہو گیا۔ اول تو نظر کی بدکاریاں ہوئیں اور پھر معانقہ بھی ایک معمولی امر ہو گیا پھر اس سے ترقی ہو کر بوسہ لینے کی بھی عادت پڑی یہاں تک کہ استاد جوان لڑکیوں کو اپنے گھروں میں لے جا کر یورپ میں بوسہ بازی کرتے ہیں اور کوئی منع نہیں کرتا۔ شیرینیوں پر فسق و فجور کی باتیں لکھی جاتی ہیں۔ تصویروں میں نہایت درجہ کی بدکاری کا نقشہ دکھایا جاتا ہے۔ عورتیں خود چھپواتی ہیں کہ میں ایسی خوبصورت ہوں اور میری ناک ایسی اور آنکھ ایسی ہے اور ان کے عاشقوں کے ناول لکھے جاتے ہیں اور بدکاری کا ایسا دریا بہہ رہا ہے کہ نہ تو کانوں کو بچا سکتے ہیں نہ آنکھوں کو نہ ہاتھوں کو نہ منہ کو۔ یہ یسوع صاحب کی تعلیم ہے۔ (نور القرآن نمبر ۲ روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۴۱۶، ۴۱۷)

ایمان داروں کو جو مرد ہیں کہہ دے کہ آنکھوں کو نامحرم عورتوں کے دیکھنے سے بچائے رکھیں اور ایسی عورتوں کو کھلے طور سے نہ دیکھیں جو شہوت کا محل ہو سکتی ہیں اور ایسے موقع پر خوابیدہ نگاہ کی عادت پکڑیں اور اپنے ستر کی جگہ کو جس طرح ممکن ہو بچاویں۔ ایسا ہی کانوں کو نامحرموں سے بچاویں یعنی بیگانہ عورتوں کے گانے بجانے اور خوش الحانی کی آوازیں نہ سنے۔ ان کے حسن کے قصے نہ سنے۔ یہ طریق پاک نظر اور پاک دل رہنے کے لئے عمدہ طریق ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۱)

مومنوں کو کہہ دے کہ نامحرم اور محل شہوت کے دیکھنے سے اپنی آنکھیں اس قدر بند رکھیں کہ پوری صفائی سے چہرہ نظر نہ آسکے اور نہ چہرہ پر کشادہ اور بے روک نظر پڑ سکے اور اس بات کے پابند رہیں کہ ہرگز آنکھ کو پورے طور پر کھول کر نہ دیکھیں نہ شہوت کی نظر سے اور نہ بغیر شہوت سے کیونکہ ایسا کرنا آخر ٹھوکر کا باعث ہے یعنی بے قیدی کی نظر سے نہایت پاک حالت محفوظ نہیں رہ سکتی اور آخر ابتلاء پیش آتا ہے اور دل پاک نہیں ہوسکتا جب تک آنکھ پاک نہ ہو۔ اور وہ مقام ازکیٰ جس پر طالبِ حق کے لئے قدم مارنا مناسب ہے حاصل نہیں ہوسکتا اور اس آیت میں یہ بھی تعلیم ہے کہ بدن کے ان تمام سوراخوں کو محفوظ رکھیں جن کی راہ سے بدی داخل ہوسکتی ہے۔ سوراخ کے لفظ میں جو آیت ممدوح میں مذکور ہے آلاتِ شہوت اور کان اور ناک اور منہ سب داخل ہیں۔ اب دیکھو کہ یہ تمام تعلیم کس شان اور پایہ کی ہے جو کسی پہلو پر نامعقول طور پر افراط یا تفریط سے زور نہیں ڈالا گیا اور حکیمانہ اعتدال سے کام لیا گیا ہے اور اس آیت کا پڑھنے والا فی الفور معلوم کر لے گا کہ اس حکم سے جو کھلے کھلے نظر ڈالنے کی عادت نہ ڈالو یہ مطلب ہے کہ تا لوگ کسی وقت فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں اور دونوں طرف مرد اور عورت میں سے کوئی فریق ٹھوکر نہ کھاوے لیکن انجیل میں جو بیقیدی اور کھلی آزادی دی گئی اور صرف انسان کی مخفی نیت پر مدار رکھا گیا ہے اس تعلیم کا نقص اور خامی ایسا امر نہیں ہے کہ اس کی تصریح کی کچھ ضرورت ہو۔ (تریاق القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۱۶۴، ۱۶۵)

مومنوں کو کہہ دے مرد ہوں یا عورتیں ہوں کہ اپنی آنکھوں کو غیر عورتوں اور مردوں کی طرف دیکھنے سے روکو اور کانوں کو غیر مردوں کی ناجائز آواز اور غیر کی آواز سننے سے روکو اور اپنے ستر گاہوں کی حفاظت کرو کہ اس طریق سے تم پاک ہو جاؤ گے۔

اب اے آریہ صاحبان انصاف سے سوچو کہ قرآن شریف تو اس بات سے بھی منع کرتا ہے کہ کوئی مرد غیر عورت پر نظر ڈالے اور یا عورت غیر مرد پر نظر ڈالے یا اس کی آواز ناجائز طور پر سنے مگر آپ لوگ خوشی سے اپنی بیویوں کو غیر مردوں سے ہم بستر کراتے ہیں اس کا نام نیوگ رکھتے ہیں۔ کس قدر ان دونوں تعلیموں میں فرق ہے۔ خود سوچ لیں۔ (نسیمِ دعوت، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۴۴۵، ۴۴۶)

قرآن نے چونکہ کل ملل اور فرقوں کو زیرِ نظر رکھ لیا تھا اور تمام ضرورتیں اس تک پہنچ کر ختم ہوگئی تھیں اس لئے قرآن نے عقائد کو بھی اور احکامِ عملی کو بھی مدلل کیا چنانچہ قرآن فرماتا ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ یعنی مومنوں سے کہہ دے کہ اپنے ستر کو آنکھ پھاڑ کر نہ دیکھیں اور باقی تمام

فروج کی بھی حفاظت کریں۔ لازم ہے کہ انسان چشم خوابیدہ ہو تا کہ غیر محرم عورت کو دیکھ کر فتنہ میں نہ پڑے۔ کان بھی فروج میں داخل ہیں جو قصص سن کر فتنہ میں پڑ جاتے ہیں اس لئے عام طور پر فرمایا کہ تمام موریوں کو محفوظ رکھو اور کہا کہ بالکل بند رکھو ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ یہ تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے اور یہ طریق اعلیٰ درجہ کی پاکیزگی رکھتا ہے جس کے ہوتے ہوئے بدکاروں میں نہ ہوگے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۸۸)

مسیح کا یہ کہنا کہ زنا کی نظر سے نہ دیکھ کوئی کامل تعلیم نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں کامل تعلیم یہ ہے جو مبادی گناہ سے بچاتی ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ یعنی کسی نظر سے بھی نہ دیکھیں کیونکہ دل اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ کیسی کامل تعلیم ہے۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۴۴ مورخہ ۱۰؍دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۴)

مومن کو نہیں چاہیے کہ دریدہ دہن بنے یا بے محابا اپنی آنکھ کو ہر طرف اُٹھائے پھرے۔ بلکہ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ پر عمل کر کے نظر کو نیچی رکھنا چاہیے اور بدنظری کے اسباب سے بچنا چاہیے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۱ مورخہ ۲۴؍اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۳، ۴)

یورپ کی طرح بے پردگی پر بھی یہ لوگ زور دے رہے ہیں لیکن یہ ہرگز مناسب نہیں۔ یہی عورتوں کی آزادی فسق و فجور کی جڑ ہے۔ جن ممالک نے اس قسم کی آزادی کو روا رکھا ہے ذرا ان کی اخلاقی حالت کا اندازہ کرو۔ اگر اس آزادی اور بے پردگی سے ان کی عفت اور پاک دامنی بڑھ گئی ہے تو ہم مان لیں گے کہ ہم غلطی پر ہیں لیکن یہ بات بہت ہی صاف ہے کہ جب مرد اور عورت جوان ہوں اور آزادی اور بے پردگی بھی ہو تو ان کے تعلقات کس قدر خطرناک ہوں گے۔ بدنظر ڈالنی اور نفس کے جذبات سے اکثر مغلوب ہو جانا انسان کا خاصہ ہے۔ پھر جس حالت میں کہ پردہ میں بے اعتدالیاں ہوتی ہیں اور فسق فجور کے مرتکب ہو جاتے ہیں تو آزادی میں کیا کچھ نہ ہوگا۔ مردوں کی حالت کا اندازہ کرو کہ وہ کس طرح بے لگام گھوڑے کی طرح ہو گئے ہیں۔ نہ خدا کا خوف رہا ہے نہ آخرت کا یقین ہے۔ دنیاوی لذات کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ پس سب سے اول ضروری ہے کہ اس آزادی اور بے پردگی سے پہلے مردوں کی اخلاقی حالت درست کرو اگر یہ درست ہو جاوے اور مردوں میں کم از کم اس قدر قوت ہو کہ وہ اپنے نفسانی جذبات کے مغلوب نہ ہو سکیں تو اس وقت اس بحث کو چھیڑو کہ آیا پردہ ضروری ہے کہ نہیں ورنہ موجودہ حالت میں اس بات پر زور دینا کہ آزادی اور بے پردگی ہو گویا بکریوں کو شیروں کے آگے رکھ دینا ہے ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کسی بات کے نتیجہ پر غور نہیں کرتے۔ کم از کم اپنے کانشنس سے ہی کام لیں کہ آیا مردوں کی حالت ایسی اصلاح شدہ ہے

کہ عورتوں کو بے پردہ ان کے سامنے رکھا جاوے۔ قرآن شریف نے (جو کہ انسان کی فطرت کے تقاضوں اور کمزوریوں کو مدنظر رکھ کر حسبِ حال تعلیم دیتا ہے) کیا عمدہ مسلک اختیار کیا ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ کہ تو ایمان والوں کو کہہ دے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں اور اپنے سوراخوں کی حفاظت کریں۔ یہ وہ عمل ہے جس سے ان کے نفوس کا تزکیہ ہوگا۔ فروج سے مراد شرمگاہ ہی نہیں بلکہ ہر ایک سوراخ جس میں کان وغیرہ بھی شامل ہیں اور اس میں اس امر کی مخالفت کی گئی ہے کہ غیر محرم عورت کا راگ وغیرہ سنا جاوے۔

پھر یاد رکھو کہ ہزار در ہزار تجارب سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ جن باتوں سے اللہ تعالیٰ روکتا ہے آخر کار انسان کو ان سے رکنا ہی پڑتا ہے (تعدداز دواج اور طلاق کے مسئلہ پر غور کرو)

ہر چہ دانا کند کند نادان لیک بعد از خرابیٔ بسیار

ہمیں افسوس ہے کہ آریہ صاحبان بھی بے پردگی پر زور دیتے ہیں اور قرآن شریف کے احکام کی مخالفت چاہتے ہیں حالانکہ اسلام کا یہ بڑا احسان ہندوؤں پر ہے کہ اس نے ان کو تہذیب سکھلائی اور اس کی تعلیم ایسی ہے جس سے مفاسد کا دروازہ بند ہو جاتا ہے مثل مشہور ہے۔

خر بستہ بہ گرچہ درد آشنا است

یہی حالت مرد اور عورت کے تعلقات کی ہے کہ اگرچہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن تاہم فطری جوش اور تقاضے بعض اس قسم کے ہوتے ہیں کہ جب ان کو ذرا سی تحریک ہوئی تو جھٹ حدِ اعتدال سے ادھر ادھر ہو گئے اس لئے ضروری ہے کہ مرد اور عورت کے تعلقات میں حد درجہ کی آزادی وغیرہ کو ہرگز نہ دخل دیا جاوے ذرا اپنے دلوں میں غور کرو کہ کیا تمہارے دل راجہ رامچندر اور کرشن وغیرہ کی طرح پاک ہو گئے ہیں؟ پھر جب وہ پاک دلی تم کو نصیب نہیں ہوئی تو بے پردگی کو رواج دے کر بکریوں کو شیروں کے آگے کیوں رکھتے ہو۔ ہٹ اور ضد اور تعصب اور چڑ وغیرہ سے تم لوگ دیدہ و دانستہ اسلام کے ان پاکیزہ اصولوں کی مخالفت کیوں کرتے ہو جن سے تمہاری عفت برقرار رہتی ہے عقل تو اس بات کا نام ہے کہ انسان کو نیک بات جہاں سے ملے وہ لے لیوے کیونکہ نیک بات کی مثال سونے اور ہیرے اور جواہر کی ہے اور یہ اشیاء خواہ کہیں ہوں آخر وہ سونا وغیرہ ہی ہوں گی اس لئے تم کو لازم ہے کہ اسلام کے نام سے چڑ کر تم نیکی کو ترک نہ کرو ورنہ یاد رکھو کہ اسلام کا تو کچھ حرج نہیں ہے اگر اس کا ضرر ہے تو تم ہی کو ہے ہاں اگر تم لوگوں کو یہ اطمینان ہے کہ سب کے سب بھگت بن

گئے ہو اور نفسانی جذبات پر تم کو پوری قدرت حاصل ہے اور قویٰ پر میشر کی رضا اور احکام کے برخلاف بالکل حرکت نہیں کرتے تو پھر ہم تم کو منع نہیں کرتے بے شک بے پردگی کو رواج دو لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ابھی تک تم کو وہ حالت نصیب نہیں اور تم میں سے جس قدر لوگ لیڈر بن کر قوم کی اصلاح کے در پے ہیں ان کی مثال سفید قبر کی ہے جس کے اندر بجز ہڈیوں کے اور کچھ نہیں کیونکہ ان کی صرف باتیں ہی ہیں عمل وغیرہ کچھ نہیں۔

اسلام نے جو یہ حکم دیا ہے کہ مرد عورت سے اور عورت مرد سے پردہ کرے اس سے غرض یہ ہے کہ نفسِ انسانی پھسلنے اور ٹھوکر کھانے کی حد سے بچا رہے کیونکہ ابتداء میں اس کی یہی حالت ہوتی ہے کہ وہ بدیوں کی طرف جھکا پڑتا ہے اور ذرا سی بھی تحریک ہو تو بدی پر ایسے گرتا ہے جیسے کئی دنوں کا بھوکا آدمی کسی لذیذ کھانے پر۔ یہ انسان کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کرے.... یہ ہے سر اسلامی پردہ کا۔ اور میں نے خصوصیت سے اسے ان مسلمانوں کے لئے بیان کیا ہے جن کو اسلام کے احکام اور حقیقت کی خبر نہیں۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۳۴ مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۰۴ صفحہ ۶، ۷)

وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ لْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۪ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَ لَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَ تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۲﴾

ایسا ہی ایماندار عورتوں کو کہہ دے کہ وہ بھی اپنی آنکھوں کو نامحرم مردوں کے دیکھنے سے بچائیں اور اپنے کانوں کو بھی نامحرموں سے بچائیں یعنی ان کی پُرشہوت آوازیں نہ سنیں اور اپنے ستر کی جگہ کو پردہ میں رکھیں اور اپنی زینت کے اعضا کو کسی غیر محرم پر نہ کھولیں اور اپنی اوڑھنی کو اس طرح سر پر لیں کہ گریبان سے ہو کر سر

پر آ جائے یعنی گریبان اور دونوں کان اور سر اور کنپٹیاں سب چادر کے پردہ میں رہیں اور اپنے پیروں کو زمین پر ناچنے والوں کی طرح نہ ماریں۔ یہ وہ تدبیر ہے کہ جس کی پابندی ٹھوکر سے بچا سکتی ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۱، ۳۴۲)

خوابیدہ نگاہ سے غیر محل پر نظر ڈالنے سے اپنے تئیں بچا لینا اور دوسری جائز النظر چیزوں کو دیکھنا اس طریق کو عربی میں غضِ بصر کہتے ہیں اور ہر ایک پرہیز گار جو اپنے دل کو پاک رکھنا چاہتا ہے اس کو نہیں چاہیے کہ حیوانوں کی طرح جس طرف چاہے بے محابا نظر اُٹھا کر دیکھ لیا کرے بلکہ اس کے لئے اس تمدنی زندگی میں غضِ بصر کی عادت ڈالنا ضروری ہے اور یہ وہ مبارک عادت ہے جس سے اس کی یہ طبعی حالت ایک بھاری خلق کے رنگ میں آ جائے گی اور اس کی تمدنی ضرورت میں بھی فرق نہیں پڑے گا یہی وہ خلق ہے جس کو احصان اور عفت کہتے ہیں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۴)

آج کل پردہ پر حملے کئے جاتے ہیں لیکن یہ لوگ جانتے نہیں کہ اسلامی پردہ سے مراد زنداں نہیں بلکہ ایک قسم کی روک ہے کہ غیر مرد اور عورت ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکے۔ جب پردہ ہوگا ٹھوکر سے بچیں گے۔ ایک منصف مزاج کہہ سکتا ہے کہ ایسے لوگوں میں جہاں غیر مرد و عورت اکٹھے بلا تامل اور بے محابا مل سکیں۔ سیریں کریں کیوں کر جذبات نفس سے اضطراراً ٹھوکر نہ کھائیں گے۔ بسا اوقات سننے دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسی قومیں غیر مرد عورت کو ایک مکان میں تنہا رہنے کو حالانکہ دروازہ بھی بند ہو کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ یہ گویا تہذیب ہے ان ہی بدنتائج کو روکنے کے لئے شارع اسلام نے وہ باتیں کرنے ہی کی اجازت نہ دی جو کسی کی ٹھوکر کا باعث ہوں۔ ایسے موقع میں یہ کہہ دیا کہ جہاں اس طرح دو غیر محرم مرد و عورت جمع ہوں تیسرا ان میں شیطان ہوتا ہے۔ ان ناپاک نتائج پر غور کرو جو یورپ اس خلیع الرسن تعلیم سے بھگت رہا ہے۔ بعض جگہ بالکل قابلِ شرم طوائفانہ زندگی بسر کی جا رہی ہے۔ یہ انہی تعلیموں کا نتیجہ ہے۔ اگر کسی چیز کو خیانت سے بچانا چاہتے ہو تو حفاظت کرو لیکن اگر حفاظت نہ کرو اور یہ سمجھ رکھو کہ بھلے مانس لوگ ہیں تو یاد رکھو کہ ضرور وہ چیز تباہ ہوگی۔ اسلامی تعلیم کیا پاک تعلیم ہے کہ جس نے مرد و عورت کو الگ رکھ کر ٹھوکر سے بچایا اور انسان کی زندگی حرام اور تلخ نہیں کی۔ جس سے یورپ نے آئے دن کی خانہ جنگیاں اور خودکشیاں دیکھیں۔ بعض شریف عورتوں کا طوائفانہ زندگی بسر کرنا ایک عملی نتیجہ اس اجازت کا ہے جو غیر عورت کو دیکھنے کے لئے دی گئی۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۸)

قرآن مسلمان مردوں اور عورتوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ غض بصر کریں۔ جب ایک دوسرے کو دیکھیں ہی گے نہیں تو محفوظ رہیں گے۔ یہ نہیں کہ انجیل کی طرح یہ حکم دے دیتا کہ شہوت کی نظر سے نہ دیکھ۔ افسوس کی بات ہے کہ انجیل کے مصنف کو یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ شہوت کی نظر کیا ہے؟ نظر ہی تو ایک ایسی چیز ہے جو شہوت انگیز خیالات کو پیدا کرتی ہے۔ اس تعلیم کا جو نتیجہ ہوا ہے وہ ان لوگوں سے مخفی نہیں ہے جو اخبارات پڑھتے ہیں۔ ان کو معلوم ہوگا کہ لندن کے پارکوں اور پیرس کے ہوٹلوں کے کیسے شرمناک نظارے بیان کئے جاتے ہیں۔

اسلامی پردہ سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ عورت جیل خانہ کی طرح بند رکھی جاوے۔ قرآن شریف کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں ستر کریں۔ وہ غیر مرد کو نہ دیکھیں۔ جن عورتوں کو باہر جانے کی ضرورت تمدنی امور کے لئے پڑے ان کو گھر سے باہر نکلنا منع نہیں ہے۔ وہ بیشک جائیں لیکن نظر کا پردہ ضروری ہے۔

مساوات کے لئے عورتوں کے نیکی کرنے میں کوئی تفریق نہیں رکھی گئی ہے اور نہ ان کو منع کیا گیا ہے کہ وہ نیکی میں مشابہت نہ کریں۔ اسلام نے یہ کب بتایا ہے کہ زنجیر ڈال کر رکھو اسلام شہوات کی بناء کو کاٹتا ہے۔ یورپ کو دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کتوں اور کتیوں کی طرح زنا ہوتا ہے اور شراب کی اس قدر کثرت ہے کہ تین میل تک شراب کی دکانیں چلی گئی ہیں۔ یہ کس تعلیم کا نتیجہ ہے؟ کیا پردہ داری کا یا پردہ دری کا؟

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴؍اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

پردہ کے متعلق بڑی افراط تفریط ہوئی ہے۔ یورپ والوں نے تفریط کی ہے اور اب ان کی تقلید سے بعض نیچری بھی اسی طرح چاہتے ہیں حالانکہ اس بے پردگی نے یورپ میں فسق و فجور کا دریا بہا دیا ہے اور اس کے بالمقابل بعض مسلمان افراط کرتے ہیں کہ کبھی عورت گھر سے باہر نکلتی ہی نہیں حالانکہ ریل پر سفر کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ غرض ہم ان دونوں قسم کے لوگوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں۔ جو افراط اور تفریط کر رہے ہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۶ مورخہ ۱۷؍فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

شرعی پردہ یہ ہے کہ چادر کو حلقہ کے طور پر کر کے اپنے سر کے بالوں کو کچھ حصہ پیشانی اور زنخدان کے ساتھ بالکل ڈھانک لیں اور ہر ایک زینت کا مقام ڈھانک لیں۔ مثلاً منہ پر اردگرد اس طرح پر چادر ہو (اس جگہ انسان کے چہرہ کی شکل دکھا کر جن مقامات پر پردہ نہیں ہے ان کو کھلا رکھ کر باقی پردہ کے نیچے دکھایا گیا ہے) اس قسم کے پردہ کو انگلستان کی عورتیں آسانی سے برداشت کر سکتی ہیں اور اس طرح پر سیر کرنے

میں کچھ حرج نہیں آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۴ نمبر ۱ صفحہ ۱۷، ماہ جنوری ۱۹۰۵ء)

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۳﴾

اگر کسی عورت کا خاوند مر جائے تو گو وہ عورت جوان ہی ہو دوسرا خاوند کرنا ایسا برا جانتی ہے جیسا کوئی بڑا بھارا گناہ ہوتا ہے اور تمام عمر بیوہ اور رانڈ رہ کر یہ خیال کرتی ہے کہ میں نے بڑے ثواب کا کام کیا ہے اور پاک دامن بیوی ہوگئی ہوں حالانکہ اس کے لئے بیوہ رہنا سخت گناہ کی بات ہے۔ عورتوں کے لئے بیوہ ہونے کی حالت میں خاوند کر لینا نہایت ثواب کی بات ہے۔ ایسی عورت حقیقت میں بڑی نیک بخت اور ولی ہے جو بیوہ ہونے کی حالت میں برے خیالات سے ڈر کر کسی سے نکاح کر لے اور نابکار عورتوں کے لعن طعن سے نہ ڈرے۔ ایسی عورتیں جو خدا اور رسولؐ کے حکم سے روکتی ہیں خود لعنتی اور شیطان کی چیلیاں ہیں جن کے ذریعہ سے شیطان اپنا کام چلاتا ہے۔ جس عورت کو اللہ، رسولؐ پیارا ہے اس کو چاہیے کہ بیوہ ہونے کے بعد کوئی ایماندار اور نیک بخت خاوند تلاش کرے اور یاد رکھے کہ خاوند کی خدمت میں مشغول رہنا بیوہ ہونے کی حالت کے وظائف سے صدہا درجہ بہتر ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰؍جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

بیوہ کے نکاح کا حکم اسی طرح ہے جس طرح کہ باکرہ کے نکاح کا حکم ہے۔ چونکہ بعض قومیں بیوہ عورت کا نکاح خلافِ عزت خیال کرتے ہیں اور یہ بدرسم بہت پھیلی ہوئی ہے اس واسطے بیوہ کے نکاح کے واسطے حکم ہوا ہے لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ہر بیوہ کا نکاح کیا جاوے نکاح تو اسی کا ہوگا جو نکاح کے لائق ہے اور جس کے واسطے نکاح ضروری ہے۔ بعض عورتیں بوڑھی ہو کر بیوہ ہوتی ہیں۔ بعض کے متعلق دوسرے حالات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ نکاح کے لائق نہیں ہوتیں مثلاً کسی کو ایسا مرض لاحق حال ہے کہ وہ قابلِ نکاح ہی نہیں یا ایک بیوہ کافی اولاد اور تعلقات کی وجہ سے ایسی حالت میں ہے کہ اس کا دل پسند ہی نہیں کر سکتا کہ وہ اب دوسرا خاوند کرے۔ ایسی صورتوں میں مجبوری نہیں کہ عورت کو خواہ مخواہ جکڑ کر خاوند کرایا جاوے۔ ہاں اس بدرسم کو مٹا دینا چاہیے کہ بیوہ عورت کو ساری عمر بغیر خاوند کے جبراً رکھا جاتا ہے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱)

وَ لْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖۗ وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اٰتٰىكُمْ ؕ وَ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۴﴾

جو لوگ نکاح کی طاقت نہ رکھیں جو پرہیز گار رہنے کا اصل ذریعہ ہے تو ان کو چاہئے کہ اور تدبیروں سے طلب عفت کریں چنانچہ بخاری اور مسلم کی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو نکاح کرنے پر قادر نہ ہو اس کے لئے پرہیز گار رہنے کے لئے یہ تدبیر ہے کہ وہ روزے رکھا کرے اور حدیث یہ ہے یَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَآءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَاِنَّهٗ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَ اَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَاِنَّهٗ لَهٗ وِجَآءٌ۔ صحیح مسلم و بخاری یعنی اے جوانوں کے گروہ جو کوئی تم میں سے نکاح کی قدرت رکھتا ہو تو چاہئے کہ وہ نکاح کرے کیونکہ نکاح آنکھوں کو خوب نیچا کر دیتا ہے اور شرم کے اعضاء کو زنا وغیرہ سے بچاتا ہے ورنہ روزہ رکھو کہ وہ خصّی کر دیتا ہے۔

اب ان آیات اور حدیث اور بہت سی اور آیات سے ثابت ہے کہ نکاح سے شہوت رانی غرض نہیں بلکہ بدخیالات اور بدنظری اور بدکاری سے اپنے تئیں بچانا اور نیز حفظ صحت بھی غرض ہے۔

(آریہ دھرم، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۲، ۲۳)

جس کو نکاح میسر نہ آوے چاہئے کہ وہ اپنی عفت کو دوسرے طریقوں سے بچاوے۔ مثلاً روزہ رکھے یا کم کھاوے یا اپنی طاقتوں سے تن آزار کام لے اور اور لوگوں نے یہ بھی طریق نکالے ہیں کہ وہ ہمیشہ عمداً نکاح سے دست بردار رہیں یا خوجے بنیں اور کسی طریق سے رہبانیت اختیار کریں۔ مگر ہم نے انسان پر یہ حکم فرض نہیں کئے اس لئے وہ ان بدعتوں کو پورے طور پر نبھا نہ سکے۔ خدا کا یہ فرمانا کہ ہمارا یہ حکم نہیں کہ لوگ خوجے بنیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اگر خدا کا حکم ہوتا تو سب لوگ اس حکم پر عمل کرنے کے مجاز بنتے تو اس صورت میں بنی آدم کی قطع نسل ہو کر کبھی کا دنیا کا خاتمہ ہو جاتا۔ اور نیز اگر اس طرح پر عفت حاصل کرنی ہو کہ عضو مردمی کو کاٹ دیں تو یہ درپردہ اس صانع پر اعتراض ہے جس نے وہ عضو بنایا اور نیز جبکہ

ثواب کا تمام مدار اس بات پر ہے کہ ایک قوت موجود ہو اور پھر انسان خدا تعالیٰ کا خوف کر کے اس قوت کے خراب جذبات کا مقابلہ کرتا رہے۔ اور اس کے منافع سے فائدہ اٹھا کر دو طور کا ثواب حاصل کرے۔ پس ظاہر ہے کہ ایسے عضو کے ضائع کر دینے میں دونوں ثوابوں سے محروم رہا۔ ثواب تو جذبہ مخالفانہ کے وجود اور پھر اس کے مقابلہ سے ملتا ہے۔ مگر جس میں بچہ کی طرح وہ قوت ہی نہیں رہی اس کو کیا ثواب ملے گا۔ کیا بچہ کو اپنی عفت کا ثواب مل سکتا ہے؟ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۲، ۳۴۳)

اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ مَثَلُ نُوۡرِہٖ کَمِشۡکٰوۃٍ فِیۡہَا مِصۡبَاحٌ ؕ اَلۡمِصۡبَاحُ فِیۡ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّہَا کَوۡکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوۡقَدُ مِنۡ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیۡتُوۡنَۃٍ لَّا شَرۡقِیَّۃٍ وَّ لَا غَرۡبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ زَیۡتُہَا یُضِیۡٓءُ وَ لَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡہُ نَارٌ ؕ نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ ؕ یَہۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۳۶﴾

خدا آسمان و زمین کا نور ہے۔ یعنی ہر ایک نور جو بلندی اور پستی میں نظر آتا ہے۔ خواہ وہ ارواح میں ہے۔ خواہ اجسام میں اور خواہ ذاتی ہے اور خواہ عرضی اور خواہ ظاہری ہے اور خواہ باطنی اور خواہ ذہنی ہے خواہ خارجی۔ اسی کے فیض کا عطیہ ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت رب العالمین کا فیض عام ہر چیز پر محیط ہو رہا ہے اور کوئی اس کے فیض سے خالی نہیں۔ وہی تمام فیوض کا مبدء ہے اور تمام انوار کا علت العلل اور تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے۔ اسی کی ہستی حقیقی تمام عالم کی قیوم اور تمام زیر و زبر کی پناہ ہی وہی ہے جس نے ہر یک چیز کو ظلمت خانہ عدم سے باہر نکالا اور خلعت وجود بخشا۔ بجز اس کے کوئی ایسا وجود نہیں ہے کہ جو فی حد ذاتہ واجب اور قدیم ہو۔ یا اس سے مستفیض نہ ہو بلکہ خاک اور افلاک اور انسان اور حیوان اور حجر اور شجر اور روح اور جسم سب اُسی کے فیضان سے وجود پذیر ہیں۔ یہ تو عام فیضان ہے جس کا بیان آیت اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ۔ میں ظاہر فرمایا گیا۔ یہی فیضان ہے جس نے دائرہ کی طرح ہر یک چیز پر احاطہ کر رکھا ہے جس کے فائض ہونے کے لئے کوئی قابلیت شرط نہیں۔ لیکن بمقابلہ اس کے ایک خاص فیضان بھی ہے جو مشروط بشرائط ہے اور انہیں افراد خاصہ پر فائض ہوتا ہے جن میں اس کے قبول کرنے کی قابلیت و استعداد موجود ہے۔ یعنی نفوس کاملہ انبیاء علیہم السلام پر جن میں سے افضل و اعلیٰ ذات جامع البرکات

حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم ہے دوسروں پر ہرگز نہیں ہوتا۔ اور چونکہ وہ فیضان ایک نہایت باریک صداقت ہے اور دقائق حکمیہ میں سے ایک دقیق مسئلہ ہے۔ اس لئے خداوند تعالیٰ نے اول فیضان عام کو (جو بدیہی الظہور رہے) بیان کر کے پھر اس فیضان خاص کو بغرض اظہار کیفیت نور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ایک مثال میں بیان فرمایا ہے کہ جو اس آیت سے شروع ہوتی ہے۔ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ الخ اور بطور مثال اس لئے بیان کیا کہ تا اس دقیقہ نازک کے سمجھنے میں ابہام اور دقت باقی نہ رہے۔ کیونکہ معانی معقولہ کو صُوَرِ محسوسہ میں بیان کرنے سے ہر یک غبی و بلید بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ بقیہ ترجمہ آیات ممدوحہ یہ ہے۔ اس نور کی مثال (فرد کامل میں جو پیغمبر ہے) یہ ہے جیسے ایک طاق (یعنی سینہ مشروح حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم) اور طاق میں ایک چراغ (یعنی وحی اللہ) اور چراغ ایک شیشہ کی قندیل میں جو نہایت مصفیٰ ہے۔ (یعنی نہایت پاک اور مقدس دل میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دل ہے جو کہ اپنی اصل فطرت میں شیشہ سفید اور صافی کی طرح ہر یک طور کی کثافت اور کدورت سے منزہ اور مطہر ہے۔ اور تعلقات ماسوی اللہ سے بکلی پاک ہے) اور شیشہ ایسا صاف کہ گویا ان ستاروں میں سے ایک عظیم النور ستارہ ہے جو کہ آسمان پر بڑی آب و تاب کے ساتھ چمکتے ہوئے نکلتے ہیں جن کو کوکب دری کہتے ہیں (یعنی حضرت خاتم الانبیاء کا دل ایسا صاف کہ کوکب دری کی طرح نہایت منور اور درخشندہ جس کی اندرونی روشنی اس کے بیرونی قالب پر پانی کی طرح بہتی ہوئی نظر آتی ہے) وہ چراغ زیتون کے شجرۂ مبارکہ سے (یعنی زیتون کے روغن سے) روشن کیا گیا ہے (شجرہ مبارکہ زیتون سے مراد وجودِ مبارک محمدیؐ ہے کہ جو بوجہ نہایت جامعیت وکمال انواع واقسام کی برکتوں کا مجموعہ ہے جس کا فیض کسی جہت و مکان و زمان سے مخصوص نہیں۔ بلکہ تمام لوگوں کے لئے عام علیٰ سبیل الدوام ہے اور ہمیشہ جاری ہے کبھی منقطع نہیں ہوگا) اور شجرۂ مبارکہ نہ شرقی ہے نہ غربی (یعنی طینت پاک محمدی میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔ بلکہ نہایت توسط واعتدال پر واقع ہے اور احسن تقویم پر مخلوق ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ اس شجرہ مبارکہ کے روغن سے چراغِ وحی روشن کیا گیا ہے۔ سو روغن سے مراد عقل لطیف نورانی محمدی معہ جمیع اخلاق فاضلہ فطرتیہ ہے جو اس عقل کامل کے چشمہ صافی سے پروردہ ہیں۔ اور وحی کا چراغ لطائف محمدیہ سے روشن ہونا ان معنوں کر کے ہے کہ ان لطائف قابلہ پر وحی کا فیضان ہوا اور ظہور وحی کا موجب وہی ٹھہرے۔ اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ فیضانِ وحی ان لطائف محمدیہ کے مطابق ہوا۔ اور انہیں اعتدالات کے مناسب حال ظہور میں آیا کہ جو طینت محمدیہ میں موجود تھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے

کہ ہر یک وحی نبی منزل علیہ کی فطرت کے موافق نازل ہوتی ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزاج میں جلال اور غضب تھا۔ توریت بھی موسوی فطرت کے موافق ایک جلالی شریعت نازل ہوئی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے مزاج میں حلم اور نرمی تھی۔ سو انجیل کی تعلیم بھی حلم اور نرمی پر مشتمل ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج بغایت درجہ وضع استقامت پر واقعہ تھا نہ ہر جگہ حلم پسند تھا اور نہ ہر مقام غضب مرغوب خاطر تھا۔ بلکہ حکیمانہ طور پر رعایت محل اور موقعہ کی ملحوظ طبیعت مبارک تھی۔ سو قرآن شریف بھی اسی طرز موزون و معتدل پر نازل ہوا کہ جامع شدت و رحمت و ہیبت و شفقت و نرمی و درشتی ہے۔ سو اس جگہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمایا کہ چراغِ وحی فرقان اس شجرۂ مبارکہ سے روشن کیا گیا ہے کہ نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔ یعنی طینت معتدلہ محمدؐیہ کے موافق نازل ہوا ہے جس میں نہ مزاج موسوی کی طرح درشتی ہے۔ نہ مزاج عیسوی کی مانند نرمی۔ بلکہ درشتی اور نرمی اور قہر اور لطف کا جامع ہے۔ اور مظہر کمال اعتدال اور جامع بین الجلال والجمال ہے اور اخلاق معتدلہ فاضلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ جو بمعیت عقل لطیف روغن ظہور روشنی وحی قرار پائی۔ ان کی نسبت ایک دوسرے مقام میں بھی اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو مخاطب کر کے فرمایا ہے اور وہ یہ ہے اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم: ۵) الجزو نمبر ۲۹ یعنی تو اے نبی ایک خلق عظیم پر مخلوق و مفطور ہے یعنی اپنی ذات میں تمام مکارم اخلاق کا ایسا متمم و مکمل ہے کہ اس پر زیادت متصور نہیں کیونکہ لفظ عظیم محاورۂ عرب میں اس چیز کی صفت میں بولا جاتا ہے جس کو اپنا نوعی کمال پورا پورا حاصل ہو۔ مثلاً جب کہیں کہ یہ درخت عظیم ہے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جس قدر طول و عرض درخت میں ہوسکتا ہے وہ سب اس میں موجود ہے۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ عظیم وہ چیز ہے جس کی عظمت اس حد تک پہنچ جائے کہ حیطۂ ادراک سے باہر ہو۔ اور خلق کے لفظ سے قرآن شریف اور ایسا ہی دوسری کتب حکمیہ میں صرف تازہ روی اور حسنِ اختلاط یا نرمی و تلطف و ملائمت (جیسا عوام الناس خیال کرتے ہیں) مراد نہیں ہے بلکہ خَلق بفتح خا اور خُلق بضم خا دو لفظ ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل واقعہ ہیں۔ خَلق بفتح خا سے مراد وہ صورت ظاہری ہے جو انسان کو حضرت واہب الصور کی طرف سے عطا ہوئی۔ جس صورت کے ساتھ وہ دوسرے حیوانات کی صورتوں سے ممیز ہے۔ اور خُلق بضم خا سے مراد وہ صورت باطنی یعنی خواص اندرونی ہیں جن کی رو سے حقیقت انسانیہ حقیقت حیوانیہ سے امتیاز کلی رکھتی ہے۔ پس جس قدر انسان میں من حیث الانسانیت اندرونی خواص پائے جاتے ہیں اور شجرہ انسانیت کو نچوڑ کر نکل سکتے ہیں جو کہ انسان اور حیوان میں من حیث الباطن مابہ الامتیاز ہیں۔ اُن سب کا نام خُلق ہے۔ اور چونکہ شجرۂ فطرتِ انسانی

اصل میں توسط اور اعتدال پر واقعہ ہے۔ اور ہر یک افراط و تفریط سے جو قویٰ حیوانیہ میں پایا جاتا ہے منزّہ ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین:۵) الجز و نمبر ۳۰۔ اس لئے خُلق کے لفظ سے جو کسی مذمت کی قید کے بغیر بولا جائے ہمیشہ اخلاق فاضلہ مراد ہوتے ہیں۔ اور وہ اخلاق فاضلہ جو حقیقت انسانیہ ہے۔ تمام وہ خواص اندرونی ہیں جو نفس ناطقہ انسان میں پائے جاتے ہیں جیسے عقلِ ذکا۔ سرعتِ فہم۔ صفائی ذہن۔ حسنِ تحفظ۔ حسنِ تذکر۔ عفت۔ حیا۔ صبر۔ قناعت۔ زہد۔ تورع۔ جوانمردی۔ استقلال۔ عدل۔ امانت۔ صدق لہجہ۔ سخاوت فی محلہ۔ ایثار فی محلہ۔ کرم فی محلہ۔ مروت فی محلہ۔ شجاعت فی محلہ۔ علو ہمت فی محلہ۔ حلم فی محلہ۔ تحمل فی محلہ۔ حمیت فی محلہ۔ تواضع فی محلہ۔ ادب فی محلہ۔ شفقت فی محلہ۔ رافت فی محلہ۔ رحمت فی محلہ۔ خوف الٰہی۔ محبت الٰہیہ۔ انس باللہ۔ انقطاع الی اللہ وغیرہ وغیرہ) اور تیل ایسا صاف اور لطیف کہ بن آگ ہی روشن ہونے پر آمادہ (یعنی عقل اور جمیع اخلاق فاضلہ اس نبی معصوم کے ایسے کمال موزونیت و لطافت و نورانیت پر واقعہ کہ الہام سے پہلے ہی خود بخود روشن ہونے پر مستعد تھے) نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ۔ نور فائض ہوا نور پر (یعنی جب کہ وجودِ مبارک حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم میں کئی نور جمع تھے سو ان نوروں پر ایک اور نور آسمانی جو وحی الٰہی ہے وارد ہو گیا اور اس نور کے وارد ہونے سے وجود باجود خاتم الانبیاء کا مجمع الانوار بن گیا۔ پس اس میں یہ اشارہ فرمایا کہ نور وحی کے نازل ہونے کا یہی فلسفہ ہے کہ وہ نور پر ہی وارد ہوتا ہے۔ تاریکی پر وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ فیضان کے لئے مناسبت شرط ہے۔ اور تاریکی کو نور سے کچھ مناسبت نہیں۔ بلکہ نور کو نور سے مناسبت ہے اور حکیم مطلق بغیر رعایت مناسبت کوئی کام نہیں کرتا۔ ایسا ہی فیضان نور میں بھی اس کا یہی قانون ہے کہ جس کے پاس کچھ نور ہے اسی کو اور نور بھی دیا جاتا ہے۔ اور جس کے پاس کچھ نہیں اس کو کچھ نہیں دیا جاتا۔ جو شخص آنکھوں کا نور رکھتا ہے وہی آفتاب کا نور پاتا ہے اور جس کے پاس آنکھوں کا نور نہیں وہ آفتاب کے نور سے بھی بے بہرہ رہتا ہے اور جس کو فطرتی نور کم ملا ہے اس کو دوسرا نور بھی کم ہی ملتا ہے اور جس کو فطرتی نور زیادہ ملا ہے اس کو دوسرا نور بھی زیادہ ہی ملتا ہے۔ اور انبیاء منجملہ سلسلہ متفاوتہ فطرت انسانی کے وہ افراد عالیہ ہیں جن کو اس کثرت اور کمال سے نور باطنی عطا ہوا ہے کہ گویا وہ نور مجسم ہو گئے ہیں۔ اسی جہت سے قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نور اور سراج منیر رکھا ہے جیسا فرمایا ہے قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (المائدۃ:۱۶)۔ الجز و نمبر ۶۔ وَ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا (الاحزاب:۴۷)۔ نمبر ۲۲۔ یہی حکمت ہے کہ نور وحی جس کے لئے

نور فطرتی کا کامل اور عظیم الشان ہونا شرط ہے صرف انبیاء کو ملا اور انہیں سے مخصوص ہوا۔ پس اب اس حجت موجّہ سے کہ جو مثال مقدم الذکر میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ۔ بطلان ان لوگوں کے قول کا ظاہر ہے جنہوں نے باوصف اس کے کہ فطرتی تفاوت مراتب کے قائل ہیں ۔ پھر محض حمق و جہالت کی راہ سے یہ خیال کرلیا ہے کہ جو نور افراد کامل الفطرت کو ملتا ہے وہی نور افراد ناقصہ کو بھی مل سکتا ہے۔ ان کو دیانت اور انصاف سے سوچنا چاہیئے کہ فیضان وحی کے بارہ میں کس قدر غلطی میں وہ مبتلا ہورہے ہیں ۔ صریح دیکھتے ہیں کہ خدا کا قانون قدرت ان کے خیال باطل کی تصدیق نہیں کرتا ۔ پھر شدت تعصب وعناد سے اسی خیال فاسد پر جمے بیٹھے ہیں ۔ ایسا ہی عیسائی لوگ بھی نور کے فیضان کے لئے فطرتی نور کا شرط ہونا نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ جس دل پر نور وحی نازل ہو۔ اس کے لئے اپنے کسی خاصّہ اندرونی میں نورانیت کی حالت ضروری نہیں بلکہ اگر کوئی بجائے عقل سلیم کے کمال درجہ کا نادان اور سفیہ ہو اور بجائے صفت شجاعت کے کمال درجہ کا بزدل اور بجائے صفت سخاوت کے کمال درجہ کا بخیل اور بجائے صفت حمیت کے کمال درجہ کا بے غیرت اور بجائے صفت محبت الٰہیہ کے کمال درجہ کا محبِ دنیا اور بجائے صفت زہد وورع وامانت کے بڑا بھارا چور اور ڈاکو اور بجائے صفت عفت وحیا کے کمال درجہ کا بے شرم اور شہوت پرست اور بجائے صفت قناعت کے کمال درجہ کا حریص اور لالچی ۔ تو ایسا شخص بھی بقول حضرات عیسائیاں باوصف ایسی حالت خراب کے خدا کا نبی اور مقرب ہوسکتا ہے ۔ بلکہ ایک مسیح کو باہر نکال کر دوسرے تمام انبیاء جن کی نبوت کو بھی وہ مانتے ہیں اور ان کی الہامی کتابوں کو بھی مقدس مقدس کر کے پکارتے ہیں وہ نعوذ باللہ بقول ان کے ایسے ہی تھے اور کمالات قدسیہ سے جو مستلزم عصمت و پاک دلی ہیں محروم تھے ۔ عیسائیوں کی عقل اور خدا شناسی پر بھی ہزار آفرین ۔ کیا اچھا نور وحی کے نازل ہونے کا فلسفہ بیان کیا مگر ایسے فلسفہ کے تابع ہونے والے اور اس کو پسند کرنے والے وہی لوگ ہیں جو سخت ظلمت اور کور باطنی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں ۔ ورنہ نور کے فیض کے لئے نور کا ضروری ہونا ایسی بدیہی صداقت ہے کہ کوئی ضعیف العقل بھی اس سے انکار نہیں کرسکتا ۔ مگر ان کا کیا علاج جن کو عقل سے کچھ بھی سروکار نہیں اور جو کہ روشنی سے بغض اور اندھیرے سے پیار کرتے ہیں اور چمگادڑ کی طرح رات میں ان کی آنکھیں خوب کھلتی ہیں لیکن روز روشن میں وہ اندھے ہوجاتے ہیں) خدا اپنے نور کی طرف (یعنی قرآن شریف کی طرف) جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے اور وہ ہر یک چیز کو بخوبی جانتا ہے (یعنی ہدایت ایک امر منجانب اللہ ہے ۔ اسی کو ہوتی ہے جس کو عنایت ازلی سے توفیق حاصل ہو۔

دوسرے کو نہیں ہوتی۔ اور خدا مسائل دقیقہ کو مثالوں کے پیرایہ میں بیان فرماتا ہے تا حقائق عمیقہ قریب باافہام ہو جائیں۔ مگر وہ اپنے علم قدیم سے خوب جانتا ہے کہ کون ان مثالوں کو سمجھے گا اور حق کو اختیار کرے گا اور کون محروم اور مخذول رہے گا) پس اس مثال میں جس کا یہاں تک جلی قلم سے ترجمہ کیا گیا۔ خدا تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کے دل کو شیشہ مصفیٰ سے تشبیہ دی جس میں کسی نوع کی کدورت نہیں۔ یہ نورِ قلب ہے۔ پھر آنحضرت کے فہم و ادراک و عقل سلیم اور جمیع اخلاق فاضلہ جبلی و فطرتی کو ایک لطیف تیل سے تشبیہ دی جس میں بہت سی چمک ہے اور جو ذریعہ روشنی چراغ ہے یہ نور عقل ہے کیونکہ منبع و منشاء جمیع لطائفِ اندرونی کا قوت عقلیہ ہے۔ پھر ان تمام نوروں پر ایک نور آسمانی کا جو وحی ہے نازل ہونا بیان فرمایا۔ یہ نور وحی ہے۔ اور انوار ثلاثہ مل کر لوگوں کی ہدایت کا موجب ٹھہرے۔ یہی حقانی اصول ہے جو وحی کے بارہ میں قدوس قدیم کی طرف سے قانون قدیم ہے اور اس کی ذات پاک کے مناسب۔ پس اس تمام تحقیقات سے ثابت ہے کہ جب تک نور قلب و نور عقل کسی انسان میں کامل درجہ پر نہ پائے جائیں تب تک وہ نور وحی ہرگز نہیں پاتا اور پہلے اس سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کمالِ عقل و کمالِ نورانیت قلب صرف بعض افراد بشریہ میں ہوتا ہے کل میں نہیں ہوتا۔ اب ان دونوں ثبوتوں کے ملانے سے یہ امر بپایہ ثبوت پہنچ گیا کہ وحی اور رسالت فقط بعض افراد کاملہ کو ملتی ہے نہ ہر یک فردِ بشر کو۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۱۹۱، ۱۹۸ حاشیہ)

يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ عنقریب ہے کہ اس کا تیل خود بخود روشن ہو جائے اگرچہ آگ اس کو چھو بھی نہ جائے۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۹۲ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یعنی خدا آسمان و زمین کا نور ہے۔ اسی سے طبقہء سفلی اور علوی میں حیات اور بقاء کی روشنی ہے۔ (پرانی تحریریں، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۱۹)

اس کا نورِ قدرت ساری زمین و آسمان اور ذرہ ذرہ کے اندر چمک رہا ہے۔

(شحنۂ حق، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۳۹۸)

باوا صاحب (نانک۔ ناقل) کے گرنتھ پر غور کرنے والوں پر یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ویدوں کے ان اصولوں سے باوا صاحب نے صاف انکار کر دیا ہے جن کو سچائی کے مطابق نہیں پایا۔ مثلاً ویدوں کے رو سے تمام ارواح اور ذرات غیر مخلوق اور انادی ہیں لیکن باوا صاحب کے نزدیک تمام ذرات اور ارواح مخلوق ہیں جیسا کہ وہ فرماتے ہیں۔

اول اللہ نور اُپایا قدرت کے سب بندے اک نور سے سب جگ الجھا کون بھلے کون مندے

یعنی خدا تعالیٰ نے ایک نور پیدا کر کے اس نور سے تمام کائنات کو پیدا کیا۔ پس پیدائش کی رو سے تمام ارواح نوری ہیں یعنی نیک و بد کا اعمال سے فرق پیدا ہوتا ہے ورنہ باعتبار خلقت ظلمت محض کوئی بھی پیدا نہیں کیا گیا۔ ہر یک میں نور کا ذرہ مخفی ہے اس میں باوا صاحب نے آیت اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے اقتباس کیا ہے اسی لئے اللہ اور نور کا لفظ شعر میں قائم رہنے دیا تا اقتباس پر دلالت کرے اور نیز حدیث اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ کی طرف بھی اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔ (ست بچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۱۲۶، ۱۲۷)

خدا ہی ہے جو ہر دم آسمان کا نور اور زمین کا نور ہے اسی سے ہر ایک جگہ روشنی پڑتی ہے آفتاب کا وہی آفتاب ہے زمین کے تمام جانداروں کی وہی جان ہے۔ سچا زندہ خدا وہی ہے۔ مبارک وہ جو اس کو قبول کرے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۴۴)

اللہ تعالیٰ زمین وآسمان کا نور ہے۔ ہر ایک نور اسی کے نور کا پَرتَو ہے۔

(ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۲۴۷)

فَلَمَّا ثَبَتَ اَنَّ رَبَّنَا هُوَ نُوْرُ كُلِّ شَیْءٍ مِنَ الْاَشْيَاءِ. وَمُنِيْرٌ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالسَّمَآءِ. ثَبَتَ اَنَّهُ الْمُفِيْضُ مِنْ جَمِيْعِ الْاَنْحَآءِ. وَ خَالِقُ الرَّقِيْعِ وَالْغَبْرَآءِ. وَ هُوَ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ. وَ اِنَّهٗ اَعْطَى الْعَيْنَيْنِ. وَ خَلَقَ اللِّسَانَ وَالشَّفَتَيْنِ. وَهَدَى الرَّضِيْعَ اِلَى النَّجْدَيْنِ. وَمَا غَادَرَ مِنْ كَمَالٍ مَطْلُوْبٍ اِلَّا اَعْطَاهَا بِاَحْسَنِ اُسْلُوْبٍ.

اور جبکہ ثابت ہوا کہ ہمارا خدا ہر یک چیز کا نور اور زمین اور آسمان کا روشن کرنے والا ہے تو ثابت ہو گیا کہ وہی ہر یک طرح سے مبدءِ جمیع فیوض ہے اور وہی زمین وآسمان کا خالق اور احسن الخالقین ہے اس نے دو آنکھیں دیں اور زبان اور ہونٹ دیئے اور بچہ کو پستانوں کی طرف ہدایت دی اور کوئی ایسا کمال انسانی اٹھا نہ رکھا جس کی طرف انسان کو حاجت ہے اور ہر یک مطلوب احسن طور سے ادا کیا۔ (ترجمہ اصل کتاب سے)

(منن الرحمن، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۱۹۸، ۱۹۹)

خدا اصل نور ہے۔ ہر ایک نور زمین وآسمان کا اسی سے نکلا ہے پس خدا کا نام استعارۃً پتا رکھنا اور ہر ایک نور کی جڑ اس کو قرار دینا اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسانی روح کا خدا سے کوئی بھاری علاقہ ہے۔

(نسیمِ دعوت، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۳۸۶، ۳۸۷)

خدا وہ ہے جو زمین اور آسمان میں اسی کے چہرہ کی چمک ہے اور اس کے بغیر سب تاریکی ہے۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۹۷)

خدا ہر ایک چیز کا نور ہے اسی کی چمک ہر ایک چیز میں ہے خواہ وہ چیز آسمان میں ہے اور خواہ وہ زمین میں۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۲۰)

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ ﴿۳۸﴾

وہ ایسے مرد ہیں کہ ان کو یادِ الٰہی سے نہ تجارت روک سکتی ہے اور نہ بیع مانع ہوتی ہے یعنی محبتِ الٰہیہ میں ایسا کمال تام رکھتے ہیں۔ کہ دنیوی مشغولیاں گو کیسی ہی کثرت سے پیش آویں ان کے حال میں خلل انداز نہیں ہوسکتیں۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۱۷ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

یہ ایک ہی آیت صحابہؓ کے حق میں کافی ہے کہ انہوں نے بڑی بڑی تبدیلیاں کی تھیں اور انگریز بھی اس کے معترف ہیں۔ ان کی کہیں نظیر ملنا مشکل ہے۔ بادیہ نشیں لوگ اور اتنی بہادری اور جرأت۔ تعجب آتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

یاد رکھو کہ کامل بندے اللہ تعالیٰ کے وہی ہوتے ہیں جن کی نسبت فرمایا ہے لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ جب دل خدا کے ساتھ سچا تعلق اور عشق پیدا کر لیتا ہے تو وہ اس سے الگ ہوتا ہی نہیں۔ اس کی ایک کیفیت اس طریق پر سمجھ میں آسکتی ہے کہ جیسے کسی کا بچہ بیمار ہو تو خواہ وہ کہیں جاوے کسی کام میں مصروف ہو مگر اس کا دل اور دھیان اسی بچہ میں رہے گا۔ اسی طرح جو لوگ خدا کے ساتھ سچا تعلق اور محبت پیدا کرتے ہیں وہ کسی حال میں بھی خدا کو فراموش نہیں کرتے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۲۱ مورخہ ۲۴؍جون ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

دین اور دنیا ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے سوائے اس حالت کے جب خدا چاہے تو کسی شخص کی فطرت کو ایسا سعید بنائے کہ وہ دنیا کے کاروبار میں پڑ کر بھی اپنے دین کو مقدم رکھے اور ایسے شخص بھی دنیا میں ہوتے ہیں چنانچہ ایک شخص کا ذکر تذکرہ اولیاء میں ہے کہ ایک شخص ہزار ہا روپیہ کے لین دین کرنے میں مصروف تھا ایک ولی اللہ نے اس کو دیکھا اور کشفی نگاہ اس پر ڈالی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا دل باوجود اس قدر لین دین روپیہ کے خدا تعالیٰ سے ایک دم غافل نہ تھا۔ ایسے ہی آدمیوں کے متعلق خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لَا تُلْهِيْهِمْ

تِجَارَةٌ وَّ لَا بَیْعٌ کوئی تجارت اور خرید وفروخت ان کو غافل نہیں کرتی اور انسان کا کمال بھی یہی ہے کہ دنیوی کاروبار میں بھی مصروفیت رکھے اور پھر خدا کو بھی نہ بھولے۔ وہ ٹٹو کس کام کا ہے جو بروقت بوجھ لادنے کے بیٹھ جاتا ہے اور جب خالی ہو تو خوب چلتا ہے وہ قابلِ تعریف نہیں۔ وہ فقیر جو دنیوی کاموں سے گھبرا کر گوشہ نشین بن جاتا ہے وہ ایک کمزوری دکھلاتا ہے۔ اسلام میں رہبانیت نہیں۔ ہم کبھی نہیں کہتے کہ عورتوں کو اور بال بچوں کو ترک کر دو اور دنیوی کاروبار کو چھوڑ دو۔ نہیں۔ بلکہ ملازم کو چاہیے کہ اپنی ملازمت کے فرائض ادا کرے اور تاجر اپنی تجارت کے کاروبار کو پورا کرے لیکن دین کو مقدم رکھے۔

اس کی مثال خود دنیا میں موجود ہے کہ تاجر اور ملازم لوگ باوجود اس کے کہ وہ اپنی تجارت اور ملازمت کو بہت عمدگی سے پورا کرتے ہیں پھر بھی بیوی بچے رکھتے ہیں اور ان کے حقوق برابر ادا کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک انسان ان تمام مشاغل کے ساتھ خدا تعالیٰ کے حقوق کو ادا کر سکتا ہے اور دین کو دنیا پر مقدم رکھ کر بڑی عمدگی سے اپنی زندگی گزار سکتا ہے۔　(بدر جلد ۶ نمبر ۱۱ مورخہ ۱۴؍ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

ہمارے ایسے بندے بھی ہیں جو بڑے بڑے کارخانہ تجارت میں ایک دم کے لئے بھی ہمیں نہیں بھولتے خدا سے تعلق رکھنے والا دنیا دار نہیں کہلاتا۔　(بدر جلد ۷ نمبر ۱ مورخہ ۹؍ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۰)

ہم یہ نہیں کہتے کہ زراعت والا زراعت کو اور تجارت والا تجارت کو۔ ملازمت والا ملازمت کو اور صنعت و حرفت والا اپنے کاروبار کو ترک کر دے اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ والا معاملہ ہو۔ دست با کار دِل با یار والی بات ہو۔ تاجر اپنے کاروبارِ تجارت میں اور زمیندار اپنے امورِ زراعت میں اور بادشاہ اپنے تختِ حکومت پر بیٹھ کر۔ غرض جو جس کام میں ہے اپنے کاموں میں خدا کو نصب العین رکھے اور اس کی عظمت اور جبروت کو پیشِ نظر رکھ کر اس کے احکام اور اوامر و نواہی کا لحاظ رکھتے ہوئے جو چاہے کرے۔ اللہ سے ڈر اور سب کچھ کر۔

اسلام کہاں ایسی تعلیم دیتا ہے کہ تم کاروبار چھوڑ کر لنگڑے لُولوں کی طرح نکمے بیٹھ رہو اور بجائے اس کے کہ اوروں کی خدمت کرو خود دوسروں پر بوجھ بنو۔ نہیں بلکہ سست ہونا گناہ ہے بھلا ایسا آدمی پھر خدا اور اس کے دین کی کیا خدمت کر سکے گا۔ عیال و اطفال جو خدا نے اس کے ذمے لگائے ہیں ان کو کہاں سے کھلائے گا۔

پس یاد رکھو کہ خدا کا یہ ہرگز منشاء نہیں کہ تم دنیا کو بالکل ترک کر دو بلکہ اس کا جو منشاء ہے وہ یہ ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا تجارت کرو، زراعت کرو، ملازمت کرو اور حرفت کرو۔ جو چاہو کرو مگر نفس کو خدا کی نافرمانی

سے روکتے رہو اور ایسا تزکیہ کرو کہ یہ امور تمہیں خدا سے غافل نہ کر دیں پھر جو تمہاری دنیا ہے وہ بھی دین کے حکم میں آجاوے گی۔

انسان دنیا کے واسطے پیدا نہیں کیا گیا۔ دل پاک ہو اور ہر وقت یہ لَو اور تڑپ لگی ہوئی ہو کہ کسی طرح خدا خوش ہو جائے تو پھر دنیا بھی اس کے واسطے حلال ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۹، ۵۰ مورخہ ۲۶ تا ۳۰ راگست ۱۹۰۸ء صفحہ ۳، ۴)

وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ؕ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۶﴾

خدا نے ہر ایک جاندار کو پانی سے پیدا کیا سو بعض جاندار پیٹ پر چلتے ہیں اور بعض دو پاؤں پر بعض چار پاؤں پر۔ خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے یہ مختلف چیزیں اس لئے بنائیں کہ تا مختلف قدرتیں اس کی ظاہر ہوں۔ غرض اختلاف طبائع جو فطرتِ مخلوقات میں واقع ہے۔ اس میں حکمت الٰہیہ انہیں امورِ ثلاثہ میں منحصر ہے جن کو خدائے تعالیٰ نے آیاتِ ممدوحہ میں بیان کر دیا۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۰۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۵﴾

کہہ خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور یہ مسلم اور بدیہی امر ہے کہ خدا کے احکام سے تخلف کرنا معصیت اور موجب دخول جہنم ہے اور اس مقام میں جس طرح خدا اپنی اطاعت کے لئے حکم فرماتا ہے ایسا ہی رسول کی اطاعت کے لئے حکم فرماتا ہے۔ سو جو شخص اس کے حکم سے منہ پھیرتا ہے وہ ایسے جرم کا ارتکاب کرتا ہے جس کی سزا جہنم ہے۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۲۸)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا

اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۵۶

خدا نے تم میں سے بعض نیکوکار ایمانداروں کے لئے یہ وعدہ ٹھہرا رکھا ہے کہ وہ انہیں زمین پر اپنے رسول مقبول کے خلیفے کرے گا انہیں کی مانند جو پہلے کرتا رہا ہے اور ان کے دین کو کہ جو ان کے لئے اس نے پسند کر لیا ہے یعنی دین اسلام کو زمین پر جما دے گا اور مستحکم اور قائم کر دے گا اور بعد اس کے کہ ایماندار خوف کی حالت میں ہوں گے یعنی بعد اس وقت کے کہ جب بباعث وفات حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ خوف دامنگیر ہوگا کہ شاید اب دین تباہ نہ ہو جائے۔ تو اس خوف اور اندیشہ کی حالت میں خدائے تعالیٰ خلافت حقہ کو قائم کر کے مسلمانوں کو اندیشہ ابتری دین سے بےغم اور امن کی حالت میں کر دے گا وہ خالصاً میری پرستش کریں گے اور مجھ سے کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ یہ تو ظاہری طور پر بشارت ہے مگر جیسا کہ آیات قرآنیہ میں عادت الٰہیہ جاری ہے اس کے نیچے ایک باطنی معنے بھی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ باطنی طور پر ان آیات میں خلافت روحانی کی طرف بھی اشارہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر یک خوف کی حالت میں کہ جب محبت الٰہیہ دلوں سے اٹھ جائے اور مذاہب فاسدہ ہر طرف پھیل جائیں اور لوگ رو بہ دنیا ہو جائیں اور دین کے گم ہونے کا اندیشہ ہو تو ہمیشہ ایسے وقتوں میں خدا روحانی خلیفوں کو پیدا کرتا رہے گا کہ جن کے ہاتھ پر روحانی طور پر نصرت اور فتح دین کی ظاہر ہو۔ اور حق کی عزت اور باطل کی ذلت ہو۔ تا ہمیشہ دین اپنی اصلی تازگی پر عود کرتا رہے اور ایماندار ضلالت کے پھیل جانے اور دین کے مفقود ہو جانے کے اندیشہ سے امن کی حالت میں آجائیں۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۹، ۲۶۰ حاشیہ نمبر ۱۱)

خدائے تعالیٰ نے اس اُمّت کے مومنوں اور نیکوکاروں کے لئے وعدہ فرمایا ہے کہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسا کہ اس نے پہلوں کو بنایا تھا یعنی اُسی طرز اور طریق کے موافق اور نیز اُسی مدت اور زمانہ کے مشابہ اور اُسی صورت جلالی اور جمالی کی مانند جو بنی اسرائیل میں سنّت اللہ گزر چکی ہے اس اُمّت میں بھی خلیفے بنائے جائیں گے اور اُن کا سِلسلہ خلافت اس سلسلے سے کم نہیں ہوگا۔ جو بنی اسرائیل کے خلفاء کے لئے مقرر کیا گیا تھا اور نہ ان کی طرز خلافت اس طرز سے مبائن و مخالف ہوگی جو بنی اسرائیل کے خلیفوں کے لئے مقرر

کی گئی تھی۔ پھر آگے فرمایا ہے کہ ان خلیفوں کے ذریعے سے زمین پر دین جما دیا جائے گا اور خدا خوف کے دنوں کے بعد امن کے دن لائے گا۔ خالصًا اُسی کی بندگی کریں گے اور کوئی اس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ لیکن اس زمانہ کے بعد پھر کفر پھیل جائے گا۔ مماثلت تامہ کا اشارہ جو كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے سمجھا جاتا ہے۔ صاف دلالت کررہا ہے کہ یہ مماثلت مدت ایام خلافت اور خلیفوں کی طرز اصلاح اور طرزِ ظہور سے متعلق ہے۔ سو چونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل میں خلیفۃ اللہ ہونے کا منصب حضرت موسیٰ سے شروع ہوا اور ایک مدت دراز تک نوبت بہ نوبت انبیاء بنی اسرائیل میں رہ کر آخر چودہ (سو) برس کے پورے ہونے تک حضرت عیسیٰ ابن مریم پر یہ سلسلہ ختم ہوا حضرت عیسیٰ ابن مریم ایسے خلیفۃ اللہ تھے کہ ظاہری عنان حکومت اُن کے ہاتھ میں نہیں آئی تھی اور سیاست ملکی اور اس دنیوی بادشاہی سے ان کو کچھ علاقہ نہیں تھا اور دنیا کے ہتھیاروں سے وہ کچھ کام نہیں لیتے تھے بلکہ اس ہتھیار سے کام لیتے تھے جو اُن کے انفاس طیّبہ میں تھا۔ یعنی اس موجّہ بیان سے جو اُن کی زبان پر جاری کیا گیا تھا جس کے ساتھ بہت سی برکتیں تھیں اور جس کے ذریعہ سے وہ مرے ہوئے دلوں کو زندہ کرتے تھے اور بہرے کانوں کو کھولتے تھے اور مادرزاد اندھوں کو سچائی کی روشنی دکھا دیتے تھے اُن کا وہ دم ازلی کافر کو مارتا تھا اور اُس پر پوری حجت کرتا تھا لیکن مومن کو زندگی بخشتا تھا۔ وہ بغیر باپ کے پیدا کئے گئے تھے اور ظاہری اسباب اُن کے پاس نہیں تھے اور ہر بات میں خدائے تعالیٰ اُن کا متولّی تھا۔ وہ اُس وقت آئے تھے کہ جبکہ یہودیوں نے نہ صرف دین کو بلکہ انسانیت کی خصلتیں بھی چھوڑ دی تھیں اور بے رحمی اور خود غرضی اور کینہ اور بُغض اور ظلم اور حسد اور بے جا جوش نفس امّارہ کے اُن میں ترقی کر گئے تھے۔ اور نہ صرف بنی نوع کے حقوق کو انہوں نے چھوڑ دیا تھا بلکہ غلبہ شقاوت کی وجہ سے حضرت محسنِ حقیقی سے عبودیت اور اطاعت اور سچے اخلاص کا رشتہ بھی توڑ بیٹھے تھے۔ صرف بے مغز استخوان کی طرح توریت کے چند الفاظ اُن کے پاس تھے جو قہر الٰہی کی وجہ سے ان کی حقیقت تک وہ نہیں پہنچ سکتے تھے کیونکہ ایمانی فراست اور زیرکی بالکل اُن میں سے اُٹھ گئی تھی اور اُن کے نفوس مظلمہ پر جہل غالب آ گیا تھا اور سفلی مکاریاں اور کراہت کے کام اُن سے سرزد ہوتے تھے اور جھوٹ اور ریاکاری اور غدّاری اُن میں انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ ایسے وقت میں اُن کی طرف مسیح ابن مریم بھیجا گیا تھا جو بنی اسرائیل کے مسیحوں اور خلیفوں میں سے آخری مسیح اور آخری خلیفۃ اللہ تھا جو برخلاف سُنّت اکثر نبیوں کے بغیر تلوار اور نیزہ کے آیا تھا۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ شریعت موسوی میں خلیفۃ اللہ کو مسیح کہتے تھے اور حضرت داوٗد کے وقت اور یا اُن سے

کچھ عرصہ پہلے یہ لفظ بنی اسرائیل میں شائع ہو گیا تھا۔ بہرحال اگرچہ بنی اسرائیل میں کئی مسیح آئے لیکن سب سے پیچھے آنے والا مسیح وہی ہے جس کا نام قرآن کریم میں مسیح عیسیٰ بن مریم بیان کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل میں مریمیں بھی کئی تھیں اور ان کے بیٹے بھی کئی تھے لیکن مسیح عیسیٰ بن مریم یعنی اِن تینوں ناموں سے ایک مرکب نام بنی اسرائیل میں اُس وقت اور کوئی نہیں پایا گیا۔ سو مسیح عیسیٰ بن مریم یہودیوں کی اس خراب حالت میں آیا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ آیات موصوفہ بالا میں ابھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کا اس اُمّت کے لئے وعدہ تھا کہ بنی اسرائیل کی طرز پر ان میں بھی خلیفے پیدا ہوں گے۔ اب ہم جب اس طرز کو نظر کے سامنے لاتے ہیں تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ضرور تھا کہ آخری خلیفہ اس اُمّت کا مسیح ابن مریم کی صورت مثالی پر آوے اور اس زمانہ میں آوے کہ جو اُس وقت سے مشابہ ہو جس وقت میں بعد حضرت موسیٰ کے مسیح ابن مریم آئے تھے یعنی چودھویں صدی میں یا اس کے قریب اُس کا ظہور ہو اور ایسا ہی بغیر سیف وسنان کے اور بغیر آلات حرب کے آوے جیسا کہ حضرت مسیح ابن مریم آئے تھے اور نیز ایسے ہی لوگوں کی اصلاح کے لئے آوے جیسا کہ مسیح ابن مریم اُس وقت کے خراب اندرون یہودیوں کی اصلاح کے لئے آئے تھے۔ اور جب آیات ممدوحہ بالا کو غور سے دیکھتے ہیں تو ہمیں ان کے اندر سے یہ آواز سُنائی دیتی ہے کہ ضرور آخری خلیفہ اس اُمّت کا جو چودھویں صدی کے سر پر ظہور کرے گا حضرت مسیح کی صورت مثالی پر آئے گا اور بغیر آلاتِ حرب ظہور کرے گا دو سلسلوں کی مماثلت میں یہی قاعدہ ہے کہ اوّل اور آخر میں اشد درجہ کی مشابہت اُن میں ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک لمبے سلسلہ اور ایک طولانی مدت میں تمام درمیانی افراد کا مفصل حال معلوم کرنا طول بلا طائل ہے۔ پس جبکہ قرآن کریم نے صاف صاف بتلا دیا کہ خلافت اسلامی کا سلسلہ اپنی ترقی اور تنزّل اور اپنی جلالی اور جمالی حالت کی رو سے خلافت اسرائیلی سے بکلی مطابق ومشابہ ومماثل ہوگا اور یہ بھی بتلا دیا کہ نبی عربی امّی مثیل موسیٰ ہے تو اس ضمن میں قطعی اور یقینی طور پر بتلایا گیا کہ جیسے اسلام میں سر دفتر الٰہی خلیفوں کا مثیل موسیٰ ہے جو اس سلسلہ اسلامیہ کا سپہ سالار اور بادشاہ اور تختِ عزت کے اوّل درجہ پر بیٹھنے والا اور تمام برکات کا مصدر اور اپنی روحانی اولاد کا مورث اعلیٰ ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایسا ہی اس سلسلہ کا خاتم باعتبار نسبت تامہ وہ مسیح عیسیٰ بن مریم ہے جو اس اُمّت کے لوگوں میں سے بحکم ربی مسیحی صفات سے رنگین ہو گیا ہے اور فرمان جَعَلْنَاكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ نے اُس کو درحقیقت وہی بنا دیا ہے۔ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا۔ اور اس آنے والے کا نام جو احمد رکھا گیا ہے وہ بھی اس کے مثیل ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ محمدؐ

جلالی نام ہے اور احمد جمالی۔ اور احمد اور عیسیٰ اپنے جمالی معنوں کی رُو سے ایک ہی ہیں۔ اسی کی طرف یہ اشارہ ہے وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ۔ مگر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فقط احمد ہی نہیں بلکہ محمد بھی ہیں یعنی جامع جلال و جمال ہیں۔ لیکن آخری زمانہ میں برطبق پیشگوئی مجرّد احمد جو اپنے اندر حقیقت عیسویت رکھتا ہے بھیجا گیا۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۶۰ تا ۴۶۳)

خدا وعدہ دے چکا ہے کہ اس دین میں رسول اللہ صلعم کے بعد خلیفے پیدا کرے گا اور قیامت تک اس کو قائم کرے گا۔ یعنی جس طرح موسیٰؑ کے دین میں مدت ہائے دراز تک خلیفے اور بادشاہ بھیجتا رہا ایسا ہی اس جگہ بھی کرے گا اور اس کو معدوم ہونے نہیں دے گا۔ اَب قرآن شریف موجود ہے حافظ بھی بیٹھے ہیں دیکھ لیجئے کہ کفار نے کس دعوے کے ساتھ اپنی رائیں ظاہر کیں کہ یہ دین ضرور معدوم ہو جائے گا اور ہم اس کو کالعدم کر دیں گے اور ان کے مقابل پر یہ پیشگوئی کی گئی جو قرآن شریف میں موجود ہے کہ ہرگز تباہ نہیں ہوگا۔ یہ ایک بڑے درخت کی طرح ہو جائے گا اور پھیل جائے گا اور اس میں بادشاہ ہوں گے۔

(جنگِ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۹۰، ۲۹۱)

خدا نے اُن لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کئے یہ وعدہ کیا ہے کہ البتہ اُنہیں زمین میں اسی طرح خلیفہ کرے گا جیسا کہ اُن لوگوں کو کیا جو اُن سے پہلے گزر گئے اور اُن کے دین کو جو اُن کے لئے پسند کیا ہے ثابت کر دے گا اور اُن کے لئے خوف کے بعد امن کو بدل دے گا میری عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ الجزو نمبر ۱۸ سُورۃ نور۔ اب غور سے دیکھو کہ اِس آیت میں بھی مماثلت کی طرف صریح اشارہ ہے اور اگر اس مماثلت سے مماثلت تامہ مُراد نہیں تو کلام عبث ہوا جاتا ہے کیونکہ شریعت موسوی میں چودہ سو برس تک خلافت کا سلسلہ ممتد رہا نہ صرف تیس برس تک اور صدہا خلیفے رُوحانی اور ظاہری طور پر ہوئے نہ صرف چار اور پھر ہمیشہ کے لئے خاتمہ۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ مِنْكُمْ کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ وہ خلیفے صرف صحابہ میں سے ہوں کیونکہ منکم کے لفظ میں مخاطب صرف صحابہ ہیں تو یہ خیال ایک بدیہی غلطی ہے اور ایسی بات صرف اُس شخص کے مُنہ سے نکلے گی جس نے کبھی قرآن کریم کو غور سے نہیں پڑھا اور نہ اُس کی اسالیب کلام کو پہچانا کیونکہ اگر یہی بات سچ ہے کہ مخاطبت کے وقت وہی لوگ مُراد ہوتے ہیں جو موجودہ زمانہ میں بحیثیت ایمانداری زندہ موجود ہوں تو ایسا تجویز کرنے سے سارا قرآن زیروزبر ہو جائے گا۔ مثلاً اسی آیت موصوفہ بالا کے مشابہ قرآن کریم میں ایک اور آیت

بھی ہے جس میں اسی طرح بظاہر الفاظ وہ لوگ مخاطب ہیں جو حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تھے اور اس وقت زندہ موجود تھے بلکہ ان آیات میں تو اس بات پر نہایت قوی قرائن موجود ہیں کہ در حقیقت وہی مخاطب کئے گئے ہیں اور وہ آیات یہ ہیں قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ۔ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۬ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ قَالُوْۤا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۔ (الاعراف:۱۲۸ تا ۱۳۰) الجزو نمبر ۹ سورۃ الاعراف۔ یعنی فرعون نے کہا کہ ہم بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور اُن کی بیٹیوں کو زندہ رکھیں گے اور تحقیقاً ہم ان پر غالب ہیں۔ تب موسیٰ نے اپنی قوم کو کہا کہ اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو زمین خدا کی ہے جس کو اپنے بندوں سے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور انجام بخیر پرہیزگاروں کا ہی ہوتا ہے۔ تب موسیٰ کی قوم نے اس کو جواب دیا کہ ہم تیرے پہلے بھی ستائے جاتے تھے اور تیرے آنے کے بعد بھی ستائے گئے تو موسیٰ نے اُن کے جواب میں کہا کہ قریب ہے کہ خُدا تمہارے دشمن کو ہلاک کرے اور زمین پر تمہیں خلیفے مقرر کر دے اور پھر دیکھے کہ تم کس طور کے کام کرتے ہو۔

اَب اِن آیات میں صریح اور صاف طور پر وہی لوگ مخاطب ہیں جو حضرت موسیٰ کی قوم میں سے اُن کے سامنے زندہ موجود تھے اور انہوں نے فرعون کے ظلموں کا شِکوہ بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ ہم تیرے پہلے بھی ستائے گئے اور تیرے آنے کے بعد بھی اور انہیں کو خطاب کر کے کہا تھا کہ تم ان تکلیفات پر صبر کرو خدا تمہاری طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہوگا اور تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تم کو زمین پر خلیفے بنا دے گا لیکن تاریخ دانوں پر ظاہر ہے اور یہودیوں اور نصاریٰ کی کتابوں کو دیکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ گو اس قوم کا دشمن یعنی فرعون اُن کے سامنے ہلاک ہوا مگر وہ خود تو زمین پر نہ ظاہری خلافت پر پہنچے نہ باطنی خلافت پر۔ بلکہ اکثر ان کی نافرمانیوں سے ہلاک کئے گئے اور چالیس برس تک بیابان لق ودق میں آوارہ رہ کر جان بحق تسلیم ہوئے پھر بعد ان کی ہلاکت کے ان کی اولاد میں ایسا سلسلہ خلافت کا شروع ہوا کہ بہت سے بادشاہ اس قوم میں ہوئے اور داؤد اور سلیمان جیسے خلیفۃ اللہ اسی قوم میں سے پَیدا ہوئے یہاں تک کہ آخر یہ سلسلہ خلافت کا چودھویں صدی میں حضرت مسیح پر ختم ہوا پس اس سے ظاہر ہے کہ کسی قوم موجودہ کو مخاطب کرنے سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خطاب قوم موجودہ تک ہی محدود رہے بلکہ قرآن کریم کا تو یہ بھی محاورہ پایا جاتا

ہے کہ بسا اوقات ایک قوم کو مخاطب کرتا ہے مگر اصل مخاطب کوئی اور لوگ ہوتے ہیں جو گزر گئے یا آئندہ آنے والے ہیں مثلاً اللہ جلّ شانہ، سورۃ البقر میں یہود موجودہ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (البقرۃ:۴۱) یعنی اے بنی اسرائیل اُس نعمت کو یاد کرو جو ہم نے تم پر انعام کی اور میرے عہد کو پُورا کرو تا مَیں بھی تمہارے عہد کو پُورا کروں اور مجھ سے پس ڈرو۔ اب ظاہر ہے کہ یہود موجودہ زمانہ آنحضرت تو ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ کا مصداق تھے ان پر تو کوئی انعام بھی نہیں ہوا تھا اور نہ ان سے یہ عہد ہوا تھا کہ تم نے خاتم الانبیاء پر ایمان لانا۔ پھر بعد اس کے فرمایا وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۔ وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔ (البقرۃ:۵۰،۵۱) یعنی وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم کو آل فرعون سے نجات دی وہ تم کو طرح طرح کے دُکھ دیتے تھے تمہارے لڑکوں کو مار ڈالتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے تمہارا بڑا امتحان تھا اور وہ وقت یاد کرو جبکہ ہم نے تمہارے پہنچنے کے ساتھ ہی دریا کو پھاڑ دیا۔ پھر ہم نے تم کو نجات دے دی اور فرعون کے لوگوں کو ہلاک کر دیا اور تم دیکھتے تھے۔

اب سوچنا چاہیئے کہ ان واقعات میں سے کوئی واقعہ بھی ان یہودیوں کو پیش نہیں آیا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے نہ وہ فرعون کے ہاتھ سے دُکھ دیئے گئے نہ اُن کے بیٹوں کو کسی نے قتل کیا نہ وہ کسی دریا سے پار کئے گئے۔ پھر آگے فرماتا ہے وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى (البقرۃ:۵۶ تا ۵۸) یعنی وہ وقت یاد کرو جب تم نے موسیٰ کو کہا کہ ہم تیرے کہے پر تو ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو بچشم خود نہ دیکھ لیں تب تم پر صاعقہ پڑی اور پھر تم کو زندہ کیا گیا تا کہ تم شکر کرو اور ہم نے بادلوں کو تم پر سائبان کیا اور ہم نے تم پر من وسلویٰ اُتارا۔ اب ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ تو ان یہودیوں سے جو قرآن میں مخاطب کئے گئے دو ہزار برس پہلے فوت ہو چکے تھے اور ان کا حضرت موسیٰ کے زمانہ میں نام ونشان بھی نہ تھا پھر وہ حضرت موسیٰ سے ایسا سوال کیوں کر کر سکتے تھے کہاں اُن پر بجلی گری کہاں انہوں نے من وسلویٰ کھایا۔ کیا وہ پہلے حضرت موسیٰ کے زمانہ میں اور اور قالبوں میں موجود تھے اور پھر آنحضرتؐ کے زمانہ میں بھی بطور تناسخ آ موجود ہوئے اور اگر یہ نہیں تو بجز

اس تاویل کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ مخاطبت کے وقت ضروری نہیں کہ وہی لوگ حقیقی طور پر واقعات منسوبہ کے مصداق ہوں جو مخاطب ہوں۔ کلام الٰہی اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ ایک قاعدہ ٹھہر گیا ہے کہ بسا اوقات کوئی واقعہ ایک شخص یا ایک قوم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور دراصل وہ واقعہ کسی دوسری قوم یا دُوسرے شخص سے تعلق رکھتا ہے اور اسی باب میں سے عیسیٰ بن مریم کے آنے کی خبر ہے کیونکہ بعض احادیث میں آخری زمانہ میں آنے کا ایک واقعہ حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کیا گیا حالانکہ وہ فوت ہو چکے تھے پس یہ واقعہ بھی حضرت مسیح کی طرف ایسا ہی منسوب ہے جیسا کہ واقعہ فرعون کے ہاتھ سے نجات پانے کا اور من وسلوٰی کھانے کا اور صاعقہ گرنے کا اور دریا سے پار ہونے کا اور قصّہ لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ (البقرۃ:۶۲) کا اُن یہودیوں کی طرف منسوب کیا گیا جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں موجود تھے۔ حالانکہ وہ واقعات اُن کی پہلی قوم کے تھے جو اُن سے صدہا برس پہلے مر چکے تھے۔ پس اگر کسی کو آیات کے معنے کرنے میں معقولی شق کی طرف خیال نہ ہو اور ظاہر الفاظ پر اڑ جانا واجب سمجھے تو کم سے کم ان آیات سے یہ ثابت ہوگا کہ مسئلہ تناسخ حق ہے ورنہ کیوں کر ممکن تھا کہ خدا تعالیٰ ایک فاعل کے فعل کو کسی ایسے شخص کی طرف منسوب کرے جس کو اِس فعل کے ارتکاب سے کچھ بھی تعلق نہیں حالانکہ وُہ آپ ہی فرماتا ہے لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (بنی اسرائیل:۱۶) پھر اگر موسیٰ کی قوم نے موسیٰ کی نافرمانی کی تھی اور اُن پر بجلی گری تھی یا انہوں نے گوسالہ پرستی کی تھی اور ان پر عذاب نازل ہوا تھا تو اس دُوسری قوم کو ان واقعات سے کیا تعلق تھا جو دو ہزار برس بعد پیدا ہوئے۔ یُوں تو حضرت آدم سے تا ایں دم متقدمین متاخرین کے لئے بطور آباء واجداد ہیں لیکن کسی کا گنہ کسی پر عائد نہیں ہوسکتا۔ پھر خدا تعالیٰ کا قرآن کریم میں یہ فرمانا کہ تم نے موسیٰ کی نافرمانی کی اور تم نے کہا کہ ہم خدا کو نہیں مانیں گے جب تک اس کو دیکھ نہ لیں اور اس گنہ کے سبب سے تم پر بجلی گری کیوں کر ان تمام الفاظ کے بنظر ظاہر کوئی اور معنے ہو سکتے ہیں بجُز اس کے کہ کہا جائے کہ دراصل وہ تمام یہودی جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں موجود تھے حضرت موسیٰ کے وقت میں بھی موجود تھے اور انہیں پر من وسلوٰی نازل ہوا تھا اور انہیں پر بجلی پڑی تھی اور انہیں کی خاطر فرعون کو ہلاک کیا گیا تھا اور پھر وہی یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بطور تناسخ پیدا ہو گئے اور اِس طرح پر خطاب صحیح ٹھہر گیا مگر سوال یہ ہے کہ کیوں ایسے سیدھے معنے نہیں کئے جاتے۔ کیا یہ خدا تعالیٰ کی قدرت سے دُور ہیں اور کیوں ایسے معنے قبول کئے جاتے ہیں جو تاویلات بعیدہ کے حکم میں ہیں کیا خدا تعالیٰ قادر نہیں کہ جس طرح

بقول ہمارے مخالفوں کے وہ حضرت عیسیٰ کو بعینہٖ بجسدہ العنصری کسی وقت صدہا برسوں کے بعد پھر زمین پر لے آئے گا۔ اسی طرح اُس نے حضرت موسیٰ کے زمانہ کے یہودیوں کو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں زندہ کر دیا ہو یا اُن کی رُوحوں کو بطور تناسخ پھر دُنیا میں لے آیا ہو جس حالت میں صرف بے بنیاد اقوال کی بنیاد پر حضرت عیسیٰ کی روح کا پھر دنیا میں آنا تسلیم کیا گیا ہے تو کیوں اور کیا وجہ کہ ان تمام یہودیوں کی روحوں کا دوبارہ بطور تناسخ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں آجانا قبول نہ کیا جائے جن کے موجود ہو جانے پر نصوص صریحیہ بیّنہ قرآن کریم شاہد ہیں۔ دیکھو خدا تعالیٰ صاف فرماتا ہے وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (البقرۃ:۵۶) یعنی تم وہ وقت یاد کرو جبکہ تم نے نہ کسی اور نے یہ کہا کہ ہم تیرے کہنے پر تو ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم آپ ظاہر ظاہر خدا کو نہ دیکھ لیں اور پھر تم کو بجلی نے پکڑا اور تم دیکھتے تھے۔ اور اس آیت میں ایک اور لطیفہ یہ ہے کہ چونکہ خدا تعالیٰ نے اِس آیت کے مضمون میں موجودہ یہودیوں کو گذشتہ لوگوں کے قائم مقام نہیں ٹھہرایا بلکہ اُن کو فی الحقیقت گذشتہ لوگ ہی ٹھہرا دیا تو اس صورت میں قرآن کریم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کے یہودیوں کے وہی نام رکھ دیئے جو اُن گذشتہ بنی اسرائیل کے نام تھے کیونکہ جبکہ یہ لوگ حقیقتاً وہی لوگ قرار دیئے گئے تو یہ لازمی ہوا کہ نام بھی وہی ہوں وجہ یہ کہ نام حقائق کے لئے مثل عوارض غیر منفک کے ہیں اور عوارض لازمیہ اپنے حقائق سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اب خوب متوجہ ہو کر سوچو کہ جبکہ خدا تعالیٰ نے صریح اور صاف لفظوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم نے ہی ایسے ایسے برے کام حضرت موسیٰ کے عہد میں کیے تھے تو پھر ایسی صریح اور کُھلی کُھلی نص کی تاویل کرنا اور احادیث کی بنیاد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو قرآن کریم کی رُو سے وفات یافتہ ہے پھر زمین پر اُتارنا کیسی بے اعتدالی اور ناانصافی ہے۔ عزیزو! اگر خدا تعالیٰ کی یہی عادت اور سنت ہے کہ گذشتہ لوگوں کو پھر دُنیا میں لے آتا ہے تو نص قرآنی جو بہ تکرار در تکرار گذشتہ لوگوں کو مخاطب کر کے اُن کے زندہ ہونے کی شہادت دے رہی ہے اس سے درگزر کرنا ہرگز جائز نہیں اور اگر وہاں یہ دھڑکہ دل کو پکڑتا ہے کہ ایسے معنے گو خدا تعالیٰ کی قدرت سے تو بعید نہیں لیکن معقول کے برخلاف ہیں۔ اِس لئے تاویل کی طرف رُخ کیا جاتا ہے اور وہ معنے کئے جاتے ہیں جو عند العقل کچھ بعید نہیں ہیں تو پھر ایسا ہی حضرت عیسیٰ کے آنے کی پیشگوئی کے معنے کرنے چاہئیں کیونکہ اگر گذشتہ یہودیوں کا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں زندہ ہو جانا یا اگر بطریق

تناسخ کے اُن کی رُوحیں پھر آ جانا طریق معقول کے برخلاف ہے تو حضرت مسیح کی نسبت کیوں کر دوبارہ دنیا میں آنا تجویز کیا جاتا ہے جن کی وفات پر آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (المائدۃ:۱۱۸) بلند آواز سے شہادت دے رہی ہے کیا یہودیوں کی رُوحوں کا دوبارہ دُنیا میں آنا خدا تعالیٰ کی قدرت سے بعید اور نیز طریق معقول کے برخلاف لیکن حضرت عیسیٰ کا بجسدہ العنصری پھر زمین پر آ جانا بہت معقول ہے۔ پھر اگر نصوص بیّنہ صریحہ قرآنیہ کو بباعث استبعاد ظاہری معنوں کے مؤوّل کر کے طریق صرف عن الظاہر اختیار کیا جاتا ہے تو پھر کیا وجہ کہ نصوص احادیثیہ کا صرف عن الظاہر جائز نہیں کیا احادیث کی قرآن کریم سے کوئی اعلیٰ شان ہے کہ تا ہمیشہ احادیث کے بیان کو گو کیسا ہی بعید از عقل ہو ظاہر الفاظ پر قبول کیا جائے اور قرآن میں تاویلات بھی کی جائیں۔ پھر ہم اصل کلام کی طرف رجوع کر کے لکھتے ہیں کہ بعض صاحب آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کی عمومیت سے انکار کر کے کہتے ہیں کہ مِنْكُمْ سے صحابہ ہی مراد ہیں اور خلافتِ راشدہ حقہ انہیں کے زمانہ تک ختم ہوگئی اور پھر قیامت تک اسلام میں اس خلافت کا نام ونشان نہیں ہوگا۔ گویا ایک خواب وخیال کی طرح اس خلافت کا صرف تیس ۳۰ برس ہی دَور تھا اور پھر ہمیشہ کے لئے اسلام ایک لازوال نحوست میں پڑ گیا مگر مَیں پُوچھتا ہوں کہ کیا کسی نیک دل انسان کی ایسی رائے ہوسکتی ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت تو یہ اعتقاد رکھے کہ بلاشبہ ان کی شریعت کی برکت اور خلافت راشدہ کا زمانہ برابر چودہ سو برس تک رہا لیکن وہ نبی جو افضل الرسل اور خیر الانبیاء کہلاتا ہے اور جس کی شریعت کا دامن قیامت تک ممتد ہے اس کی برکات گویا اس کے زمانہ تک ہی محدود رہیں اور خدا تعالیٰ نے نہ چاہا کہ کچھ بہت مدت تک اس کی برکات کے نمونے اس کے رُوحانی خلیفوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوں ایسی باتوں کو سُن کر تو ہمارا بدن کانپ جاتا ہے مگر افسوس کہ وہ لوگ بھی مسلمان ہی کہلاتے ہیں کہ جو سراسر چالاکی اور بیبا کی کی راہ سے ایسے بے ادبانہ الفاظ منہ پر لے آتے ہیں کہ گویا اسلام کی برکات آگے نہیں بلکہ مُدّت ہوئی کہ اُن کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

ماسویٰ اس کے مِنْكُمْ کے لفظ سے یہ استدلال پیدا کرنا کہ چونکہ خطاب صحابہ سے ہے اس لئے یہ خلافت صحابہ تک ہی محدود ہے عجیب عقلمندی ہے اگر اسی طرح قرآن کی تفسیر ہو تو پھر یہودیوں سے بھی آگے بڑھ کر قدم رکھنا ہے۔ اب واضح ہو کہ مِنْكُمْ کا لفظ قرآن کریم میں قریباً بیاسی ۸۲ جگہ آیا ہے اور بجُز دو یا تین جگہ کے جہاں کوئی خاص قرینہ قائم کیا گیا ہے باقی تمام مواضع میں مِنْكُمْ کے خطاب سے وہ تمام مسلمان مُراد ہیں جو

قیامت تک پَیدا ہوتے رہیں گے۔

اب نمونہ کے طور پر چند وہ آیتیں ہم لکھتے ہیں جن میں منکم کا لفظ پایا جاتا ہے۔

(۱) فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (البقرۃ: ۱۸۵) یعنی جو تم میں سے مریض یا سفر پر ہو تو اتنے ہی روزے اور رکھ لے۔ اب سوچو کہ کیا یہ حکم صحابہ سے ہی خاص تھا یا اس میں اور بھی مسلمان جو قیامت تک پَیدا ہوتے رہیں گے شامل ہیں ایسا ہی نیچے کی آیتوں پر بھی غور کرو۔

(۲) ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرۃ: ۲۳۳) یعنی یہ اُس کو وعظ کیا جاتا ہے جو تم میں سے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاتا ہے۔

(۳) وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا (البقرۃ: ۲۳۵) یعنی تم میں سے جو جورو ئیں چھوڑ کر فوت ہو جائیں۔

(۴) وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (اٰلِ عمران: ۱۰۵) یعنی تم میں سے ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو نیکی کی دعوت کریں اور امر معروف اور نہی منکر اپنا طریق رکھیں۔

(۵) اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (اٰلِ عمران: ۱۹۵) مَیں تم میں سے کسی عامل کا عمل ضائع نہیں کروں گا خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت ہو۔

(۶) لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء: ۳۰) ناجائز طور پر ایک دوسرے کے مال مت کھاؤ مگر باہم رضامندی کی تجارت سے۔

(۷) وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (المائدۃ: ۷) یعنی اگر تم مریض ہو یا سفر پر یا پاخانہ سے آؤ یا عورتوں سے مباشرت کرو اور پانی نہ ملے تو ان سب صورتوں میں پاک مٹی سے تیمّم کر لو۔

(۸) اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (النساء: ۶۰) یعنی اللہ اور رسول اور اپنے بادشاہوں کی تابعداری کرو۔

(۹) مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (الانعام: ۵۵) یعنی جو شخص تم میں سے بوجہ اپنی جہالت کے کوئی بدی کرے اور پھر توبہ کرے اور نیک کاموں میں

مشغول ہو جائے پس اللہ غفور رحیم ہے۔

(۱۰) فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِ (البقرۃ :۸۶) یعنی جو شخص تم میں سے ایسا کام کرے دُنیا کی زندگی میں اُس کو رسوائی ہو گی اور قیامت کو اُس کے لئے سخت عذاب ہے۔

(۱۱) وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (مریم :۷۲) یعنی تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو دوزخ میں وارد نہ ہو۔

(۱۲) وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ (الحجر :۲۵) یعنی ہم اُن لوگوں کو جانتے ہیں جو تم میں سے آگے بڑھنے والے ہیں اور جو پیچھے رہنے والے ہیں۔

اب ان تمام مقامات کو دیکھو کہ مِنْكُمْ کا لفظ تمام مسلمانوں کے لئے عام ہے خواہ اس وقت موجود تھے خواہ بعد میں قیامت تک آتے جائیں ایسا ہی تمام دوسرے مقامات میں بجز دو تین موضعوں کے عام طور پر استعمال ہوا ہے اور تمام احکام میں بظاہر صورت مخاطب صحابہ ہی ہیں لیکن تخصیص صحابہ بجز قیام قرینہ کے جائز نہیں۔ ورنہ ہر یک فاسق عذر کر سکتا ہے کہ صوم اور صلوٰۃ اور حج اور تقویٰ اور طہارت اور اجتناب عن المعاصی کے متعلق جس قدر احکام ہیں ان احکام کے مخاطب صرف صحابہ ہی تھے اِس لئے ہمیں نماز روزہ وغیرہ کی پابندی لازم نہیں اور ظاہر ہے کہ ایسے کلمات بجز ایک زندیق کے اور کوئی خدا ترس آدمی زبان پر نہیں لا سکتا۔

اگر کسی کے دِل میں یہ خیال گزرے کہ اگر آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فائدہ عموم کا دیتی ہے یعنی مقصود اصلی تعمیم تھی نہ تخصیص۔ تو پھر مِنْكُمْ کا لفظ اس جگہ کیوں زیادہ کیا گیا۔ اور اس کی زیادت کی ضرورت ہی کیا تھی صرف اس قدر فرمایا ہوتا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وعدہ ان ایمانداروں اور نیکوکاروں کے مقابل پر تھا جو اس اُمت سے پہلے گزر چکے ہیں پس گویا تفصیل اِس آیت کی یُوں ہے کہ خدا تعالیٰ نے تم سے پہلے ان لوگوں کو رُوئے زمین پر خلیفے مقرر کیا تھا جو ایماندار اور صالح تھے اور اپنے ایمان کے ساتھ اعمال صالح جمع رکھتے تھے اور خدا تعالیٰ وعدہ کرتا ہے کہ تم میں سے بھی اے مسلمانو ایسے لوگوں کو جو انہیں صفات حسنہ سے موصوف ہوں اور ایمان کے ساتھ اعمال صالح جمع رکھتے ہوں خلیفے کرے گا پس مِنْكُمْ کا لفظ زائد نہیں بلکہ اس سے غرض یہ ہے کہ تا اسلام کے ایمانداروں اور نیکوکاروں کی طرف اشارہ کرے کیونکہ جبکہ نیکوکار اور ایماندار کا لفظ اِس آیت میں پہلی امتوں اور اِس اُمت کے ایمانداروں اور نیکوکاروں پر برابر حاوی تھا پھر اگر

کوئی تخصیص کا لفظ نہ ہوتا تو عبارت رکیک اور مبہم اور دُور از فصاحت ہوتی اور مِنْكُمْ کے لفظ سے یہ جتانا بھی منظور ہے کہ پہلے بھی وُہی لوگ خلیفے مقرر کئے گئے تھے کہ جو ایماندار اور نیکوکار تھے اور تم میں سے بھی ایماندار اور نیکوکار ہی مقرر کئے جائیں گے۔ اَب اگر آنکھیں دیکھنے کی ہوں تو عام معنی کی رُو سے مِنْكُمْ کے لفظ کا زائد ہونا کہاں لازم آتا ہے اور تکرار کلام کیوں کر ہے جبکہ ایمان اور عمل صالح اِسی اُمت سے شروع نہیں ہوا پہلے بھی مومن اور نکوکار گزرے ہیں تو اِس صورت میں تمیز کامل بجز مِنْكُمْ کے لفظ کے کیوں کر ہوسکتی تھی۔ اگر صرف اِس قدر ہوتا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ تو کچھ معلوم نہ ہوسکتا تھا کہ یہ کن ایمانداروں کا ذکر ہے آیا اس اُمت کے ایماندار یا گذشتہ امتوں کے اور اگر صرف مِنْكُمْ ہوتا اور اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ نہ ہوتا تو یہ سمجھا جاتا کہ فاسق اور بدکار لوگ بھی خدا تعالیٰ کے خلیفے ہو سکتے ہیں حالانکہ فاسقوں کی بادشاہت اور حکومت بطور ابتلا کے ہے نہ بطور اصطفا کے اور خدا تعالیٰ کے حقانی خلیفے خواہ وہ رُوحانی خلیفے ہوں یا ظاہری وہی لوگ ہیں جو متقی اور ایماندار اور نیکوکار ہیں۔

اور یہ وہم کہ عام معنوں کی رُو سے ان آیات کی اخیر کی آیت یعنی وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ بالکل بے معنی ٹھہر جاتی ہے ایسا بیہودہ خیال ہے جو اس پر ہنسی آتی ہے کیونکہ آیت کے صاف اور سیدھے یہ معنی ہیں کہ اللہ جلّ شانہٗ خلیفوں کے پیدا ہونے کی خوشخبری دے کر پھر باغیوں اور نافرمانوں کو دھمکی دیتا ہے کہ بعد خلیفوں کے پیدا ہونے کے جب وہ وقتاً فوقتاً پیدا ہوں اگر کوئی بغاوت اختیار کرے اور ان کی اطاعت اور بیعت سے مُنہ پھیرے تو وُہ فاسق ہے۔ اب نادرستی معنوں کی کہاں ہے اور واضح ہو کہ اس آیت کریمہ سے وہ حدیث مطابق ہے جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ مَنْ لَّمْ يَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِهٖ فَقَدْ مَاتَ مِيْتَةَ الْجَاهِلِيَّةِ۔ جس شخص نے اپنے زمانہ کے امام کو شناخت نہ کیا وہ جاہلیّت کی موت پر مر گیا یعنی جیسے جیسے ہر یک زمانہ میں امام پیدا ہوں گے اور جو لوگ اُن کو شناخت نہیں کریں گے تو ان کی موت کفار کی موت کے مشابہ ہوگی اور معترض صاحب کا اس آیت کو پیش کرنا کہ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (المائدۃ: ۱۱۶) اور اِس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مِنْكُمْ کا لفظ اِس جگہ خصوصیت کے ساتھ حاضرین کے حق میں آیا ہے ایک بے فائدہ بات ہے کیونکہ ہم لکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کا عام محاورہ جس سے تمام قرآن بھرا پڑا ہے یہی ہے کہ خطاب عام ہوتا ہے اور احکام خطابیہ تمام امت کے لئے ہوتے ہیں نہ صرف صحابہ کے لئے۔ ہاں جس جگہ کوئی صریح اور صاف

قرینہ تحدید خطاب کا ہو وہ جگہ مستثنیٰ ہے چنانچہ آیات موصوفہ بالا میں خاص حواریوں کے ایک طائفہ نے نزول مائدہ کی درخواست کی اُسی طائفہ کو مخاطب کر کے جواب ملا۔ سو یہ قرینہ کافی ہے کہ سوال بھی اسی طائفہ کا تھا اور جواب بھی اسی کو ملا اور یہ کہنا کہ اس کی مثالیں کثرت سے قرآن میں ہیں بالکل جھوٹ اور دھوکا دینا ہے۔ قرآن میں بیاسی کے قریب لفظ مِنْكُمْ ہے اور چھ سو کے قریب اَور اَور صورتوں میں خطاب ہے لیکن تمام خطابات احکامیہ وغیرہ میں تعمیم ہے اگر قرآن کے خطابات صحابہ تک ہی محدود ہوتے تو صحابہ کے فوت ہو جانے کے ساتھ قرآن باطل ہو جاتا اور آیت متنازعہ فیہا جو خلافت کے متعلق ہے درحقیقت اس آیت سے مشابہ ہے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (یونس : ٦٥) کیا یہ بشریٰ صحابہ سے ہی خاص تھا یا کسی اور کو بھی اس سے حصہ ہے۔ اور معترض کا یہ کہنا کہ جو شخص اصلی معنوں سے جو خصوصیت مخاطبین ہے عدول کر کے اس کے معنے عموم لیوے اس کا ذمہ ہے کہ وہ دلیل یقینی سے اپنے عدول کو ثابت کرے اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف معترض کو قرآن کریم سے بلکہ تمام الٰہی کتابوں کے اسلوب کلام سے کچھ بھی خبر نہیں مشکل یہ ہے کہ اکثر شتاب کار لوگ قبل اس کے جو پورے طور پر خوض کریں اعتراض کرنے کو طیار ہو جاتے ہیں۔ اگر معترض صاحب کو صحیح نیت سے تحقیق کا شوق تھا تو وہ تمام ایسے موقعہ جہاں بظاہر نظر صحابہ مخاطب ہیں جمع کر کے دیکھتے کہ اکثر اغلب اور بلا قیام قرینہ قرآن شریف میں کیا محاورہ ہے کیونکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ جو اکثر اغلب محاورہ ثابت ہوگا اسی کے موافق اصلی معنی ٹھہریں گے اور ان سے عدول کرنا بغیر قیام قرینہ جائز نہیں ہوگا۔ اب ظاہر ہو کہ اصل محاورہ قرآن کریم کا خطاب حاضرین میں عموم ہے اور قرآن کا چھ سو ٦٠٠ حکم اسی بناء پر عام سمجھا جاتا ہے نہ یہ کہ صحابہ تک محدود سمجھا جائے پھر جو شخص عام محاورہ سے عدول کر کے کسی حکم کو صحابہ تک ہی محدود رکھے اس کے ذمہ یہ بار ثبوت ہوگا کہ قرائن قویہ سے یہ ثابت کرے کہ یہ خطاب صحابہ سے ہی خاص ہے اور دوسرے لوگ اس سے باہر ہیں مثلاً اللہ جلّ شانہٗ قرآن کریم میں بظاہر صحابہ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ تم صرف خدا کی[1] بندگی کرو اور صبر[2] اور صلوٰۃ کے ساتھ مدد چاہو اور پاک[3] چیزوں میں سے کھاؤ اور کسی قسم کا فساد[4] مت کرو۔ اور تم زکوٰۃ[5] اور نماز[6] کو قائم کرو اور مقام ابرا[7]ہیم سے جائے نماز ٹھہراؤ۔ اور خیرا[8]ت میں ایک دوسرے سے سبقت کرو اور مجھ کو یاد کرو میں[9] تم کو یاد کروں گا۔ اور میرا شکر[10] کرو۔ اور مجھ[11] سے دعا مانگو اور جو لوگ[12] خدا کی راہ میں شہید ہوں ان کو مردے مت کہو اور جو تم کو سلام[13] علیکم کرے اس کا نام کافر اور بے ایمان نہ رکھو۔ پاک[14] چیزیں زمین کی پیداوار میں سے کھاؤ اور شیطان[15] کی پیروی نہ کرو۔ تم پر روزے[16] فرض کئے گئے ہیں مگر جو تم میں سے بیمار یا سفر پر ہو وہ

اتنے روزے[۱۷] پھر رکھے۔تم ایک دوسرے کے مال[۱۸] کو ناحق کے طور پر مت کھاؤ اور تم تقویٰ[۱۹] اختیار کرو تا فلاح پاؤ اور تم خدا کی راہ[۲۰] میں ان سے جو تم سے لڑیں لڑو لیکن حد سے مت[۲۱] بڑھو اور کوئی زیادتی مت[۲۲] کرو کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور تم خدا[۲۳] کی راہ میں خرچ کرو اور دانستہ[۲۴] اپنے تئیں ہلاکت میں مت ڈالو۔اور لوگوں سے احسان[۲۵] کرو کہ خدا محسنین کو دوست رکھتا ہے اور حج[۲۶] اور عمرہ کو اللہ کے واسطے پورا کرو اور اپنے پاس توشہ[۲۷] رکھو کہ توشہ میں یہ فائدہ ہے کہ تم کسی دوسرے سے سوال نہیں کرو گے یعنی سوال ایک ذلت ہے اس سے بچنے کے لئے تدبیر کرنی چاہئے اور تم صلح[۲۸] اور اسلام میں داخل ہو۔اور مشرکات[۲۹] سے نکاح مت کرو جب تک ایمان نہ لاویں اور مشرکین[۳۰] سے اے عورتو تم نکاح مت کرو جب تک ایمان نہ لاویں اور اپنے نفسوں[۳۱] کے لئے کچھ آگے بھیجو اور خدا[۳۲] تعالیٰ کو اپنی قسموں کا عرضہ مت بناؤ اور عورتوں[۳۳] کو دکھ دینے کی غرض سے بندمت رکھو[۳۴] اور جو لوگ تم میں سے فوت ہو جائیں اور جو روئیں رہ جائیں تو وہ چار مہینے اور دس دن نکاح کرنے سے رکی رہیں۔اگر تم طلاق[۳۵] دو تو عورتوں کو احسان کے ساتھ رخصت کرو۔اگر تمہیں خوف[۳۶] ہو تو نماز پیروں سے چلتے چلتے یا سوار ہونے کی حالت میں پڑھ لو۔اگر اپنے صدقات[۳۷] لوگوں کو دکھلا کے دو تو یہ عموماً اچھی بات ہے کہ تا لوگ تمہارے نیک کاموں کی پیروی کریں اور اگر چھپا کر محتاجوں کو دو تو یہ تمہارے نفسوں کے لئے بہتر ہے جب[۳۸] تم کسی کو قرضہ دو تو ایک نوشت لکھا لو اور قرض[۳۹] ادا کرنے میں خدا سے ڈرو اور کچھ باقی مت رکھو اور جب[۴۰] تم کوئی خرید و فروخت کرو تو اس پر گواہ رکھ لو۔اور اگر تم سفر[۴۱] میں ہو اور کوئی کاتب نہ ملے تو کوئی جائیداد قبضہ میں کر لو۔تم سب[۴۲] مل کر خدا کی رسی سے پنجہ مارو اور باہم پھوٹ مت ڈالو۔تم میں سے ایسے[۴۳] بھی ہونے چاہئیں کہ جو امر معروف اور نہی منکر کریں۔تم خدا[۴۴] کی مغفرت کی طرف دوڑو اور اگر تم میں سے کسی کی بیوی[۴۵] فوت ہو جاوے تو وہ اس کی جائیداد میں سے نصف کا مالک ہے بشرطیکہ اس کی کچھ اولاد نہ ہو اور اگر اولاد[۴۶] ہو تو پھر اس کو چہارم حصہ جائیداد بعد عمل بر وصیت پہنچے گا۔

یہ چند احکام بطور نمونہ ہم نے لکھے ہیں اس میں ایک تھوڑی سی عقل کا آدمی بھی سوچ سکتا ہے کہ بظاہر یہ تمام خطاب صحابہ کی طرف ہے لیکن درحقیقت تمام مسلمان ان احکام پر عمل کرنے کے لئے مامور ہیں نہ یہ کہ صرف صحابہ مامور ہیں و بس۔غرض قرآن کا اصلی اور حقیقی اسلوب جس سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے یہ ہے کہ اس کے خطاب کے مورد حقیقی اور واقعی طور پر تمام وہ مسلمان ہیں جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے گو بظاہر صورت خطاب صحابہ کی طرف راجع معلوم ہوتا ہے پس جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ یہ وعدہ یا وعید صحابہ تک ہی

محدود ہے وہ قرآن کے عام محاورہ سے عدول کرتا ہے اور جب تک پورا ثبوت اس دعویٰ کا پیش نہ کرے تب تک وہ ایسے طریق کے اختیار کرنے میں ایک ملحد ہے کیا قرآن صرف صحابہ کے واسطے ہی نازل ہوا تھا۔ اگر قرآن کے وعدا ور وعید اور تمام احکام صحابہ تک ہی محدود ہیں تو گویا جو بعد میں پیدا ہوئے وہ قرآن سے بکلی بے تعلق ہیں۔ نعوذ باللہ من ھذہ الخرافات۔

اور یہ کہنا کہ حدیث میں آیا ہے کہ خلافت تیس سال تک ہوگی عجیب فہم ہے جس حالت میں قرآن کریم بیان فرماتا ہے کہ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ۔ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ (الواقعۃ: ۴۰، ۴۱) تو پھر اس کے مقابل پر کوئی حدیث پیش کرنا اور اس کے معنی مخالف قرآن قرار دینا معلوم نہیں کہ کس قسم کی سمجھ ہے اگر حدیث کے بیان پر اعتبار ہے تو پہلے ان حدیثوں پر عمل کرنا چاہیئے جو صحت اور وثوق میں اس حدیث پر کئی درجہ بڑھی ہوئی ہیں مثلاً صحیح بخاری کی وہ حدیثیں جن میں آخری زمانہ میں بعض خلیفوں کی نسبت خبر دی گئی ہے خاص کر وہ خلیفہ جس کی نسبت بخاری میں لکھا ہے کہ آسمان سے اس کے لیے آواز آئے گی هٰذَا خَلِيْفَةُ اللهِ الْمَهْدِيُّ اب سوچو کہ یہ حدیث کس پایہ اور مرتبہ کی ہے جو ایسی کتاب میں درج ہے جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے لیکن وہ حدیث جو معترض صاحب نے پیش کی علماء کو اس میں کئی طرح کا جرح ہے اور اس کی صحت میں کلام ہے کیا معترض نے غور نہیں کی کہ جو آخری زمانہ کی نسبت بعض خلیفوں کے ظہور کی خبریں دی گئی ہیں کہ حارث آئے گا۔ مہدی آئے گا۔ آسمانی خلیفہ آئے گا۔ یہ خبریں حدیثوں میں ہیں یا کسی اور کتاب میں۔ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ زمانے تین ہیں۔ اول خلافت راشدہ کا زمانہ پھر فیج اعوج جس میں ملک عضوض ہوں گے اور بعد اس کے آخری زمانہ جو زمانہ نبوت کے نہج پر ہوگا۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کا اول زمانہ اور پھر آخری زمانہ باہم بہت ہی متشابہ ہیں اور یہ دونوں زمانے اس بارش کی طرح ہیں جو ایسی خیر اور برکت سے بھری ہوئی ہو کہ کچھ معلوم نہیں کہ برکت اس کے پہلے حصہ میں زیادہ ہے یا پچھلے میں۔

اس جگہ یہ بھی واضح رہے کہ اللہ جلّ شانہٗ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر: ۱۰) یعنی ہم نے ہی اس کتاب کو اتارا اور ہم ہی اس تنزیل کی محافظت کریں گے۔ اس میں اس بات کی تصریح ہے کہ یہ کلام ہمیشہ زندہ رہے گا اور اس کی تعلیم کو تازہ رکھنے والے اور اس کا نفع لوگوں کو پہنچانے والے ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے اور اگر یہ سوال ہو کہ قرآن کے وجود کا فائدہ کیا ہے جس فائدہ کے وجود پر اس کی حقیقی حفاظت موقوف ہے تو اس دوسری آیت سے ظاہر ہے هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ

رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعة : ۳)اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے بڑے فائدے دو ہیں جن کے پہنچانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آئے تھے۔ ایک حکمت فرقان یعنی معارف و دقائق قرآن دوسری تاثیر قرآن جو موجب تزکیہ نفوس ہے اور قرآن کی حفاظت صرف اسی قدر نہیں جو اس کے صحف مکتوبہ کو خوب نگہبانی سے رکھیں کیونکہ ایسے کام تو اوائل حال میں یہود اور نصاریٰ نے بھی کئے یہاں تک کہ توریت کے نقطے بھی گن رکھے تھے بلکہ اس جگہ مع حفاظت ظاہری حفاظت فوائد و تاثیرات قرآنی مراد ہے اور وہ موافق سنت اللہ کے تبھی ہو سکتی ہے کہ جب وقتاً فوقتاً نائب رسول آویں جن میں ظلی طور پر رسالت کی تمام نعمتیں موجود ہوں اور جن کو وہ تمام برکات دی گئی ہوں جو نبیوں کو دی جاتی ہیں جیسا کہ ان آیات میں اسی امر عظیم کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔

پس یہ آیت درحقیقت اس دوسری آیت اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر : ۱۰) کے لئے بطور تفسیر کے واقعہ ہے اور اس سوال کا جواب دے رہی ہے کہ حفاظت قرآن کیوں کر اور کس طور سے ہوگی سو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اس نبی کریم کے خلیفے وقتاً فوقتاً بھیجتا رہوں گا اور خلیفہ کے لفظ کو اس اشارہ کے لئے اختیار کیا گیا کہ وہ نبی کے جانشین ہوں گے اور اس کی برکتوں میں سے حصہ پائیں گے جیسا کہ پہلے زمانوں میں ہوتا رہا۔ اور ان کے ہاتھ سے برجائی دین کی ہوگی اور خوف کے بعد امن پیدا ہوگا یعنی ایسے وقتوں میں آئیں گے کہ جب اسلام تفرقہ میں پڑا ہوگا پھر ان کے آنے کے بعد جو اُن سے سرکش رہے گا وہی لوگ بدکار اور فاسق ہیں۔ یہ اس بات کا جواب ہے کہ بعض جاہل کہا کرتے ہیں کہ کیا ہم پر اولیاء کا ماننا فرض ہے سو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیشک فرض ہے اور ان سے مخالفت کرنے والے فاسق ہیں اگر مخالفت پر ہی مریں۔

اس جگہ معترض صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (المائدة : ۴) اور پھر اعتراض کیا ہے کہ جب کہ دین کمال کو پہنچ چکا ہے اور نعمت پوری ہو چکی تو پھر نہ کسی مجدد کی ضرورت ہے نہ کسی نبی کی مگر افسوس کہ معترض نے ایسا خیال کر کے خود قرآن کریم پر اعتراض کیا ہے کیونکہ قرآن کریم نے اس امت میں خلیفوں کے پیدا ہونے کا وعدہ کیا ہے جیسا کہ ابھی گزر

چکا ہے اور فرمایا ہے کہ ان کے وقتوں میں دین استحکام پکڑے گا اور تزلزل اور تذبذب دور ہوگا۔ اور خوف کے بعد امن پیدا ہوگا پھر اگر تکمیل دین کے بعد کوئی بھی کارروائی درست نہیں تو بقول معترض کے جو تیس سال کی خلافت ہے وہ بھی باطل ٹھہرتی ہے کیونکہ جب دین کامل ہو چکا تو پھر کسی دوسرے کی ضرورت نہیں۔ لیکن افسوس کہ معترض بےخبر نے ناحق آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کو پیش کر دیا۔ ہم کب کہتے ہیں کہ مجدد اور محدث دنیا میں آکر دین میں سے کچھ کم کرتے ہیں یا زیادہ کرتے ہیں بلکہ ہمارا تو یہ قول ہے کہ ایک زمانہ گزرنے کے بعد جب پاک تعلیم پر خیالات فاسدہ کا ایک غبار پڑ جاتا ہے اور حق خالص کا چہرہ چھپ جاتا ہے۔ تب اس خوبصورت چہرہ کو دکھلانے کے لئے مجدد اور محدث اور روحانی خلیفے آتے ہیں نہ معلوم کہ بےچارہ معترض نے کہاں سے اور کس سے سن لیا کہ مجدد اور روحانی خلیفے دنیا میں آکر دین کی کچھ ترمیم و تنسیخ کرتے ہیں۔ نہیں وہ دین کو منسوخ کرنے نہیں آتے بلکہ دین کی چمک اور روشنی دکھانے کو آتے ہیں اور معترض کا یہ خیال کہ ان کی ضرورت ہی کیا ہے صرف اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ معترض کو اپنے دین کی پرواہ نہیں اور کبھی اس نے غور نہیں کی کہ اسلام کیا چیز ہے اور اسلام کی ترقی کس کو کہتے ہیں اور حقیقی ترقی کیوں کر اور کن راہوں سے ہو سکتی ہے اور کس حالت میں کسی کو کہا جاتا ہے کہ وہ حقیقی طور پر مسلمان ہے یہی وجہ ہے کہ معترض صاحب اس بات کو کافی سمجھتے ہیں کہ قرآن موجود ہے اور علماء موجود ہیں اور خود بخود اکثر لوگوں کے دلوں کو اسلام کی طرف حرکت ہے پھر کسی مجدد کی کیا ضرورت ہے لیکن افسوس کہ معترض کو یہ سمجھ نہیں کہ مجددوں اور روحانی خلیفوں کی اس امت میں ایسے ہی طور سے ضرورت ہے جیسا کہ قدیم سے انبیاء کی ضرورت پیش آتی رہی ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی مرسل تھے اور ان کی توریت بنی اسرائیل کی تعلیم کے لئے کامل تھی اور جس طرح قرآن کریم میں آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ ہے اسی طرح توریت میں بھی آیات ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو ایک کامل اور جلالی کتاب دی گئی ہے جس کا نام توریت ہے چنانچہ قرآن کریم میں بھی توریت کی یہی تعریف ہے لیکن باوجود اس کے بعد توریت کے صدہا ایسے نبی بنی اسرائیل میں سے آئے کہ کوئی نئی کتاب ان کے ساتھ نہیں تھی بلکہ ان انبیاء کے ظہور کے مطالب یہ ہوتے تھے کہ تا ان کے موجودہ زمانہ میں جو لوگ تعلیم توریت سے دور پڑ گئے ہوں پھر ان کو توریت کے اصلی منشاء کی طرف کھینچیں اور جن کے دلوں میں کچھ شکوک اور دہریت اور بےایمانی ہوگئی ہو ان کو پھر زندہ ایمان بخشیں چنانچہ اللہ جلّ شانہٗ خود قرآن کریم میں فرماتا ہے وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ (البقرۃ:۸۸) یعنی موسیٰ

کو ہم نے تورات دی اور پھر اس کتاب کے بعد ہم نے کئی پیغمبر بھیجے تا توریت کی تعلیم کی تائید اور تصدیق کریں اسی طرح دوسری جگہ فرماتا ہے ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا تَتۡرَا (المؤمنون:۴۵) یعنی پھر پیچھے سے ہم نے اپنے رسول پے در پے بھیجے۔ پس ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ عادت اللہ یہی ہے کہ وہ اپنی کتاب بھیج کر پھر اس کی تائید اور تصدیق کے لئے ضرور انبیاء بھیجا کرتا ہے چنانچہ توریت کی تائید کے لئے ایک ایک وقت میں چار چار سو نبی بھی آیا جن کے آنے پر اب تک بائبل شہادت دے رہی ہے۔

اس کثرت ارسال رسل میں اصل بھید یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ عہد مؤکد ہو چکا ہے کہ جو اس کی سچی کتاب کا انکار کرے تو اس کی سزا دائمی جہنم ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ (البقرة:۴۰) یعنی جو لوگ کافر ہوئے اور ہماری آیتوں کی تکذیب کی وہ جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اب جب کہ سزائے انکار کتاب الٰہی میں ایسی سخت تھی اور دوسری طرف یہ مسئلہ نبوت اور وحی الٰہی کا نہایت دقیق تھا بلکہ خود خدا تعالیٰ کا وجود بھی ایسا دقیق در دقیق تھا کہ جب تک انسان کی آنکھ خداداد نور سے منور نہ ہو ہرگز ممکن نہ تھا کہ سچی اور پاک معرفت اس کی حاصل ہو سکے چہ جائیکہ اس کے رسولوں کی معرفت اور اس کے کتاب کی معرفت حاصل ہو۔ اس لئے رحمانیت الٰہی نے تقاضا کیا کہ اندھی اور نابینا مخلوق کی بہت ہی مدد کی جائے اور صرف اس پر اکتفا نہ کیا جائے کہ ایک مرتبہ رسول اور کتاب بھیج کر پھر باوجود امتداد ازمنہ طویلہ کے ان عقائد کے انکار کی وجہ سے جن کو بعد میں آنے والے زیادہ اس سے سمجھ نہیں سکتے کہ وہ ایک پاک اور عمدہ منقولات ہیں ہمیشہ کی جہنم میں منکروں کو ڈال دیا جائے اور درحقیقت سوچنے والے کے لئے یہ بات نہایت صاف اور روشن ہے کہ وہ خدا جس کا نام رحمٰن اور رحیم ہے اتنی بڑی سزا دینے کے لئے کیوں کر یہ قانون اختیار کر سکتا ہے کہ بغیر پورے طور پر اتمام حجت کے مختلف بلاد کے ایسے لوگوں کو جنہوں نے صدہا برسوں کے بعد قرآن اور رسول کا نام سنا اور پھر وہ عربی سمجھ نہیں سکتے۔ قرآن کی خوبیوں کو دیکھ نہیں سکتے دائمی جہنم میں ڈال دے اور کس انسان کی کانشنس اس بات کو قبول کر سکتی ہے کہ بغیر اس کے کہ قرآن کریم کا منجاب اللہ ہونا اس پر ثابت کیا جائے یوں ہی اس پر چھری پھیر دی جائے پس یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے دائمی خلیفوں کا وعدہ دیا تا وہ ظلی طور پر انوار نبوت پا کر دنیا کو ملزم کریں اور قرآن کریم کی خوبیاں اور اس کی پاک برکات لوگوں کو دکھلاویں۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہر یک زمانہ کے لئے اتمام حجت بھی مختلف رنگوں سے ہوا کرتا ہے اور مجدد وقت

ان قوتوں اور ملکوں اور کمالات کے ساتھ آتا ہے جو موجودہ مفاسد کا اصلاح پانا ان کمالات پر موقوف ہوتا ہے سو ہمیشہ خدا تعالیٰ اسی طرح کرتا رہے گا جب تک کہ اس کو منظور ہے کہ آثار رشد اور صلاح کے دنیا میں باقی رہیں اور یہ باتیں بے ثبوت نہیں بلکہ نظائر متواترہ اس کے شاہد ہیں اور مختلف بلاد کے نبیوں اور مرسلوں اور محدثوں کو چھوڑ کر اگر صرف بنی اسرائیل کے نبیوں اور مرسلوں اور محدثوں پر ہی نظر ڈالی جائے تو ان کی کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چودہ سو[۱۴۰۰] برس کے عرصہ میں یعنی حضرت موسیٰ سے حضرت مسیح تک ہزارہا نبی اور محدث ان میں پیدا ہوئے کہ جو خادموں کی طرح کمر بستہ ہو کر توریت کی خدمت میں مصروف رہے۔ چنانچہ ان تمام بیانات پر قرآن شاہد ہے اور بائیبل شہادت دے رہی ہے اور وہ نبی کوئی نئی کتاب نہیں لاتے تھے کوئی نیا دین نہیں سکھاتے تھے صرف توریت کے خادم تھے اور جب بنی اسرائیل میں دہریت اور بے ایمانی اور بدچلنی اور سنگدلی پھیل جاتی تھی تو ایسے وقتوں میں وہ ظہور کرتے تھے۔ اب کوئی سوچنے والا سوچے کہ جس حالت میں موسیٰؑ کی ایک محدود شریعت کے لئے جو زمین کی تمام قوموں کے لئے نہیں تھی اور نہ قیامت تک اس کا دامن پھیلا ہوا تھا خدا تعالیٰ نے یہ احتیاطیں کیں کہ ہزارہا نبی اس شریعت کی تجدید کے لئے بھیجے اور بارہا آنے والے نبیوں نے ایسے نشان دکھلائے کہ گویا بنی اسرائیل نے نئے سرے خدا کو دیکھ لیا تو پھر یہ امت جو خیر الامم کہلاتی ہے اور خیر الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے لٹک رہی ہے کیوں کر ایسی بدقسمت سمجھی جائے کہ خدا تعالیٰ نے صرف تیس برس اس کی طرف نظر رحمت کر کے اور آسمانی انوار دکھلا کر پھر اس سے منہ پھیر لیا اور پھر اس امت پر اپنے نبی کریم کی مفارقت میں صدہا برس گزرے اور ہزارہا طور کے فتنے پڑے اور بڑے بڑے زلزلے آئے اور انواع اقسام کی دجالیت پھیلی اور ایک جہان نے دین متین پر حملے کئے اور تمام برکات اور معجزات سے انکار کیا گیا اور مقبول کو نامقبول ٹھہرایا گیا لیکن خدا تعالیٰ نے پھر کبھی نظر اٹھا کر اس امت کی طرف نہ دیکھا اور اس کو کبھی اس امت پر رحم نہ آیا اور کبھی اس کو یہ خیال نہ آیا کہ یہ لوگ بھی تو بنی اسرائیل کی طرح انسان ضعیف البنیان ہیں اور یہودیوں کی طرح ان کے پودے بھی آسمانی آبپاشی کے ہمیشہ محتاج ہیں کیا اس کریم خدا سے ایسا ہو سکتا ہے جس نے اس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ کے مفاسد کے دور کرنے کے لئے بھیجا تھا کیا ہم یہ گمان کر سکتے ہیں کہ پہلی امتوں پر تو خدا تعالیٰ کا رحم تھا اس لئے اس نے توریت کو بھیج کر پھر ہزارہا رسول اور محدث توریت کی تائید کے لئے اور دلوں کو بار بار زندہ کرنے کے لئے بھیجے لیکن یہ امت مورد غضب تھی اس لئے اس نے قرآن کریم کو نازل کر کے ان سب

باتوں کو بھلا دیا اور ہمیشہ کے لئے علماء کو ان کی عقل اور اجتہاد پر چھوڑ دیا اور حضرت موسیٰ کی نسبت تو صاف فرمایا وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (النساء: ۱۶۵، ۱۶۶) یعنی خدا موسیٰ سے ہمکلام ہوا اور اس کی تائید اور تصدیق کے لئے رسول بھیجے جو مبشر اور منذر تھے تا کہ لوگوں کی کوئی حجت باقی نہ رہے اور نبیوں کا مسلسل گروہ دیکھ کر توریت پر دلی صدق سے ایمان لاویں۔ اور فرمایا رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ .... وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ (النساء: ۱۶۵) یعنی ہم نے بہت سے رسول بھیجے اور بعض کا تو ہم نے ذکر کیا اور بعض کا ذکر بھی نہیں کیا لیکن دین اسلام کے طالبوں کے لئے وہ انتظام نہ کیا گویا جو رحمت اور عنایت باری حضرت موسیٰ کی قوم پر تھی وہ اس امت پر نہیں ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہمیشہ امتداد زمانہ کے بعد پہلے معجزات اور کرامات قصہ کے رنگ میں ہو جاتے ہیں اور پھر آنے والی نسلیں اپنے گروہ کو ہر یک امر خارق عادت سے بے بہرہ دیکھ کر آخر گذشتہ معجزات کی نسبت شک پیدا کرتی ہیں پھر جس حالت میں بنی اسرائیل کے ہزارہا انبیاء کا نمونہ آنکھوں کے سامنے ہے تو اس سے اور بھی بے دلی اس امت کو پیدا ہوگی اور اپنے تئیں بدقسمت پا کر بنی اسرائیل کو رشک کی نگہہ سے دیکھیں گے یا بد خیالات میں گرفتار ہو کر ان کے قصوں کو بھی صرف افسانجات خیال کریں گے اور یہ قول کہ پہلے اس سے ہزارہا انبیاء ہو چکے اور معجزات بھی بکثرت ہوئے اس لئے اس امت کو خوارق اور کرامات اور برکات کی کچھ ضرورت نہیں تھی لہٰذا خدا تعالیٰ نے ان کو سب باتوں سے محروم رکھا۔ یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں جنہیں وہ لوگ منہ پر لاتے ہیں جن کو ایمان کی کچھ بھی پرواہ نہیں ورنہ انسان نہایت ضعیف اور ہمیشہ تقویت ایمان کا محتاج ہے اور اس راہ میں اپنے خود ساختہ دلائل کبھی کام نہیں آ سکتے جب تک تازہ طور پر معلوم نہ ہو کہ خدا موجود ہے ہاں جھوٹا ایمان جو بدکاریوں کو روک نہیں سکتا نقلی اور عقلی طور پر قائم رہ سکتا ہے اور اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ دین کی تکمیل اس بات کو مستلزم نہیں جو اس کی مناسب حفاظت سے بکلی دستبردار ہو جائے مثلاً اگر کوئی گھر بناوے اور اس کے تمام کمرے سلیقہ سے طیار کرے اور اس کی تمام ضرورتیں جو عمارت کے متعلق ہیں باحسن وجہ پوری کر دیوے اور پھر مدت کے بعد اندھیریاں چلیں اور بارشیں ہوں اور اس گھر کے نقش و نگار پر گرد و غبار بیٹھ جاوے اور اس کی خوبصورتی چھپ جاوے اور پھر اس کا کوئی وارث اس گھر کو صاف اور سفید کرنا چاہے مگر اس کو منع کر دیا جاوے کہ گھر تو مکمل ہو چکا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ منع کرنا سراسر حماقت ہے افسوس کہ ایسے اعتراضات کرنے والے نہیں سوچتے کہ تکمیل شے دیگر ہے اور وقتاً فوقتاً

ایک مکمل عمارت کی صفائی کرنا یہ اور بات ہے۔ یہ یاد رہے کہ مجدد لوگ دین میں کچھ کمی بیشی نہیں کرتے ہاں گمشدہ دین کو پھر دلوں میں قائم کرتے ہیں اور یہ کہنا کہ مجددوں پر ایمان لانا کچھ فرض نہیں خدا تعالیٰ کے حکم سے انحراف ہے کیونکہ وہ فرماتا ہے وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ یعنی بعد اس کے جو خلیفے بھیجے جائیں پھر جو شخص ان کا منکر رہے وہ فاسقوں میں سے ہے۔

اب خلاصہ اس تمام تقریر کا کسی قدر اختصار کے ساتھ ہم ذیل میں لکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ دلائل مندرجہ ذیل سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات نہایت ضروری ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس امت میں فساد اور فتنوں کے وقتوں میں ایسے مصلح آتے رہیں جن کو انبیاء کے کئی کاموں میں سے یہ ایک کام سپرد ہو کہ وہ دین حق کی طرف دعوت کریں اور ہر یک بدعت جو دین سے مل گئی ہو اس کو دور کریں اور آسمانی روشنی پا کر دین کی صداقت ہر یک پہلو سے لوگوں کو دکھلاویں اور اپنے پاک نمونہ سے لوگوں کو سچائی اور محبت اور پاکیزگی کی طرف کھینچیں۔ (شہادۃ القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۲۴ تا ۳۴۵)

خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے اے مومنان امت محمد یہ وعدہ کیا ہے کہ تمہیں بھی وہ زمین میں خلیفہ کرے گا جیسا کہ تم سے پہلوں کو کیا....

ان آیات کو اگر کوئی شخص تامل اور غور کی نظر سے دیکھے تو میں کیونکر کہوں کہ وہ اس بات کو سمجھ نہ جائے کہ خدا تعالیٰ اس امت کے لئے خلافت دائمی کا صاف وعدہ فرماتا ہے اگر خلافت دائمی نہیں تھی تو شریعت موسوی کے خلیفوں سے تشبیہہ دینا کیا معنی رکھتا تھا اور اگر خلافت راشدہ صرف تیس برس تک رہ کر پھر ہمیشہ کے لئے اس کا دور ختم ہو گیا تھا تو اس سے لازم آتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا ہرگز یہ ارادہ نہ تھا کہ اس امت پر ہمیشہ کے لئے ابواب سعادت مفتوح رکھے کیونکہ روحانی سلسلہ کی موت سے دین کی موت لازم آتی ہے اور ایسا مذہب ہرگز زندہ نہیں کہلا سکتا جس کے قبول کرنے والے خود اپنی زبان سے ہی یہ اقرار کریں کہ تیرہ سو برس سے یہ مذہب مرا ہوا ہے اور خدا تعالیٰ نے اس مذہب کے لئے ہرگز یہ ارادہ نہیں کیا کہ حقیقی زندگی کا وہ نور جو نبی کریم کے سینہ میں تھا وہ توارث کے طور پر دوسروں میں چلا آوے۔

افسوس کہ ایسے خیال پر جمنے والے خلیفہ کے لفظ کو بھی جو استخلاف سے مفہوم ہوتا ہے تدبّر سے نہیں سوچتے کیونکہ خلیفہ جانشین کو کہتے ہیں اور رسول کا جانشین حقیقی معنوں کے لحاظ سے وہی ہو سکتا ہے جو ظلی طور پر رسول کے کمالات اپنے اندر رکھتا ہو اس واسطے رسول کریم نے نہ چاہا کہ ظالم بادشاہوں پر خلیفہ کا لفظ اطلاق

ہو کیونکہ خلیفہ درحقیقت رسول کا ظلّ ہوتا ہے اور چونکہ کسی انسان کے لئے دائمی طور پر بقا نہیں لہٰذا خدا تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ رسولوں کے وجود کو جو تمام دنیا کے وجودوں سے اشرف و اولیٰ ہیں ظلّی طور پر ہمیشہ کے لئے تا قیامت قائم رکھے سو اسی غرض سے خدا تعالیٰ نے خلافت کو تجویز کیا تا دنیا کبھی اور کسی زمانہ میں برکات رسالت سے محروم نہ رہے پس جو شخص خلافت کو صرف تیس برس تک مانتا ہے وہ اپنی نادانی سے خلافت کی علت غائی کو نظر انداز کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ خدا تعالیٰ کا یہ ارادہ تو ہرگز نہیں تھا کہ رسول کریم کی وفات کے بعد صرف تیس برس تک رسالت کی برکتوں کو خلیفوں کے لباس میں قائم رکھنا ضروری ہے پھر بعد اس کے دنیا تباہ ہو جائے تو ہو جائے کچھ پرواہ نہیں بلکہ پہلے دنوں میں تو خلیفوں کا ہونا بجز شوکت اسلام پھیلانے کے کچھ اور زیادہ ضرورت نہیں رکھتا تھا کیونکہ انوار رسالت اور کمالات نبوت تازہ بتازہ پھیل رہے تھے اور ہزارہا معجزات بارش کی طرح ابھی نازل ہو چکے تھے اور اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو اس کی سنت اور قانون سے یہ بھی بعید نہ تھا کہ بجائے ان چار خلیفوں کے اس تیس برس کے عرصہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کو ہی بڑھا دیتا اس حساب سے تیس برس کے ختم ہونے تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل ۹۳ برس کی عمر تک پہنچتے اور یہ اندازہ اس زمانہ کی مقررہ عمروں سے نہ کچھ زیادہ اور نہ اس قانون قدرت سے کچھ بڑھ کر ہے جو انسانی عمروں کے بارے میں ہماری نظر کے سامنے ہے۔

پس یہ حقیر خیال خدا تعالیٰ کی نسبت تجویز کرنا کہ اس کو صرف اس امت کے تیس [۳۰] برس کا ہی فکر تھا اور پھر ان کو ہمیشہ کے لئے ضلالت میں چھوڑ دیا اور وہ نور جو قدیم سے انبیاء سابقین کی امت میں خلافت کے آئینہ میں وہ دکھلاتا رہا اس امت کے لیے دکھلانا اس کو منظور نہ ہوا۔ کیا عقل سلیم خدائے رحیم و کریم کی نسبت ان باتوں کو تجویز کرے گی ہرگز نہیں اور پھر یہ آیت خلافت ائمہ پر گواہ ناطق ہے وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (الانبیاء: ۱۰۶) کیونکہ یہ آیت صاف صاف پکار رہی ہے کہ اسلامی خلافت دائمی ہے اس لئے کہ يَرِثُهَا کا لفظ دوام کو چاہتا ہے وجہ یہ کہ اگر آخری نوبت فاسقوں کی ہو تو زمین کے وارث وہی قرار پائیں گے نہ کہ صالح اور سب کا وارث وہی ہوتا ہے جو سب کے بعد ہو۔

پھر اس پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ جس حالت میں خدا تعالیٰ نے ایک مثال کے طور پر سمجھا دیا تھا کہ میں اسی طور پر اس امت میں خلیفے پیدا کرتا رہوں گا جیسے موسیٰ کے بعد خلیفے پیدا کئے تو دیکھنا چاہیئے تھا کہ موسیٰ کی وفات کے بعد خدا تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا۔ کیا اس نے صرف تیس [۳۰] برس تک خلیفے بھیجے یا چودہ سو برس تک اس

سلسلہ کو لمبا کیا۔ پھر جس حالت میں خدا تعالیٰ کا فضل ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہیں زیادہ تھا چنانچہ اس نے خود فرمایا وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (النساء: ۱۱۴) اور ایسا ہی اس امت کی نسبت فرمایا كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (اٰلِ عمران: ۱۱۱) تو پھر کیوں کر ہو سکتا تھا کہ حضرت موسیٰ کے خلیفوں کا چودہ سو[۱۴] برس تک سلسلہ ممتد ہو اور اس جگہ صرف تیس برس تک خلافت کا خاتمہ ہو جاوے اور نیز جب کہ یہ امّت خلافت کے انوار روحانی سے ہمیشہ کے لئے خالی ہے تو پھر آیت اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے کیا معنی ہیں کوئی بیان تو کرے۔ مثل مشہور ہے کہ اوخویشتن گم است کرا رہبری کند۔ جب کہ اس امت کو ہمیشہ کے لئے اندھا رکھنا ہی منظور ہے اور اس مذہب کو مردہ رکھنا ہی مدنظر ہے تو پھر یہ کہنا کہ تم سب سے بہتر ہو اور لوگوں کی بھلائی اور رہنمائی کے لئے پیدا کئے گئے ہو کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا اندھا اندھے کو راہ دکھا سکتا ہے سواے لوگو جو مسلمان کہلاتے ہو برائے خدا سوچو کہ اس آیت کے یہی معنی ہیں کہ ہمیشہ قیامت تک تم میں روحانی زندگی اور باطنی بینائی رہے گی اور غیر مذہب والے تم سے روشنی حاصل کریں گے اور یہ روحانی زندگی اور باطنی بینائی جو غیر مذہب والوں کو حق کی دعوت کرنے کے لئے اپنے اندر لیاقت رکھتی ہے یہی وہ چیز ہے جس کو دوسرے لفظوں میں خلافت کہتے ہیں پھر کیوں کر کہتے ہو کہ خلافت صرف تیس برس تک ہو کر پھر زاویہ عدم میں مخفی ہو گئی۔ اتقوا اللہ۔ اتقوا اللہ۔ اتقوا اللہ۔

(شہادۃ القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۵۲ تا ۳۵۵)

مماثلت تامہ کاملہ استخلاف محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی استخلاف موسوی سے مسیح موعود کا آنا ضروری ٹھہراتی ہے جیسا کہ آیت مندرجہ ذیل سے مفہوم ہوتا ہے یعنی آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ صاف بتلا رہی ہے کہ ایک مجدّد حضرت مسیح کے نام پر چودھویں صدی میں آنا ضروری ہے کیوں کہ امر استخلاف محمدی امر استخلاف موسوی سے اسی حالت میں اکمل اور اتم مشابہت پیدا کر سکتا ہے کہ جب کہ اول زمانہ اور آخری زمانہ باہم نہایت درجہ کی مشابہت رکھتے ہوں اور آخری زمانہ کی مشابہت دو باتوں میں تھی ایک امت کا حال ابتر ہونا اور دنیا کے اقبال میں ضعف آ جانا اور دینی دیانت اور ایمانداری اور تقویٰ میں فرق آ جانا دوسرے ایسے زمانہ میں ایک مجدد کا پیدا ہونا جو مسیح موعود کے نام پر آوے اور ایمانی حالت کو پھر بحال کرے سو پہلی علامت کو ہمارے بھائی مسلمان صرف قبول ہی نہیں کرتے بلکہ مسلمانوں کا ادبار اور ایک ایسی غیر قوم کا اقبال اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو ان

کے مذہب کو ایسا ہی حقیر اور ذلیل سمجھتی ہے جیسا کہ مجوسی یہودیوں پر غالب آ کر حضرت مسیح کے زمانہ میں یہود کو حقیر اور ذلیل سمجھتے تھے اور یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اندرونی حالت اسلام کے علماء اور اسلام کے دنیاداروں کی یہودیوں کے حالات سے کچھ کم نہیں ہے بلکہ خیر سے دہ چند معلوم ہوتی ہے۔

(شہادۃ القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۶۳ تا ۳۶۴)

إِنَّ دِيْنَنَا هٰذَا الَّذِي اسْمُهُ الْإِسْلَامُ۔ مَا أَرَادَ اللّٰهُ أَنْ يَّتْرُكَهُ سُدًى، وَمَا أَرَادَ أَنْ يُّبْطِلَهُ وَيُخْرِبَهُ مِنْ أَيْدِي الْأَعْدَآءِ، بَلْ قَالَ وَهُوَ أَصْدَقُ الصَّادِقِيْنَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ... فَهٰذِهٖ كُلُّهَا مَوَاعِيْدُ صَادِقَةٌ لِتَأْيِيْدِ الْإِسْلَامِ عِنْدَ ظُهُوْرِ الْفِتَنِ وَغَلَبَةِ الْمَعَاصِيْ وَالْاٰثَامِ، وَأَيُّ فِتَنٍ أَكْبَرُ مِنْ هٰذِهِ الْفِتَنِ الَّتِيْ ظَهَرَتْ عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ؟ وَإِنَّ النَّصَارٰى قَدْ دَخَلُوْا عَلَى النَّاسِ مِنْ بَابٍ لَّطِيْفٍ، وَسَحَرُوْا أَعْيُنَ النَّاسِ وَقُلُوْبَهُمْ وَاٰذَانَهُمْ بِالْمَكَائِدِ الَّتِيْ هِيَ دَقِيْقَةُ الْمَاْخِذِ، وَأَضَلُّوْا خَلْقًا كَثِيْرًا وَّجَآءُوْا بِسِحْرٍ مُّبِيْنٍ۔

(حمامۃ البشریٰ، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۲۰۷، ۲۰۸)

خدا نے نہیں چاہا کہ ہمارے دین اسلام کو مہمل چھوڑے اور دشمنوں کے ہاتھوں سے اس کو باطل اور خراب کراوے بلکہ اس نے فرمایا اور وہ بات کہنے میں سب سے بڑھ کر سچا ہے۔ کہ اللہ نے تم میں سے ان پکے مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے جو اچھے اعمال بجا لاویں گے کہ ضرور ان کو اسی طرز پر زمین میں خلیفہ بناوے گا کہ جس طرح پہلوں کو بنایا ہے ...پس اسلام کی تائید کے لئے یہ سب کچھ وعدے ہیں فتنوں کے ظہور اور گناہوں کے غلبہ کے وقت اور جو فتنے کہ اس وقت روئے زمین پر ظاہر ہو رہے ہیں ان سے کون سا بڑا فتنہ ہے اور نصاریٰ لطیف دروازہ سے لوگوں پر داخل ہوئے ہیں اور اپنے باریک در باریک فریبوں سے لوگوں کی آنکھوں اور کانوں اور دلوں کو سحر زدہ کر دیا ہے اور بہت سی مخلوق کو گمراہ کر دیا ہے او کھلے سحر کا کام کیا ہے۔

(ترجمہ از مرتب)

میں روحانیت کی رو سے اسلام میں خاتم الخلفاء ہوں جیسا کہ مسیح ابنِ مریم اسرائیلی سلسلہ کے لئے خاتم الخلفاء تھا۔ موسیٰ کے سلسلہ میں ابنِ مریم مسیح موعود تھا اور محمدیؐ سلسلہ میں میں مسیح موعود ہوں۔

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۱۷)

مسیح موعود کی پیشگوئی صرف حدیثوں میں نہیں ہے بلکہ قرآن شریف نے نہایت لطیف اشارات میں

آنے والے مسیح کی خوشخبری دی ہے جیسا کہ اُس نے وعدہ فرمایا ہے کہ جس طرز اور طریق سے اسرائیلی نبوتوں میں سلسلۂ خلافت قائم کیا گیا ہے وہی طرز اسلام میں ہوگی ۔ یہ وعدہ مسیح موعود کے آنے کی خوشخبری اپنے اندر رکھتا ہے۔ کیونکہ جب سِلسلۂ خلافت انبیاء بنی اسرائیل میں غور کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ سِلسلہ حضرت موسیٰ سے شروع ہوا اور پھر چودہ سو برس بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ختم ہو گیا۔ اور اِس نظامِ خلافت پر نظر ڈال کر معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کا مسیح موعود جس کے آنے کی یہود کو خوشخبری دی گئی تھی چودہ سو برس بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آیا اور غریبوں اور مسکینوں کی شکل میں ظاہر ہوا اور اس مماثلت کے پورا کرنے کے لئے جو قرآن شریف میں دونوں سلسلۂ خلافت اسرائیلی اور خلافت محمدی میں قائم کی گئی ہے ضروری ہے کہ ہر ایک منصف اِس بات کو مان لے کہ سلسلۂ خلافتِ محمدیہ کے آخر میں بھی ایک مسیح موعود کا وعدہ ہو جیسا کہ سِلسلۂ خلافت موسویہ کے آخر میں ایک مسیح موعود کا وعدہ تھا اور نیز تکمیل مشابہت دونوں سِلسلوں کے لئے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جیسا کہ خلافت موسویہ کے چودہ سو برس کی مدت پر مسیح موعود بنی اسرائیل کے لئے ظاہر ہوا تھا ایسا ہی اور اسی مدّت کے مشابہ زمانہ میں خلافتِ محمدؐیہ کا مسیح موعود ظاہر ہو۔ اور نیز تکمیل مشابہت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جیسا کہ یہودیوں کے علماء نے خلافت موسویہ کے مسیح موعود کو نعوذ باللہ کافر اور ملحد اور دجّال قرار دیا تھا ایسا ہی خلافتِ محمدیہ کے مسیح موعود کو اسلامی قوم کے علماء کافر اور ملحد اور دجّال قرار دیں۔ اور نیز تکمیل مشابہت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جیسا کہ خلافتِ موسویہ کا مسیح موعود ایسے وقت میں آیا تھا کہ جبکہ یہودیوں کی اخلاقی حالت نہایت ہی خراب ہو گئی تھی اور دیانت اور امانت اور تقویٰ اور طہارت اور باہمی محبت اور صلح کاری میں بہت فتور پڑ گیا تھا اور اُن کی اس ملک کی بھی سلطنت جاتی رہی تھی جس ملک میں مسیح موعود اُن کی دعوت کے لئے ظاہر ہوا تھا۔ ایسا ہی خلافتِ محمدیہ کا مسیح موعود قوم کی ایسی حالت اور ایسے ادبار کے وقت ظاہر ہو۔

(ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۲۸۳، ۲۸۴)

ثُمَّ بَعْدَ ذَالِكَ اعْلَمُوْا يَا أُولِي النُّهٰى - اَنَّ اللّٰهَ ذَكَرَ فِي الْقُرْاٰنِ اَنَّهٗ بَعَثَ مُوْسٰى بَعْدَمَا اَهْلَكَ الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى - وَاٰتَاهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ - وَوَهَبَ لِقَوْمِهِ الْخِلَافَةَ ۔ وَاَقَامَ فِيْهِمْ سِلْسِلَةَ الْهُدٰى -

پھر بعد اس کے تمہیں معلوم ہو اے دانشمندو! کہ خدا نے قرآن شریف میں یہ ذکر کیا کہ اس نے پہلی امتوں کے ہلاک کر دینے کے بعد موسیٰ کو پیدا کیا۔ اور اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی اور اس کی قوم کو خلافت بخشی اور ان میں سلسلہ ہدایت کا قائم کیا اور اس

وَجَعَلَ خَاتَمَ خُلَفَائِهٖ رَسُوْلَهُ ابْنَ مَرْيَمَ عِيْسٰى. فَكَانَ عِيْسٰى اٰخِرَ لَبِنِ هٰذِهِ الْعِمَارَةِ وَعِلْمًا لِسَاعَةِ زَوَالِهَا وَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى - ثُمَّ بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيَّنَا الْاُمِّيَّ فِيْ اَرْضِ اُمِّ الْقُرٰى وَجَعَلَهٗ مَثِيْلَ مُوْسٰى. وَجَعَلَ سِلْسِلَةَ خُلَفَآءِهٖ -كَمَثَلِ سِلْسِلَةِ خُلَفَآءِ الْكَلِيْمِ لِتَكُوْنَ رِدْءًا لَهَاوَاِنَّ فِيْ هٰذَا لَاٰيَةً لِّمَنْ يَّرٰى -وَاِنْ شِئْتَ فَاقْرَءْ اٰيَةَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى . فَاِنَّ فِيْهَا وَعْدَ الْاِسْتِخْلَافِ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ كَمَثَلِ الَّذِيْنَ اسْتُخْلِفُوْا مِنْ قَبْلُ وَ الْكَرِيْمُ اِذَا وَعَدَ وَفَا - وَاِنَّا لَا نَعْلَمُ اَسْمَآءَ خُلَفَآءَ سَبَقُوْنَا مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَ مِنْ قَبْلُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ مَّضٰى. وَمَا قَصَّ عَلَيْنَا رَبُّنَا قِصَصَ كُلِّهِمْ وَمَا اَنْبَأَنَا بِاَسْمَآءِهِمْ فَلَا نُؤْمِنُ بِهِمْ اِلَّا اِجْمَالًا وَنُفَوِّضُ تَفْصِيْلَهُمْ اِلٰى رَبِّنَا الْاَعْلٰى وَلٰكِنَّا اُلْجِئْنَا بِنَصِّ الْقُرْاٰنِ اِلٰى اَنْ نُّؤْمِنَ بِخَلِيْفَةٍ مِّنَّا هُوَ اٰخِرُ الْخُلَفَآءِ عَلٰى قَدَمِ عِيْسٰى وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّكْفُرَ بِهٖ فَاِنَّهٗ كُفْرٌ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَلَا يُفْلِحُ الْكَافِرُ حَيْثُ اَتٰى. وَفَكِّرْ

سلسلہ کا خاتم الخلفاء حضرت عیسیٰ کو بنایا پس حضرت عیسیٰ اس عمارت کی آخری اینٹ تھے اور ایک دلیل تھے اس عمارت کے زوال کی گھڑی پر اور ایک عبرت تھے اس شخص کے لئے جو ڈرتا ہو۔ پھر خدا نے ہمارے پیغمبر اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کی زمین میں مبعوث فرمایا اور ان کو مثیل موسیٰ علیہ السلام بنایا اور ان کے خلیفوں کا سلسلہ حضرت موسیٰ کے خلیفوں کے سلسلہ کی طرح اور ان کے مشابہ کر دیا تا کہ یہ سلسلہ اس سلسلہ کا مددگار رہو اور اس میں دیکھنے والوں کے لئے ایک نشان ہے اور اگر تو چاہے تو اس آیت کو پڑھ لے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ اور اپنے ہوا و ہوس کا پیرو مت بن کیونکہ اس آیت میں صاف وعدہ اس امت کے لئے ایسے خلیفوں کا ہے جو ان خلیفوں کی طرح ہوں جو بنی اسرائیل میں گزر چکے ہیں اور کریم جب وعدہ کرتا ہے تو اسے پورا کرتا ہے اور ہم ان تمام خلیفوں کے نام نہیں جانتے جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں مگر اس امت کے اور اگلی امتوں کے چند گزرے ہوئے آدمی۔ اور خدا نے ان سب کے نام سے بھی ہم کو اطلاع نہیں دی پس ہم ان پر اجمالی طور پر ایمان لاتے ہیں اور ان کے ناموں کی تفصیل کو اپنے خدا کو سونپتے ہیں مگر ہم قرآن کی نص کے رو سے اس بات پر مجبور ہو گئے کہ اس بات پر ایمان لائیں کہ آخری خلیفہ اسی امت میں سے ہوگا اور وہ عیسیٰ کے قدم پر آئے گا اور کسی مومن کی مجال نہیں کہ اس کا انکار کرے کیونکہ یہ قرآن کا انکار ہے اور جو کوئی قرآن کا منکر ہے وہ جہاں جاوے خدا کے عذاب کے نیچے ہے اور تو قرآن میں

فِي الْقُرْاٰنِ حَقَّ الْفِكْرِ وَلَا تَكُنْ كَالَّذِي اسْتَكْبَرَ وَ اَبٰى - وَاِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَا فَاقْرَءْ سُوْرَةَ النُّوْرِ مُتَدَبِّرًا لِّيَتَجَلّٰى عَلَيْكَ هٰذَا النُّوْرُ كَالضُّحٰى -

(خطبہ الہامیہ، روحانی خزائن جلد ۱۶ صفحہ ۷۴ تا ۷۷)

ایسا فکر کر جیسا کہ فکر کرنے کا حق ہے اور اس شخص کی طرح نہ ہو جو تکبر کر کے سر پھیر لیتا ہے اور یہی بات خدا کی طرف سے حق ہے۔ پس سورہ نور کو غور سے پڑھ تا کہ تجھ پر یہ نور دن کی طرح ظاہر ہو۔ (ترجمہ اصل کتاب سے)

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَا وَعَدَ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى- لَيُقُوْلُنَّ اِنَّهٗ وَعَدَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْ يَّسْتَخْلِفَ مِنْهُمْ كَمَا اسْتَخْلَفَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى - فَقَدْ اَقَرُّوْا بِتَشَابُهِ السِّلْسِلَتَيْنِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَ كَبَصِيْرٍ تَعَامٰى- وَلَمَّا كَانَ نَبِيُّنَا مَثِيْلَ مُوْسٰى- وَكَانَ سِلْسِلَةُ خُلَفَآءِهٖ مَثِيْلَ السِّلْسِلَةِ الْمُوْسَوِيَّةِ بِنَصٍّ اَجْلٰى- وَجَبَ اَنْ تَخْتَتِمَ السِّلْسِلَةُ الْمُحَمَّدِيَّةُ عَلٰى خَلِيْفَةٍ هُوَ مَثِيْلُ عِيْسٰى- كَمَا اخْتُتِمَ عَلَى ابْنِ مَرْيَمَ سِلْسِلَةُ صَاحِبِ الْعَصَا- لِيُطَابِقَ هٰذِهِ السِّلْسِلَةُ بِسِلْسِلَةٍ اُوْلٰى وَلِيَتِمَّ وَعْدُ مُمَاثَلَةِ الْاِسْتِخْلَافِ كَمَا هُوَ ظَاهِرٌ مِّنْ لَفْظِ كَمَا-

(خطبہ الہامیہ، روحانی خزائن جلد ۱۶ صفحہ ۹۱، ۹۲)

اگر ان سے پوچھا جائے کہ تمہارے خدا نے کیا وعدہ فرمایا ہے تو اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں خدا نے یہ وعدہ مومنوں سے ضرور کیا ہے کہ ان میں خلیفے پیدا کئے جاویں گے ان خلیفوں کی مانند جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں خلیفے پیدا کئے تھے۔ پس دونوں سلسلوں کی مشابہت کا اقرار کرتے ہیں پھر ایسے شخص کی طرح انکار کر بیٹھے ہیں کہ وہ سوجا کھا ہو اور اپنے آپ کو اندھا بنالے اور جس حالت میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مثیل موسیٰ ٹھہرے اور نیز سلسلہ خلفاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مثیل سلسلہ موسیٰ علیہ السلام قرار پایا جیسا کہ نص صریح اس پر دلالت کرتی ہے پس واجب ہوا کہ سلسلہ محمدیہ ایک ایسے خلیفہ پر ختم ہو کہ وہ مثیل عیسیٰ علیہ السلام ہووے جیسا کہ سلسلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ختم ہوا تا کہ یہ دونوں سلسلے باہم مطابق ہو جائیں اور تا کہ وعدہ مماثلت اس سلسلہ کے خلیفوں کا اور اس سلسلہ کے خلیفوں کا پورا ہو جائے جیسا کہ امر مماثلت کَمَا کے لفظ سے ظاہر ہے۔ (ترجمہ اصل کتاب سے)

اَمَا قَالَ رَبُّكُمْ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

کیا تمہارے خدا نے نہیں فرمایا ہے کہ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اس میں ایک حجت ہے

وَ اِنَّ فِیْ ذَالِكَ حُجَّةً عَلٰی مَنْ طَغٰی۔ فَاِنَّ لَفْظَ كَمَا یُوْجَبُ اَنْ یَّكُوْنَ سِلْسِلَةَ الْخُلَفَآءِ فِیْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ كَمَثَلِ سِلْسِلَةِ نَبِیِّ اللّٰهِ مُوْسٰی۔ الَّتِیْ خُتِمَتْ عَلَی ابْنِ مَرْیَمَ عِیْسٰی۔ فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ مِنْ هٰذِهِ الْاٰیَةِ وَتُبْعِدُوْنَ مَا دَنٰی - وَوَ اللّٰهِ لَیْسَ فِی الْقُرْاٰنِ الَّذِیْ هُوَ اَهْلُ الْفَصْلِ وَالْقَضَآءِ اِلَّا خَبَرَ ظُهُوْرِ خَاتَمِ الْخُلَفَآءِ مِنْ اُمَّةِ خَیْرِ الْوَرٰی فَلَا تَقْفُوْا مَا لَیْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ قَدْ اُعْطِیْتُمْ فِیْهِ مِنَ الْهُدٰی- وَلَا تُخْرِجُوْا مِنْ اَفْوَاهِكُمْ كَلِمَاتٍ شَتّٰی۔الَّتِیْ لَیْسَتْ هِیَ اِلَّا كَسَهْمٍ فِی الظُّلُمَاتِ یُرْمٰی - وَاِنَّ هٰذَا الْوَعْدَ وَعْدٌ حَقٌّ۔

(خطبہ الہامیہ، روحانی خزائن جلد ۱۶ صفحہ ۱۰۸، ۱۰۹)

اس کے لئے کہ جو حد سے تجاوز کرتا ہے کیونکہ لفظ کما جو اس آیت میں موجود ہے اس امت کے سلسلہ کے خلفاء کو موسیٰ علیہ السلام کے خلفاء سے مانند ہونے کو واجب کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ سلسلہ خلفاءِ موسیٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام پر ختم ہو گیا ہے۔ پس اس آیت سے کہاں روگردانی کرتے ہو اور نزدیک راہ کو دور ڈالتے ہو اور خدا کی قسم قرآن شریف میں جو تمام اختلافوں کا فیصلہ کرنے والا ہے کہیں ذکر نہیں ہے کہ خاتم الخلفاء سلسلہ محمدیہ کا موسوی سلسلہ سے آئے گا اس کی پیروی مت کرو کہ کوئی دلیل تمہارے پاس نہیں ہے بلکہ برخلاف اس کے تم کو دلیل دی گئی۔ اور کلمات متفرقہ اپنے منہ سے نہ نکالو کہ وہ کلمات اس تیر کی طرح ہیں جو اندھیرے میں چلایا جائے اور یہ وعدہ جو مذکور ہوا سچا وعدہ ہے (ترجمہ اصل کتاب سے)

وَحَثَّ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی هٰذَا الدُّعَآءِ ثُمَّ وَعَدَ فِیْ سُوْرَةِ النُّوْرِ وَعْدًا اِنَّهٗ لَیَسْتَخْلِفَنَّ قَوْمًا مِّنْهُمْ كَمَثَلِ الَّذِیْنَ اسْتُخْلِفُوْا مِنْ قَبْلُ لِیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنَّ الدُّعَآءَ اُجِیْبَ لِبَعْضِهِمْ مِنَ الْحَضْرَةِ الْعُلْیَا -

(خطبہ الہامیہ، روحانی خزائن جلد ۱۶ صفحہ ۱۱۸، ۱۱۹)

اور اس دعا پر خدا نے مومنوں کو رغبت دلائی ہے اور اس کے بعد سورہ نور میں وعدہ دیا ہے کہ مسلمانوں میں سے خلیفے مقرر کرے گا۔ ان خلیفوں کی طرح جو ان سے پہلے ہوئے ہیں۔ (ترجمہ اصل کتاب سے)

قَدْ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ كَمِثْلِ خُلَفَآءِ شِرْعَةِ مُوْسٰی فَوَجَبَ اَنْ یَّأْتِیَ اٰخِرُ الْخُلَفَآءِ عَلٰی قَدَمِ عِیْسٰی وَمِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ۔

(خطبہ الہامیہ، روحانی خزائن جلد ۱۶ صفحہ ۱۳۹)

خدا نے مومنوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان کو موسیٰ کی شریعت کے خلیفوں کی مانند خلیفہ بنائے گا۔ یہاں سے واجب ہوا کہ آخری خلیفہ عیسیٰ علیہ السلام کے قدم پر آئے گا اور اسی امت میں سے ہوگا

(ترجمہ اصل کتاب سے)

اِعْلَمْ أَنَّ الْمَسِيْحَ الْمَوْعُوْدَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ لَيْسَ هُوَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ صَاحِبَ الْإِنْجِيْلِ وَخَادِمَ الشَّرِيْعَةِ الْمُوْسَوِيَّةِ، كَمَا ظَنَّ بَعْضُ الْجُهَلَاءِ مِنَ الْفَيْجِ الْأَعْوَجِ وَالْفِئَةِ الْخَاطِئَةِ، بَلْ هُوَ خَاتَمُ الْخُلَفَآءِ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، كَمَا كَانَ عِيْسٰى خَاتَمَ خُلَفَآءِ السِّلْسِلَةِ الْكَلِيْمِيَّةِ، وَكَانَ لَهَا كَاٰخِرِ اللَّبِنَةِ وَخَاتَمَ الْمُرْسَلِيْنَ. وَإِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْحَقُّ، فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ ثُمَّ يَمُرُّوْنَ مُنْكِرِيْنَ. وَإِنَّ الْفُرْقَانَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْمُتَنَازِعِيْنَ فِيْ هٰذِهِ الْمَسْأَلَةِ، فَإِنَّهٗ صَرَّحَ فِيْ سُوْرَةِ النُّوْرِ بِقَوْلِهٖ "مِنْكُمْ" بِأَنَّ خَاتَمَ الْأَئِمَّةِ مِنْ هٰذِهِ الْمِلَّةِ،

جان لو کتاب اللہ میں جس مسیح موعود کے آنے کا وعدہ دیا گیا ہے وہ صاحبِ انجیل اور خادم شریعتِ موسوی عیسیٰ ابن مریم نہیں جیسا کہ فیجِ اعوج کے بعض جاہل لوگوں اور غلط کار فرقہ میں سے بعض نے خیال کیا ہے بلکہ وہ خاتم الخلفاء اسی امت میں سے ہوگا جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خلفاء سلسلہ موسویہ کے خاتم تھے اور اس عمارت کی وہ آخری اینٹ اور اس سلسلہ کے آخری مرسل تھے اور یقیناً یہی بات سچی ہے۔ ان لوگوں کے لئے ہلاکت ہے جو قرآن تو پڑھتے ہیں پھر اس سے منکروں کی طرح اعراض کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس مسئلہ کے بارے میں جھگڑا کرنے والوں کے درمیان فیصلہ کر دیا ہے اور منکم کے لفظ سے سورۃ نور میں صراحت کر دی ہے کہ خاتم الآئمہ امت محمدیہ میں سے ہی ہوگا۔

(ترجمہ از مرتب)

(خطبہ الہامیہ، روحانی خزائن جلد ۱۶ صفحہ ۳۰۹)

منجملہ دلائل قویہ قطعیہ کے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں جو مسیح موعود اسی اُمتِ محمدیہ میں سے ہوگا قرآن شریف کی یہ آیت ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ الخ یعنی خدا تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے جو ایماندار ہیں اور نیک کام کرتے ہیں وعدہ فرمایا ہے جو ان کو زمین پر اُنہی خلیفوں کی مانند جو اُن سے پہلے گزر چکے ہیں خلیفے مقرر فرمائے گا اِس آیت میں پہلے خلیفوں سے مُراد حضرت موسیٰ کی امت میں سے خلیفے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی شریعت کو قائم کرنے کے لئے پے در پے بھیجا تھا اور خاص کر کسی صدی کو ایسے خلیفوں سے جو دینِ موسوی کے مجدد تھے خالی نہیں جانے دیا تھا اور قرآن شریف نے ایسے خلیفوں کا شمار کر کے ظاہر فرمایا ہے کہ وہ باراں[۱۲] ہیں اور تیرھواں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جو موسوی شریعت کا مسیح موعود ہے۔ اور اس

مماثلت کے لحاظ سے جو آیت ممدوحہ میں کَمَا کے لفظ سے مستنبط ہوتی ہے ضروری تھا کہ محمدی خلیفوں کو موسوی خلیفوں سے مشابہت ومماثلت ہو۔ سواسی مشابہت کے ثابت اور متحقق کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں بارہ موسوی خلیفوں کا ذکر فرمایا جن میں سے ہر ایک حضرت موسیٰ کی قوم میں سے تھا اور تیرھواں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرمایا جو موسیٰ کی قوم کا خاتم الانبیاء تھا مگر درحقیقت موسیٰ کی قوم میں سے نہیں تھا اور پھر خدا نے محمدی سلسلہ کے خلیفوں کو موسوی سِلسلہ کے خلیفوں سے مشابہت دے کر صاف طور پر سمجھا دیا کہ اس سلسلہ کے آخر میں بھی ایک مسیح ہے اور درمیان میں باراں خلیفے ہیں تا موسوی سلسلہ کے مقابل پر اس جگہ بھی چوداں کا عدد پورا ہو ایسا ہی سلسلہ محمدی خلافت کے مسیح موعود کو چودھویں صدی کے سر پر پیدا کیا کیونکہ موسوی سلسلہ کا مسیح موعود بھی ظاہر نہیں ہوا تھا جب تک کہ سن موسوی کے حساب سے چودھویں صدی نے ظہور نہیں کیا تھا ایسا کیا گیا تا دونوں مسیحوں کا مبدء سلسلہ سے فاصلہ باہم مشابہ ہو اور سلسلہ کے آخری خلیفہ مجدد کو چودھویں صدی کے سر پر ظاہر کرنا تکمیل نور کی طرف اشارہ ہے کیونکہ مسیح موعود اسلام کے قمر کا متمّم نور ہے اس لئے اس کی تجدید چاند کی چودھویں رات سے مشابہت رکھتی ہے اسی کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کیونکہ اظہار تام اور اتمام نور ایک ہی چیز ہے۔ اور یہ قول کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الْاَدْيَانِ كُلَّ الْاِظْهَارِ مساوی اس قول سے ہے کہ لِيُتِمَّ نُوْرَهٗ كُلَّ الْاِتْمَامِ اور پھر دوسری آیت میں اس کی اور بھی تصریح ہے اور وہ یہ ہے۔ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (الصف:۹) اس آیت میں تصریح سے سمجھایا گیا ہے کہ مسیح موعود چودھویں صدی میں پیدا ہوگا۔ کیونکہ اتمام نور کے لئے چودھویں رات مقرر ہے۔ غرض جیسا کہ قرآن شریف میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ بن مریم کے درمیان باراں خلیفوں کا ذکر فرمایا گیا اور اُن کا عدد بارہ ظاہر کیا گیا اور یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ وہ تمام بارہ کے بارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھے مگر تیرھواں خلیفہ جو اخیری خلیفہ ہے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے باپ کے رُو سے اس قوم میں سے نہیں تھا کیونکہ اس کا کوئی باپ نہ تھا جس کی وجہ سے وہ حضرت موسیٰ سے اپنی شاخ ملا سکتا۔ یہی تمام باتیں سلسلہ خلافت محمدیہ میں پائی جاتی ہیں یعنی حدیث متفق علیہ سے ثابت ہے کہ اس سلسلہ میں بھی درمیانی خلیفے باراں ہیں اور تیرھواں جو خاتمِ ولایت محمدیہ ہے وہ محمدی قوم میں سے نہیں ہے یعنی قریش میں سے نہیں اور یہی چاہئے تھا کہ باراں خلیفے تو حضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم کی قوم میں سے ہوتے اور آخری خلیفہ اپنے آباء واجداد کے رُو سے اس قوم میں سے نہ ہوتا تا تحقّق مشابہت اکمل اور اتم طور پر ہو جاتا۔ سو

الحمدللہ والمنّۃ کہ ایسا ہی ظہور میں آیا کیونکہ بخاری اور مسلم میں یہ حدیث متفق علیہ ہے جو جابر بن سمرہ سے ہے اور وہ یہ ہے لَا یَزَالُ الْاِسْلَامُ عَزِیْزًا اِلَی اثْنَا عَشَرَ خَلِیْفَۃً کُلُّھُمْ مِنْ قُرَیْشٍ۔ یعنی بارہ خلیفوں کے ہوتے تک اسلام خوب قوت اور زور میں رہے گا مگر تیرھواں خلیفہ جو مسیح موعود ہے اُس وقت آئے گا جبکہ اسلام غلبۂ صلیب اور غلبہ دجالیت سے کمزور ہو جائے گا اور وہ بارہ خلیفے جو غلبۂ اسلام کے وقت آتے رہیں گے وہ سب کے سب قریش میں سے ہوں گے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں سے ہوں گے۔★ مگر مسیح موعود جو اسلام کے ضعف کے وقت آئے گا وہ قریش کی قوم میں سے نہیں ہوگا کیونکہ ضرور تھا کہ جیسا کہ موسوی سلسلہ کا خاتم الانبیاء اپنے باپ کے رو سے حضرت موسیٰ کی قوم میں سے نہیں ہے ایسا ہی محمدی سلسلہ کا خاتم الاولیاء قریش میں سے نہ ہو اور اسی جگہ سے قطعی طور پر اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ اسلام کا مسیح موعود اِسی امت میں سے آنا چاہئے کیونکہ جبکہ نص قطعی قرآنی یعنی کَمَا کے لفظ سے ثابت ہو گیا کہ سلسلہ استخلاف محمدی کا سلسلہ استخلاف موسوی سے مماثلت رکھتا ہے جیسا کہ اُسی کَمَا کے لفظ سے ان دونبیوں یعنی حضرت موسیٰ اور حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی مماثلت ثابت ہے جو آیت کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمّل :۱۶) سے سمجھی جاتی ہے تو یہ مماثلت اسی حالت میں قائم رہ سکتی ہے جبکہ محمدی سلسلہ کے آنے والے خلیفے گزشتہ

☆ الفاظ حدیث یہ ہیں۔ عن جابر بن سمرۃ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ لَا یَزَالُ الْاِسْلَامُ عَزِیْزًا اِلَی اثْنَیْ عَشَرَ خَلِیْفَۃً کُلُّھُمْ مِّنْ قُرَیْشٍ متفق علیہ مشکوٰۃ شریف باب مناقب قریش۔ یعنی اسلام باراں خلیفوں کے ظہور تک غالب رہے گا اور وہ تمام خلیفے قریش میں سے ہوں گے۔ اس جگہ یہ دعویٰ نہیں ہو سکتا کہ مسیح موعود بھی انہی باراں میں داخل ہے کیونکہ متفق علیہ یہ امر ہے کہ مسیح موعود اسلام کی قوت کے وقت نہیں آئے گا بلکہ اس وقت آئے گا جبکہ زمین پر نصرانیت کا غلبہ ہوگا جیسا کہ یَکْسِرُ الصَّلِیْبَ کے فقرہ سے مستنبط ہوتا ہے۔ پس ضرور ہے کہ مسیح کے ظہور سے پہلے اسلام کی قوت جاتی رہے اور مسلمانوں کی حالت پر ضعف طاری ہو جائے اور اکثر ان کے دوسری طاقتوں کے نیچے اسی طرح محکوم ہوں جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور کے وقت یہودیوں کی حالت ہو رہی تھی۔ چونکہ حدیثوں میں مسیح موعود کا خاص طور پر تذکرہ تھا اس لئے باراں خلیفوں سے اس کو الگ رکھا گیا کیونکہ مقدر ہے کہ وہ نزول شدائد و مصائب کے بعد آوے اور اس وقت آوے جبکہ اسلام کی حالت میں ایک صریح انقلاب پیدا ہو جائے اور اِسی طرز سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تھے یعنی ایسے وقت میں جبکہ یہودیوں میں ایک صریح زوال کی علامت پیدا ہو گئی تھی پس اس طریق سے حضرت موسیٰ کے خلیفے بھی تیرہ ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفے بھی تیرہ اور جیسا کہ حضرت موسیٰ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام چودھویں جگہ تھے ایسا ہی ضرور تھا کہ اسلام کا مسیح موعود بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چودھویں جگہ پر ہو اِسی مشابہت سے مسیح موعود کا چودھویں صدی میں ظاہر ہونا ضروری تھا۔ منہ

خلیفوں کا عین نہ ہوں بلکہ غیر ہوں۔★ وجہ یہ کہ مشابہت اور مماثلت میں من وجہٍ مغائرت ضروری ہے اور کوئی چیز اپنے نفس کے مشابہ نہیں کہلاسکتی۔ پس اگر فرض کرلیں کہ آخری خلیفہ سلسلہ محمدیہ کا جو تقابل کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقابل پر واقع ہوا ہے جس کی نسبت یہ ماننا ضروری ہے کہ وہ اس اُمت کا خاتم الاولیاء ہے۔★★ جیسا کہ سلسلہ موسویہ کے خلیفوں میں حضرت عیسیٰ خاتم الانبیاء ہے۔ اگر درحقیقت وہی عیسیٰ علیہ السلام ہے جو دوبارہ آنے والا ہے تو اس سے قرآن شریف کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ قرآن جیسا کہ کَمَا کے لفظ سے مستنبط ہوتا ہے دونوں سلسلوں کے تمام خلیفوں کو من وجہ مغائر قرار دیتا ہے اور یہ ایک نص قطعی ہے کہ اگر ایک دنیا اس کے مخالف اکٹھی ہو جائے تب بھی وہ اس نص واضح کو ردّ نہیں کر سکتی کیونکہ جب پہلے سلسلہ کا عین ہی نازل ہو گیا تو وہ مغائرت فوت ہو گئی اور لفظ کَمَا کا مفہوم باطل ہو گیا۔ پس اس صورت میں تکذیب قرآن شریف لازم ہوئی۔ وَهٰذَا بَاطِلٌ وَّكُلَّمَا يَسْتَلْزِمُ الْبَاطِلَ فَهُوَ بَاطِلٌ۔

یاد رہے کہ قرآن شریف نے آیت كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ میں وہی کَمَا استعمال کیا ہے جو آیت كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمّل: ١٦) میں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے جو

★ جبکہ بوجہ کَمَا کے لفظ کے جو آیت كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ میں موجود ہے محمدی سلسلہ کے خلیفوں کی نسبت وجوباً وقطعاً مان لیا گیا ہے کہ وہ وہی خلیفے نہیں ہیں جو موسوی سلسلہ کے خلیفے تھے ہاں اُن خلیفوں سے مشابہ ہیں اور نیز ساتھ اس کے واقعات نے بھی ظاہر کر دیا ہے کہ وہ لوگ پہلے خلیفوں کے عین نہیں ہیں بلکہ غیر ہیں۔ تو پھر آخری خلیفہ اس سلسلہ محمدیہ کی نسبت جو مسیح موعود ہے کیوں یہ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ پہلے مسیح کا عین ہے؟ کیا وہ کَمَا کے لفظ کے نیچے نہیں ہے؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ حسب منشاء کَمَا کے لفظ کے محمدی سلسلہ کا مسیح اسرائیلی مسیح کا غیر ہونا چاہئے نہ عین۔ عین سمجھنا تو قرآن کے منطوق نص پر صریح حملہ ہے بلکہ قرآن شریف کی صریح تکذیب ہے اور نیز ایک بے جا تحکم کہ باراں خلیفوں کو تو حسب منشاء کَمَا کے لفظ کے اسرائیلی خلیفوں کا غیر سمجھنا اور پھر مسیح موعود کو جو سلسلہ موسویہ کے مقابل پر سلسلہ محمدیہ کا آخری خلیفہ ہے پہلے مسیح کا عین قرار دے دینا۔ وهٰذِهٖ نُكْتَةٌ مُّبْتَكِرَةٌ وَّحُجَّةٌ بَاهِرَةٌ وَّدُرَّةٌ مِّنْ دُرَرٍ تَفَرَّدْتُ بِهَا فَخُذُوْهَا بِقُوَّةٍ وَّاشْكُرُوا اللّٰهَ بِاِنَابَةٍ وَّلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمَحْرُوْمِيْنَ۔ منہ

★★ شیخ محی الدین ابن عربی اپنی کتاب فصوص میں مہدی خاتم الاولیاء کی ایک علامت لکھتے ہیں کہ اس کا خاندان چینی حدود میں سے ہوگا اور اس کی پیدائش میں یہ ندرت ہوگی کہ اس کے ساتھ ایک لڑکی بطور توام پیدا ہوگی۔ یعنی اس طرح پر خدا اناث کا مادہ اس سے الگ کر دے گا۔ سو اسی کشف کے مطابق اس عاجز کی ولادت ہوئی ہے اور اسی کشف کے مطابق میرے بزرگ چینی حدود سے پنجاب میں پہنچے ہیں۔ منہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مثیل موسیٰ ہو کر نہیں آئے بلکہ یہ خود موسیٰ بطور تناسخ آ گیا ہے یا یہ دعویٰ کرے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ توریت کی اس پیشگوئی کا میں مصداق ہوں بلکہ اس پیشگوئی کے معنے یہ ہیں کہ خود موسیٰ ہی آ جائے گا جو بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ہے تو کیا اس فضول دعوے کا یہ جواب نہیں دیا جائے گا کہ قرآن شریف میں ہرگز بیان نہیں فرمایا گیا کہ خود موسیٰ آئے گا بلکہ کَمَا کے لفظ سے مثیل موسیٰ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ پس یہی جواب ہماری طرف سے ہے کہ اس جگہ بھی سلسلہ خلفاء محمدی کے لئے کَمَا کا لفظ موجود ہے۔ اور یہ نص قطعی کلام الٰہی کی آفتاب کی طرح چمک کر ہمیں بتلا رہی ہے کہ سلسلہ خلافتِ محمدی کے تمام خلیفے خلفاء موسوی کے مثیل ہیں۔ اِسی طرح آخری خلیفہ جو خاتم ولایت محمدیہ ہے جو مسیح موعود کے نام سے موسوم ہے وہ حضرت عیسیٰ سے جو خاتم سلسلۂ نبوت موسویہ ہے مماثلت اور مشابہت رکھتا ہے۔ مثلاً دیکھو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت یوشع بن نون سے کیسی مشابہت ہے کہ انہوں نے ایسا ایک ناتمام کام لشکر اسامہ اور انبیاء کاذبین کے مقابلہ کا پورا کیا جیسا کہ حضرت یوشع بن نون نے پورا کیا۔ اور آخری خلیفہ سلسلہ موسوی کا یعنی حضرت عیسیٰ جیسا کہ اُس وقت آیا جبکہ گلیل اور پیلاطوس کے علاقہ سے سلطنت یہود کی جاتی رہی تھی ایسا ہی سلسلہ محمدیہ کا مسیح ایسے وقت میں آیا کہ جب ہندوستان کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکی۔ (تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۸)

جس آیت سے دونوں سلسلوں یعنی سلسلہ خلافتِ موسویہ اور سلسلہ خلافت محمدیہ میں مماثلت ثابت ہے یعنی جس سے قطعی اور یقینی طور پر سمجھا جاتا ہے کہ سلسلۂ نبوتِ محمدیہ کے خلیفے سلسلۂ نبوت موسویہ کے مشابہ و مماثل ہیں وہ یہ آیت ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ الخ یعنی خدا نے اُن ایمانداروں سے جو نیک کام بجالاتے ہیں وعدہ کیا ہے جو اُن میں سے زمین پر خلیفے مقرر کرے گا انہی خلیفوں کی مانند جو اُن سے پہلے کئے تھے۔ اب جب ہم مانند کے لفظ کو پیش نظر رکھ کر دیکھتے ہیں جو محمدی خلیفوں کی موسوی خلیفوں سے مماثلت واجب کرتا ہے تو ہمیں ماننا پڑتا ہے جو ان دونوں سلسلوں کے خلیفوں میں مماثلث ضروری ہے اور مماثلت کی پہلی بنیاد ڈالنے والا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہے اور مماثلت کا آخری نمونہ ظاہر کرنے والا وہ مسیح خاتم خلفاءِ محمدیہ ہے جو سلسلہ خلافت محمدیہ کا سب سے آخری خلیفہ ہے۔ سب سے پہلا خلیفہ جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہے وہ حضرت یوشع بن نون کے مقابل اور اُن کا مثیل ہے جس کو خدا نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت

کے لئے اختیار کیا اور سب سے زیادہ فراست کی رُوح اُس میں پھونکی یہاں تک کہ وہ مشکلات جو عقیدۂ باطلہ حیاتِ مسیح کے مقابلہ میں خاتم الخلفاء کو پیش آنی چاہئے تھی ان تمام شبہات کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کمال صفائی سے حل کر دیا اور تمام صحابہ میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ رہا جس کا گذشتہ انبیاء علیہم السلام کی موت پر اعتقاد نہ ہو گیا ہو بلکہ تمام اُمور میں تمام صحابہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایسی ہی اطاعت اختیار کر لی جیسا کہ حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل نے حضرت یشوع بن نون کی اطاعت کی تھی اور خدا بھی موسیٰ اور یشوع بن نون کے نمونہ پر جس طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا اور آپ کا حامی اور مؤید تھا۔ ایسا ہی ابوبکر صدیق کا حامی اور مؤید ہو گیا۔ درحقیقت خدا نے یشوع بن نون کی طرح اس کو ایسا مبارک کیا جو کوئی دشمن اس کا مقابلہ نہ کر سکا اور اسامہ کے لشکر کا ناتمام کام جو حضرت موسیٰ کے ناتمام کام سے مشابہت رکھتا تھا حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر پورا کیا۔ اور حضرت ابوبکر کی حضرت یشوع بن نون کے ساتھ ایک اور عجیب مناسبت یہ ہے جو حضرت موسیٰ کی موت کی اطلاع سب سے پہلے حضرت یوشع کو ہوئی اور خدا نے بلاتوقف اُن کے دل میں وحی نازل کی جو موسیٰ مر گیا تا یہود حضرت موسیٰ کی موت کے بارے میں کسی غلطی یا اختلاف میں نہ پڑ جائیں جیسا کہ یشوع کی کتاب باب اوّل سے ظاہر ہے اِسی طرح سب سے پہلے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی موت پر حضرت ابوبکر نے یقین کامل ظاہر کیا اور آپ کے جسدِ مبارک پر بوسہ دے کر کہا کہ تو زندہ بھی پاک تھا اور موت کے بعد بھی پاک ہے اور پھر وہ خیالات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بارے میں بعض صحابہ کے دل میں پیدا ہو گئے تھے ایک عام جلسہ میں قرآن شریف کی آیت کا حوالہ دے کر اُن تمام خیالات کو دُور کر دیا اور ساتھ ہی اس غلط خیال کی بھی بیخ کنی کر دی جو حضرت مسیح کی حیات کی نسبت احادیث نبویہ میں پوری غور نہ کرنے کی وجہ سے بعض کے دلوں میں پایا جاتا تھا اور جس طرح حضرت یشوع بن نون نے دین کے سخت دشمنوں اور مفتریوں اور مفسدوں کو ہلاک کیا تھا اِسی طرح بہت سے مفسد اور جھوٹے پیغمبر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مارے گئے اور جس طرح حضرت موسیٰ راہ میں ایسے نازک وقت میں فوت ہو گئے تھے کہ جب ابھی بنی اسرائیل نے کنعانی دشمنوں پر فتح حاصل نہیں کی تھی اور بہت سے مقاصد باقی تھے اور اردگرد دشمنوں کا شور تھا جو حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد اور بھی خطرناک ہو گیا تھا ایسا ہی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک خطرناک زمانہ پیدا ہو گیا تھا۔ کئی فرقے عرب کے مرتد ہو گئے تھے بعض نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا اور کئی جھوٹے پیغمبر

کھڑے ہو گئے تھے اور ایسے وقت میں جو ایک بڑے مضبوط دل اور مستقل مزاج اور قوی الایمان اور دلاور اور بہادر خلیفہ کو چاہتا تھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر کئے گئے اور ان کو خلیفہ ہوتے ہی بڑے غموں کا سامنا ہوا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ بباعث چند در چند فتنوں اور بغاوت اعراب اور کھڑے ہونے جھوٹے پیغمبروں کے میرے باپ پر جبکہ وہ خلیفہ رسول اللہ صلعم مقرر کیا گیا وہ مصیبتیں پڑیں اور وہ غم دل پر نازل ہوئے کہ اگر وہ غم کسی پہاڑ پر پڑتے تو وہ بھی گر پڑتا اور پاش پاش ہو جاتا اور زمین سے ہموار ہو جاتا۔ مگر چونکہ خدا کا یہ قانونِ قدرت ہے کہ جب خدا کے رسول کا کوئی خلیفہ اس کی موت کے بعد مقرر ہوتا ہے تو شجاعت اور ہمت اور استقلال اور فراست اور دل قوی ہونے کی رُوح اس میں پھونکی جاتی ہے جیسا کہ یشوع کی کتاب باب اول آیت ۶ میں حضرت یشوع کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مضبوط ہو اور دلاوری کر یعنی موسیٰ تو مر گیا اَب تو مضبوط ہو جا۔ ★ یہی حکم قضا و قدر کے رنگ میں نہ شرعی رنگ میں حضرت ابوبکر کے دل پر بھی نازل ہوا تھا تناسب اور تشابہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا ابوبکر بن قحافہ اور یشوع بن نون ایک ہی شخص ہے۔ استخلافی مماثلت نے اِس جگہ کَس کر اپنی مشابہت دکھلائی ہے یہ اس لئے کہ کسی دو لمبے سلسلوں میں باہم مشابہت کو دیکھنے والے طبعاً یہ عادت رکھتے ہیں کہ یا اوّل کو دیکھا کرتے ہیں اور یا آخر کو مگر دو سلسلوں کی درمیانی مماثلت کو جس کی تحقیق و تفتیش زیادہ وقت چاہتی ہے دیکھنا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ اوّل اور آخر پر قیاس کر لیا کرتے ہیں اس لئے خُدا نے اس مشابہت کو جو یشوع بن نون اور حضرت ابوبکر میں ہے جو دونوں خلافتوں کے اوّل سلسلہ میں ہیں اور نیز اس مشابہت کو جو حضرت عیسیٰ بن مریم اور اِس اُمت کے مسیح موعود میں ہے جو دونوں خلافتوں کے آخر سلسلہ میں ہیں اجلی بدیہیات کر کے دکھلا دیا۔ مثلاً یشوع اور ابوبکر میں وہ مشابہت درمیان رکھ دی کہ گویا وہ دونوں ایک ہی وجود ہے یا ایک ہی جوہر کے دو ٹکڑے ہیں اور جس طرح بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد یوشع بن نون کی باتوں کے شنوا ہو

★ خدا تعالیٰ کے حکم دو قسم کے ہوتے ہیں ایک شرعی جیسا یہ کہ تو خون نہ کر چوری نہ کر جھوٹی گواہی مت دے دوسری قسم حکم کی قضا و قدر کے حکم ہیں جیسا کہ یہ حکم کہ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ شرعی حکم میں محکوم کا تخلف حکم سے جائز ہے جیسا کہ بہتیرے باوجود حکم شرعی پانے کے خون بھی کرتے ہیں چوری بھی کرتے ہیں جھوٹی گواہی بھی دیتے ہیں مگر قضا و قدر کے حکم میں ہرگز تخلف جائز نہیں۔ انسان تو انسان قدری حکم سے جمادات بھی تخلف نہیں کر سکتے کیونکہ جبروتی کشش اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ سو حضرت یشوع کو خدا کا یہ حکم کہ مضبوط دل ہو جا قدری حکم تھا یعنی قضاء و قدر کا حکم وہی حکم حضرت ابوبکر کے دل پر بھی نازل ہوا تھا۔ منہ

گئے اور کوئی اختلاف نہ کیا اور سب نے اپنی اطاعت ظاہر کی یہی واقعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پیش آیا اور سب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی میں آنسو بہا کر دلی رغبت سے حضرت ابوبکر کی خلافت کو قبول کیا۔غرض ہر ایک پہلو سے حضرت ابوبکر صدیق کی مشابہت حضرت یشوع بن نون علیہ السلام سے ثابت ہوئی۔خدا نے جس طرح حضرت یشوع بن نون کو اپنی وہ تائیدیں دکھلائیں کہ جو حضرت موسیٰ کو دکھلایا کرتا تھا ایسا ہی خدا نے تمام صحابہ کے سامنے حضرت ابوبکر کے کاموں میں برکت دی اور نبیوں کی طرح اس کا اقبال چمکا۔اُس نے مفسدوں اور جھوٹے نبیوں کو خدا سے قدرت اور جلال پا کر قتل کیا تا کہ اصحاب رضی اللہ عنہم جانیں کہ جس طرح خدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا اس کے بھی ساتھ ہے۔ایک اور عجیب مناسبت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت یشوع بن نون علیہ السلام سے ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت یشوع بن نون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ایک ہولناک دریا سے جس کا نام یردن ہے عبور مع لشکر کرنا پیش آیا تھا اور یردن میں ایک طوفان تھا اور عبور غیر ممکن تھا اور اگر اس طوفان سے عبور نہ ہوتا تو بنی اسرائیل کی دشمنوں کے ہاتھ سے تباہی متصور تھی اور یہ وہ پہلا امر ہولناک تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد یشوع بن نون کو اپنے خلافت کے زمانہ میں پیش آیا اس وقت خدا تعالیٰ نے اس طوفان سے اعجازی طور پر یوشع بن نون اور اس کے لشکر کو بچا لیا اور یردن میں خشکی پیدا کر دی جس سے وہ بآسانی گزر گیا وہ خشکی بطور جوار بھاٹا تھی یا محض ایک فوق العادۃ اعجاز تھا۔بہرحال اس طرح خدا نے ان کو طوفان اور دشمن کے صدمہ سے بچایا اسی طوفان کی مانند بلکہ اس سے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر خلیفۃ الحق کو مع تمام جماعت صحابہ کے جو ایک لاکھ سے زیادہ تھے پیش آیا یعنی ملک میں سخت بغاوت پھیل گئی۔اور وہ عرب کے بادیہ نشین جن کو خدا نے فرمایا تھا قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (سورۃ الحجرات:۱۵) ضرور تھا کہ اس پیشگوئی کے مطابق وہ بگڑتے تا یہ پیشگوئی پوری ہوتی۔پس ایسا ہی ہوا اور وہ سب لوگ مُرتد ہو گئے اور بعض نے زکوٰۃ سے انکار کیا اور چند شریر لوگوں نے پیغمبری کا دعویٰ کر دیا جن کے ساتھ کئی لاکھ بدبخت انسانوں کی جمعیت ہو گئی اور دشمنوں کا شمار اس قدر بڑھ گیا کہ صحابہ کی جماعت اُن کے آگے کچھ بھی چیز نہ تھی اور ایک سخت طوفان ملک میں برپا ہوا یہ طوفان اُس خوفناک پانی سے بہت بڑھ کر تھا جس کا سامنا حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو پیش آیا تھا اور جیسا کہ یوشع بن نون حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد ناگہانی طور پر اس سخت ابتلا میں مبتلا ہو گئے تھے

کہ دریا سخت طوفان میں تھا اور کوئی جہاز نہ تھا اور ہر ایک طرف سے دشمن کا خوف تھا۔ یہی ابتلا حضرت ابوبکر کو پیش آیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے اور ارتدادِ عرب کا ایک طوفان برپا ہو گیا اور جھوٹے پیغمبروں کا ایک دوسرا طوفان اس کو قوت دینے والا ہو گیا۔ یہ طوفان یوشع کے طوفان سے کچھ کم نہ تھا بلکہ بہت زیادہ تھا اور پھر جیسا کہ خدا کی کلام نے حضرت یوشع کو قوت دی اور فرمایا کہ جہاں جہاں تو جاتا ہے میں تیرے ساتھ ہوں تو مضبوط ہو اور دلاور بن جا اور بے دل مت ہو۔ تب یشوع میں بڑی قوت اور استقلال اور وہ ایمان پیدا ہو گیا جو خدا کی تسلّی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ ایسا ہی حضرت ابوبکر کو بغاوت کے طوفان کے وقت خدا تعالیٰ سے قوت ملی۔ جس شخص کو اس زمانہ کی اسلامی تاریخ پر اطلاع ہے وہ گواہی دے سکتا ہے کہ وہ طوفان ایسا سخت طوفان تھا کہ اگر خدا کا ہاتھ ابوبکر کے ساتھ نہ ہوتا اور اگر درحقیقت اسلام خدا کی طرف سے نہ ہوتا اور اگر درحقیقت ابوبکر خلیفۂ حق نہ ہوتا تو اس دن اسلام کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ مگر یشوع نبی کی طرح خدا کے پاک کلام سے ابوبکر صدیق کو قوت ملی کیونکہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں اس ابتلا کی پہلے سے خبر دے رکھی تھی۔ چنانچہ جو شخص اس آیت مندرجہ ذیل کو غور سے پڑھے گا وہ یقین کر لے گا کہ بلاشبہ اس ابتلا کی خبر قرآن شریف میں پہلے سے دی گئی تھی اور وہ خبر یہ ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ یعنی خدا نے مومنوں کو جو نیکوکار ہیں وعدہ دے رکھا ہے جو ان کو خلیفے بنائے گا انہی خلیفوں کی مانند جو پہلے بنائے تھے اور اُسی سلسلہ خلافت کی مانند سلسلہ قائم کرے گا جو حضرت موسیٰ کے بعد قائم کیا تھا اور اُن کے دین کو یعنی اسلام کو جس پر وہ راضی ہوا زمین پر جما دے گا اور اُس کی جڑ لگا دے گا اور خوف کی حالت کو امن کی حالت کے ساتھ بدل دے گا۔ وہ میری پرستش کریں گے کوئی دوسرا میرے ساتھ نہیں ملائیں گے۔ دیکھو اس آیت میں صاف طور پر فرما دیا ہے کہ خوف کا زمانہ بھی آئے گا اور امن جاتا رہے گا مگر خدا اُس خوف کے زمانہ کو پھر امن کے ساتھ بدل دے گا۔ سو یہی خوف یشوع بن نون کو بھی پیش آیا تھا اور جیسا کہ اس کو خدا کے کلام سے تسلّی دی گئی ایسا ہی ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی خدا کے کلام سے تسلّی دی گئی اور چونکہ ہر ایک سلسلہ میں خدا کا یہ قانونِ قدرت ہے کہ اس کا کمال تب ظاہر ہوتا ہے کہ جب آخر حصّہ سلسلہ کا پہلے حصہ سے مشابہ ہو جائے اس لئے ضروری ہوا کہ موسوی اور محمدی سلسلہ کا پہلا خلیفہ موسوی اور محمدی سلسلہ

کے آخری خلیفہ سے مشابہ ہو کیونکہ کمال ہر ایک چیز کا استدارت ★ کو چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام بسائط

★ استدارت کے لفظ سے میری مراد یہ ہے کہ جب ایک دائرہ پورے طور پر کامل ہو جاتا ہے تو جس نقطہ سے شروع ہوا تھا اسی نقطہ سے جاملتا ہے اور جب تک اس نقطہ کو نہ ملے تب تک اُس کو دائرۂ کاملہ نہیں کہہ سکتے۔ پس آخری نقطہ کا پہلے نقطہ سے جاملنا وہی امر ہے جس کو دوسرے لفظوں میں مشابہت تامّہ کہا کرتے ہیں۔ پس جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یشوع بن نون سے مشابہت تھی یہاں تک کہ نام میں بھی تشابہ تھا ایسا ہی حضرت ابوبکر اور مسیح موعود کو بعض واقعات کے رُو سے بشدّت مشابہت ہے اور وہ یہ کہ ابوبکر کو خدا نے سخت فتنہ اور بغاوت اور مفتریوں اور مفسدوں کے عہد میں خلافت کے لئے مقرر کیا تھا ایسا ہی مسیح موعود اس وقت ظاہر ہوا کہ جبکہ تمام علامات صغریٰ کا طوفان ظہور میں آچکا تھا اور کچھ کبریٰ میں سے بھی۔ اور دوسری مشابہت یہ ہے کہ جیسا کہ خدا نے حضرت ابوبکر کے وقت میں خوف کے بعد امن پیدا کر دیا اور برخلاف دشمنوں کی خواہشوں کے دین کو جما دیا ایسا ہی مسیح موعود کے وقت میں بھی ہوگا کہ اس طوفانِ تکذیب اور تکفیر اور تفسیق کے بعد یکدفعہ لوگوں کو محبت اور ارادت کی طرف میلان دیا جائے گا اور جب بہت سے نور نازل ہوں گے اور ان کی آنکھیں کھلیں گی تو وہ معلوم کریں گے کہ ہمارے اعتراض کچھ چیز نہ تھے اور ہم نے اپنے اعتراضوں میں بجز اس کے اور کچھ نہ دکھلایا جو اپنے سطحی خیال اور موٹی عقل اور حسد اور تعصب کے زہر کو لوگوں پر ظاہر کر دیا۔ اور پھر اس کے بعد ابوبکر اور مسیح موعود میں یہ مشابہت ظاہر کر دی جائے گی کہ اس دین کو جس کی مخالف بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں زمین پر خوب جما دیا جائے گا اور ایسا مستحکم کیا جائے گا کہ پھر قیامت تک اس میں تزلزل نہیں ہوگا۔ اور پھر تیسری مشابہت یہ ہوگی کہ جو شرک کی ملونی مسلمانوں کے عقیدوں میں مل گئی تھی وہ بکلّی اُن کے دلوں میں سے نکال دی جائے گی۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ شرک کا ایک بڑا حصہ جو مسلمانوں کے عقائد میں داخل ہو گیا تھا یہاں تک کہ دجال کو بھی خدا کی صفتیں دی گئی تھیں اور حضرت مسیح کو ایک حصہ مخلوق کا خالق سمجھا گیا تھا یہ ہر ایک قسم کا شرک دُور کیا جائے گا جیسا کہ آیت یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡـًٔا سے مستنبط ہوتا ہے۔ ایسا ہی اس پیشگوئی سے جو مسیح موعود اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں مشترک ہے یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ جس طرح شیعہ لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تکفیر کرتے ہیں اور اُن کے مرتبہ اور بزرگی سے منکر ہیں ایسا ہی مسیح موعود کی تکفیر بھی کی جائے گی اور ان کے مخالف ان کے مرتبہ ولایت سے انکار کریں گے کیونکہ اس پیشگوئی کے اخیر میں یہ آیت ہے وَ مَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ۔ اور اس آیت کے معنے جیسا کہ روافض کی عملی حالت سے کھلے ہیں یہی ہیں کہ بعض گمراہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقامِ بلند سے منکر ہو جائیں گے اور ان کی تکفیر کریں گے پس اس آیت سے سمجھا جاتا ہے کہ مسیح موعود کی بھی تکفیر ہوگی کیونکہ وہ خلافت کے اس آخری نقطہ پر ہے جو خلافت کے پہلے نقطہ سے ملا ہوا ہے۔ یہ بات بہت ضروری اور یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ہر ایک دائرہ کا عام قاعدہ یہی ہے کہ اُس کا آخری نقطہ پہلے نقطہ سے اتصال رکھتا ہے لہٰذا اس عام قاعدہ کے موافق خلافت محمدیہ کے دائرہ میں بھی ایسا ہی ہونا ضروری ہے یعنے یہ لازمی امر ہے کہ آخری نقطہ اُس دائرہ کا جس سے مراد مسیح موعود ہے جو سلسلۂ خلافتِ محمدیہ کا خاتم ہے وہ اس دائرہ کے پہلے نقطہ سے جو خلافت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نقطہ ہے جو سلسلہ خلافت محمدیہ کے دائرہ کا پہلا نقطہ جو ابوبکر ہے وہ اِس دائرہ کے انتہائی نقطہ سے جو مسیح موعود ہے اتّصالِ تام رکھتا ہے جیسا کہ مشاہدہ اس بات پر گواہ ہے کہ آخر نقطہ ہر ایک دائرہ کا اس کے پہلے نقطہ سے جاملتا ہے۔ اب جبکہ اوّل اور آخر کے دونوں نقطوں کا اتصال ماننا پڑا تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو قرآنی پیشگوئیاں خلافت کے پہلے نقطہ کے حق میں ہیں یعنی حضرت ابوبکر کے حق میں وہی خلافت کے آخری نقطہ کے حق میں بھی ہیں یعنی مسیح موعود کے حق میں اور یہی ثابت کرنا تھا۔ منہ

گول شکل پر پیدا کئے گئے ہیں تا خدا کے ہاتھ کی پیدا کی ہوئی چیزیں ناقص نہ ہوں۔ اِسی بنا پر ماننا پڑتا ہے کہ زمین کی شکل بھی گول ہے۔ کیونکہ دوسری تمام شکلیں کمالِ تام کے مخالف ہیں اور جو چیز خدا کے ہاتھ سے بلاواسطہ نکلی ہے اس میں مناسب حال مخلوقیت کے کمال تام ضرور چاہئے تا اس کا نقص خالق کے نقص کی طرف عائد نہ ہو۔ اور نیز اس لئے بسائط کا گول رکھنا خدا تعالیٰ نے پسند کیا کہ گول میں کوئی جہت نہیں ہوتی۔ اور یہ امر توحید کے بہت مناسب حال ہے۔ غرض صنعت کا کمال مدوّر شکل سے ہی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اس میں انتہائی نقطہ اس قدر اپنے کمال کو دکھلاتا ہے کہ پھر اپنے مبدء کو جا ملتا ہے۔

اب ہم پھر اپنے اصل مدعا کی طرف رجوع کر کے لکھتے ہیں کہ ہمارے مذکورہ بالا بیان سے یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جو حضرت سیدنا محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے پہلے خلیفہ تھے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام سے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے پہلے خلیفہ ہیں اشد مشابہت ہے تو پھر اس سے لازم آیا کہ جیسا کہ سلسلہ محمدیہ کی خلافت کا پہلا خلیفہ سلسلہ موسویہ کی خلافت کے پہلے خلیفہ سے مشابہت رکھتا ہے ایسا ہی سلسلہ محمدیہ کی خلافت کا آخری خلیفہ جو مسیح موعود سے موسوم ہے سلسلۂ موسویہ کے آخری خلیفہ سے جو حضرت عیسیٰ بن مریم ہے مشابہت رکھے تا دونوں سلسلوں کی مشابہت تامہ میں جو نص قرآنی سے ثابت ہوتی ہے کچھ نقص نہ رہے کیونکہ جب تک دونوں سلسلے یعنی سلسلہ موسویہ وسلسلہ محمدیہ اوّل سے آخر تک باہم مشابہت نہ دکھلائیں تب تک وہ مماثلت جو آیت کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ میں کَمَا کے لفظ سے مستنبط ہوتی ہے ثابت نہیں ہو سکتی۔ اور پھر چونکہ ہم ابھی حاشیہ میں اکمل اور اتم طور پر ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسیح موعود سے مشابہت رکھتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حضرت ابوبکر حضرت یوشع بن نون سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اور حضرت یشوع بن نون اس قاعدہ کے رو سے جو دائرہ کا اوّل نقطہ دائرہ کے آخر نقطہ سے اتحاد رکھتا ہے جیسا کہ ابھی ہم نے حاشیہ میں لکھا ہے حضرت عیسیٰ بن مریم سے مشابہت رکھتے ہیں تو اس سلسلۂ مساوات سے لازم آیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسلام کے مسیح موعود سے جو شریعت اسلامیہ کا آخری خلیفہ ہے مشابہت رکھتے ہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ حضرت یشوع بن نون سے مشابہ ہیں اور حضرت یشوع بن نون حضرت ابوبکر سے مشابہ۔ اور پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت ابوبکر اسلام کے آخری خلیفہ یعنی مسیح موعود سے مشابہ ہیں تو اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عیسیٰ اسلام کے آخری خلیفہ سے جو مسیح موعود ہے مشابہ ہیں۔ کیونکہ مشابہ کا مشابہ مشابہ ہوتا

ہے۔مثلاً اگر خط اُ خط اَن سے مساوی ہے اور خط اَن خط لِ سے مساوی تو ماننا پڑے گا کہ خط اُ خط لِ سے مساوی ہے اور یہی مدعا ہے۔اور ظاہر ہے کہ مشابہت من وجہ مغائرت کو چاہتی ہے اِس لئے قبول کرنا پڑا کہ اسلام کا مسیح موعود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ اس کا غیر ہے۔اور عوام جو باریک باتوں کو سمجھ نہیں سکتے اُن کے لئے اِسی قدر کافی ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے دو رسول ظاہر کر کے اُن کو دو مستقل شریعتیں عطا فرمائی ہیں۔ایک[1] شریعت موسویہ۔دوسری[2] شریعت محمدیہ اور ان دونوں سلسلوں میں تیرہ تیرہ خلیفے مقرر کئے ہیں اور درمیانی بارا[12] خلیفے جو ان دونوں شریعتوں میں پائے جاتے ہیں وہ ہر دو نبی صاحب الشریعت کی قوم میں سے ہیں۔یعنی موسوی خلیفے اسرائیلی ہیں اور محمدی خلیفے قریشی ہیں مگر آخری دو خلیفے ان دونوں سلسلوں کے وہ ان ہر دو نبی صاحب الشریعت کی قوم میں سے نہیں ہیں۔حضرت عیسیٰ اس لئے کہ ان کا کوئی باپ نہیں اور اسلام کے مسیح موعود کی نسبت جو آخری خلیفہ ہے خود علماءِ اسلام مان چکے ہیں کہ وہ قریش میں سے نہیں ہے اور نیز قرآن شریف فرماتا ہے کہ یہ دونوں مسیح ایک دوسرے کا عین نہیں ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں اسلام کے مسیح موعود کو موسوی مسیح موعود کا مثیل ٹھہراتا ہے نہ عین۔پس محمدی مسیح موعود کو موسوی مسیح کا عین قرار دینا قرآن شریف کی تکذیب ہے۔اور تفصیل اس استدلال کی یہ ہے کہ كَمَا کا لفظ جو آیت كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ میں ہے جس سے تمام محمدی سلسلہ کے خلیفوں کی موسوی سلسلہ کے خلیفوں کے ساتھ مشابہت ثابت ہوتی ہے ہمیشہ مماثلت کے لئے آتا ہے اور مماثلت ہمیشہ من وجہٍ مغایرت کو چاہتی ہے یہ ممکن نہیں کہ ایک چیز اپنے نفس کی مثیل کہلائے بلکہ مُشَبَّہ اور مُشَبَّہ بِہٖ میں کچھ مغایرت ضروری ہے اور عین کسی وجہ سے اپنے نفس کا مغایر نہیں ہوسکتا۔پس جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ کے مثیل ہو کر اُن کے عین نہیں ہو سکتے ایسا ہی تمام محمدی خلیفے جن میں سے آخری خلیفہ مسیح موعود ہے وہ موسوی خلیفوں کے جن میں سے آخری خلیفہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کسی طرح عین نہیں ہو سکتے اس سے قرآن شریف کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ كَمَا کا لفظ جیسا کہ حضرت موسیٰ اور آنحضرت کی مشابہت کے لئے قرآن نے استعمال کیا ہے وہی كَمَا کا لفظ آیت كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ میں وارد ہے جو اسی قسم کی مغائرت چاہتا ہے جو حضرت موسیٰ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔یاد رہے کہ اسلام کا بارھواں خلیفہ جو تیرھویں صدی کے سر پر ہونا چاہئے وہ یحییٰ نبی کے مقابل پر ہے جس کا ایک پلید قوم کے لئے سر کاٹا گیا (سمجھنے والا سمجھ لے) اس لئے ضروری ہے کہ بارھواں خلیفہ قریشی ہو جیسا کہ حضرت یحییٰ اسرائیلی ہیں۔

لیکن اسلام کا تیرھواں خلیفہ جو چودھویں صدی کے سر پر ہونا چاہئے جس کا نام مسیح موعود ہے اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ قریش میں سے نہ ہو جیسا کہ حضرت عیسیٰ اسرائیلی نہیں ہیں۔ سید احمد صاحب بریلوی سلسلہ خلافتِ محمدیہ کے بارھویں خلیفہ ہیں جو حضرت یحییٰ کے مثیل ہیں اور سید ہیں۔

(تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۱۸۳ تا ۱۹۴)

جبکہ مماثلت کی ضرورت کی وجہ سے واجب تھا کہ اس اُمت کے خلیفوں کا سلسلہ ایک ایسے خلیفہ پر ختم ہو جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مثیل ہو تو منجملہ وجوہ مماثلت کے ایک یہ وجہ بھی ضروری الوقوع تھی کہ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت کے فقیہ اور مولوی اُن کے دشمن ہو گئے تھے اور اُن پر کفر کا فتویٰ لکھا تھا اور ان کو سخت سخت گالیاں دیتے اور اُن کی اور اُن کی پردہ نشین عورتوں کی توہین کرتے اور اُن کے ذاتی نقص نکالتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ اُن کو لعنتی ثابت کریں ایسا ہی اسلام کے مسیح موعود پر اس زمانہ کے مولوی کفر کا فتویٰ لکھیں اور اس کی توہین کریں اور اس کو بے ایمان اور لعنتی قرار دیں اور گالیاں دیں اور اس کے پرائیویٹ امور میں دخل دیں اور طرح طرح کے اس پر افترا کریں اور قتل کا فتویٰ دیں پس چونکہ یہ امت مرحومہ ہے اور خدا نہیں چاہتا کہ ہلاک ہوں۔ اِس لئے اُس نے یہ دُعا غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کی سکھلا دی اور اس کو قرآن میں نازل کیا اور قرآن اسی سے شروع ہوا اور یہ دُعا مسلمانوں کی نمازوں میں داخل کر دی تا وہ کسی وقت سوچیں اور سمجھیں کہ کیوں ان کو یہود کی اس سیرت سے ڈرایا گیا جس سیرت کو یہود نے نہایت بُرے طور سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ظاہر کیا تھا۔ (تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۲۰۱)

چونکہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ حسب وعدہ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ آخری خلیفہ اس امت کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رنگ میں آئے گا۔ اور ضرور ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح قوم کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھائے اور اس پر کفر کا فتویٰ لکھا جاوے اور اس کے قتل کے ارادے کئے جائیں اس لئے ترحم کے طور پر تمام مسلمانوں کو یہ دُعا سکھلائی کہ تم خدا سے پناہ چاہو کہ تم اُن یہودیوں کی طرح نہ بن جاؤ جنہوں نے موسوی سلسلہ کے مسیح موعود کو کافر ٹھہرایا تھا اور اس کی توہین کرتے تھے اور اُن کو گالیاں دیتے تھے۔

(تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۲۰۲ تا ۲۰۴)

أَنْتَ تَقْرَأُ قَوْلَهٗ ” وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ “ وَتَقْرَأُ قَوْلَهٗ ” لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ “

اور تو خدا کا قول وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ بھی پڑھتا ہے اور اس کا قول ” لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ “ بھی پڑھتا ہے۔

فَفَكِّرْ فِيْ قَوْلِهٖ "مِنْكُمْ" فِيْ سُوْرَةِ النُّوْرِ وَاتْرُكِ الظَّالِمِيْنَ وَظَنَّهُمْ. أَلَمْ يَأْنِ لَكَ أَنْ تَعْلَمَ عِنْدَ قِرَآءَةِ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ. إِنَّ اللّٰهَ قَدْ جَعَلَ الْخُلَفَآءَ كُلَّهُمْ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ بِالْعِنَايَاتِ. فَكَيْفَ يَأْتِي الْمَسِيْحُ الْمَوْعُوْدُ مِنَ السَّمَاوَاتِ. أَلَيْسَ الْمَسِيْحُ الْمَوْعُوْدُ عِنْدَكَ مِنَ الْخُلَفَآءِ. فَكَيْفَ تَحْسَبُهٗ مِنْ بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ وَمِنْ تِلْكَ الْأَنْبِيَآءِ. أَتَتْرُكُ الْقُرْاٰنَ وَفِي الْقُرْاٰنِ كُلُّ الشِّفَآءِ. أَوْ تَغَلَّبَتْ عَلَيْكَ شِقْوَتُكَ. فَتَتْرُكُ مُتَعَمِّدًا طَرِيْقَ الْاِهْتِدَآءِ. أَلَا تَرٰى قَوْلَهٗ تَعَالٰى "كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ" فِيْ هٰذِهِ السُّوْرَةِ. فَوَجَبَ أَنْ يَّكُوْنَ الْمَسِيْحُ الْاٰتِيْ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ. لَا مِنْ غَيْرِهِمْ بِالضَّرُوْرَةِ. فَإِنَّ لَفْظَ "كَمَا" يَأْتِيْ لِلْمُشَابَهَةِ وَالْمُمَاثَلَةِ. وَالْمُشَابَهَةُ تَقْتَضِيْ قَلِيْلًا مِّنَ الْمُغَايَرَةِ. وَلَا يَكُوْنُ شَيْءٌ مُشَابِهَ نَفْسِهٖ كَمَا هُوَ مِنَ الْبَدِيْهِيَّاتِ. فَثَبَتَ بِنَصٍّ قَطْعِيٍّ أَنَّ عِيْسَى الْمُنْتَظَرَ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ وَهٰذَا يَقِيْنِيٌّ وَّمُنَزَّهٌ عَنِ الشُّبُهَاتِ. هٰذَا مَا قَالَ الْقُرْاٰنُ وَيَعْلَمُهُ الْعَالِمُوْنَ.

(اعجاز المسیح، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۱۷۸، ۱۷۹)

پس تو سورۂ نور میں خدا تعالیٰ کے لفظ مِنْكُمْ میں غور کر اور ظالموں اور ان کے اوہام کو چھوڑ دے۔ کیا تیرے لئے ابھی یہ وقت نہیں آیا کہ تو ان آیات کو پڑھ کر یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تمام کے تمام خلفاء کو اسی امت میں سے بنانا مقدر کیا ہے تو پھر مسیح موعود کس طرح آسمانوں سے اترے گا۔ کیا تمہارے نزدیک مسیح موعود خلفاء میں شامل نہیں پھر تم مسیح موعود کو بنی اسرائیل اور بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے کیوں گمان کرتے ہو۔ کیا تم قرآن کو چھوڑتے ہو۔ حالانکہ ہر قسم کی شفاء قرآن کریم میں ہے۔ کیا تم پر تمہاری بدبختی غالب آ گئی ہے اور تم عمداً ہدایت کا رستہ ترک کر رہے ہو۔ کیا تم اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کے الفاظ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کو نہیں دیکھتے۔ پس ضروری ہوا کہ آنے والا مسیح اسی امت میں سے ہو نہ کہ امت کے باہر سے۔ کیونکہ كَمَا کا لفظ مشابہت اور مماثلت کے لئے آتا ہے اور مشابہت کسی قدر مغائرت کو چاہتی ہے اور یہ ایک بدیہی امر ہے کہ کوئی چیز اپنے آپ کے مشابہ نہیں ہوا کرتی۔ پس قطعی نص سے ثابت ہو گیا کہ جس عیسیٰ کا انتظار کیا جا رہا ہے وہ اسی امت میں سے ہے۔ اور یہ بات یقینی اور شبہات سے پاک ہے یہ قرآن کریم کا فرمودہ ہے اور عالم لوگ اسے خوب جانتے ہیں۔

(ترجمہ از مرتب)

وَقَدْ سَمِعْتَ مِنْ قَبْلُ أَنَّ سُوْرَةَ النُّوْرِ

تم پہلے سن چکے ہو کہ سورۃ نور ہمیں ایسے سلسلہ

قَدْ بَشَّرَتْنَا بِسِلْسِلَةِ خُلَفَآءٍ تُشَابِهُ سِلْسِلَةَ خُلَفَآءِ الْكَلِيْمِ۔ وَكَيْفَ تَتِمُّ الْمُشَابَهَةُ مِنْ دُوْنِ أَنْ يَّظْهَرَ مَسِيْحٌ كَمَسِيْحِ سِلْسِلَةِ الْكَلِيْمِ فِيْ اٰخِرِ سِلْسِلَةِ النَّبِيِّ الْكَرِيْمِ۔ وَإِنَّا اٰمَنَّا بِهٰذَا الْوَعْدِ فَإِنَّهٗ مِنْ رَّبِّ الْعِبَادِ۔ وَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔ وَالْعَجَبُ مِنَ الْقَوْمِ أَنَّهُمْ مَا نَظَرُوْا إِلٰى وَعْدِ حَضْرَةِ الْكِبْرِيَآءِ۔ وَهَلْ يُوَفّٰى وَيُنْجَزُ إِلَّا الْوَعْدُ فَلْيَنْظُرُوْا بِالتَّقْوٰى وَالْحَيَآءِ۔ وَهَلْ فِيْ شِرْعَةِ الْإِنْصَافِ۔ أَنْ يُّنَزَّلَ الْمَسِيْحُ مِنَ السَّمَآءِ وَيُخْلَفُ وَعْدُ مُمَاثَلَةِ سِلْسِلَةِ الْاِسْتِخْلَافِ۔ وَإِنَّ تَشَابُهَ السِّلْسِلَتَيْنِ قَدْ وَجَبَ بِحُكْمِ اللّٰهِ الْغَيُّوْرِ۔ كَمَا هُوَ مَفْهُوْمٌ مِّنْ لَفْظِ "كَمَا" فِيْ سُوْرَةِ النُّوْرِ۔

(اعجاز المسیح، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۱۸۸، ۱۸۹)

خلفاء کی بشارت دے رہی ہے جو سلسلہ موسویہ کے مشابہ ہوں گے اور یہ مشابہت سوائے اس کے کس طرح پوری ہوسکتی ہے کہ موسوی سلسلہ کے مسیح کی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ کے آخر میں بھی ایک مسیح ظاہر ہو اور ہم اس وعدہ پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ یہ وعدہ رب العباد کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا اور ان لوگوں پر تعجب ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کی طرف توجہ نہیں کی حالانکہ وعدہ کا ایفاء لازمی ہوتا ہے۔ پس تقویٰ اور حیا کے ساتھ دیکھو کیا یہ طریقِ انصاف ہے کہ مسیح آسمان سے اتارا جائے اور سلسلہ استخلاف کے وعدہ کی خلاف ورزی کرائی جائے اور ہر دو سلسلہ کا تشابہ خدائے غیور کے حکم سے ضروری ہے۔ چنانچہ سورۃ نور کے لفظ کَمَا سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے۔

(ترجمہ از مرتب)

أَيُّهَا الْعُلَمَآءُ! فَكِّرُوْا فِيْ وَعْدِ اللّٰهِ وَاتَّقُوا الْمُقْتَدِرَ الَّذِيْ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ إِنَّهٗ جَعَلَ النُّبُوَّةَ وَالْخِلَافَةَ فِيْ بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ ثُمَّ أَهْلَكَهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۔ وَبَعَثَ نَبِيَّنَا بَعْدَهُمْ وَجَعَلَهٗ مَثِيْلَ مُوْسٰى فَاقْرَءُوْا سُوْرَةَ الْمُزَّمِّلِ إِنْ كُنْتُمْ تَرْتَابُوْنَ۔ ثُمَّ وَعَدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعْدَ الْاِسْتِخْلَافِ۔ فَفَكِّرُوْا فِيْ سُوْرَةِ النُّوْرِ إِنْ كُنْتُمْ تَشُكُّوْنَ۔ هٰذَانِ

اے علماء! اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے بارے میں غور کرو اور اس خدائے مقتدر سے ڈرو جس کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اللہ نے بنی اسرائیل میں نبوت اور خلافت کا سلسلہ چلایا پھر ان کو ان کی زیادتیوں کے باعث ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کو مثیلِ موسیٰ قرار دیا۔ اگر تمہیں اس کے متعلق شک و شبہ ہو تو سورۃ مزمل پڑھو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ دو

وَعْدَانِ مِنَ اللّٰهِ فَلَا تُحَرِّفُوْا كَلِمَ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ تَتَّقُوْنَ۔ وَلِذَالِكَ بُدِءَ سِلْسِلَةُ نَبِيِّنَا مِنْ مَثِيْلِ مُوْسٰى۔ وَخُتِمَ عَلٰى مَثِيْلِ عِيْسٰى۔ لِيَتِمَّ وَعْدُ اللّٰهِ صِدْقًا وَّحَقًّا۔ إِنَّ فِيْ ذَالِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ وَ كَانَ مِنَ الْوَاجِبِ أَنْ يَّتَسَاوَى السِّلْسِلَتَانِ۔ اَلْاَوَّلُ كَالْاَوَّلِ وَالْاٰخِرُ كَالْاٰخِرِ۔ أَلَا تَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ أَوْ بِهٖ تَكْفُرُوْنَ؟ فَإِنْ تَمَنَّيْتُمْ أَنْ يَّنْزِلَ عِيْسٰى بِنَفْسِهٖ فَقَدْ كَذَّبْتُمُ الْقُرْاٰنَ وَمَا اقْتَبَسْتُمْ مِنْ سُوْرَةِ النُّوْرِ نُوْرًا وَبَقِيْتُمْ مَعَ النُّوْرِ كَقَوْمٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ۔ أَتَبْغُوْنَ عِوَجًا بَعْدَ أَنْ تُسَاوِيَ السِّلْسِلَتَانِ؟ اِتَّقُوا اللّٰهَ وَعَدِّلُوا الْمِيْزَانَ۔ مَا لَكُمْ لَا تَتَفَقَّهُوْنَ؟ وَكَانَ وَعْدُ اللّٰهِ أَنَّهٗ يَسْتَخْلِفُ مِنْكُمْ وَمَا كَانَ وَعْدُهٗ أَنْ يَّسْتَخْلِفَ مِنْ بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ۔ فَلَا تَتَّبِعُوْا فَيْجًا أَعْوَجَ وَتَعَالَوْا إِلٰى حَكَمِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَسْتَرْشِدُوْنَ۔ أَتُرِيْدُوْنَ أَنْ تُفَضِّلُوْا عَلٰى سِلْسِلَةِ نَبِيِّكُمْ سِلْسِلَةَ مُوْسٰى؟ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى! فَلِمَ لَا تَنْتَهُوْنَ؟ أَلَا تَقْرَءُوْنَ سُوْرَةَ النُّوْرِ أَوْ عَلَى الْقُلُوْبِ أَقْفَالُهَا أَوْ إِلَى اللّٰهِ لَا تُرَدُّوْنَ؟

وعدے ہیں اگر تم متقی ہو تو اللہ کے کلام میں تحریف کے مرتکب نہ بنو اور اسی لئے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ کو مثیلِ موسیٰ سے شروع کیا گیا اور اسے مثیلِ عیسیٰ پر ختم کیا گیا تا اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورے طور پر سچا ثابت ہو۔ اس میں سوچنے والوں کے لئے ایک بڑا نشان ہے اور یہ ضروری تھا کہ دونوں سلسلے برابر ہوں۔ پہلے کی ابتدا دوسرے کی ابتدا کی طرح اور پہلے کی انتہا دوسرے کی انتہا کی مانند۔ کیا تم قرآن مجید نہیں پڑھتے یا تم اس کا انکار کرتے ہو۔ اگر تم یہ چاہتے کہ بعینہٖ عیسیٰ نازل ہوں تو تم نے قرآن کریم کو جھٹلا دیا اور تم نے سورہ نور سے کوئی نور حاصل نہیں کیا اور نور کی موجودگی میں بھی تم ایسے لوگوں کی مانند ہی رہے جو نہیں دیکھتے۔ کیا تم سلسلہ موسوی اور سلسلہ محمدی کے برابر ہونے کے بعد کج روی اختیار کرنا چاہتے ہو، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میزان کو برابر رکھو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم بات سمجھتے نہیں۔ اللہ کا وعدہ تھا کہ وہ تم میں سے خلیفہ بنائے گا اور اس کا یہ وعدہ نہیں تھا کہ وہ بنی اسرائیل میں سے خلیفہ بنائے گا۔ پس تم فیجِ اعوج کی پیروی نہ کرو اور اپنے رب کے فیصلے کو قبول کرو۔ اگر تم ہدایت کے طالب ہو کیا تم چاہتے ہو کہ تم موسوی سلسلہ کو اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ پر فضیلت دو۔ یہ تو سراسر غلط تقسیم ہے پس کیوں تم اس بات سے نہیں رکتے کیا تم سورہ نور کو نہیں پڑھتے یا دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں یا تم اللہ کی طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے۔

وَإِنَّ الْقُرْاٰنَ عَدَّلَ الْمِيْزَانَ۔ وَأَعْطٰى نَبِيَّنَا كُلَّ مَا أَعْطٰى مُهْلِكَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ۔ فَمَا لَكُمْ لَا تَعْدِلُوْنَ؟ وَقَدْ بَلَّغَ الْقُرْاٰنُ أَمْرَهٗ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَالِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔ أَتَخْتَارُوْنَ أَهْوَآءَكُمْ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ أَوْ بَلَغَكُمْ عِلْمٌ يُّسَاوِى الْقُرْاٰنَ فَأَخْرِجُوْهُ لَنَا إِنْ كُنْتُمْ تُصَدِّقُوْنَ۔ كَلَّا بَلْ وَجَدُوْا كُبَرَآءَهُمْ عَلَيْهِ فَهُمْ عَلٰى اٰثَارِهِمْ يُهْرَعُوْنَ۔ وَقَدْ سَوَّى اللّٰهُ السِّلْسِلَتَيْنِ وَهُمْ يَزِيْدُوْنَ وَيَنْقُصُوْنَ۔ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ اتَّخَذَ سَبِيْلًا غَيْرَ سَبِيْلِ الْقُرْاٰنِ۔ أَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ۔ يَا حَسْرَةً عَلَيْهِمْ أَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ أَوْ هُمْ قَوْمٌ عَمُوْنَ؟ وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ أَتَتْرُكُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا، وَلَوْ كَانَ اٰبَاءُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ۔ أَتَتْرُكُوْنَ كَلَامَ رَبِّكُمْ لِاٰبَاءِكُمْ؟ أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ وَقَالُوْا اِنَّا رَأَيْنَا فِي الْأَحَادِيْثِ۔ وَمَافَهِمُوْا قَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَإِنْ هُمْ اِلَّا يَعْمَهُوْنَ۔ يُرِيْدُوْنَ أَنْ يُّفَرِّقُوْا

قرآن کریم نے میزان کو برابر رکھا ہے اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سب کچھ دیا جو فرعون اور ہامان کو ہلاک کرنے والا موسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا پھر تم کیوں انصاف نہیں کرتے۔ قرآن کریم نے اپنا فیصلہ تمہیں پہنچا دیا ہے۔ پس جس نے اس فیصلے کے بعد انکار کیا تو ایسے لوگ فاسق ہیں کیا تم اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مقابلے میں اپنی خواہشات کو ترجیح دیتے ہو یا پھر تمہیں کوئی ایسا علم مل گیا ہے جو قرآن کریم کے مساوی ہے۔ سو اگر تم سچے ہو تو اس علم کو نکال کر ہمارے سامنے پیش کرو لیکن تم ہرگز ایسا نہیں کر سکو گے۔ اصل بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بڑوں کو اس راستے پر چلتے پایا تھا اور یہ انہی کے نقشِ قدم پر بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں سلسلوں کو برابر قرار دیا ہے۔ اور یہ لوگ ان میں کمی بیشی کر رہے ہیں۔ پس اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو قرآن کریم کے رستہ کو چھوڑ کر اپنا الگ رستہ بناتا ہے۔ سنو ان لوگوں پر خدا کی لعنت ہے جو ظلم کرتے ہیں۔ ہائے افسوس کیا یہ لوگ قرآن کریم پر تدبر نہیں کرتے یا پھر وہ اندھے ہیں۔ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ تم تو اللہ کی کتاب کو چھوڑ رہے ہو تو وہ کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر پایا ہے اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ بھی علم و عقل نہ رکھتے ہوں۔ کیا تم اللہ کے کلام کو اپنے آباء و اجداد کی خاطر چھوڑتے ہو۔ افسوس ہے تم پر اور اس کام پر جو تم کر رہے ہو وہ کہتے ہیں ہم نے احادیث میں ایسا دیکھا ہے حالانکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو نہیں سمجھے اور صرف اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ کتاب اللہ اور قولِ رسول میں

بَيْنَ كِتَابِ اللّٰهِ وَبَيْنَ قَوْلِ رَسُوْلِهٖ۔ قَوْمٌ مُّفْتَرُوْنَ۔ وَقَدْ صَرَّحَ اللّٰهُ حَقَّ التَّصْرِيْحِ فِي الْفُرْقَانِ۔ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ يُؤْثِرُوْنَ الشَّكَّ عَلَى الْيَقِيْنِ۔ وَهٰذَا هُوَ مِنْ سِيَرِ قَوْمٍ يَّهْلِكُوْنَ۔ أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ هٰذَا كَانَ وَعْدًا مِّنَ اللّٰهِ فَسَوَّى السِّلْسِلَتَيْنِ كَمَا وَعَدَ فَمَا لَكُمْ تُجَوِّزُوْنَ الْخُلْفَ عَلَى اللّٰهِ وَلَا تَخَافُوْنَ؟ أَتُعِزُّوْنَ إِلَى اللّٰهِ نَكْثَ الْعَهْدِ وَالْوَعْدِ؟ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا تَزْعُمُوْنَ أَظَنَنْتُمْ أَنَّ سِلْسِلَةَ الْمُصْطَفٰى لَا تُشَابِهُ سِلْسِلَةَ مُوْسٰى؟ وَإِنْ هٰذَا اِلَّا تَكْذِيْبُ الْقُرْاٰنِ إِنْ كُنْتُمْ تَفْهَمُوْنَ۔ أَلَا يُشَابِهُ أَوَّلُهَا بِأَوَّلِهَا وَاٰخِرُهَا بِاٰخِرِهَا؟ سَآءَمَا تَحْكُمُوْنَ۔ أَرَفَعْتُمْ مُوْسٰى وَوَضَعْتُمُ الْمُصْطَفٰى؟ أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَصْنَعُوْنَ۔ أَتُخْسِرُوْنَ الْقِسْطَاسَ بَعْدَ تَعْدِيْلِهٖ وَلَا تَعْدِلُوْنَ كِفَّتَيْهِ وَلَا تُقْسِطُوْنَ؟ وَإِنَّ اللّٰهَ أَرَى فَضْلَ هٰذِهِ السِّلْسِلَةِ بِخَتْمِ الْأَمْرِ عَلَيْهَا ثُمَّ تَأْتُوْنَ بِعِيْسٰى وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ مَا لَكُمْ لَا تُؤْتُوْنَ ذَا فَضْلٍ فَضْلَهٗ وَتَظْلِمُوْنَ؟ أَتَقْطَعُوْنَ رِجْلَ هٰذِهِ السِّلْسِلَةِ وَتُبْقُوْنَ

تفریق پیدا کریں۔ یہ لوگ تو افتراء کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرقان مجید میں خوب کھول کر بیان کر دیا ہے۔ پس وہ قرآن کو چھوڑ کر اور کس بات پر ایمان لائیں گے یہ لوگ شک کو یقین پر ترجیح دیتے ہیں اور یہ ہلاک ہونے والوں کا راستہ ہے۔ اے لوگو! سنو! یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وعدہ تھا اور اس نے دونوں سلسلوں کو اپنے وعدہ کے مطابق برابر کر دیا۔ پس کیوں تم اللہ تعالیٰ کے متعلق خلاف ورزی جائز قرار دیتے ہو اور اس سے ڈرتے نہیں۔ کیا تم اللہ تعالیٰ کی طرف عہد شکنی منسوب کرتے ہو۔ وہ ذات اس سے جو تم خیال کرتے ہو پاک اور بلند ہے۔ کیا تم نے خیال کر لیا کہ سلسلہ محمدی سلسلہ موسوی کے مشابہ نہیں اور یہ تو قرآن کریم کی تکذیب ہے اگر تم سمجھو۔ کیا اس کی ابتداء اس کی ابتداء سے اور اس کی انتہاء اس کی انتہاء سے مشابہ نہیں۔ تم بہت برا فیصلہ کر رہے ہو۔ کیا تم موسیٰ علیہ السلام کی شان کو بلند کرو گے اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو کم کرو گے۔ افسوس تم پر اور اس کارروائی پر جو تم کرتے ہو۔ کیا تم میزان کو اس کے برابر ہونے کے بعد کم کر رہے ہو اور تم اس کے دونوں پلڑوں کو برابر نہیں کرتے اور تم انصاف سے کام نہیں لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے پر شریعت کو ختم کر کے اس کی فضیلت ظاہر کر دی ہے۔ پھر باوجود اس کے جانتے بوجھتے ہوئے تم عیسیٰ کو لاتے ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم صاحبِ فضیلت کو اس کی فضیلت نہیں دیتے اور اس کا حق مارتے ہو۔ کیا تم اس سلسلہ کے پاؤں کاٹنا چاہتے

رَأْسَهَا وَمَا هٰذَا إِلَّا فِعْلُ الْمَجْنُوْنِ۔
(الھدٰی، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۳۲۹ تا ۳۳۱)

ہو اور اس کے سر کو باقی رکھنا چاہتے ہو۔ اور یہ تو صرف ایک مجنون کا ہی کام ہوسکتا ہے۔ (ترجمہ از مرتب)

وَأَمَّا الْمَسِيْحُ الْمَوْعُوْدُ فَهُوَ مِنْكُمْ كَمَا وَعَدَ اللّٰهُ فِيْ سُوْرَةِ النُّوْرِ۔ وَهُوَ أَمْرٌ وَّاضِحٌ وَّلَيْسَ كَالسِّرِّ الْمَسْتُوْرِ۔ وَإِنَّهٗ "إِمَامُكُمْ مِنْكُمْ" كَمَا جَآءَ فِيْ حَدِيْثِ الْبُخَارِيِّ وَالْمُسْلِمِ۔ وَمَنْ كَفَرَ بِشَهَادَةِ الْقُرْاٰنِ وَشَهَادَةِ الْحَدِيْثِ فَهُوَ لَيْسَ بِمُسْلِمٍ۔
(الھدٰی، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۳۶۵)

مسیح موعود تم ہی میں سے ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ نور میں وعدہ کیا ہے اور یہ ایک واضح امر ہے اور چھپا ہوا راز نہیں۔ اور تم میں سے ہی تمہارا امام ہوگا جیسا کہ حدیث بخاری اور مسلم میں آیا ہے اور جو قرآن کریم اور حدیث کی گواہی کا انکار کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں۔
(ترجمہ از مرتب)

قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ فِيْ كِتَابِهِ الْمُبِيْنِ۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ هٰذَا مَا بَشَّرَ

اللہ عزوجل نے اپنی کتابِ مبین میں فرمایا ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور مناسبِ حال عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنا دے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنا دیا تھا۔ اور جو دین ان کے لئے پسند کیا ہے وہ ان کے لئے اسے مضبوطی سے قائم کر دے گا اور ان کے خوف کی حالت کے بعد وہ ان کے لئے امن کی حالت تبدیل کر دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور جو لوگ اس کے بعد بھی انکار کریں گے وہ نافرمانوں میں سے قرار دیئے جائیں گے اور تم سب نمازوں کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اس رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے اور کبھی خیال نہ کرو کہ کفار زمین میں ہمیں اپنی تدبیروں سے عاجز کر دیں گے اور ان کا ٹھکانا تو دوزخ ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ یہ وہ بشارت ہے جو ہمارے

رَبُّنَا لِلْمُؤْمِنِيْنَ، وَأَخْبَرَ عَنْ عَلَامَاتِ الْمُسْتَخْلَفِيْنَ، فَمَنْ أَتَى اللّٰهَ لِلْاِسْتِمَاحَةِ، وَمَا سَلَكَ مَسْلَكَ الْوَقَاحَةِ، وَمَا شَدَّ جَبَائِرَ التَّلْبِيْسِ عَلٰى سَاعِدِ الصَّرَاحَةِ، فَلَا بُدَّ لَهٗ مِنْ أَنْ يَّقْبِلَ هٰذَا الدَّلِيْلَ، وَيَتْرُكَ الْمَعَاذِيْرَ وَالْأَقَاوِيْلَ، وَيَأْخُذَ طُرُقَ الصَّالِحِيْنَ۔

وَأَمَّا تَفْصِيْلُهٗ لِيَبْدُوَ عَلَيْكَ دَلِيْلُهٗ فَاعْلَمُوْا يَا أُولِي الْأَلْبَابِ وَالْفَضْلِ اللُّبَابِ، أَنَّ اللّٰهَ قَدْ وَعَدَ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ لِلْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ أَنَّهٗ سَيَسْتَخْلِفَنَّ بَعْضَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُمْ فَضْلًا وَّرَحْمًا، وَّيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا، فَهٰذَا أَمْرٌ لَّا نَجِدُ مِصْدَاقَهٗ عَلٰى وَجْهٍ أَتَمَّ وَأَكْمَلَ إِلَّا خِلَافَةَ الصِّدِّيْقِ، فَإِنَّ وَقْتَ خِلَافَتِهٖ كَانَ وَقْتَ الْخَوْفِ وَالْمَصَائِبِ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلٰى أَهْلِ التَّحْقِيْقِ۔ فَإِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا تُوُفِّيَ نَزَلَتِ الْمَصَائِبُ عَلَى الْإِسْلَامِ وَالْمُسْلِمِيْنَ، وَارْتَدَّ كَثِيْرٌ مِّنَ الْمُنَافِقِيْنَ، وَتَطَاوَلَتْ أَلْسِنَةُ الْمُرْتَدِّيْنَ، وَادَّعَى النُّبُوَّةَ نَفَرٌ مِنَ الْمُفْتَرِيْنَ، وَاجْتَمَعَ عَلَيْهِمْ كَثِيْرٌ مِّنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ، حَتّٰى لَحِقَ بِمُسَيْلِمَةَ قَرِيْبٌ مِّنْ

رب نے مومنوں کو دی ہے اور اللہ نے مومنوں میں سے خلیفہ بننے والوں کی علامتیں بتادی ہیں۔ پس جو شخص اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں مانگنے کے لئے آئے گا اور بے حیائی کے راستے پر گامزن نہیں ہوگا اور مکر و فریب کی پٹیاں صراحت کی کلائی پر نہیں باندھے گا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس دلیل کو قبول کرلے اور حیلے بہانے اور جھوٹی باتیں چھوڑ دے اور صالحین کا طریق اختیار کرے۔

لیکن اس کی تفصیل کے متعلق اے عقلمندو اور اعلیٰ فضیلت والو جان لو تا کہ تم پر اس کی دلیل واضح ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں مسلمان مردوں اور عورتوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ضرور ان میں سے بعض مومنوں کو اپنے فضل اور رحمت سے خلیفہ بنائے گا اور ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا۔ پس یہ ایک ایسی بات ہے جس کا پورا اور مکمل مصداق ہم حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کو پاتے ہیں جیسا کہ اہل تحقیق کے نزدیک یہ امر واضح ہے کہ ان کی خلافت کا زمانہ ایک خوف و مصائب کا زمانہ تھا کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو اسلام اور مسلمانوں پر طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہوئیں اور بہت سارے منافق مرتد ہو گئے اور مرتدین کی زبانیں دراز ہو گئیں اور جھوٹے دعویداروں سے ایک گروہ نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور ان کے گرد بہت سارے بادیہ نشین جمع ہو گئے یہاں تک کہ مسیلمہ کے ساتھ قریباً ایک لاکھ جاہل اور فاجر لوگ آ شامل ہوئے اور

مِّائَةِ أَلْفٍ مِّنَ الْجَهَلَةِ الْفَجَرَةِ، وَهَاجَتِ الْفِتَنُ وَكَثُرَتِ الْمِحَنُ، وَأَحَاطَتِ الْبَلَايَا قَرِيْبًا وَّبَعِيْدًا، وَّزُلْزِلَ الْمُؤْمِنُوْنَ زِلْزَالًا شَدِيْدًا۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مِّنَ النَّاسِ، وَظَهَرَتْ حَالَاتٌ مُّخَوِّفَةٌ مُدْهِشَةُ الْحَوَاسِّ، وَكَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ مُضْطَرِّيْنَ كَأَنَّ جَمْرًا أُضْرِمَتْ فِيْ قُلُوْبِهِمْ أَوْ ذُبِحُوْا بِالسِّكِّيْنِ۔ وَكَانُوْا يَبْكُوْنَ تَارَةً مِّنْ فِرَاقِ خَيْرِ الْبَرِيَّةِ، وَأُخْرٰى مِنْ فِتَنٍ ظَهَرَتْ كَالنِّيْرَانِ الْمُحْرِقَةِ، وَلَمْ يَكُنْ أَثَرًا مِّنْ أَمْنٍ، وَّغُلِبَتِ الْمُفْتَتِنُوْنَ كَخَضْرَآءِ دِمَنٍ، فَزَادَ الْمُؤْمِنُوْنَ خَوْفًا وَّفَزَعًا، وَّمُلِئَتِ الْقُلُوْبُ دَهْشًا وَّجَزَعًا۔ فَفِيْ ذٰلِكَ الْأَوَانِ جُعِلَ أَبُوْ بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حَاكِمَ الزَّمَانِ وَخَلِيْفَةَ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ۔ فَغَلَبَ عَلَيْهِ هَمٌّ وَّغَمٌّ مِّنْ أَطْوَارٍ رَّاٰهَا، وَمِنْ اٰثَارٍ شَاهَدَهَا فِي الْمُنَافِقِيْنَ وَالْكَافِرِيْنَ وَالْمُرْتَدِّيْنَ، وَكَانَ يَبْكِيْ كَمَرَابِيْعِ الرَّبِيْعِ، وَتَجْرِيْ عَبَرَاتُهٗ كَالْيَنَابِيْعِ، وَيَسْأَلُ اللّٰهَ خَيْرَ الْإِسْلَامِ وَالْمُسْلِمِيْنَ۔

فتنوں نے جوش مارا اور مصائب بڑھ گئے اور قسم قسم کی بلاؤں نے دور و نزدیک سے مسلمانوں کا احاطہ کر لیا اور مومن ایک سخت زلزلہ میں مبتلا کئے گئے اور مسلمانوں میں سے ہر فرد آزمائش میں ڈالا گیا اور خوفناک اور حواس کو دہشت ناک کرنے والے حالات پیدا ہو گئے اور مومن بے چارگی کی حالت کو پہنچ گئے۔ گویا ایک انگارا تھا جو ان کے دلوں میں بھڑکایا گیا یا یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھری کے ساتھ ذبح کر دیئے گئے ہیں کبھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق کی وجہ سے اور کبھی آگ کی مانند جلا دینے والے فتنوں کی وجہ سے روتے تھے اور امن و امان کا کوئی نشان باقی نہ رہا اور فتنوں میں پڑے ہوئے مسلمان ایسے مغلوب ہو گئے جیسے رُوڑی کے اُوپر اُ گی ہوئی گھاس اس کو ڈھانپ لیتی ہے۔ پس مومنوں کا خوف اور گھبراہٹ بڑھ گیا اور ان کے دل دہشت اور کرب سے بھر گئے تو ایسے وقت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زمانے کا حاکم اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ بنایا گیا۔ اسلام پر حالاتِ وارده کی وجہ سے اور ان باتوں کی وجہ سے جو آپ نے منافقوں، کافروں اور مرتدین کی طرف سے دیکھیں آپ پر سخت غم طاری ہو گیا اور آپ موسمِ ربیع کی بارش کی طرح روتے تھے اور آپ کے آنسو چشموں کی طرح بہتے تھے اور آپ اللہ تعالیٰ سے اسلام اور مسلمانوں کی بہتری اور بھلائی چاہتے تھے۔

وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب

لَمَّا جُعِلَ أَبِيْ خَلِيْفَةً وَّفَوَّضَ اللّٰهُ إِلَيْهِ الْإِمَارَةَ، فَرَاٰى بِمُجَرَّدِ الْاِسْتِخْلَافِ تَمَوُّجَ الْفِتَنِ مِنْ كُلِّ الْأَطْرَافِ، وَمَوْرَ الْمُتَنَبِّيِّيْنَ الْكَاذِبِيْنَ، وَبَغَاوَةَ الْمُرْتَدِّيْنَ الْمُنَافِقِيْنَ. فَصُبَّتْ عَلَيْهِ مَصَائِبُ لَوْ صُبَّتْ عَلَى الْجِبَالِ لَانْهَدَّتْ وَسَقَطَتْ وَانْكَسَرَتْ فِي الْحَالِ، وَلٰكِنَّهٗ أُعْطِيَ صَبْرًا كَالْمُرْسَلِيْنَ، حَتّٰى جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَقُتِلَ الْمُتَنَبِّئُوْنَ وَأُهْلِكَ الْمُرْتَدُّوْنَ، وَأُزِيْلَ الْفِتَنُ وَدُفِعَ الْمِحَنُ، وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَقَامَ أَمْرُ الْخِلَافَةِ، وَنَجَّى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنَ الْاٰفَةِ، وَبَدَّلَ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا، وَّمَكَّنَ لَهُمْ دِيْنَهُمْ وَأَقَامَ عَلَى الْحَقِّ زَمَنًا وَّسَوَّدَ وُجُوْهَ الْمُفْسِدِيْنَ، وَأَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهُ الصِّدِّيْقَ، وَأَبَادَ الطَّوَاغِيْتَ وَالْغَرَانِيْقَ، وَأَلْقَى الرُّعْبَ فِيْ قُلُوْبِ الْكُفَّارِ، فَانْهَزَمُوْا وَرَجَعُوْا وَتَابُوْا وَكَانَ هٰذَا وَعْدٌ مِّنَ اللّٰهِ الْقَهَّارِ، وَهُوَ أَصْدَقُ الصَّادِقِيْنَ. فَانْظُرْ كَيْفَ تَمَّ وَعْدُ الْخِلَافَةِ مَعَ جَمِيْعِ لَوَازِمِهٖ وَإِمَارَاتِهٖ فِي الصِّدِّيْقِ، وَادْعُ اللّٰهَ أَنْ يَّشْرَحَ صَدْرَكَ لِهٰذَا التَّحْقِيْقِ، وَتَدَبَّرْ كَيْفَ كَانَتْ

میرے باپ خلیفہ بنائے گئے اور اللہ تعالیٰ نے امرِ خلافت آپ کو تفویض کیا تو آپ نے خلیفہ بنتے ہی فتنوں کو ہر طرف سے موجزن پایا اور یہ کہ جھوٹے نبوت کے مدعی جوش میں ہیں اور منافق مرتد لوگ بغاوت پر آمادہ ہیں سو آپ پر اس قدر مصائب آ پڑے کہ اگر پہاڑوں پر اتنی مصیبتیں نازل ہوتیں تو وہ ٹوٹ کر گر جاتے اور ریزہ ریزہ ہوجاتے۔ لیکن آپ کو رسولوں کی طرح ایک صبر عطا کیا گیا یہاں تک کہ اللہ کی نصرت آئی اور جھوٹے مدعیانِ نبوت قتل کئے گئے اور مرتد ہلاک کر دیئے گئے اور فتنوں اور مصائب کا قلع قمع کر دیا گیا اور معاملے کا فیصلہ کر دیا گیا اور امرِ خلافت مضبوط ہو گیا اور اللہ نے مومنوں کو مصیبت سے نجات بخشی اور ان پر خوف طاری ہونے کے بعد اسے امن میں بدل دیا اور ان کے دین کو مضبوط کر دیا۔ اور مفسدین کے منہ کالے کر دیئے اور اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے ابوبکر صدیق کی مدد فرمائی اور سرکشوں اور بڑے بڑے بتوں کو تباہ کر دیا اور کفار کے دلوں میں رعب ڈال دیا پس وہ شکست کھا گئے اور انہوں نے حق کی طرف رجوع کیا اور سرکشی سے توبہ کی اور یہ غالب خدا کا وعدہ تھا جو تمام سچوں سے زیادہ سچا ہے۔ پس دیکھو کس طرح خلافت کا وعدہ اپنے تمام لوازم اور نشانات کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کی ذات میں پورا ہوا اور تمہیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ تمہارا سینہ اس تحقیق کے لئے کھول دے۔ اور غور کرو کہ حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ منتخب

حَالَةُ الْمُسْلِمِيْنَ فِيْ وَقْتِ اسْتِخْلَافِهٖ وَقَدْ كَانَ الْإِسْلَامُ مِنَ الْمَصَائِبِ كَالْحَرِيْقِ، ثُمَّ رَدَّ اللهُ الْكَرَّةَ عَلَى الْإِسْلَامِ وَأَخْرَجَهٗ مِنَ الْبِيْرِ الْعَمِيْقِ، وَقُتِلَ الْمُتَنَبِّئُوْنَ بِأَشَدِّ الْاٰلَامِ، وَأُهْلِكَ الْمُرْتَدُّوْنَ كَالْأَنْعَامِ، وَاٰمَنَ اللهُ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ خَوْفٍ كَانُوْا فِيْهِ كَالْمَيِّتِيْنَ۔ وَكَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بَعْدَ رَفْعِ هٰذَا الْعَذَابِ، وَيُهَنِّئُوْنَ الصِّدِّيْقَ وَيَتَلَقَّوْنَهٗ بِالتَّرْحَابِ، وَيَحْمَدُوْنَهٗ وَيَدْعُوْنَ لَهٗ مِنْ حَضْرَةِ رَبِّ الْأَرْبَابِ، وَبَادَرُوْا إِلٰى تَعْظِيْمِهٖ وَاٰدَابِ تَكْرِيْمِهٖ، وَأَدْخَلُوْا حُبَّهٗ فِيْ تَامُوْرِهِمْ، وَاقْتَدَوْا بِهٖ فِيْ جَمِيْعِ أُمُوْرِهِمْ، وَكَانُوْا لَهٗ شَاكِرِيْنَ۔ وَصَقَلُوْا خَوَاطِرَهُمْ، وَسَقَوْا نَوَاضِرَهُمْ، وَزَادُوْا حُبًّا، وَوَدُّوْا وَطَاوَعُوْهُ جُهْدًا وَّجِدًّا، وَّكَانُوْا يَحْسَبُوْنَهٗ مُبَارَكًا وَمُؤَيَّدًا كَالنَّبِيِّيْنَ۔ وَكَانَ هٰذَا كُلُّهٗ مِنْ صِدْقِ الصِّدِّيْقِ وَالْيَقِيْنِ الْعَمِيْقِ۔ وَوَاللهِ إِنَّهٗ كَانَ اٰدَمَ الثَّانِيْ لِلْإِسْلَامِ، وَالْمَظْهَرَ الْأَوَّلَ لِأَنْوَارِ خَيْرِ الْأَنَامِ، وَمَا كَانَ نَبِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَتْ فِيْهِ قُوَى الْمُرْسَلِيْنَ، فَبِصِدْقِهٖ عَادَتْ حَدِيْقَةُ الْإِسْلَامِ إِلٰى زُخْرُفِهِ التَّامِّ،

ہونے کے وقت مسلمانوں کی کیسی کمزور حالت تھی اور اسلام مصائب کی وجہ سے ایک جلے ہوئے شخص کی طرح تھا پھر اللہ نے دوبارہ اسلام کو طاقت بخشی اور اس کو بہرے کنوئیں سے نکالا اور جھوٹے مدعیانِ نبوت سخت عذاب کے ساتھ قتل کئے گئے اور مرتدین چوپایوں کی طرح ہلاک کر دیئے گئے۔ اور اللہ نے مومنوں کو اس خوف سے امن دیا جس میں وہ مردوں کی طرح پڑے ہوئے تھے اور مومن اس مصیبت کے دور ہوتے ہی خوشیاں منانے لگے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مبارک باد دینے لگے اور آپ کو مرحبا اور خوش آمدید کہتے اور آپ کی تعریف کرتے تھے اور آپ کے لئے خدا تعالیٰ سے دعائیں مانگتے تھے اور آپ کی تعظیم و تکریم میں جلدی کرتے تھے اور آپ کی محبت اپنے دلوں میں بٹھاتے تھے اور تمام امور میں آپ کی اطاعت کرتے اور آپ کے شکر گزار تھے اور انہوں نے اپنے دلوں کو جلا دی اور دل کے کھیتوں کو سیراب کیا اور آپ سے محبت میں بڑھ گئے اور پوری کوشش سے آپ کی اطاعت کی۔ اور وہ آپ کو مبارک اور انبیاء کی طرح مؤیّد سمجھا کرتے تھے اور یہ سب کچھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سچائی اور گہرے یقین پر قائم ہونے کے سبب سے تھا۔ بخدا وہ اسلام کے آدم ثانی اور آنحضرتؐ کے انوار کے لئے مظہرِ اوّل تھے۔ گو وہ نبی نہیں تھے لیکن ان میں انبیاء کے قویٰ پائے جاتے تھے اور آپ کے صدق کی بدولت اسلام کا باغ اپنی کامل

وَأَخَذَ زِيْنَتَهٗ وَقُرَّتَهٗ بَعْدَ صَدَمَاتِ السِّهَامِ، وَتَنَوَّعَتْ أَزَاهِيْرُهٗ وَطُهِّرَتْ أَغْصَانُهٗ مِنَ الْقَتَامِ، وَكَانَ قَبْلَ ذٰلِكَ كَمَيِّتٍ نُدِبَ، وَشَرِيْدٍ جُدِبَ، وَجَرِيْحٍ نُوْبَ وَذَبِيْحٍ جُوِبَ، وَأَلِيْمِ أَنْوَاعٍ تُعِبَ، وَحَرِيْقِ هَاجِرَةٍ ذَاتِ لَهَبٍ، ثُمَّ نَجَّاهُ اللّٰهُ مِنْ جَمِيْعِ تِلْكَ الْبَلِيَّاتِ، وَاسْتَخْلَصَهٗ مِنْ سَائِرِ الْاٰفَاتِ، وَأَيَّدَهٗ بِعَجَائِبِ التَّائِيْدَاتِ حَتّٰى أَمَّ الْمُلُوْكَ وَمَلِكَ الرِّقَابَ، بَعْدَمَا تَكَسَّرَ وَافْتَرَشَ التُّرَابَ، فَزُمِتَ أَلْسِنَةُ الْمُنَافِقِيْنَ وَتَهَلَّلَ وَجْهُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ وَكُلُّ نَفْسٍ حَمِدَتْ رَبَّهٗ وَشَكَرَتِ الصِّدِّيْقَ، وَجَاءَتْهُ مُطَاوِعًا إِلَّا الزِّنْدِيْقُ، وَالَّذِيْ كَانَ مِنَ الْفَاسِقِيْنَ۔ وَكَانَ كُلُّ ذٰلِكَ أَجْرَ عَبْدٍ تَخَيَّرَهُ اللّٰهُ وَصَافَاهُ وَرَضِيَ عَنْهُ وَعَافَاهُ، وَاللّٰهُ لَا يُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔

فَالْحَاصِلُ أَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ كُلَّهَا مُخْبِرَةٌ عَنْ خِلَافَةِ الصِّدِّيْقِ، وَلَيْسَ لَهَا مَحْمَلٌ اٰخَرُ فَانْظُرْ عَلٰى وَجْهِ التَّحْقِيْقِ، وَاخْشَ اللّٰهَ وَلَا تَكُنْ مِّنَ

تروتازگی کو پہنچا اور اس نے اپنی زینت اور سکینت تیروں کے صدمات سہنے کے بعد حاصل کی اور اس کے اندر رنگارنگ کے پھول پیدا ہوئے اور اس کی شاخیں غبار سے صاف ہوگئیں اور اس سے پہلے اسلام ایک ایسے مردہ کی طرح تھا جس پر ماتم کیا جاچکا ہو اور قحط سے بھگائے ہوئے اور مصائب سے زخمی اور سفروں سے درماندہ اور قسم قسم کی تھکان سے دکھ دیئے ہوئے اور شعلوں والی دوپہر کے جلے بھنے ہوئے شخص کی مانند تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے ان تمام مصائب سے نجات دی اور تمام آفات سے چھڑایا اور عجیب تائیدات سے اس کی مدد کی یہاں تک کہ اس نے بادشاہوں کی قیادت کی اور لوگوں کی گردنیں اس کے ہاتھ میں آگئیں بعد اس کے کہ وہ درماندہ اور شکستہ ہو چکا تھا اور خاک میں مل چکا تھا۔ پس منافقوں کی زبانیں بند ہوگئیں اور مومنوں کے چہرے چمک اُٹھے اور ہر ایک شخص نے اپنے رب کی حمد کی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا شکر بجالایا اور سوائے زندیق اور فاسق کے سب ان کے پاس مطیع بن کر آگئے۔ یہ سارا اجر اس بندے کا تھا جسے اللہ نے چن لیا تھا اور اسے اپنی دوستی کے لئے مخصوص کر لیا تھا اور اس سے راضی ہوگیا تھا اور اس کو عافیت بخشی تھی اور اللہ تعالیٰ محسنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

حاصل کلام یہ کہ یہ تمام آیات حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کی خبر دے رہی ہیں اور ان کا کوئی اور مصداق نہیں ہے۔ پس آپ تحقیق کی نظر سے اسے دیکھیں اور اللہ سے ڈریں اور متعصب مت بنیں پھر دیکھیں کہ یہ تمام آیات آئندہ

الْمُتَعَصِّبِيْنَ. ثُمَّ انْظُرْ أَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ كَانَتْ مِنَ الْأَنْبَآءِ الْمُسْتَقْبِلَةِ لِتَزِيْدَ إِيْمَانُ الْمُؤْمِنِيْنَ عِنْدَ ظُهُوْرِهَا، وَلِيَعْرِفُوْا مَوَاعِيْدَ حَضْرَةِ الْعِزَّةِ. فَإِنَّ اللّٰهَ أَخْبَرَ فِيْهَا عَنْ زَمَانِ حُلُوْلِ الْفِتَنِ وَنُزُوْلِ الْمَصَائِبِ عَلَى الْإِسْلَامِ بَعْدَ وَفَاةِ خَيْرِ الْأَنَامِ، وَوَعَدَ أَنَّهٗ سَيَسْتَخْلِفُ فِيْ ذٰلِكَ الزَّمَنِ بَعْضًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَيُؤْمِنُهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ، وَيُمَكِّنُ دِيْنَهُ الْمُتَزَلْزِلَ وَيُهْلِكُ الْمُفْسِدِيْنَ. وَلَا شَكَّ أَنَّ مِصْدَاقَ هٰذَا النَّبَإِ لَيْسَ إِلَّا أَبُوْ بَكْرٍ وَّزَمَانُهٗ، فَلَا تُنْكِرْ وَقَدْ حَصْحَصَ بُرْهَانُهٗ. إِنَّهٗ وَجَدَ الْإِسْلَامَ كَجِدَارٍ يُّرِيْدُ أَنْ يَّنْقَضَّ مِنْ شَرِّ أَشْرَارٍ، فَجَعَلَهُ اللّٰهُ بِيَدِهٖ كَحِصْنٍ مُّشَيَّدٍ لَهٗ جُدْرَانٌ مِّنْ حَدِيْدٍ، وَفِيْهِ فَوْجٌ مُّطِيْعُوْنَ كَعَبِيْدٍ. فَانْظُرْ هَلْ تَجِدُ مِنْ رَّيْبٍ فِيْ هٰذَا، أَوْ يَسُوْغُ عِنْدَكَ إِتْيَانُ نَظِيْرِهٖ مِنْ زُمَرٍ اٰخَرِيْنَ؟

(سر الخلافۃ، روحانی خزائن جلد ۸ صفحہ ۳۳۳ تا ۳۳۶)

کے لئے پیشگوئیاں تھیں تا کہ ان کے ظہور کے وقت مومنوں کا ایمان بڑھ جائے اور وہ اللہ کے وعدوں کو پہچان لیں۔ کیونکہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام میں فتنے پیدا ہونے اور اس پر مصائب نازل ہونے کی خبر دی تھی اور ان میں یہ وعدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس وقت بعض مومنوں کو خلیفہ بنائے گا اور خوف کے بعد ان کو امن دے گا اور ان کے متزلزل دین کو تقویت بخشے گا اور مفسدین کو ہلاک کرے گا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پیشگوئی کا مصداق سوائے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اور ان کے زمانے کے کوئی نہیں۔ پس انکار نہ کریں کیونکہ اس کی دلیل تو ظاہر ہوگئی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسلام کو ایسی دیوار کی طرح پایا جو مفسدین کی شرارت کی وجہ سے گرنے کو تھی۔ خدا تعالیٰ نے اس کو ان کے ہاتھوں ایک چونہ گچ، مضبوط اونچے قلعہ کی طرح بنا دیا جس کی دیواریں فولادی تھیں اور اس میں ایسی فوج تھی جو غلاموں کی طرح فرمانبردار تھی۔ پس غور کریں کیا اس میں آپ کے لئے کوئی شک کی گنجائش ہے یا اس کی نظیر آپ کے نزدیک اور جماعتوں سے لانا ممکن ہے۔

(ترجمہ از مرتب)

کیا یہ سچ نہیں ہے کہ قرآن شریف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مثیل موسیٰ قرار دیا ہے اور کیا یہ سچ نہیں ہے کہ قرآن کریم نے نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مثیل موسیٰؑ قرار دیا بلکہ آیت كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ میں تمام سلسلہ خلافت محمدیہ کو سلسلہ خلافت موسویہ کا مثیل قرار دے دیا ہے۔ پس اس صورت میں قطعاً و وجوباً لازم آتا ہے کہ سلسلۂ خلافتِ اسلامیہ کے آخر میں ایک مثیل عیسیٰؑ پیدا ہو اور چونکہ اوّل اور

آخر کی مشابہت ثابت ہونے سے تمام سلسلہ کی مشابہت ثابت ہو جاتی ہے اس لئے خدا تعالیٰ کے پاک نبیوں کی کتابوں میں جابجا انہیں دونوں مشابہتوں پر زور دیا گیا ہے بلکہ اوّل اور آخر کے دشمنوں میں بھی مشابہت ثابت کی گئی ہے جیسا کہ ابوجہل کو فرعون سے مشابہت دی گئی ہے اور آخری مسیح کے مخالفین کو یہود مغضوب علیہم سے اور آیت کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ میں یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ آخری خلیفہ اس امت کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسے زمانہ میں آئے گا۔ جو وہ زمانہ اپنی مدّت میں اس زمانہ کی مانند ہوگا۔ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے تھے۔ یعنی چودھویں صدی کیونکہ کَمَا کا لفظ جس مشابہت کو چاہتا ہے اس میں زمانہ کی مشابہت بھی داخل ہے تمام فرقے یہودیوں کے اس بات پر متفق ہیں کہ عیسیٰؑ بن مریم نے جس زمانہ میں دعویٰ نبوت کیا وہ زمانہ حضرت موسیٰؑ سے چودھویں صدی تھی۔ اور عیسائیوں میں سے پروٹسٹنٹ مذہب والے خیال کرتے ہیں۔ کہ پندرھویں (۱۵۰۰) صدی موسوی سے کچھ سال گزر چکے تھے جب حضرت عیسیٰؑ نے دعویٰ نبوت کیا۔ اور پروٹسٹنٹ کا قول یہودیوں کے متفق علیہ قول کے مقابل پر کچھ چیز نہیں اور اگر اس کی صحت مان بھی لیں تو اس قدر قلیل فرق سے مشابہت میں کچھ فرق نہیں آتا بلکہ مشابہت ایک قلیل فرق کو چاہتی ہے۔ ایسا ہی قرآن شریف کی رُو سے سلسلہ محمدیہ سلسلہ موسویہ سے ہر یک نیکی اور بدی میں مشابہت رکھتا ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۱۲، ۱۳)

یہ فیصلہ بھی قرآن شریف نے ہی سورۃ نور میں لفظ مِنْكُمْ کے ساتھ ہی کر دیا ہے کہ اس دین کے تمام خلیفے اسی اُمّت میں سے پیدا ہوں گے اور وہ خلفاء سلسلہ موسوی کے مثیل ہوں گے اور صرف ایک اُن میں سے سلسلہ کے آخر میں موعود ہوگا جو عیسیٰ بن مریم کے مشابہ ہوگا باقی موعود نہیں ہوں گے یعنی نام لے کر اُن کے لئے کوئی پیشگوئی نہیں ہوگی اور یہ مِنْكُمْ کا لفظ بخاری میں بھی موجود ہے اور مسلم میں بھی ہے جس کے یہی معنے ہیں کہ وہ مسیح موعود اسی اُمّت میں سے پیدا ہوگا۔ پس اگر ایک غور کرنے والا اس جگہ پورا غور کرے اور طریق خیانت اختیار نہ کرے تو اس کو ان تین مِنْكُمْ کے لفظوں پر نظر ڈالنے سے یقین ہو جائے گا کہ یہ امر قطعی فیصلہ تک پہنچ چکا ہے کہ مسیح موعود اسی اُمت میں سے پیدا ہوگا۔

(تذکرۃ الشہادتین، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۹، ۴۰)

سورہ نور میں بیان کیا گیا ہے کہ تمام خلیفے اِسی اُمت میں سے پیدا ہوں گے۔ اور قرآن شریف سے مستنبط ہوتا ہے کہ اس اُمت پر دو زمانے بہت خوفناک آئیں گے۔ ایک وہ زمانہ جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آیا۔ اور دوسرا وہ زمانہ جو دجّالی فتنہ کا زمانہ ہے جو مسیح کے عہد میں آنے والا تھا جس سے پناہ مانگنے کے لئے اس آیت میں اشارہ ہے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ (الفاتحۃ : ۷) اور اسی زمانہ کے لئے یہ پیشگوئی سورہ نور میں موجود ہے۔ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا۔ اس آیت کے معنے پہلی آیت کے ساتھ ملا کر یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس دین پر آخری زمانہ میں ایک زلزلہ آئے گا اور خوف پیدا ہو جائے گا کہ یہ دین ساری زمین پر سے گم نہ ہو جائے۔ تب خدا تعالیٰ دوبارہ اس دین کو روئے زمین پر متمکن کر دے گا اور خوف کے بعد امن بخش دے گا۔

(لیکچر لاہور، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۱۸۷)

سورہ نور میں صریح اشارہ فرماتا ہے کہ ہر ایک رنگ میں جیسے بنی اسرائیل میں خلیفے گزرے ہیں وہ تمام رنگ اس اُمت کے خلیفوں میں بھی ہوں گے۔ چنانچہ اسرائیلی خلیفوں میں سے حضرت عیسیٰؑ ایسے خلیفے تھے جنہوں نے نہ تلوار اُٹھائی اور نہ جہاد کیا۔ سو اِس امت کو بھی اسی رنگ کا مسیح موعود دیا گیا۔ دیکھو آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ اس آیت میں فقرہ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قابلِ غور ہے۔ کیونکہ اِس سے سمجھا جاتا ہے کہ محمدی خلافت کا سلسلہ موسوی خلافت کے سلسلہ سے مشابہ ہے اور چونکہ موسوی خلافت کا انجام ایسے نبی پر ہوا یعنی حضرت عیسیٰؑ پر جو حضرت موسیٰؑ سے چودھویں صدی کے سر پر آیا اور نیز کوئی جنگ اور جہاد نہیں کیا اس لئے ضروری تھا کہ آخری خلیفہ سلسلہ محمدی کا بھی اِسی شان کا ہو۔ (لیکچر سیالکوٹ، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۲۱۳، ۲۱۴)

خدا تعالیٰ..... دو قسم کی قدرت ظاہر کرتا ہے (۱) اوّل خود نبیوں کے ہاتھ سے اپنی قدرت کا ہاتھ دکھاتا ہے (۲) دوسرے ایسے وقت میں جب نبی کی وفات کے بعد مشکلات کا سامنا پیدا ہو جاتا ہے اور دشمن زور میں آجاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اب کام بگڑ گیا اور یقین کر لیتے ہیں کہ اب یہ جماعت نابود ہو جائے گی اور خود جماعت کے لوگ بھی تردّد میں پڑ جاتے ہیں اور اُن کی کمریں ٹوٹ جاتی ہیں اور کئی بدقسمت مرتد ہونے کی راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ تب خدا تعالیٰ دوسری مرتبہ اپنی زبردست قدرت ظاہر کرتا ہے اور گرتی ہوئی جماعت کو سنبھال لیتا ہے پس وہ جو اخیر تک صبر کرتا ہے خدا تعالیٰ کے اس معجزہ کو دیکھتا ہے جیسا کہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے وقت میں ہوا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موت ایک بے وقت موت سمجھی گئی اور بہت سے بادیہ نشین نادان مرتد ہو گئے اور صحابہؓ بھی مارے غم کے دیوانہ کی طرح ہو گئے۔ تب خدا تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کھڑا کر کے دوبارہ اپنی قدرت کا نمونہ دکھایا اور اسلام کو نابود ہوتے ہوتے تھام لیا اور اُس وعدہ کو پورا کیا جو فرمایا تھا وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا۔ یعنی خوف کے بعد پھر ہم ان کے پیر جما دیں گے۔ ایسا ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں ہوا جب کہ حضرت موسیٰؑ مصر اور کنعان کی راہ میں پہلے اِس سے جو بنی اسرائیل کو وعدہ کے موافق منزل مقصود تک پہنچا دیں فوت ہو گئے اور بنی اسرائیل میں اُن کے مرنے سے ایک بڑا ماتم برپا ہوا جیسا کہ توریت میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل اس بے وقت موت کے صدمہ سے اور حضرت موسیٰؑ کی ناگہانی جدائی سے چالیس[۴] دن تک روتے رہے۔ ایسا ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ معاملہ ہوا۔ اور صلیب کے واقعہ کے وقت تمام حواری تتر بتر ہو گئے اور ایک ان میں سے مرتد بھی ہو گیا۔ (الوصیت، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۰۴، ۳۰۵)

قرآن شریف کی یہ آیت بھی کہ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ یہی چاہتی ہے کہ اس اُمت کے لئے چودھویں[۱۴] صدی میں مثیل عیسیٰ ظاہر ہو جیسا کہ حضرت عیسیٰ حضرت موسیٰ سے چودھویں صدی میں ظاہر ہوئے تھے تا دونوں مثیلوں کے اول وآخر میں مشابہت ہو۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۵۰۰)

سورۂ نور میں مِنْكُمْ کا لفظ اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہر ایک خلیفہ اسی اُمت میں سے ہوگا اور آیت كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ بھی اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس سے ظاہر ہے کہ کوئی امر غیر معمولی نہیں ہوگا بلکہ جس طرح صدر زمانہ اسلام میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مثیل موسیٰ ہیں جیسا کہ آیت كَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزّمل:۱۶) سے ظاہر ہے ایسا ہی آخر زمانہ اسلام میں دونوں سلسلوں موسوی اور محمدی کا اوّل اور آخر میں تطابق پورا کرنے کے لئے مثیل عیسیٰ کی ضرورت تھی۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰)

ہمارا رسول مثیلِ موسیٰ ہے.... فرمایا وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ الخ س ۱۸ اس مثیلِ موسیٰ کے خلفاء بھی اسی سلسلہ سے ہوں گے جیسے کہ موسیٰ کے خلفاء سلسلہ وار آئے۔ اس سلسلہ کی میعاد چودہ سو برس تک رہی۔ برابر خلفاء آتے رہے۔ یہ ایک اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیشگوئی تھی کہ جس طرح سے پہلے سلسلہ کا آغاز ہوا ویسے ہی اس سلسلہ کا آغاز

ہوگا یعنی جس طرح موسیٰ نے ابتداء میں جلالی نشان دکھلائے اور فرعون سے چھڑایا اسی طرح آنے والا نبی بھی موسیٰ کی طرح ہوگا۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۳)

قرآن شریف نے اسرائیلی اور اسماعیلی سلسلوں میں خلافت کی مماثلت کا کھلا کھلا اشارہ کیا ہے جیسے اس آیت سے ظاہر ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ الآیہ اسرائیلی سلسلہ کا آخری خلیفہ جو چودھویں صدی پر بعد از موسیٰ علیہ السلام آیا وہ مسیح ناصری تھا۔ مقابل میں ضروری تھا کہ اس اُمت کا مسیح بھی چودھویں صدی کے سر پر آوے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۸)

اس آیت میں استخلاف کے موافق جو خلیفے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں ہوں گے وہ پہلے خلیفوں کی طرح ہوں گے اس قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مثیل موسیٰ فرمایا گیا ہے جیسے فرمایا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمل: ۱۶) اور آپ مثیلِ موسیٰ استثنا کی پیشگوئی کے موافق بھی ہیں۔ پس اس مماثلت میں جیسے كَمَا کا لفظ فرمایا گیا ہے ویسے ہی سورہ نور میں كَمَا کا لفظ ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا کہ موسوی سلسلہ اور محمدی سلسلہ میں مشابہت اور مماثلت تامہ ہے۔ موسوی سلسلہ کے خلفاء کا سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آ کر ختم ہوگیا تھا اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد چودھویں صدی میں آئے تھے۔ اس مماثلت کے لحاظ سے کم از کم اتنا تو ضروری ہے کہ چوھویں صدی میں ایک خلیفہ اسی رنگ قوت کا پیدا ہو جو مسیح سے مماثلت رکھتا ہو اور اسی کے قلب اور قدم پر ہو۔ پس اگر اللہ تعالیٰ اس امر کی اور دوسری شہادتیں اور تائیدیں نہ بھی پیش کرتا تو یہ سلسلہ مماثلت بالطبع چاہتا تھا کہ چودھویں صدی میں عیسوی بروز آپؐ کی امت میں ہو ورنہ آپ کی مماثلت میں معاذ اللہ ایک نقص اور ضعف ثابت ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اس مماثلت کی تصدیق اور تائید فرمائی بلکہ یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ مثیلِ موسیٰ، موسیٰ سے اور تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل تر ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲، ۳)

آیت استخلاف میں اللہ تعالیٰ نے صاف طور ایک سلسلہ خلافت قائم کرنے کا وعدہ فرمایا اور اس سلسلہ کو پہلے سلسلہ خلافت کے ہم رنگ قرار دیا جیسا فرمایا كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اب اس وعدہ استخلاف کے موافق اور اس کی مماثلت کے لحاظ سے ضروری تھا کہ جیسے موسوی سلسلہ خلافت کا خاتم الخلفاء مسیح تھا ضرور

ہے کہ سلسلہ محمدیہ کے خلفاء کا خاتم بھی ایک مسیح ہی ہو۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۱ر فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ میں جو استخلاف کا وعدہ ہے یہ بھی اسی امر پر صاف دلیل ہے کہ کوئی پرانا نبی اخیر تک نہ آوے ورنہ کَمَا باطل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کَمَا کے نیچے تو مثیل کو رکھا ہے عین کو نہیں رکھا پھر یہ کس قدر غلطی اور جرأت ہے کہ خدا تعالیٰ کے منشا کے خلاف ایک بات اپنی طرف سے پیدا کر لی جاوے اور ایک نیا اعتقاد بنا لیا جاوے۔

اور پھر کَمَا میں مدت کی بھی تعیین ہے کیونکہ مسیح موسیٰ کے بعد چودھویں صدی میں آیا تھا اس لئے ضروری تھا کہ آنے والا محمدی مسیح بھی چودھویں صدی میں آئے۔ غرض یہ آیت ان تمام امور کو حل کرتی ہے اگر کوئی سوچنے والا ہو۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

کیا مِنۡکُمۡ ثَلَاثَہ ہمارے مخالفوں کے لئے کافی نہیں۔ ایک بخاری کا مِنۡکُمۡ (اِمَامُکُمۡ مِنۡکُمۡ) مسلم کا مِنۡکُمۡ (اَمَّکُمۡ مِنۡکُمۡ) اور سب سے بڑھ کر قرآن کا مِنۡکُمۡ (وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ)۔
(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۶)

قرآن پر تدبر سے نظر کرنے والے کو معلوم ہوگا کہ دو سلسلوں کا مساوی ذکر ہے اول سلسلہ جو موسیٰ سے شروع ہو کر مسیح علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے اور دوسرا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہوتا ہے یہ اس شخص پر ختم ہونا چاہیے جو مثیلِ مسیح ہو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مثیلِ موسیٰ ہیں اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ۬ۙ شَاہِدًا عَلَیۡکُمۡ۔ الایۃ (المزمل: ۱۶) اور پھر سورہ نور میں وعدہ استخلاف فرمایا کہ جس طرح پر موسوی سلسلہ ہو گزرا ہے اسی طرح پر محمدی سلسلہ بھی ہوگا تا کہ دونوں سلسلوں میں بموجب آیاتِ قرآنی باہم مطابقت اور موافقت تامہ ہو چنانچہ جب کہ موسوی سلسلہ آخر عیسیٰ علیہ السلام پر ختم ہوا ضروری تھا کہ محمدی سلسلہ کا خاتم بھی عیسیٰ موعود ہوتا۔ ان دونوں سلسلوں کا بہم تقابل مرایا متقابلہ کی طرح ہے یعنی جب دو شیشے ایک دوسرے کے بالمقابل رکھے جاتے ہیں تو ایک شیشہ کا دوسرے میں انعکاس ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

(اس سوال کے جواب میں کہ قرآن میں مسیح موعود کا کہاں کہاں ذکر ہے۔ فرمایا۔)

سورۃ فاتحہ، سورہ نور، سورہ تحریم وغیرہ میں۔ سورہ فاتحہ میں تو اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ سورۃ نور میں وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ الآیۃ اور سورہ تحریم میں جہاں مومنوں کی مثالیں بیان کی ہیں ان میں فرمایا وَ مَرۡیَمَ

ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (التحریم : ۱۳)۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۳ مورخہ ۲۴؍جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام براہِ راست خدا کے نبی تھے اور میری نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے اور فیوض سے ہے پھر وہی عیسیٰ کیوں کر آ سکتا ہے جبکہ سورۃ نور میں جو آیت استخلاف ہے اس میں وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ لکھا ہے اور صحیح بخاری میں بھی اِمَامُكُمْ مِنْكُمْ ہے پھر عیسیٰ علیہ السلام تو فوت ہو چکے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں معراج کی رات مردوں میں دیکھ چکے جو بہشت میں ہوں انہیں زندوں سے کیا تعلق۔ جس بات پر خدا نے اپنے قول سے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فعل سے شہادت دے دی اس سے انکار کرنا دراصل میری تکذیب کرنا نہیں۔ میں کیا ہوں اور میری تکذیب کیا دراصل یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہے۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۵؍جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۹)

موعود وہ ہے جس کا ذکر مِنْكُمْ میں ہے جیسے کہ فرماتا ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الخ ورنہ اس طرح خواہ صدہا مسیح آویں اور کسی امت کے ہوں مگر وہ موعود نہ ہوویں گے کیونکہ وہ مِنْكُمْ سے باہر ہوں گے حالانکہ خدا تعالیٰ کا وعدہ مِنْكُمْ کا ہے پھر باہر سے آنے والا کیسے موعود ہو سکتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۷؍جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰۲)

مسیح موعود کی نسبت ان کا یہ خیال کہ وہ اسرائیلی مسیح ہوگا بالکل غلط ہے قرآن شریف میں صاف لکھا ہے کہ وہ تم میں سے ہوگا جیسے سورہ نور میں ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ پھر بخاری میں بھی مِنْكُمْ ہی ہے پھر مسلم میں بھی مِنْكُمْ ہی صاف لکھا ہے۔ ان کمبختوں کو اس قدر خیال نہیں آتا اگر اسی مسیح نے پھر آنا تھا تو مِنْكُمْ کی بجائے مِنْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ لکھا ہوتا۔ اب قرآن شریف اور احادیث تو پکار پکار کر مِنْكُمْ کہہ رہے ہیں مگر ان لوگوں کا دعویٰ مِنْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ کا ہے۔ سوچ کر دیکھو کہ قرآن کو چھوڑیں یا ان کو۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۶؍اکتوبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۰۶)

قرآن شریف نے بڑی وضاحت کے ساتھ دو سلسلوں کا ذکر کیا ہے ایک وہ سلسلہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شروع ہوا اور حضرت مسیح علیہ السلام پر آ کر ختم ہوا اور دوسرا سلسلہ جو اسی سلسلہ کے مقابل پر واقع ہوا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ ہے چنانچہ توریت میں بھی آپ کو مثیلِ موسیٰ کہا گیا اور قرآن شریف میں بھی آپ کو مثیلِ موسیٰ ٹھہرایا گیا ہے جیسے فرمایا ہے اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا ۙ۬ شَاهِدًا عَلَیْكُمْ كَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمل: ۱۶)۔ پھر جس طرح پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سلسلہ حضرت مسیح پر

آ کر ختم ہو گیا اسی سلسلہ کی مماثلت کے لئے ضروری تھا کہ اس وقت اور اسی زمانہ پر جب حضرت مسیح حضرت موسیٰ کے بعد آئے تھے مسیح محمدیؐ بھی آتا اور یہ بالکل ظاہر اور صاف بات ہے کہ مسیح موسوی چودھویں صدی میں آیا تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ مسیح محمدی بھی چودھویں صدی میں آتا۔ اگر کوئی اور نشان اور شہادت نہ بھی ہوتی تب بھی اس سلسلہ کی تکمیل چاہتی تھی کہ اس وقت مسیح محمدی آوے مگر یہاں تو صدہا اور نشان اور دلائل ہیں پھر آنے والے کو اسی امت میں سے ٹھہرایا گیا ہے جیسے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ میں فرمایا گیا ہے اور اسی طرح پر احادیث میں بھی آنے والا اسی امت سے ٹھہرایا گیا ہے جبکہ فرمایا ہے وَ اِمَامُكُمْ مِنْكُمْ۔ اب نصوصِ قرآنیہ اور حدیثیہ بوضاحت شہادت دیتے ہیں کہ آنے والا مسیح موعود اسی امت میں سے ہوگا اور ضرورت بجائے خود داعی ہے کیونکہ اسلام پر سخت حملے ہو رہے ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ان مخالفوں کا بس چلے اسلام کو نابود کر دیں۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۲ مورخہ ۱۰/اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۴، ۵)

اسی امت کے اب مومنین اور اعمالِ صالحہ بجالانے والوں سے خلافت کا وعدہ کیا گیا اسی طرح پر جس طرح بنی اسرائیل میں خلفاء کئے گئے تھے یہاں بھی وہی كَمَا کا لفظ موجود ہے ایک طرف تو اس سلسلہ کو سلسلہ موسوی کا مثیل ٹھہرایا۔ دوسری جگہ سلسلہ موسوی کی طرح خلفاء بنانے کا وعدہ کیا پھر کیا دونوں سلسلوں کا طبعی توافق ظاہر نہیں کرتا کہ اس امت میں خلفاء اسی رنگ کے قائم ہوں؟ ضرور کرتا ہے

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۰/نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

پیشگوئی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وعدہ کی جیسے فرمایا وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ۔ اہل سنت مانتے ہیں کہ اس قسم کی پیشگوئیوں میں تخلف نہیں ہوتا کیونکہ خدا تعالیٰ کریم ہے لیکن وعید کی پیشگوئیوں میں وہ ڈرا کر بخش بھی دیتا ہے اس لئے کہ وہ رحیم ہے۔ بڑا نادان اور اسلام سے دور پڑا ہوا ہے وہ شخص جو کہتا ہے وعید کی سب پیشگوئیاں پوری ہوتی ہیں۔ وہ قرآن کریم کو چھوڑتا ہے اس لئے کہ قرآن شریف تو کہتا ہے يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ (المؤمن: ۲۹)۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۷/اکتوبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۷﴾

انسان کو جو حکم اللہ تعالیٰ نے شریعت کے رنگ میں دیئے ہیں جیسے اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ نماز کو قائم رکھو۔ یا فرمایا

وَ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ (البقرۃ :۴۶) ان پر جب وہ ایک عرصہ تک قائم رہتا ہے تو یہ احکام بھی شرعی رنگ سے نکل کر کوئی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور پھر وہ ان احکام کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۵)

لَیۡسَ عَلَی الۡاَعۡمٰی حَرَجٌ وَّ لَا عَلَی الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَی الۡمَرِیۡضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ اَنۡ تَاۡکُلُوۡا مِنۡۢ بُیُوۡتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اٰبَآئِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اُمَّہٰتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اِخۡوَانِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اَخَوٰتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اَعۡمَامِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ عَمّٰتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اَخۡوَالِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ خٰلٰتِکُمۡ اَوۡ مَا مَلَکۡتُمۡ مَّفَاتِحَہٗۤ اَوۡ صَدِیۡقِکُمۡ ؕ لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَاۡکُلُوۡا جَمِیۡعًا اَوۡ اَشۡتَاتًا ؕ فَاِذَا دَخَلۡتُمۡ بُیُوۡتًا فَسَلِّمُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ تَحِیَّۃً مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ مُبٰرَکَۃً طَیِّبَۃً ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۲﴾

چھوت وغیرہ دراصل اس بات کا نشان ہے کہ ہندوؤں کا مذہب کمزور ہے جو ہاتھ لگانے سے بھی جاتا رہتا ہے۔ اسلام کی بنیاد چونکہ قوی تھی اس لئے اس نے ایسی باتوں کو اپنے مذہب میں نہیں رکھا چنانچہ کھانے کے متعلق فرمادیا لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَاۡکُلُوۡا جَمِیۡعًا اَوۡ اَشۡتَاتًا۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۲۴ر مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

اگر کھانا کھانے کو کسی کے ساتھ جی نہیں کرتا تو کسی اور بہانہ سے الگ ہو جاوے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَاۡکُلُوۡا جَمِیۡعًا اَوۡ اَشۡتَاتًا۔ مگر اظہار نہ کرے یہ اچھا نہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۷ مورخہ ۲۴ر جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۱۰)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تفسیر سورۃ الفرقان

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝۲

وہ بہت ہی برکت والا ہے جس نے قرآن شریف کو اپنے بندہ پر اس غرض سے اتارا کہ تمام جہان کو ڈرانے والا ہو یعنی تا ان کی بدراہی اور بدعقیدگی پر ان کو متنبہ کرے۔ پس یہ آیت بصراحت اس بات پر دلیل ہے کہ قرآن کا یہی دعویٰ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت میں تشریف لائے تھے جبکہ تمام دنیا اور تمام قومیں بگڑ چکی تھیں اور مخالف قوموں نے اس دعویٰ کو نہ صرف اپنی خاموشی سے بلکہ اپنے اقراروں سے مان لیا ہے۔ پس اس سے بہ بداہت نتیجہ نکلا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم درحقیقت ایسے وقت میں آئے تھے جس وقت میں ایک سچے اور کامل نبی کو آنا چاہیے۔ پھر جب ہم دوسرا پہلو دیکھتے ہیں کہ آنجناب صلعم کس وقت واپس بلائے گئے تو قرآن صاف اور صریح طور پر ہمیں خبر دیتا ہے کہ ایسے وقت میں بلانے کا حکم ہوا کہ جب اپنا کام پورا کر چکے تھے یعنی اس وقت کے بعد بلائے گئے جبکہ یہ آیت نازل ہو چکی کہ مسلمانوں کے لئے تعلیم کا مجموعہ کامل ہو گیا اور جو کچھ ضروریاتِ دین میں نازل ہونا تھا وہ سب نازل ہو چکا اور نہ صرف یہی بلکہ یہ بھی خبر دی گئی کہ خدا تعالیٰ کی تائیدیں بھی کمال کو پہنچ گئیں اور جوق در جوق لوگ دینِ اسلام میں داخل ہو گئے اور یہ آیتیں بھی نازل ہو گئیں کہ خدا تعالیٰ نے ایمان اور تقویٰ کو ان کے دلوں میں لکھ دیا اور

فسق اور فجور سے انہیں بیزار کر دیا اور پاک اور نیک اخلاق سے وہ متصف ہو گئے اور ایک بھاری تبدیلی ان کے اخلاق اور چلن اور روح میں واقع ہو گئی۔ (نور القرآن نمبر ۱، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۳۶۱ تا ۳۶۵)

ہم نے تجھے بھیجا تا کہ تو دنیا کی تمام قوموں کو ڈراوے یعنی ان کو متنبہ کرے کہ وہ خدا تعالیٰ کے حضور میں اپنی بدکاریوں اور عقیدوں کی وجہ سے سخت گنہگار ٹھہری ہیں۔

یاد رہے کہ جو اس آیت میں نذیر کا لفظ دنیا کے تمام فرقوں کے مقابل پر استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی گنہگاروں اور بدکاروں کو ڈرانا ہے اسی لفظ سے یقینی سمجھا جاتا ہے کہ قرآن کا یہ دعویٰ تھا کہ تمام دنیا بگڑ گئی اور ہر ایک نے سچائی اور نیک بختی کا طریق چھوڑ دیا کیونکہ انذار کا محل فاسق اور مشرک اور بدکار ہی ہیں اور انذار اور ڈرانا مجرموں کی ہی تنبیہ کے لئے ہوتا ہے نہ نیک بختوں کے لئے۔ اس بات کو ہر یک جانتا ہے کہ ہمیشہ سرکشوں اور بے ایمانوں کو ہی ڈرایا جاتا ہے اور سنت اللہ اسی طرح پر ہے کہ نبی نیکوں کے لئے بشیر ہوتے ہیں اور بدوں کے لئے نذیر۔ پھر جبکہ ایک نبی تمام دنیا کے لئے نذیر ہوا تو ماننا پڑا کہ تمام دنیا کو نبی کی وحی نے بداعمالیوں میں مبتلا قرار دیا ہے اور یہ ایک ایسا دعویٰ ہے کہ نہ توریت نے موسیٰ کی نسبت کیا اور نہ انجیل نے عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کی نسبت بلکہ صرف قرآن شریف نے کیا۔

(نور القرآن نمبر ۱، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۳۳۶، ۳۳۷)

ہم نے اِس لئے بھیجا ہے کہ تمام دُنیا کو ڈراوے۔ لیکن ہم بڑے زور سے کہتے ہیں کہ قرآن شریف سے پہلے دُنیا کی کسی الہامی کتاب نے یہ دعویٰ نہیں کیا بلکہ ہر ایک نے اپنی رسالت کو اپنی قوم تک ہی محدود رکھا یہاں تک کہ جس نبی کو عیسائیوں نے خدا قرار دیا اُس کے منہ سے بھی یہی نکلا کہ ”میں اسرائیل کی بھیڑوں کے سوا اور کسی کی طرف نہیں بھیجا گیا“ اور زمانہ کے حالات نے بھی گواہی دی کہ قرآن شریف کا یہ دعویٰ تبلیغِ عام کا عین موقعہ پر ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت تبلیغ عام کا دروازہ کھل گیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ سے بعد نزول اس آیت کے کہ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف:۱۵۹) دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کی طرف دعوتِ اسلام کے خط لکھے تھے کسی اور نبی نے غیر قوموں کے بادشاہوں کی طرف دعوتِ دین کے ہرگز خط نہیں لکھے کیونکہ وہ دوسری قوموں کی دعوت کے لئے مامور نہ تھے یہ عام دعوت کی تحریک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ہی شروع ہوئی اور مسیح موعود کے زمانہ میں اور اُس کے ہاتھ سے کمال تک پہنچی۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۷۶، ۷۷)

الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا۝۳ وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ وَ لَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا وَّ لَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَیٰوةً وَّ لَا نُشُوْرًا۝۴

خدا وہ خدا ہے جو تمام زمین و آسمان کا اکیلا مالک ہے۔کوئی اس کا حصہ دار نہیں۔اس کا کوئی بیٹا نہیں اور نہ اس کے ملک میں کوئی اس کا شریک۔اور اسی نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور پھر ایک حد تک اس کے جسم اور اس کی طاقتوں اور اس کی عمر کو محدود کر دیا اور مشرکوں نے بجز اس خدائے حقیقی کے اور اور ایسے ایسے خدا مقرر کر رکھے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ آپ پیدا شدہ اور مخلوق ہیں اپنے ضرر اور نفع کے مالک نہیں ہیں اور نہ موت اور زندگی اور جی اُٹھنے کے مالک ہیں اب دیکھو خدائے تعالیٰ صاف صاف طور پر فرما رہا ہے کہ بجز میرے کوئی اور خالق نہیں بلکہ ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے کہ تمام جہان مل کر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتا اور صاف فرماتا ہے کہ کوئی شخص موت اور حیات اور ضرر اور نفع کا مالک نہیں ہو سکتا۔اس جگہ ظاہر ہے کہ اگر کسی مخلوق کو موت اور حیات کا مالک بنا دینا اور اپنی صفات میں شریک کر دینا اس کی عادت میں داخل ہوتا تو وہ بطور استثناء ایسے لوگوں کو ضرور باہر رکھ لیتا اور ایسی اعلیٰ توحید کی ہمیں ہرگز تعلیم نہ دیتا۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۲۵۹، ۲۶۰ حاشیہ)

وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا یعنی اس کے ملک میں کوئی اس کا شریک نہیں وہ سب کا خالق ہے اور اس کے خالق ہونے پر یہ دلیل واضح ہے کہ ہر ایک چیز کو ایک اندازہ مقرری پر پیدا کیا ہے کہ جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتی بلکہ اسی اندازہ میں محصور اور محدود ہے اس کی شکل منطقی اس طرح پر ہے کہ ہر جسم اور روح ایک اندازہ مقرری میں محصور اور محدود ہے اور ہر ایک وہ چیز کہ کسی اندازہ مقرری میں محصور اور محدود ہو اس کا کوئی حاصر اور محدد ضرور ہوتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک جسم اور روح کے لئے ایک حاصر اور محدد ہے۔اب اثبات قضیہ اولیٰ کا یعنی محدود القدر ہونے اشیاء کا اس طرح پر ہے کہ جمیع اجسام اور ارواح میں جو جو خاصیتیں پائی جاتی ہیں عقل تجویز کر سکتی ہے کہ ان خواص سے زیادہ خواص ان میں پائے جاتے۔مثلاً انسان کی دو آنکھیں ہیں اور عند العقل ممکن تھا کہ اس کی چار آنکھیں ہوتیں دو منہ کی طرف اور دو

پیچھے کی طرف تا کہ جیسا آگے کی چیزوں کو دیکھتا ہے ویسا ہی پیچھے کی چیزوں کو بھی دیکھ لیتا اور کچھ شک نہیں کہ چار آنکھ کا ہونا بہ نسبت دو آنکھ کے کمال میں زیادہ اور فائدہ میں دو چند ہے۔ اور انسان کے پَر نہیں اور ممکن تھا کہ مثل اَور پرندوں کے اس کے پر بھی ہوتے اور علیٰ ہذا القیاس نفسِ ناطقہ انسان بھی ایک خاص درجہ میں محدود ہے جیسا کہ وہ بغیر تعلیم کسی معلم کے خود بخود مجہولات کو دریافت نہیں کرسکتا۔ قاسر خارجی سے کہ جیسے جنون یا مخموری ہے سالم الحال نہیں رہ سکتا بلکہ فی الفور اس کی قوتوں اور طاقتوں میں تنزل واقع ہو جاتا ہے اسی طرح بذاتہٖ ادراک جزئیات کا نہیں کرسکتا جیسا کہ اس کو شیخ محقق بوعلی سینا نے نمط سابع اشارات میں بتصریح لکھا ہے حالانکہ عند العقل ممکن تھا کہ ان سب آفات اور عیوب سے بچا ہوا ہوتا۔ پس جن جن مراتب اور فضائل کو انسان اور اس کی روح کے لئے عقل تجویز کرسکتی ہے وہ کس بات سے ان مراتب سے محروم ہے آیا تجویز کسی اور مجوز سے یا خود اپنی رضامندی سے۔ اگر کہو کہ اپنی رضامندی سے تو یہ صریح خلاف ہے کیونکہ کوئی شخص اپنے حق میں نقص روا نہیں رکھتا اور اگر کہو کہ تجویز کسی اور مجوز سے تو مبارک ہو کہ وجود خالق ارواح اور اجسام کا ثابت ہو گیا اور یہی مدعا تھا۔ (پرانی تحریریں، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۸، ۹)

اس کے خالق ہونے پر یہ دلیل واضح ہے کہ ہر ایک چیز کو ایک اندازہ مقرری میں محصور اور محدود پیدا کیا ہے جس سے وجود اس ایک حاصر اور محدد کا ثابت ہوتا ہے۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۲۱ حاشیہ نمبر ۳)

واضح رہے کہ تقدیر کے معنے صرف اندازہ کرنا ہے جیسے کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا یعنی ہر ایک چیز کو پیدا کیا تو پھر اس کے لئے ایک مقرر اندازہ ٹھہرا دیا اس سے کہاں ثابت ہوتا ہے کہ انسان اپنے اختیارات سے روکا گیا ہے بلکہ وہ اختیارات بھی اسی اندازہ میں آ گئے۔ جب خدا تعالیٰ نے انسانی فطرت اور انسانی خوئے کا اندازہ کیا تو اس کا نام تقدیر رکھا اور اسی میں یہ مقرر کیا کہ فلاں حد تک انسان اپنے اختیارات برت سکتا ہے یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ تقدیر کے لفظ کو ایسے طور پر سمجھا جائے کہ گویا انسان اپنے خدا داد قویٰ سے محروم رہنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ اس جگہ تو ایک گھڑی کی مثال ٹھیک آتی ہے کہ گھڑی کا بنانے والا جس حد تک اس کا دور مقرر کرتا ہے اس حد سے وہ زیادہ چل نہیں سکتی۔ یہی انسان کی مثال ہے کہ جو قویٰ اس کو دیئے گئے ہیں ان سے زیادہ وہ کچھ کر نہیں سکتا اور جو عمر دی گئی ہے اس سے زیادہ جی نہیں سکتا۔ (جنگِ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۳۲)

آپ خدا نے ہر یک چیز کو پیدا کیا اور اس کا اندازہ بھی آپ اپنے اختیار سے مقرر کر دیا۔

(ست بچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۳۱)

قرآن شریف نے وید کی طرح بے وجہ اور محض زبردستی کے طور پر اللہ جلّ شانہٗ کو تمام ارواح اور ہر ایک ذرّہ ذرّہ اجسام کا مالک نہیں ٹھہرایا بلکہ اس کی ایک وجہ بیان کی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ .... خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۔ (ترجمہ) یعنی زمین اور آسمان اور جو کچھ اُن میں ہے سب خدا تعالیٰ کی ملکیّت ہے کیونکہ وہ سب چیزیں اُسی نے پیدا کی ہیں اور پھر ہر ایک مخلوق کی طاقت اور کام کی ایک حد مقرر کر دی ہے تا محدود چیزیں ایک محدّد پر دلالت کریں جو خدا تعالیٰ ہے سو ہم دیکھتے ہیں کہ جیسا کہ اجسام اپنے اپنے حدود میں مقیّد ہیں اور اس حد سے باہر نہیں ہو سکتے اِسی طرح ارواح بھی مقیّد ہیں اور اپنی مقررہ طاقتوں سے زیادہ کوئی طاقت پیدا نہیں کر سکتے۔ اب پہلے ہم اجسام کے محدود ہونے کے بارہ میں بعض مثالیں پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مثلاً چاند ایک مہینہ میں اپنا دورہ ختم کر لیتا ہے یعنی انتیس[۲۹] یا تیس[۳۰] دن تک مگر سورج تین سو چونسٹھ[۳۶۴] دن میں اپنے دورہ کو پورا کرتا ہے اور سورج کو یہ طاقت نہیں ہے کہ اپنے دورہ کو اِس قدر کم کر دے جیسا کہ چاند کے دورہ کا مقدار ہے اور نہ چاند کی یہ طاقت ہے کہ اس قدر اپنے دورہ کے دن بڑھا دے کہ جس قدر سورج کے لئے دن مقرر ہیں اور اگر تمام دنیا اِس بات کے لئے اتفاق بھی کر لے کہ ان دونوں نیرّوں کے دَوروں میں کچھ کمی بیشی کر دیں تو یہ ہرگز اُن کے لئے ممکن نہیں ہوگا اور نہ خود سورج اور چاند میں یہ طاقت ہے کہ اپنے اپنے دَوروں میں کچھ تغیر تبدّل کر ڈالیں۔

پس وہ ذات جس نے ان ستاروں کو اپنی اپنی حد پر ٹھہرا رکھا ہے یعنی جو اُن کا محدّد اور حد باندھنے والا ہے وہی خدا ہے۔ ایسا ہی انسان کے جسم اور ہاتھی کے جسم میں بڑا فرق ہے اگر تمام ڈاکٹر اس بات کے لئے اکٹھے ہوں کہ انسان اپنی جسمانی طاقتوں اور جسم کی ضخامت میں ہاتھی کے برابر ہو جاوے تو یہ اُن کے لئے غیر ممکن ہے۔ اور اگر یہ چاہیں کہ ہاتھی محض انسان کے قد تک محدود رہے تو یہ بھی اُن کے لئے غیر ممکن ہے پس اس جگہ بھی ایک تحدید ہے یعنی حد باندھنا جیسا کہ سورج اور چاند میں ایک تحدید ہے اور وہی تحدید ایک محدّد یعنی حد باندھنے والے پر دلالت کرتی ہے یعنی اُس ذات پر دلالت کرتی ہے جس نے ہاتھی کو وہ مقدار بخشا اور انسان کے لئے وہ مقدار مقرر کیا۔ اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو ان تمام جسمانی چیزوں میں عجیب طور سے خدا تعالیٰ کا ایک پوشیدہ تصرّف نظر آتا ہے اور عجیب طور پر اس کی حد بندی مشاہدہ ہوتی ہے۔ اُن کیڑوں کی

مقدار سے لے کر جو بغیر دُوربین کے دکھائی نہیں دے سکتے اُن بڑی بڑی مچھلیوں کی مقدار تک جو ایک بڑے جہاز کو بھی چھوٹے سے لقمہ کی طرح نگل سکتی ہیں۔ حیوانی اجسام میں ایک عجیب نظارہ حد بندی کا نظر آتا ہے کوئی جانور اپنے جسم کی رُو سے اپنی حد سے باہر نہیں جا سکتا۔ ایسا ہی وہ تمام ستارے جو آسمان پر نظر آتے ہیں اپنی اپنی حد سے باہر نہیں جا سکتے۔ پس یہ حد بندی دلالت کر رہی ہے کہ در پردہ کوئی حد باندھنے والا ہے۔ یہی معنی اس مذکورہ بالا آیت کے ہیں کہ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۔

اب واضح ہو کہ جیسا کہ یہ حد بندی اجسام میں پائی جاتی ہے ایسا ہی یہ حد بندی ارواح میں بھی ثابت ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ جس قدر انسانی روح اپنے کمالات ظاہر کر سکتا ہے یا یوں کہو کہ جس قدر کمالات کی طرف ترقی کر سکتا ہے وہ کمالات ایک ہاتھی کی رُوح کو باوجود ضخیم اور جسیم ہونے کے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اِسی طرح ہر ایک حیوان کی رُوح بلحاظ اپنی قوتوں اور طاقتوں کے اپنے نوع کے دائرہ کے اندر محدود ہے اور وہی کمالات حاصل کر سکتے ہیں کہ جو اس کے نوع کے لئے مقرر اور مقدّر ہیں۔ پس جس طرح اجسام کی حد بندی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اُن کا کوئی حد باندھنے والا اور خالق ہے۔ اسی طرح ارواح کی طاقتوں کی حد بندی اِس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اُن کا بھی کوئی خالق اور حد باندھنے والا ہے۔ اور اس جگہ تناسخ کا لغو اور بیہودہ جھگڑا پیش کرنا خدا تعالیٰ کے کاموں میں اختلاف ڈالنا ہے کیونکہ عقل صریح شہادت دیتی ہے کہ یہ دونوں حد بندیاں ایک ہی انتظام کے ماتحت ہیں اور ان دونوں حد بندیوں سے ایک ہی مقصود ہے اور وہ یہ کہ تا حد بندی سے حد باندھنے والے کا پتہ لگ جائے اور تا معلوم ہو جائے کہ جیسا کہ وہ اجسام کا خالق اور حد باندھنے والا ہے ایسا ہی وہ ارواح کا خالق اور حد باندھنے والا ہے۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۷۱ تا ۱۹۱)

خدا وہ ہے جس نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور کوئی چیز اس کی پیدائش سے باہر نہیں اور اُس نے پیدا کر کے ہر ایک کے جسم اور طاقتوں اور قوتوں اور خواص اور صورت اور شکل کو ایک حد کے اندر محدود کر دیا تا اس کا محدود ہونا محدد پر دلالت کرے جو ذاتِ باری عزّ اسمہٗ ہے مگر آپ وہ غیر محدود ہے اس لئے اس کی نسبت سوال نہیں ہو سکتا کہ اس کا محدد کون ہے۔ غرض آیت ممدوحہ بالا میں خدا تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ ہر ایک چیز جو ظہور پذیر ہوئی ہے مع اپنی تمام قوتوں اور طاقتوں کے خدا کی پیدا کردہ ہے پس یہی کامل توحید ہے جو خدا تعالیٰ کو تمام فیوض کا سرچشمہ قرار دیتی ہے اور کوئی ایسی چیز قرار نہیں دیتی جو اس کی پیدا کردہ نہیں یا اسی کے

سہارے سے جیتی نہیں۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۶۵)

بعض ایسی تقدیریں جو تقدیرِ مبرم کے مشابہ ہوں بدلائی بھی جاتی ہیں مگر جو تقدیر حقیقی اور واقعی طور پر مبرم ہے وہ مومن کامل کی دعاؤں سے ہرگز بدلائی نہیں جاتی اگرچہ وہ مومن کامل نبی یا رسول کا ہی درجہ رکھتا ہو۔

(آسمانی فیصلہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۳۲۴)

یہ سچ ہے کہ ہر ایک امر پر تقدیر محیط ہو رہی ہے مگر تقدیر نے علوم کو ضائع اور بے حرمت نہیں کیا اور نہ اسباب کو بے اعتبار کر کے دکھلایا بلکہ اگر غور کر کے دیکھو تو یہ جسمانی اور روحانی اسباب بھی تقدیر سے باہر نہیں ہیں۔ مثلاً اگر ایک بیمار کی تقدیر نیک ہو تو اسباب علاج پورے طور پر میسر آ جاتے ہیں اور جسم کی حالت بھی ایسے درجہ پر ہوتی ہے کہ وہ ان سے نفع اٹھانے کے لئے مستعد ہوتا ہے تب دوا نشانہ کی طرح جا کر اثر کرتی ہے۔ یہی قاعدہ دعا کا بھی ہے یعنی دعا کے لئے بھی تمام اسباب و شرائط قبولیت اسی جگہ جمع ہوتے ہیں جہاں ارادۂ الٰہی اس کے قبول کرنے کا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے نظامِ جسمانی اور روحانی کو ایک ہی سلسلہ مؤثرات اور متاثرات میں باندھ رکھا ہے۔ (برکات الدعا، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۱، ۱۲)

تقدیر دو قسم کی ہوتی ہے ایک کا نام معلق ہے اور دوسری کو مبرم کہتے ہیں۔ اگر کوئی تقدیر معلق ہو تو دعا اور صدقات اس کو ٹلا دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس تقدیر کو بدل دیتا ہے اور مبرم ہونے کی صورت میں وہ صدقات اور دعا اس تقدیر کے متعلق کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے ہاں وہ عبث اور فضول بھی نہیں رہتی کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔ وہ اس دعا اور صدقات کا اثر اور نتیجہ کسی دوسرے پیرائے میں اس کو پہنچا دیتا ہے۔ بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی تقدیر میں ایک وقت تک توقف اور تاخیر ڈال دیتا ہے۔ قضائے معلق اور مبرم کا ماخذ اور پتہ قرآن کریم سے ملتا ہے۔ یہ الفاظ گو نہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں فرمایا ہے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المؤمن: ۶۱) دعا مانگو میں قبول کروں گا۔ اب یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا قبول ہو سکتی ہے اور دعا سے عذاب ٹل جاتا ہے اور ہزارہا کیا کل کام دعا سے نکلتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کل چیزوں پر قادرانہ تصرف ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کے پوشیدہ تصرفات کی لوگوں کو خواہ خبر ہو یا نہ ہو مگر صدہا تجربہ کاروں کے وسیع تجربے اور ہزارہا دردمندوں کی دعا کے صریح نتیجے بتلا رہے ہیں کہ اس کا ایک پوشیدہ اور مخفی تصرف ہے وہ جو چاہتا ہے محو کرتا ہے اور جو چاہتا ہے اثبات کرتا ہے۔ ہمارے لئے یہ امر ضروری نہیں کہ ہم اس کی تہہ تک پہنچنے اور اس کی کنہ اور کیفیت معلوم

کرنے کی کوشش کریں جبکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ایک شے ہونے والی ہے۔اس لئے ہم کو اس جھگڑے اور مباحثہ میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔خدا تعالیٰ نے انسان کے قضا وقدر کو مشروط بھی رکھا ہے جو توبہ، خشوع خضوع سے ٹل سکتی ہیں۔جب کسی قسم کی تکلیف اور مصیبت انسان کو پہنچتی ہے تو وہ فطرتاً اور طبعاً اعمالِ حسنہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔اپنے اندر ایک قلق اور کرب محسوس کرتا ہے جو اسے بیدار کرتا اور نیکیوں کی طرف کھینچے لئے جاتا ہے اور گناہ سے ہٹاتا ہے۔جس طرح پر ہم ادویات کے اثر کو تجربے کے ذریعہ سے پالیتے ہیں اسی طرح پر ایک مضطرب الحال انسان جب خدا تعالیٰ کے آستانہ پر نہایت تذلّل اور نیستی کے ساتھ گرتا ہے اور رَبِّیْ رَبِّیْ کہہ کر اس کو پکارتا اور دعائیں مانگتا ہے تو وہ رؤیائے صالحہ یا الہامِ صحیحہ کے ذریعہ سے ایک بشارت اور تسلی پالیتا ہے۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب صبر اور صدق سے دعا انتہاء کو پہنچے گی تو وہ قبول ہو جاتی ہے۔دعا، صدقہ اور خیرات سے عذاب کا ٹلنا ایسی ثابت شدہ صداقت ہے جس پر ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی کا اتفاق ہے اور کروڑ ہا صلحاء اور اتقیاء اور اولیاء اللہ کے ذاتی تجربے اس امر پر گواہ ہیں۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۲؍اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۳)

تقدیر یعنی دنیا کے اندر تمام اشیاء کا ایک اندازہ اور قانون کے ساتھ چلنا اور ٹھہرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا کوئی مقدر یعنی اندازہ باندھنے والا ضرور ہے۔گھڑی کو اگر کسی نے بالارادہ نہیں بنایا تو وہ کیوں اس قدر ایک باقاعدہ نظام کے ساتھ اپنی حرکت کو قائم رکھ کر ہمارے واسطے فائدہ مند ہوتی ہے ایسا ہی آسمان کی گھڑی کہ اس کی ترتیب اور باقاعدہ اور باضابطہ انتظام یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ بالارادہ خاص مقصد اور مطلب اور فائدہ کے واسطے بنائی گئی ہے۔اس طرح انسان مصنوع سے صانع کو اور تقدیر سے مقدّر کو پہچان سکتا ہے۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴؍جولائی ۱۸۹۹ء صفحہ ۶)

اہلِ علم خوب جانتے ہیں کہ قضا ٹل جایا کرتی ہے اس لئے انسان پوری تضرع، خشوع خضوع اور حضور قلب سے اور سچی عاجزی، فروتنی اور دردِ دل سے اس سے دعا کرے... ہمیں بار بار خیال آتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو بھی کوئی ایک وحشت ناک ہی معاملہ معلوم ہوا ہوگا کہ انہوں نے ساری رات دعا میں صرف کی اور نہایت درجے کے دردانگیز اور بلبلانے والے الفاظ سے خدا کے حضور دعا کرتے رہے۔ممکن ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی تقدیر معلق کو مبرم ہی خیال کر بیٹھے ہوں اور اسی وجہ سے ان کا یہ سارا اضطراب اور گھبراہٹ بڑھ گئی ہو اور اس درجے کا گداز اور رقت ان میں اپنا آخری دم جان کر ہی پیدا ہوئی ہو کیونکہ اکثر ایک تقدیر جو

معلق ہوا کرتی ہے ایسی باریک رنگ میں ہوتی ہے کہ اس کو سرسری نظر سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مبرم ہے چنانچہ شیخ عبد القادر صاحب جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنی کتاب فتوح الغیب میں لکھتے ہیں کہ میری دعا سے اکثر وہ قضا جو قضا مبرم کے رنگ میں ہوتی ہے ٹل جاتی ہے اور ایسے بہت سے واقعات ہو چکے ہیں مگر ان کے اس امر کا جواب ایک اور بزرگ نے دیا ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تقدیرِ معلق ایسے طور سے واقع ہوتی ہے کہ اس کا پہچاننا کہ آیا معلق ہے یا مبرم محال ہوجاتا ہے۔ اسے سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ مبرم ہے مگر درحقیقت ہوتی وہ تقدیرِ معلق ہے اور وہ ایسی ہی تقدیریں ہوں گی جو شیخ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کی دعا سے ٹل گئی ہوں کیونکہ تقدیرِ معلق ٹل جایا کرتی ہے۔ غرض اہل اللہ نے اس امر کو خوب واضح طور سے لکھا ہے کہ قضا معلق ٹل جایا کرتی ہے...... وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (مریم : ۷۲) سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ضرور انبیاء اور صلحاء کو بھی دنیا میں ایک ایسا وقت آتا ہے کہ نہایت درجہ کی مصیبت کا وقت اور سخت جانکاہ مشکل ہوتی ہے اور اہلِ حق بھی ایک دفعہ اسی صعوبت میں وارد ہوتے ہیں مگر خدا جلد تر ان کی خبر گیری کرتا اور ان کو اس سے نکال لیتا ہے اور چونکہ وہ ایک تقدیر معلق ہوتی ہے اسی واسطے ان کی دعاؤں اور ابتہال سے ٹل جایا کرتی ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ تقدیر کے دو حصے کیوں ہیں تو جواب یہ ہے کہ تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ بعض وقت سخت خطرناک صورتیں پیش آتی ہیں اور انسان بالکل مایوس ہوجاتا ہے لیکن دعا وصدقات وخیرات سے آخر کار وہ صورت ٹل جاتی ہے۔ پس آخر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگر معلق تقدیر کوئی شے نہیں ہے اور جو کچھ ہے مبرم ہی ہے تو پھر دفع بلا کیوں ہوجاتا ہے؟ اور دعا وصدقہ وخیرات وغیرہ کوئی شے نہیں ہے بعض ارادے الٰہی صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ انسان کو ایک حد تک خوف دلایا جاوے اور پھر صدقہ وخیرات جب وہ کرے تو وہ خوف دور کر دیا جاوے۔ دعا کا اثر مثل نر و مادہ کے ہوتا ہے کہ جب وہ شرط پوری ہو اور وقت مناسب مل جاوے اور کوئی نقص نہ ہو تو ایک امر ٹل جاتا ہے اور جب تقدیر مبرم ہو تو پھر ایسے اسباب دعا کی قبولیت کے بہم نہیں پہنچتے۔ طبیعت تو دعا کو چاہتی ہے مگر توجہ کامل میسر نہیں آتی اور دل میں گداز پیدا نہیں ہوتا۔ نماز، سجدہ وغیرہ جو کچھ کرتا ہے اس میں بدمزگی پاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انجام بخیر نہیں اور تقدیر مبرم ہے... سید عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ بھی لکھتے ہیں کہ بعض وقت میری دعا سے تقدیر مبرم ٹل گئی ہے۔ اس پر شارح شیخ عبد الحق محدث دہلی نے اعتراض کیا ہے کہ تقدیر مبرم تو ٹل نہیں سکتی پھر اس کے کیا معنی ہوئے۔ آخر خود ہی

جواب دیا ہے کہ تقدیر مبرم کی دو اقسام ہیں؛ ایک مبرم حقیقی اور ایک مبرم غیر حقیقی۔ جو مبرم حقیقی ہے وہ تو کسی صورت سے ٹل نہیں سکتی ہے جیسے کہ انسان پر موت تو آنی ہے اب اگر کوئی چاہے کہ اس پر موت نہ آوے اور یہ قیامت تک زندہ رہے تو یہ نہیں ٹل سکتی دوسری غیر حقیقی وہ ہے جس میں مشکلات اور مصائب انتہائی درجہ تک پہنچ چکے ہوں اور قریب قریب نہ ٹلنے کے نظر آویں۔ اس کا نام مجازی طور پر مبرم رکھا گیا ہے ورنہ حقیقی مبرم تو ایسی ہے کہ اگر کل انبیاء بھی مل کر دعا کریں کہ وہ ٹل جاوے تو وہ ہرگز نہیں ٹل سکتی۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲۷ مورخہ ۱۶؍جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳، ۴)

تقدیر دو طرح کی ہوتی ہے ایک کو تقدیر معلق کہتے ہیں اور دوسری کو تقدیر مبرم کہتے ہیں ارادۂ الٰہی جب ہو چکتا ہے تو پھر اس کا تو کچھ علاج نہیں ہوتا اگر اس کا بھی کچھ علاج ہوتا تو سب دنیا بچ جاتی۔ مبرم کے علامات ہی ایسے ہوتے ہیں کہ دن بدن بیماری ترقی کرتی جاتی ہے اور حالت بگڑتی چلی جاتی ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴؍ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكُ اِۨفْتَرٰىهُ وَ اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۛۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا ۝

اگر آنحضرت اُمی نہ ہوتے تو مخالفینِ اسلام بالخصوص یہودی اور عیسائی جن کو علاوہ اعتقادی مخالفت کے یہ بھی حسد اور بغض دامنگیر تھا کہ بنی اسرائیل میں سے رسول نہیں آیا بلکہ ان کے بھائیوں میں سے جو بنی اسماعیل ہیں آیا۔ وہ کیوں کر ایک صریح امر خلافِ واقعہ پا کر خاموش رہتے بلا شبہ ان پر یہ بات بکمال درجہ ثابت ہو چکی تھی کہ جو کچھ آنحضرتؐ کے منہ سے نکلتا ہے وہ کسی امی اور ناخواندہ کا کام نہیں اور نہ دس بیس آدمیوں کا کام ہے تب ہی تو وہ اپنی جہالت سے اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ کہتے تھے اور جو ان میں سے دانا اور واقعی اہلِ علم تھے وہ بخوبی معلوم کر چکے تھے کہ قرآن انسانی طاقتوں سے باہر ہے اور ان پر یقین کا دروازہ ایسا کھل گیا تھا کہ ان کے حق میں خدا نے فرمایا يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (البقرۃ: ۱۴۷)۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۸۸ تا ۵۹۰)

اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ یعنی ایک بڑی جماعت نے متفق ہو کر قرآن شریف کو تالیف کیا ہے ایک آدمی کا کام نہیں۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۸۴)

وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۟

عرب کے کفار کا ایک یہ اعتراض خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں لکھا ہے کہ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ یعنی یہ تو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں پھرتا ہے۔ ان کے نزدیک روٹی کھانا یا عمدہ کھانا استعمال کرنا شانِ نبوت کے برخلاف تھا اور نیز یہ اعتراض تھا کہ نبی گوشہ گزین ہونا چاہیے نہ یہ کہ بازاروں میں بھی پھرے۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۹۷ حاشیہ)

انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایک تصرف تو اسی مخلوق کی نوعیت اور اعتبار سے ہوتا ہے جو يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ وغیرہ کے رنگ میں ہوتا ہے۔ صحت بیماری وغیرہ اس کے ہی اختیار میں ہوتا ہے اور ایک جدید تصرف قرب کے مراتب میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے طور پر ان کے قریب ہوتا ہے کہ ان سے مخاطبات اور مطالعات شروع ہو جاتے ہیں اور ان کی دعاؤں کا جواب ملتا ہے مگر بعض لوگ نہیں سمجھ سکتے اور یہاں تک ہی نہیں بلکہ نرے مطالعہ اور مخاطبہ سے بڑھ کر ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ الوہیت کی چادر ان پر پڑی ہوئی ہوتی ہے اور خدائے تعالیٰ اپنی ہستی کے طرح طرح کے نمونے ان کو دکھاتا ہے اور یہ ایک ٹھیک مثال اس قرب اور تعلق کی ہے کہ جیسے لوہے کو کسی آگ میں رکھ دیں تو وہ اثر پذیر ہو کر سرخ آگ کا ایک ٹکڑا ہی نظر آتا ہے اس وقت اس میں آگ کی سی روشنی بھی ہوتی ہے اور احراق جو ایک صفت آگ کی ہے وہ بھی اس میں آجاتی ہے مگر بایں ہمہ یہ ایک بین بات ہے کہ وہ لوہا آگ یا آگ کا ٹکڑا نہیں ہوتا۔ اسی طرح سے ہمارے تجربہ میں آیا ہے کہ اہل اللہ قربِ الٰہی میں ایسے مقام تک جا پہنچتے ہیں جبکہ ربانی رنگ بشریت کے رنگ و بو کو بتمام وکمال اپنے رنگ کے نیچے متواری کر لیتا ہے اور جس طرح آگ لوہے کو اپنے نیچے ایسا چھپا لیتی ہے کہ ظاہر میں بجز آگ کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا اور ظلی طور پر وہ صفاتِ الٰہیہ کا رنگ اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۰، ۱۴۱)

کفار نے جو یہ کہا تھا کہ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ تو انہوں نے بھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حالت دیکھ کر ہی یہ کلمہ منہ سے نکالا تھا کہ کیا ہے جی۔ یہ تو ہمارے جیسا آدمی ہی ہے۔ کھاتا پیتا بازاروں میں پھرتا ہے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

صحبت کا فیض نہ تھا کہ ان کو کوئی رسالت کا امر نظر آتا۔ وہ معذور تھے انہوں نے جو دیکھا تھا اسی کے مطابق رائے زنی کردی۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷؍مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۴)

انہوں نے کہا کہ یہ کیسا رسول ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے۔ ان کو آخر یہی جواب دیا گیا کہ یہ بھی ایک بشر ہے اور بشری حوائج اس کے ساتھ ہیں۔ اس سے پہلے جس قدر نبی اور رسول آئے وہ بھی بشر ہی تھے۔ یہ بات انہوں نے بنظر استخفاف کہی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی بازاروں میں عموماً سودا سلف خریدا کرتے تھے۔ ان کے دلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو نقشہ تھا وہ تو نری بشریت تھی جس میں کھانا پینا سونا چلنا پھرنا وغیرہ تمام امور اور لوازم بشریت کے موجود تھے اس واسطے ان لوگوں نے رد کر دیا۔ یہ مشکل اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ اپنے دل سے ہی ایک خیالی تصویر بنا لیتے ہیں کہ نبی ایسا ہونا چاہیے اور چونکہ اس تصویر کے موافق وہ اسے نہیں پاتے اس لحاظ سے ٹھوکر کھاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۷ مورخہ ۲۴؍اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

طعام سے مراد اچھا مکلف کھانا ہے۔ جب انکار حد سے گزر جاتا ہے تو ایسے ہی اعتراض سوجھتے ہیں۔
(بدر جلد ۷ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۲۴؍مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَ جَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَ كَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۱﴾

ہم نے تجھ سے پہلے جس قدر رسول بھیجے ہیں وہ سب کھانا کھایا کرتے تھے اور بازاروں میں پھرتے تھے اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اب وہ تمام نبی نہ کھانا کھاتے ہیں اور نہ بازاروں میں پھرتے ہیں اور پہلے ہم بہ نص قرآنی ثابت کر چکے ہیں کہ دنیوی حیات کے لوازم میں سے طعام کا کھانا ہے سو چونکہ وہ اب تمام نبی طعام نہیں کھاتے لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب فوت ہو چکے ہیں جن میں بوجہ کلمہ حصر مسیح بھی داخل ہے۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۳۱)

وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۸﴾

يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ۔ یعنی ظالم اپنا ہاتھ کاٹے گا۔ (مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۳۴۴)

وَ قَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝۳۱

یادرکھو قرآن شریف حقیقی برکات کا سرچشمہ اور نجات کا سچا ذریعہ ہے۔ یہ ان لوگوں کی اپنی غلطی ہے جو قرآن شریف پر عمل نہیں کرتے۔ عمل نہ کرنے والوں میں سے ایک گروہ تو وہ ہے جس کو اس پر اعتقاد ہی نہیں اور وہ اس کو خدا تعالیٰ کا کلام ہی نہیں سمجھتے یہ لوگ تو بہت دور پڑے ہوئے ہیں لیکن وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں کہ وہ خدا کا کلام ہے اور نجات کا شفا بخش نسخہ ہے اگر وہ اس پر عمل نہ کریں تو کس قدر تعجب اور افسوس کی بات ہے۔ ان میں سے بہت سے تو ایسے ہیں جنہوں نے ساری عمر میں کبھی اسے پڑھا ہی نہیں۔ پس ایسے آدمی جو خدا تعالیٰ کی کلام سے ایسے غافل اور لاپرواہ ہیں ان کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کو معلوم ہے کہ فلاں چشمہ نہایت ہی مصفّا اور شیریں اور خنک ہے اور اس کا پانی بہت سی امراض کے واسطے اکسیر اور شفا ہے۔ یہ علم اس کو یقینی ہے لیکن باوجود اس علم کے اور باوجود پیاسا ہونے اور بہت سی امراض میں مبتلا ہونے کے اس کے پاس نہیں جاتا تو یہ اس کی کیسی بدقسمتی اور جہالت ہے اسے تو چاہیے تھا کہ وہ اس چشمہ پر منہ رکھ دیتا اور سیراب ہو کر اس کے لطف و شفا بخش پانی سے حظ اُٹھاتا مگر وہ بوجود علم کے اس سے ویسا ہی دور ہے جیسا کہ ایک بے خبر اور اس وقت تک اس سے دور رہتا ہے جو موت آ کر خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس شخص کی حالت بہت ہی عبرت بخش اور نصیحت خیز ہے۔ مسلمانوں کی حالت اس وقت ایسی ہی ہو رہی ہے وہ جانتے ہیں کہ ساری ترقیوں اور کامیابیوں کی کلید یہی قرآن شریف ہے جس پر ہم کو عمل کرنا چاہیے مگر نہیں اس کی پرواہ بھی نہیں کی جاتی۔ ایک شخص جو نہایت ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ اور پھر نری ہمدردی ہی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے حکم اور ایما سے اس طرف بلاوے تو اسے کذاب اور دجال کہا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا قابلِ رحم حالت اس قوم کی ہوگی۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝۳۳

کافر کہتے ہیں کہ کیوں قرآن ایک مرتبہ ہی نازل نہ ہوا۔ ایسا ہی چاہیے تھا تا وقتاً فوقتاً ہم تیرے دل کو تسلی دیتے رہیں اور تا وہ معارف اور علوم جو وقت سے وابستہ ہیں اپنے وقت پر ہی ظاہر ہوں کیونکہ قبل از وقت کسی

بات کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے سو اس مصلحت سے خدا نے قرآن شریف کو تئیس برس تک نازل کیا تا اس مدت تک موعود نشان بھی ظاہر ہو جائیں۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۳۵۷)

انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے مکتب میں تعلیم پانے والے ہوتے ہیں اور تلامیذ الرحمٰن کہلاتے ہیں ان کی ترقی بھی تدریجی ہوتی ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن شریف میں آیا ہے كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۔ پس میں اس بات کو خوب جانتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام کی حالت کیسی ہوتی ہے جس دن نبی مامور ہوتا ہے اس دن اور اس کی نبوت کے آخری دن میں ہزاروں کوس کا فرق ہو جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷/اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

وَ اِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۲﴾

اور تیرے ساتھ ہنسی سے ہی پیش آئیں گے۔ اور ٹھٹھا مار کر کہیں گے کیا یہی ہے جس کو خدا نے اصلاحِ خلق کے لئے مقرر کیا یعنی جن کا مادہ ہی خبث ہے ان سے صلاحیت کی امید مت رکھ۔
(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۱۱، ۶۱۲ حاشیہ نمبر ۳)

ان لوگوں نے تجھے ایک ہنسی کی جگہ سمجھ رکھا ہے۔ وہ طنزاً کہتے ہیں کہ کیا یہی وہ شخص ہے جس کو خدا نے ہم میں دعوت کے لئے کھڑا کیا۔ (براہینِ احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۸۷)

تجھے لوگ ہنسی کی جگہ بنالیں گے اور کہیں گے کہ کیا یہی شخص خدا نے مبعوث فرمایا ہے۔
(براہینِ احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۱۱۲)

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۵﴾

کیا تو یہ خیال کرتا ہے کہ اکثر لوگ ان میں سے سنتے اور سمجھتے ہیں۔ نہیں یہ تو چارپایوں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بھی بدتر۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۵۱)

انسان جو اخلاقِ فاضلہ کو حاصل کر کے نفع رساں ہستی نہیں بنتا۔ ایسا ہو جاتا ہے کہ وہ کسی بھی کام نہیں آسکتا۔ مردار حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی تو کھال اور ہڈیاں بھی کام آجاتی ہیں اس کی تو کھال

بھی کام نہیں آتی اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں انسان بَلْ هُمْ اَضَلُّ کا مصداق ہو جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۲۵ مورخہ ۹؍جولائی ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

تیسرے درجہ کے وہ لوگ ہیں جو عمدہ اخلاق اور عمدہ اعمال میں سبقت لے جاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ جو صدر اسلام کا وقت تھا اس زمانہ پر ایک وسیع نظر ڈال کر ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم نے کیوں کر ایمان لانے والوں کو مذکورہ بالا ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ تک پہنچا دیا کیونکہ ایمان لانے والے اپنی ابتدائی حالت میں اکثر ایسے تھے کہ جس حالت کو وہ ساتھ لے کر آئے تھے وہ حالت جنگلی وحشیوں سے بدتر تھی اور درندوں کی طرح ان کی زندگی تھی اور اس قدر بداعمال اور بداخلاق میں وہ مبتلا تھے کہ انسانیت سے باہر ہو چکے تھے اور ایسے بے شعور ہو چکے تھے کہ نہیں سمجھتے تھے کہ ہم بداعمال ہیں یعنی نیکی اور بدی کی شناخت کی حس بھی جاتی رہی تھی۔ پس قرآنی تعلیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے جو پہلا اثر ان پر کیا تو یہ تھا کہ ان کو محسوس ہو گیا کہ ہم پاکیزگی کے جامہ سے بالکل برہنہ اور بداعمالی کے گند میں گرفتار ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ ان کی پہلی حالت کی نسبت فرماتا ہے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ یعنی ”یہ لوگ چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر“۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک صحبت اور فرقان کی دلکش تاثیر سے ان کو محسوس ہو گیا کہ جس حالت میں ہم نے زندگی بسر کی ہے وہ ایک وحشیانہ زندگی ہے اور سراسر بداعمالیوں سے ملوث ہے تو انہوں نے روح القدس سے قوت پا کر نیک اعمال کی طرف حرکت کی۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۴۲۴)

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۙ﴿۴۶﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۷﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّ النَّوْمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۸﴾

کیا تو خدا کی طرف دیکھتا نہیں کہ وہ کیوں کر سایہ کو لمبا کھینچتا ہے یہاں تک کہ تمام زمین پر تاریکی ہی دکھائی دیتی ہے اور اگر وہ چاہتا تو ہمیشہ تاریکی رکھتا اور کبھی روشنی نہ ہوتی لیکن ہم آفتاب کو اس لئے نکالتے ہیں کہ تا اس بات پر دلیل قائم ہو کہ اس سے پہلے تاریکی تھی یعنی تا بذریعہ روشنی کے تاریکی کا وجود شناخت

کیا جائے کیونکہ ضد کے ذریعہ سے ضد کا پہچاننا بہت آسان ہو جاتا ہے اور روشنی کا قدر و منزلت اسی پر کھلتا ہے کہ جو تاریکی کے وجود پر علم رکھتا ہو اور پھر فرمایا کہ ہم تاریکی کو روشنی کے ذریعہ سے تھوڑا تھوڑا دور کرتے جاتے ہیں تا اندھیرے میں بیٹھنے والے اس روشنی سے آہستہ آہستہ متنفع ہو جائیں اور جو یک دفعی انتقال میں حیرت و وحشت متصور ہے وہ بھی نہ ہو سو اسی طرح جب دنیا پر روحانی تاریکی طاری ہوتی ہے تو خلقت کو روشنی سے متنفع کرنے کے لئے اور نیز روشنی اور تاریکی میں جو فرق ہے وہ فرق ظاہر کرنے کے لئے خدائے تعالیٰ کی طرف سے آفتابِ صداقت نکلتا ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ دنیا پر طلوع کرتا جاتا ہے۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۵۶، ۶۵۷)

وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ۙ۝۴۹ لِّنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّ نُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ۝۵۰

خدا وہ ذاتِ کریم و رحیم ہے کہ جو بارش سے پہلے ہواؤں کو چھوڑتا ہے پھر ہم ایک پاک پانی آسمان سے اتارتے ہیں تا اس سے مری ہوئی بستی کو زندہ کریں اور پھر بہت سے آدمیوں اور ان کے چارپایوں کو پانی پلاویں۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۵۲)

ہم نے آسمان سے پاک پانی اتارا یعنی قرآن تا ہم اس کے ساتھ مردہ زمین کو زندہ کریں۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۳۲۲)

وَ لَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ٘ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝۵۱

اور ہم پھیر پھیر کر مثالیں بتلاتے ہیں تا لوگ یاد کرلیں کہ نبیوں کے بھیجنے کا یہی اصول ہے۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۵۲)

وَ لَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۝۵۲ۖ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۳

اور اگر ہم چاہتے تو ہر یک بستی کے لئے جدا جدا رسول بھیجتے مگر یہ اس لئے کیا گیا کہ تا تجھ سے بھاری کوششیں

ظہور میں آویں یعنی جب ایک مرد ہزاروں کا کام کرے گا تو بلا شبہ وہ بڑا اجر پائے گا اور یہ امر اس کی افضلیت کا موجب ہوگا سو چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیاء اور سب رسولوں سے بہتر اور بزرگ تر تھے اور خدائے تعالیٰ کو منظور تھا کہ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ذاتی جوہر کی رو سے فی الواقع سب انبیاء کے سردار ہیں ایسا ہی ظاہری خدمات کی رو سے بھی ان کا سب سے فائق اور برتر ہونا دنیا پر ظاہر اور روشن ہوجائے اس لئے خدائے تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو کافہ بنی آدم کے لئے عام رکھا تا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محنتیں اور کوششیں عام طور پر ظہور میں آویں۔ موسیٰ اور ابنِ مریم کی طرح ایک خاص قوم سے مخصوص نہ ہوں اور تا ہر یک طرف سے اور ہر یک گروہ اور قوم سے تکالیفِ شاقہ اٹھا کر اس اجرِ عظیم کے مستحق ٹھہر جائیں کہ جو دوسرے نبیوں کو نہیں ملے گا۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۵۲ تا ۶۵۴)

وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا ؕ وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ۝۵۵

خدا وہ ذات قادرِ مطلق ہے جس نے بشر کو اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا کیا پھر اس کے لئے نسل اور رشتہ مقرر کر دیا۔ اسی طرح وہ انسان کی روحانی پیدائش پر بھی قادر تھا یعنی اس کا قانونِ قدرت روحانی پیدائش میں بعینہٖ جسمانی پیدائش کی طرح ہے کہ اول وہ ضلالت کے وقت میں کہ جو عدم کا حکم رکھتا ہے کسی انسان کو روحانی طور پر اپنے ہاتھ سے پیدا کرتا ہے اور پھر اس کے متبعین کو کہ جو اس کی ذریت کا حکم رکھتے ہیں برکت متابعت اس کی کے روحانی زندگی عطا فرماتا ہے سو تمام مرسل روحانی آدم ہیں اور ان کی امت کے نیک لوگ ان کی روحانی نسلیں ہیں اور روحانی اور جسمانی سلسلہ بالکل آپس میں تطابق رکھتا ہے اور خدا کے ظاہری اور باطنی قوانین میں کسی نوع کا اختلاف نہیں۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۵۴ تا ۶۵۶)

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝۵۸

دوسری صفت رحمان کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس صفت کے بھی کامل مظہر ٹھہرے کیونکہ آپ کے فیوض و برکات کا کوئی بدل اور اجر نہیں مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۔ پھر آپؐ رحیمیت کے مظہر ہیں۔ آپؐ نے اور آپؐ کے صحابہؓ نے جو محنتیں اسلام کے لئے کیں اور ان خدمات میں جو تکالیف اُٹھائیں وہ ضائع نہیں

ہوئیں بلکہ ان کا اجر دیا گیا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن شریف میں رحیم کا لفظ بولا ہی گیا ہے۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰/اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰)

الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿۶۰﴾

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کی تفسیر کے لئے دیکھیں تفسیر سورۃ اعراف آیت نمبر ۵۵

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿۶۱﴾ تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿۶۲﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۴﴾

جب کافروں اور بے دینوں اور دہریوں کو کہا جاتا ہے کہ تم رحمان کو سجدہ کرو تو وہ رحمان کے نام سے متنفر ہو کر بطور انکار سوال کرتے ہیں کہ رحمان کیا چیز ہے (پھر بطور جواب فرمایا) رحمان وہ ذات کثیر البرکت اور مصدر خیرات دائمی ہے جس نے آسمان میں برج بنائے برجوں میں آفتاب اور چاند کو رکھا جو کہ عامہ مخلوقات کو بغیر تفریق کافر ومومن کے روشنی پہنچاتے ہیں اسی رحمان نے تمہارے لئے یعنی تمام بنی آدم کے لئے دن اور رات بنائے جو کہ ایک دوسرے کے بعد دورہ کرتے رہتے ہیں تا جو شخص طالبِ معرفت ہو وہ ان دقائقِ حکمت سے فائدہ اُٹھاوے اور جہل اور غفلت کے پردہ سے خلاصی پاوے اور جو شخص شکرِ نعمت کرنے پر مستعد ہو وہ شکر کرے۔ رحمان کے حقیقی پرستار وہ لوگ ہیں کہ جو زمین پر بردباری سے چلتے ہی اور جب جاہل لوگ ان سے سخت کلامی سے پیش آئیں تو سلامتی اور رحمت کے لفظوں سے ان کا معاوضہ کرتے ہیں یعنی بجائے سختی کے نرمی اور بجائے گالی کے دعا دیتے ہیں اور تشبہ با خلاق رحمانی کرتے ہیں کیونکہ رحمان بھی بغیر تفریق نیک و بد کے اپنے سب بندوں کو سورج اور چاند اور زمین اور دوسری بے شمار نعمتوں سے فائدہ پہنچاتا ہے۔

پس ان آیات میں خدائے تعالیٰ نے اچھی طرح کھول دیا کہ رحمان کا لفظ ان معنوں کر کے خدا پر بولا جاتا ہے کہ اس کی رحمت وسیع عام طور پر ہر یک برے بھلے پر محیط ہو رہی ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۴۴۸، ۴۴۹ حاشیہ)

خدا وہ ہے کہ جو رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات لاتا ہے تا جس نے یاد کرنا ہو وہ یاد کرے یا شکر کرنا ہو تو شکر کرے یعنی دن کے بعد رات کا آنا اور رات کے بعد دن کا آنا اس بات پر ایک نشان ہے کہ جیسے ہدایت کے بعد ضلالت اور غفلت کا زمانہ آجاتا ہے۔ ایسا ہی خدا کی طرف سے یہ بھی مقرر ہے کہ ضلالت اور غفلت کے بعد ہدایت کا زمانہ آتا ہے۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۶۵۴)

هَوْن ..... دوسرے کو ظلم کی راہ سے بدنی آزار نہ پہنچانا اور بے شر انسان ہونا اور صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرنا۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۸)

خدا کے نیک بندے صلح کاری کے ساتھ زمین پر چلتے ہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۹)

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا ﴿۶۵﴾

سچے مسلمان ہمیشہ غلبہء اسلام کے لئے دعائیں مانگتے ہیں اور تہجد بھی پڑھتے ہیں اور نماز میں بھی ان کو رقت طاری ہوتی ہے اور آیت يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا کا مصداق ہوتے ہیں۔

(انوار الاسلام، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۸۴)

عرب اور دنیا کی حالت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بالکل وحشی لوگ تھے کھانے پینے کے سوا کچھ جانتے نہ تھے۔ نہ حقوق العباد سے آشنا اور نہ حقوق اللہ سے آگاہ۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے ایک طرف ان کا نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (محمد: ۱۲) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم نے ایسا اثر کیا يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا کی حالت ہوگئی یعنی اپنے رب کی یاد میں راتیں سجدے اور قیام میں گزار دیتے تھے اللہ اللہ کس قدر فضیلت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب سے ایک بینظیر انقلاب اور عظیم الشان تبدیلی واقع ہوگئی۔ حقوق العباد اور حقوق اللہ دونوں کو میزانِ اعتدال پر قائم کر دیا اور مردار خوار اور مردہ قوم کو ایک اعلیٰ درجہ کی زندہ اور پاکیزہ قوم بنا دیا دو ہی خوبیاں ہوتی ہیں علمی یا

عملی۔عملی حالت کا تو یہ حال ہے کہ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا اور علمی کا یہ حال کہ اس قدر کثرت سے تصنیفات کا سلسلہ اور توسیعِ زبان کی خدمت کا سلسلہ جاری ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

(الحکم جلد ۲ نمبر ۲۴، ۲۵ مورخہ ۲۰ تا ۲۷ر اگست ۱۸۹۸ء صفحہ ۱۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو جماعت ملی وہ ایسی پاکباز اور خدا پرست اور مخلص تھی کہ اس کی نظیر کسی دنیا کی قوم اور کسی نبی کی جماعت میں ہرگز پائی نہیں جاتی۔احادیث میں ان کی بڑی بڑی تعریفیں آئی ہیں یہاں تک فرمایا کہ اَللّٰهُ اَللّٰهُ فِيْ اَصْحَابِيْ اور قرآن شریف میں بھی ان کی تعریف ہوئی یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۷ مورخہ ۳۱ر جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

روحانیت اور پاکیزگی کے بغیر کوئی مذہب چل نہیں سکتا۔قرآن شریف نے بتلایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پیشتر دنیا کی کیا حالت تھی يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (محمد ۱۲) پھر جب انہی لوگوں نے اسلام قبول کیا تو فرماتا ہے یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا۔جب تک آسمان سے تریاق نہ ملے تو دل درست نہیں رہتا۔انسان آگے قدم رکھتا ہے مگر وہ پیچھے پڑتا ہے۔قدسی صفات اور فطرت والا انسان ہو تو وہ مذہب چل سکتا ہے اس کے بغیر کوئی مذہب ترقی نہیں کر سکتا اور اگر کرتا بھی ہے تو پھر قائم نہیں رہ سکتا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۷ مورخہ ۲ر اکتوبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۹۰)

خدا تعالیٰ تو اپنے بندوں کی صفت میں فرماتا ہے یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا کہ وہ اپنے رب کے لئے تمام تمام رات سجدہ اور قیام میں گزارتے ہیں۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲۶ مورخہ ۸ر جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

میں بڑے زور سے کہتا ہوں کہ خواہ کیسا ہی پکا دشمن ہو اور خواہ وہ عیسائی ہو یا آریہ جب وہ ان حالات کو دیکھے گا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب کے تھے اور پھر اس تبدیلی پر نظر کرے گا جو آپ کی تعلیم اور تاثیر سے پیدا ہوئی تو اسے بے اختیار آپ کی حقانیت کی شہادت دینی پڑے گی۔موٹی سی بات ہے کہ قرآن مجید نے ان کی پہلی حالت کا تو یہ نقشہ کھینچا ہے يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (محمد:۱۲) یہ تو ان کی کفر کی حالت تھی پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تاثیرات نے ان میں تبدیلی پیدا کی تو ان کی حالت یہ ہوگئی یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا یعنی وہ اپنے رب کے حضور سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے راتیں کاٹ دیتے ہیں۔جو تبدیلی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے وحشیوں میں کی اور جس گڑھے سے نکال کر جس بلندی اور مقام تک انہیں پہنچایا اس ساری حالت کے نقشہ کو دیکھنے سے بے اختیار

ہو کر انسان رو پڑتا ہے کہ کیا عظیم الشان انقلاب ہے جو آپ نے کیا دنیا کی کسی تاریخ اور کسی قوم میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یہ نری کہانی نہیں یہ واقعات ہیں جن کی سچائی کا ایک زمانہ کو اعتراف کرنا پڑا ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۴؍ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

دوسرا معجزہ تبدیل اخلاق ہے کہ یا تو وہ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (الاعراف :۱۸۰) چار پایوں سے بھی بدتر تھے یا يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا رات نمازوں میں گزارنے والے ہو گئے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۱۹ مورخہ ۹؍ مئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

قبل اسلام میں آنے کے ان لوگوں کی حالت وہ تھی کہ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (محمد : ۱۲) چار پایوں کی طرح کھانے پینے کے سوائے ان کا کوئی شغل ہی نہ تھا۔ یہ تو حالتِ کفر تھی۔ اس کے بعد ان کی حالتِ اسلامی کی یہ تعریف ہے کہ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا اپنے رب کی عبادت میں سجدہ اور قیام کرتے ہوئے رات گزار دیتے ہیں۔ وہ کھانا پینا سب بھول گئے اور پہلا نقشہ بھی بالکل بدل گیا۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۳ مورخہ ۱۷؍ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱)

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۸﴾

اپنے خرچوں میں نہ تو اسراف کرتے ہیں نہ تنگ دلی کی عادت رکھتے ہیں اور میانہ روش چلتے ہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۵۷)

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۳﴾

لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ...... جھوٹوں کی مجلس میں نہیں بیٹھتے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۶۱)

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ..... اور اگر کوئی لغو بات کسی سے سنیں جو جنگ کا مقدمہ اور لڑائی کی ایک تمہید ہو تو بزرگانہ طور پر طرح دے کر چلے جاتے ہیں اور ادنیٰ ادنیٰ بات پر لڑنا شروع نہیں کر دیتے۔ یعنی جب تک کوئی زیادہ تکلیف نہ پہنچے اس وقت تک ہنگامہ پردازی کو اچھا نہیں سمجھتے اور صلحکاری کے محل شناسی کا یہی اصول ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں کو خیال میں نہ لاویں اور معاف فرماویں اور لغو کا لفظ جو اس آیت میں آیا ہے سو واضح ہو کہ عربی زبان میں لغو اس حرکت کو کہتے ہیں کہ مثلاً ایک شخص شرارت سے ایسی بکواس کرے یا

بہ نیت ایذا ایسا فعل اس سے صادر ہو کہ دراصل اس سے کچھ ایسا حرج اور نقصان نہیں پہنچتا۔ سو صلح کاری کی یہ علامت ہے کہ ایسی بیہودہ ایذا سے چشم پوشی فرماویں اور بزرگانہ سیرت عمل میں لاویں لیکن اگر .... ایذا صرف لغو کی مد میں داخل نہ ہو بلکہ اس سے واقعی طور پر جان یا مال یا عزت کو ضرر پہنچے تو صلح کاری کے خلق کو اس سے کچھ تعلق نہیں بلکہ اگر ایسے گناہ کو بخشا جائے تو اس خلق کا نام عفو ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۹)

کبھی انسان کا غصہ کتاب اللہ کے برخلاف ہوتا ہے۔ گالی سن کر اس کا نفس جوش مارتا ہے تقویٰ تو اس کو سکھلاتا ہے کہ وہ غصہ ہونے سے باز رہے جیسے قرآن کہتا ہے وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۱)

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب انسان کسی کا مقابلہ کرتا ہے تو اسے کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے جیسے مقدمات میں ہوتا ہے۔ اس لئے آرام اسی میں ہے کہ تم ایسے لوگوں کا مقابلہ ہی نہ کرو۔ سدِ باب کا طریق رکھو اور کسی سے جھگڑا مت کرو۔ زبان بند رکھو۔ گالیاں دینے والے کے پاس چپکے گزر جاؤ گویا سنا ہی نہیں اور ان لوگوں کی راہ اختیار کرو جن کے لئے قرآن شریف نے فرمایا ہے وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۔ اگر یہ باتیں اختیار کر لو گے تو یقیناً یقیناً اللہ تعالیٰ کے سچے مخلص بن جاؤ گے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ رجنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۰)

وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۝۷۵

نکاح سے ایک اور غرض بھی ہے جس کی طرف قرآن کریم میں یعنی سورۃ الفرقان میں اشارہ ہے اور وہ یہ ہے وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا یعنی مومن وہ ہیں جو یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے خدا ہمیں اپنی بیویوں کے بارے میں اور فرزندوں کے بارے میں دل کی ٹھنڈک عطا کر اور ایسا کر کہ ہماری بیویاں اور ہمارے فرزند نیک بخت ہوں اور ہم ان کے پیش رو ہوں۔ (آریہ دھرم، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۳)

یہ صحیح نہیں ہے کہ ہر ایک شخص جس کو کوئی خواب سچی آوے یا الہام کا دروازہ اس پر کھلا ہو وہ اس نام سے

موسوم ہوسکتا ہے بلکہ امام کی حقیقت کوئی اور امرِ جامع اور حالتِ کاملہ تامہ ہے جس کی وجہ سے آسمان پر اس کا نام امام ہے؟ اور یہ تو ظاہر ہے کہ صرف تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے کوئی شخص امام نہیں کہلا سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِیۡنَ اِمَامًا پس اگر ہر ایک متقی امام ہے تو پھر تمام مومن متقی امام ہی ہوئے اور یہ امر منشاء آیت کے برخلاف ہے۔　　(ضرورت الامام، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۴۷۲، ۴۷۳)

انسان کو سوچنا چاہیے کہ اسے اولاد کی خواہش کیوں ہوتی ہے؟ کیونکہ اس کو محض طبعی خواہش ہی تک محدود نہ کر دینا چاہیے کہ جیسے پیاس لگتی ہے یا بھوک لگتی ہے لیکن جب یہ ایک خاص انداز ہ سے گزر جاوے تو ضرور اس کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے جیسا کہ فرمایا ہے مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ (الذاریات:۵۷)۔ اب اگر انسان خود مومن اور عبد نہیں بنتا ہے اور اپنی زندگی کے اصل منشا کو پورا نہیں کرتا ہے اور پورا حقِ عبادت ادا نہیں کرتا بلکہ فسق و فجور میں زندگی بسر کرتا ہے اور گناہ پر گناہ کرتا ہے تو ایسے آدمی کی اولاد کے لئے خواہش کیا نتیجہ رکھے گی صرف یہی کہ گناہ کرنے کے لئے وہ اپنا ایک اور خلیفہ چھوڑنا چاہتا ہے خود کون سی کمی کی ہے جو اولاد کی خواہش کرتا ہے۔ پس جب تک اولاد کی خواہش محض اس غرض کے لئے نہ ہو کہ وہ دیندار اور متقی ہو اور خدا تعالیٰ کی فرمانبردار ہو کر اس کے دین کی خادم بنے بالکل فضول بلکہ ایک قسم کی معصیت اور گناہ ہے اور باقیات صالحات کی بجائے اس کا نام باقیات سیئات رکھنا جائز ہوگا۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں صالح اور خدا ترس اور خادمِ دین اولاد کی خواہش کرتا ہوں تو اس کا یہ کہنا بھی نرا ایک دعویٰ ہی دعویٰ ہوگا جب تک کہ خود وہ اپنی حالت میں ایک اصلاح نہ کرے اگر خود فسق و فجور کی زندگی بسر کرتا ہے اور منہ سے کہتا ہے کہ میں صالح اور متقی اولاد کی خواہش کرتا ہوں تو وہ اپنے اس دعویٰ میں کذّاب ہے۔ صالح اور متقی اولاد کی خواہش سے پہلے ضروری ہے کہ وہ خود اپنی اصلاح کرے اور اپنی زندگی کو متقیانہ زندگی بنادے تب اس کی ایسی خواہش ایک نتیجہ خیز خواہش ہوگی اور ایسی اولاد حقیقت میں اس قابل ہوگی کہ اس کو باقیات صالحات کا مصداق کہیں لیکن اگر یہ خواہش صرف اس لئے ہو کہ ہمارا نام باقی رہے اور وہ ہمارے املاک و اسباب کی وارث ہو یا وہ بڑا نامور اور مشہور آدمی ہو اس قسم کی خواہش میرے نزدیک شرک ہے۔

یاد رکھو کسی نیکی کو بھی اس لئے نہیں کرنا چاہیے کہ اس نیکی کے کرنے پر ثواب یا اجر ملے گا کیونکہ اگر محض اس خیال پر نیکی کی جاوے تو وہ ابتغاء لمرضات اللہ نہیں ہوسکتی بلکہ اس ثواب کی خاطر ہوگی اور اس سے اندیشہ

ہوسکتا ہے کہ کسی وقت وہ اسے چھوڑ بیٹھے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ہر روز ہم سے ملنے کو آوے اور ہم اس کو ایک روپیہ دے دیا کریں تو وہ بجائے خود یہی سمجھے گا کہ میرا جانا صرف روپے کے لئے ہے جس دن سے روپیہ نہ ملے اسی دن سے آنا چھوڑ دے گا۔ غرض یہ ایک قسم کا باریک شرک ہے اس سے بچنا چاہیے نیکی کو محض اس لئے کرنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ خوش ہو اور اس کی رضا حاصل ہو اور اس کے حکم کی تعمیل ہو۔ قطع نظر اس کے کہ اس پر ثواب ہو یا نہ ہو۔ ایمان تب ہی کامل ہوتا ہے جبکہ یہ وسوسہ اور وہم درمیان سے اُٹھ جاوے اگرچہ یہ سچ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (التوبۃ : ۱۲۰) مگر نیکی کرنے والے کو اجر مدنظر نہیں رکھنا چاہیئے۔ دیکھو اگر کوئی مہمان یہاں محض اس لئے آتا ہے کہ وہاں آرام ملے گا۔ ٹھنڈے شربت ملیں گے یا تکلف کے کھانے ملیں گے تو وہ گویا ان اشیاء کے لئے آتا ہے حالانکہ خود میزبان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ حتی المقدور ان کی مہمان نوازی میں کوئی کمی نہ کرے اور اس کو آرام پہنچاوے اور وہ پہنچاتا ہے لیکن مہمان کا خود ایسا خیال کرنا اس کے لئے نقصان کا موجب ہے۔

تو غرض مطلب یہ ہے کہ اولاد کی خواہش صرف نیکی کے اصول پر ہونی چاہیے۔ اس لحاظ سے اور خیال سے نہ ہو کہ وہ ایک گناہ کا خلیفہ باقی رہے۔ خدا تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ مجھے کبھی اولاد کی خواہش نہیں ہوئی تھی حالانکہ خدا تعالیٰ نے پندرہ سولہ برس کی عمر کے درمیان ہی اولاد دے دی تھی۔ یہ سلطان احمد اور فضل احمد اسی عمر میں پیدا ہو گئے تھے اور نہ کبھی مجھے یہ خواہش ہوئی کہ وہ بڑے بڑے دنیا دار بنیں اور اعلیٰ عہدوں پر پہنچ کر مامور ہوں۔ غرض جو اولاد معصیت اور فسق کی زندگی بسر کرنے والی ہو اس کی نسبت تو سعدیؒ کا یہ فتویٰ ہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ

پیش از پدر مردہ بہ ناخلف

پھر ایک اور بات ہے کہ اولاد کی خواہش تو لوگ بڑی کرتے ہیں اور اولاد ہوتی بھی ہے مگر یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ وہ اولاد کی تربیت اور ان کو عمدہ اور نیک چلن بنانے اور خدا تعالیٰ کے فرماں بردار بنانے کی سعی اور فکر کریں۔ نہ کبھی ان کے لئے دعا کرتے ہیں اور نہ مراتب تربیت کو مدِّنظر رکھتے ہیں۔ میری اپنی تو یہ حالت ہے کہ میری کوئی نماز ایسی نہیں ہے جس میں مَیں اپنے دوستوں اور اولاد اور بیوی کے لئے دعا نہیں کرتا۔ بہت سے والدین ایسے ہیں جو اپنی اولاد کو بری عادتیں سکھا دیتے ہیں۔ ابتدا میں جب وہ بدی کرنا سیکھنے لگتے ہیں تو ان کو تنبیہ نہیں کرتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دن بدن دلیر اور بے باک ہوتے جاتے ہیں...

لوگ اولاد کی خواہش تو کرتے ہیں مگر نہ اس لئے کہ وہ خادمِ دین ہو بلکہ اس لئے کہ دنیا میں ان کا کوئی وارث ہو اور جب اولاد ہوتی ہے تو اس کی تربیت کا فکر نہیں کیا جاتا۔ نہ اس کے عقائد کی اصلاح کی جاتی ہے اور نہ اخلاقی حالت کو درست کیا جاتا ہے۔ یہ یاد رکھو کہ اس کا ایمان درست نہیں ہو سکتا جو اقرب تعلقات کو نہیں سمجھتا۔ جب وہ اس سے قاصر ہے تو اور نیکیوں کی امید اس سے کیا ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کی خواہش کو اس طرح پر قرآن میں بیان فرمایا ہے رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا یعنی خدا تعالیٰ ہم کو ہماری بیویوں اور بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرماوے اور یہ تب ہی میسر آ سکتی ہے کہ وہ فسق و فجور کی زندگی بسر نہ کرتے ہوں بلکہ عباد الرحمٰن کی زندگی بسر کرنے والے ہوں اور خدا کو ہر ایک شے پر مقدم کرنے والے ہوں اور آگے کھول کر کہہ دیا وَ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا اولاد اگر نیک اور متقی ہو تو یہ ان کا امام ہی ہوگا۔ اس سے گویا متقی ہونے کی بھی دعا ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۵ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۰ تا ۱۲)

میں دیکھتا ہوں کہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ محض دنیا کے لئے کرتے ہیں محبت دنیا ان سے کراتی ہے خدا کے واسطے نہیں کرتے۔ اگر اولاد کی خواہش کرے تو اس نیت سے کرے وَ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا پر نظر کر کے کرے کہ کوئی ایسا بچہ پیدا ہو جائے جو اعلاء کلمہ اسلام کا ذریعہ ہو جب ایسی پاک خواہش ہو تو اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ ذکریا کی طرح اولاد دے دے مگر میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کی نظر اس سے آگے نہیں جاتی کہ ہمارا باغ ہے یا اور ملک ہے وہ اس کا وارث ہو اور کوئی شریک اس کو نہ لے جائے مگر وہ اتنا نہیں سوچتے کہ کمبخت جب تو مر گیا تو تیرے لئے دوست دشمن اپنے بیگانے سب برابر ہیں۔ میں نے بہت سے لوگ ایسے دیکھے اور کہتے سنے ہیں کہ دعا کرو کہ اولاد ہو جائے جو اس جائیداد کی وارث ہو۔ ایسا نہ ہو کہ مرنے کے بعد کوئی شریک لے جاوے۔ اولاد ہو جائے خواہ وہ بدمعاش ہی ہو۔ یہ معرفت اسلام کی رہ گئی ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۹)

ان (اولاد۔ ناقل) کی پرورش محض رحم کے لحاظ سے کرے نہ جانشین بنانے کے واسطے بلکہ وَ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا کا لحاظ ہو کہ یہ اولاد دین کی خادم ہو لیکن کتنے ہیں جو اولاد کے واسطے یہ دعا کرتے ہیں کہ اولاد دین کی پہلوان ہو۔ بہت ہی تھوڑے ہوں گے جو ایسا کرتے ہوں۔ اکثر تو ایسے ہیں کہ وہ بالکل بے خبر ہیں کہ وہ کیوں اولاد کے لئے یہ کوششیں کرتے ہیں اور اکثر ہیں جو محض جانشین بنانے کے واسطے اور کوئی غرض

ہوتی ہی نہیں صرف یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی شریک یا غیر ان کی جائیداد کا مالک نہ بن جاوے۔ مگر یاد رکھو کہ اس طرح پر دین بالکل برباد ہوجاتا ہے غرض اولاد کے واسطے صرف یہ خواہش ہو کہ وہ دین کی خادم ہو۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰؍مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا ۙ﴿۷۶﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۷۷﴾

باوا صاحب کا ایک شعر یہ ہے

او چوتھان سوہاوناں اوپر محل مرار سچ کرنی دے پائے در گھر محل پیار

یعنی وہ بہشت اونچا مکان ہے اس میں عمارتیں خوبصورت ہیں اور راست بازی سے وہ مکان ملتا ہے اور پیار اس محل کا دروازہ ہے جس سے لوگ گھر کے اندر داخل ہوتے ہیں اور یہ شعر اس آیت سے اقتباس کیا گیا ہے جو قرآن شریف میں ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ ...... حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا

یعنی جو لوگ راست باز ہیں اور خدا سے ڈرتے ہیں انہیں بہشت کے بالا خانوں میں جگہ دی جائے گی جو نہایت خوبصورت مکان اور آرام کی جگہ ہے۔ دیکھو اس جگہ صریح باوا صاحب نے اس آیت کا ترجمہ کر دیا ہے۔ کیا اب بھی کچھ شک باقی ہے کہ باوا صاحب قرآن شریف کے ہی تابعدار تھے۔ اس قسم کا بیان بہشت کے بارہ میں وید میں کہاں ہے بلکہ انجیل میں بھی نہیں تبھی تو بعض نابینا عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن میں جسمانی بہشت کا ذکر ہے مگر نہیں جانتے کہ قرآن بار بار کہتا ہے کہ جسم اور روح جو دونوں خدا تعالیٰ کی راہ میں دنیا میں کام کرتے رہے ان دونوں کو جزا ملے گی یہی تو پورا بدلہ ہے کہ روح کو روح کی خواہش کے مطابق اور جسم کو جسم کی خواہش کے مطابق بدلہ ملے لیکن دنیوی کدورتوں اور کثافتوں سے وہ جگہ بالکل پاک ہوگی اور لوگ اپنی پاکیزگی میں فرشتوں کے مشابہ ہوں گے اور بایں ہمہ جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے لذت اور سرور میں ہوں گے اور روح کی چمک جسم پر پڑے گی اور جسم کی لذت میں روح شریک ہوگا اور یہ بات دنیا میں حاصل نہیں ہوتی بلکہ دنیا میں جسمانی لذت روحانی لذت سے روکتی ہے اور روحانی لذت جسمانی لذت سے مانع آتی ہے مگر بہشت میں ایسا نہیں ہوگا بلکہ اس روز دونوں لذتوں کا ایک دوسری پر عکس پڑے گا اور اسی

حالت کا نام سعادتِ عظمٰی ہے۔غرض باوا صاحب نے یہ نکتہءِ معرفت قرآن شریف سے لیا ہے کیونکہ دوسری تمام قومیں اس سے غافل ہیں اوران کے عقیدے اس کے برخلاف ہیں۔

(ست بچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۲۲، ۲۲۳)

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۸﴾

کافروں کو کہہ کہ اگر تم خدا کی بندگی نہ کروتو وہ تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے۔سوتم نے بجائے طاعت اور بندگی کے جھٹلانا اختیار کیا سوعنقریب اس کی سزا تم پر وارد ہونے والی ہے۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۲۶۲ حاشیہ)

چونکہ خدا کے قانون میں یہی انتظام مقرر ہے کہ رحمتِ خاصہ انہیں کے شاملِ حال ہوتی ہے کہ جو رحمت کے طریق کو یعنی دعا اور توحید کو اختیار کرتے ہیں اس باعث سے جو لوگ اس طریق کو چھوڑ دیتے ہیں وہ طرح طرح کی آفات میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (اٰلِ عمران : ۹۸) یعنی ان کو کہہ دے کہ میرا خدا تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے اگر تم دعا نہ کرو اور اس کے فیضان کے خواہاں نہ ہو۔خدا کو تو کسی کی زندگی اور وجود کی حاجت نہیں۔وہ تو بے نیازِ مطلق ہے۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۵۶۳، ۵۶۴ حاشیہ ۱۱)

ان کو کہہ دے کہ میرا خدا تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے اگر تم اس کی پرستش نہ کرو اور اس کے حکموں کو نہ سنو۔

(تریاق القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۲۶۴)

ان کو کہہ دے کہ میرا خدا تمہاری پروا کیا رکھتا ہے اگر تم بندگی نہ کرو اور دعاؤں میں مشغول نہ رہو۔

(مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۶۲۸)

ان کو کہہ دے کہ اگر تم نیک چلن انسان نہ بن جاؤ اور اس کی یاد میں مشغول نہ رہو تو میرا خدا تمہاری زندگی کی پروا کیا رکھتا ہے اور سچ ہے کہ جب انسان غافلانہ زندگی بسر کرے اور اس کے دل پر خدا کی عظمت کا کوئی رعب نہ ہو اور بے قیدی اور دلیری کے ساتھ اس کے تمام اعمال ہوں تو ایسے انسان سے ایک بکری بہتر ہے جس کا دودھ پیا جاتا ہے اور گوشت کھایا جاتا ہے اور کھال بھی بہت سے کاموں

میں آجاتی ہے۔ (مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۶۵۱)

ان لوگوں کی نسبت (جو خدا تعالیٰ کے احکام کی پیروی یا پروا نہیں کرتے اور اپنی زندگی فسق و فجور میں گزارتے ہیں) فرماتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ یعنی میرا رب تمہاری کیا پروا کرتا ہے اگر تم اس کی عبادت نہ کرو۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰/اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

انسان کی پیدائش کی اصل غرض تو عبادتِ الٰہی ہے لیکن اگر وہ اپنی فطرت کو خارجی اسباب اور بیرونی تعلقات سے تبدیل کر کے بیکار کر لیتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کی پروا نہیں کرتا۔ اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ ۔ میں نے ایک بار پہلے بھی بیان کیا تھا کہ میں نے ایک رؤیا میں دیکھا کہ میں ایک جنگل میں کھڑا ہوں۔ شرقاً غرباً اس میں ایک بڑی نالی چلی گئی ہے اس نالی پر بھیڑیں لٹائی ہوئی ہیں اور ہر ایک قصاب کے جو ہر ایک بھیڑ پر مسلط ہے ہاتھ میں چھری ہے جو انہوں نے ان کی گردن پر رکھی ہوئی ہے اور آسمان کی طرف منہ کیا ہوا ہے۔ میں ان کے پاس ٹہل رہا ہوں میں نے یہ نظارہ دیکھ کر سمجھا کہ یہ آسمانی حکم کے منتظر ہیں تو میں نے یہی آیت پڑھی قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ یہ سنتے ہی ان قصابوں نے فی الفور چھریاں چلا دیں اور یہ کہا کہ تم ہو کیا؟ آخر گوہ کھانے والی بھیڑیں ہی ہو۔

غرض خدا تعالیٰ متقی کی زندگی کی پروا کرتا ہے اور اس کی بقا کو عزیز رکھتا ہے اور جو اس کی مرضی کے برخلاف چلے وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا اور اس کو جہنم میں ڈالتا ہے اس لئے ہر ایک کو لازم ہے کہ اپنے نفس کو شیطان کی غلامی سے باہر کرے۔ جیسے کلورا فارم نیند لاتا ہے اسی طرح پر شیطان انسان کو تباہ کرتا ہے۔ اور اسے غفلت کی نیند سلاتا ہے اور اسی میں اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۷/اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

ان لوگوں کو کہہ دے کہ اگر تم میری بندگی نہ کرو تو پرواہ کیا ہے۔ (رسالہ انذار ۶۳)

جانوروں کی زندگی دیکھ لو کہ محنتیں ان سے لی جاتی ہیں اور ان کو ذبح کیا جاتا ہے پس جو انسان خدا تعالیٰ سے قطع تعلق کرتا ہے اس کی زندگی کی ضمانت نہیں رہتی چنانچہ فرمایا قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ یعنی اگر تم اللہ کو نہ پکارو تو میرا رب تمہاری پرواہ ہی کیا رکھتا ہے۔

یاد رکھو جو دنیا کے لئے خدا کی عبادت کرتے ہیں یا اس سے تعلق نہیں رکھتے اللہ تعالیٰ ان کی کچھ پرواہ نہیں رکھتا۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰/اکتوبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

کامل عابد وہی ہوسکتا ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے لیکن اس آیت میں اور بھی صراحت ہے اور وہ آیت یہ ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ یعنی ان لوگوں کو کہہ دو کہ اگر تم لوگ رب کو نہ پکارو تو میرا رب تمہاری پرواہ ہی کیا کرتا ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ عابد کی پروا کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰؍جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

انسانوں میں سے بھی جو سب سے زیادہ قابلِ قدر ہے اسے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھتا ہے اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا سچا تعلق رکھتے اور اپنے اندرونہ کو صاف رکھتے ہیں اور نوع انسان کے ساتھ خیر اور ہمدردی سے پیش آتے ہیں اور خدا کے سچے فرماں بردار ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ اس کے مفہوم مخالف سے صاف پتہ لگتا ہے کہ وہ دوسروں کی پروا کرتا ہے اور وہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو سعادت مند ہوتے ہیں۔ وہ تمام کسریں ان کے اندر سے نکل جاتی ہیں جو خدا سے دور ڈال دیتی ہیں اور جب انسان اپنی اصلاح کر لیتا ہے اور خدا سے صلح کر لیتا ہے تو خدا اس کے عذاب کو بھی ٹلا دیتا ہے خدا کو کوئی ضد تو نہیں چنانچہ اس کے متعلق بھی صاف طور پر فرمایا ہے مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ (النسآء :۱۴۸) یعنی خدا نے تم کو عذاب دے کر کیا کرنا ہے اگر تم دین دار ہو جاؤ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۶)

مومن شخص کا کام ہے کہ پہلے اپنی زندگی کا مقصدِ اصلی معلوم کرے اور پھر اس کے مطابق کام کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ ۔ خدا کو تمہاری پرواہی کیا ہے اگر تم اس کی عبادت نہ کرو اور اس سے دعائیں نہ مانگو۔ یہ آیت بھی .... مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات :۵۷) ہی کی شرح ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۳؍مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

جب انسان کا ایک اصول ہو جاوے کہ زیستن از بہرِ خوردن است اس وقت اس کی نظر (ذکر۔ناقل) پر نہیں رہتی بلکہ وہ دنیا کے کاروبار اور تجارت ہی میں منہمک ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف توجہ اور رجوع کا خیال بھی نہیں رہتا اس وقت اس کی زندگی قابلِ قدر وجود نہیں ہوتی ایسے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ یعنی میرا رب تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے اگر تم اس کی بندگی نہ کرو۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۷؍ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

خدا تعالیٰ کو تو اس بات کی مطلق پرواہ نہیں ہے کہ تم اس کی طرف میلان رکھو یا نہ۔ وہ فرماتا ہے قُلْ مَا

يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ اگر اس کی طرف رجوع رکھو گے تو تمہارا ہی اس میں فائدہ ہوگا۔
(البدر جلد ۴ نمبر ۳ مورخہ ۲۰؍جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

خدا دین سے غافلوں کو ہلاکت میں ڈالنے سے پروا نہیں کرتا۔ پس ثابت ہوا کہ جو دین سے غافل نہ ہوں ان کی ہلاکت اور موت میں خدا جلدی نہیں کرتا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۵ مورخہ ۱۰؍فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

بڑے بڑے صریح ظلم مظلوموں پر ڈھائے جاتے ہیں اور ہمارے سامنے ظالموں سے کوئی چنداں باز پُرس نہیں ہوتی۔ اس کا باعث بھی خدا تعالیٰ نے اسی آیت میں فرمایا ہے مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ یعنی خدا کو تمہاری پروا کیا ہے اگر تم دعاؤں اور عبادتِ الٰہی میں تغافل اختیار کرو۔
(الحکم جلد ۹ نمبر ۵ مورخہ ۱۰؍فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

اگر خدا تعالیٰ کی طرف انسان جھکے تو وہ رحم کرتا ہے لیکن جب انسان لا پرواہی کرے تو وہ غنی بے نیاز ہے۔ اس کو کسی کی کیا پرواہ ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ لوگوں کو کہہ دے اگر تم دعا نہ کرو تو میرے رب کو تمہاری کیا پرواہ ہے بے شک وہ کریم، رحیم اور حلیم ہے مگر ساتھ ہی وہ غنی بے نیاز بھی ہے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱، ۲ مورخہ ۱۰؍جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۳)

مورکھ ہے وہ انسان جو اس ضروری سفر کا کچھ بھی فکر نہیں رکھتا۔ خدا تعالیٰ اس شخص کی عمر کو بڑھا دیتا ہے جو سچ مچ اپنی زندگی کا طریق بدل کر خدا تعالیٰ کا ہی ہو جاتا ہے ورنہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ یعنی ان کو کہہ دو کہ خدا تعالیٰ تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے اگر تم اس کی بندگی اور عبادت نہ کرو۔ سوجاگنا چاہیے اور ہوشیار ہونا چاہیے اور غلطی نہیں کھانا چاہیے کہ یہ گھر سخت بے بنیاد ہے۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۲ مورخہ ۳۱؍اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳)

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہ ہو اور رجوع نہ کرو تو اس سے اس کی ذات میں کوئی نقص پیدا نہیں ہو سکتا اور وہ تمہاری کچھ بھی پروا نہیں رکھتا جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ

یعنی ان کو کہہ دو کہ میرا رب تمہاری پروا کیا رکھتا ہے اگر تم سچے دل سے اس کی عبادت نہ کرو جیسا کہ وہ رحیم و کریم ہے ویسا ہی وہ غنی بے نیاز بھی ہے۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۲ مورخہ ۱۷؍جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

دعا میں لگے رہو کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ۔ ایک انسان جو دعا نہیں کرتا اس میں اور چار پائے میں کچھ فرق نہیں۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۲ مورخہ ۱۰؍ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تفسیر سورۃ الشعرآء

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝

کیا تو اسی غم میں اپنے تئیں ہلاک کر دے گا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۰۸ حاشیہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں نہایت درجہ کا یہ جوش تھا کہ میں اپنی زندگی میں اسلام کا زمین پر پھیلنا دیکھ لوں اور یہ بات بہت ہی ناگوار تھی کہ حق کو زمین پر قائم کرنے سے پہلے سفر آخرت پیش آوے۔ سو خدا تعالیٰ اس آیت میں (یعنی اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ..... الخ۔ناقل) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشخبری دیتا ہے کہ دیکھ میں نے تیری مراد پوری کر دی اور کم وبیش اس مراد کا ہر یک نبی کو خیال تھا مگر چونکہ اس درجہ کا جوش نہیں تھا اس لئے نہ مسیحؑ کو اور نہ موسیٰؑ کو یہ خوشخبری ملی بلکہ اسی کو ملی جس کے حق میں قرآن میں فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی کیا تو اس غم سے ہلاک ہو جاوے گا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔ (نور القرآن نمبر ۱، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۳۵۴، ۳۵۵ حاشیہ)

کیا تو اس غم سے ہلاک ہو جائے گا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔ مطلب یہ ہے کہ تیری شفقت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ تو ان کے غم میں ہلاک ہونے کے قریب ہے۔

(نور القرآن نمبر ۲، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۴۳۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعی ہمدردی اور محنت اٹھانے سے بنی نوع کی رہائی کے لئے جان کو وقف کر دیا تھا اور دعا کے ساتھ اور تبلیغ کے ساتھ اور ان کے جور و جفا اٹھانے کے ساتھ اور ہر ایک مناسب اور حکیمانہ طریق کے ساتھ اپنی جان اور اپنے آرام کو اس راہ میں فدا کر دیا تھا جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ .... کیا تو اس غم اور اس سخت محنت میں جو لوگوں کے لئے اٹھا رہا ہے اپنے تئیں ہلاک کر دے گا...... سو قوم کی راہ میں جان دینے کا حکیمانہ طریق یہی ہے کہ قوم کی بھلائی کے لئے قانونِ قدرت کی مفید راہوں کے موافق اپنی جان پر سختی اٹھاویں اور مناسب تدبیروں کے بجالانے سے اپنی جان ان پر فدا کر دیں نہ یہ کہ قوم کو سخت بلا یا گمراہی میں دیکھ کر اور خطرناک حالت میں پا کر اپنے سر پر پتھر مار لیں یا دو تین رتی اسٹر کنیا کھا کر اس جہان سے رخصت ہو جائیں اور پھر گمان کریں کہ ہم نے اپنی اس حرکتِ بیجا سے قوم کو نجات دے دی ہے۔ یہ مردوں کا کام نہیں زنانہ خصلتیں ہیں اور بے حوصلہ لوگوں کا ہمیشہ سے یہی طریق ہے کہ مصیبت کو قابلِ برداشت نہ پا کر جھٹ پٹ خودکشی کی طرف دوڑتے ہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۴۸، ۴۴۹)

ہر ایک نبی کی یہ مراد تھی کہ تمام کفار ان کے زمانہ کے جو ان کی مخالفت پر کھڑے تھے مسلمان ہو جائیں مگر یہ مراد ان کی پوری نہ ہوئی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی کیا تو اس غم سے اپنے تئیں ہلاک کر دے گا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے ایمان لانے کے لئے اس قدر جانکاہی اور سوز و گداز سے دعا کرتے تھے کہ اندیشہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس غم سے خود ہلاک نہ ہو جاویں اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان لوگوں کے لئے اس قدر غم نہ کر اور اس قدر اپنے دل کو دردوں کا نشانہ مت بنا کیونکہ یہ لوگ ایمان لانے سے لاپرواہیں اور ان کے اغراض اور مقاصد اور ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ فرمایا ہے کہ اے نبی (علیہ السلام) جس قدر تو عقدِ ہمت اور کامل توجہ اور سوز و گداز اور اپنی روح کو مشقت میں ڈالنے سے ان لوگوں کی ہدایت کے لئے دعا کرتا ہے۔ تیری دعاؤں کے پُر تاثیر ہونے میں کچھ کمی نہیں ہے لیکن شرط قبولیت دعا یہ ہے کہ جس کے حق میں دعا کی جاتی ہے سخت متعصب اور لاپروا اور گندی فطرت کا انسان نہ ہو ورنہ دعا قبول نہیں ہو گی۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۲۲۶)

یہ نورِ ہدایت جو خارقِ عادت طور پر عرب کے جزیرہ میں ظہور میں آیا اور پھر دنیا میں پھیل گیا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دلی سوزش کی تاثیر تھی۔ ہر ایک قوم توحید سے دور اور مہجور ہوگئی مگر اسلام میں چشمۂ توحید جاری رہا۔ یہ تمام برکتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا نتیجہ تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی کیا تو اس غم میں اپنے تئیں ہلاک کردے گا جو یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ پس پہلے نبیوں کی امت میں جو اس درجہ کی صلاح وتقویٰ پیدا نہ ہوئی اس کی یہی وجہ تھی کہ اس درجہ کی توجہ اور دل سوزی امت کے لئے ان نبیوں میں نہیں تھی۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد صفحہ ۱۰۳ حاشیہ)

نبی بوجہ اس کے کہ ہمدردی بنی نوع کا اس کے دل میں کمال درجہ پر جوش ہوتا ہے اپنی روحانی توجہات اور تضرع اور انکسار سے یہ چاہتا ہے کہ وہ خدا جو اس پر ظاہر ہوا ہے دوسرے لوگ بھی اس کو شناخت کریں اور نجات پاویں اور وہ دلی خواہش سے اپنے وجود کی قربانی خدا تعالیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس تمنا سے کہ لوگ زندہ ہوجائیں کئی موتیں اپنے لئے قبول کر لیتا ہے اور بڑے مجاہدات میں اپنے تئیں ڈالتا ہے جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی کیا تو اس غم میں اپنے تئیں ہلاک کر دے گا کہ یہ کافر لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے تب اگرچہ خدا مخلوق سے بے نیاز اور مستغنی ہے مگر اس کے دائمی غم اور حزن اور کرب وقلق اور تذلل اور نیستی اور نہایت درجہ کے صدق اور صفا پر نظر کر کے مخلوق کے مستعد دلوں پر اپنے نشانوں کے ساتھ اپنا چہرہ ظاہر کر دیتا ہے اور اس کی پُرجوش دعاؤں کی تحریک سے جو آسمان پر ایک صعبناک شور ڈالتی ہیں خدا تعالیٰ کے نشان زمین پر بارش کی طرح برستے ہیں اور عظیم الشان خوارق دنیا کے لوگوں کو دکھلائے جاتے ہیں جن سے دنیا دیکھ لیتی ہے کہ خدا ہے اور خدا کا چہرہ نظر آجاتا ہے لیکن اگر وہ پاک نبی اس قدر دعا اور تضرع اور ابتہال سے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ نہ کرتا اور خدا کے چہرہ کی چمک دنیا پر ظاہر کرنے کے لئے اپنی قربانی نہ دیتا اور ہر ایک قدم میں صدہا موتیں قبول نہ کرتا تو خدا کا چہرہ دنیا پر ہرگز ظاہر نہ ہوتا کیونکہ خدا تعالیٰ بوجہ استغناء ذاتی کے بے نیاز ہے۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۱۷)

چونکہ (حقانی ریفارمر۔ناقل) بنی نوع کی ہمدردی میں محو ہوتے ہیں اس لئے رات دن سوچتے رہتے ہیں اور اس فکر میں کُڑھتے رہتے ہیں کہ یہ لوگ کسی نہ کسی طرح اس راہ پر آجائیں اور ایک بار اس چشمہ سے ایک

گھونٹ پی لیں یہ ہمدردی یہ جوش ہمارے سید و مولیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں غایت درجہ کا تھا اس سے بڑھ کر کسی دوسرے میں ہوسکتا ہی نہیں۔ چنانچہ آپ کی ہمدردی اور غمگساری کا یہ عالم تھا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کا نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی کیا تو اپنی جان کو ہلاک کر دے گا اس غم میں کہ یہ کیوں مومن نہیں ہوتے۔ اس آیت کی حقیقت آپ پورے طور پر نہ سمجھ سکیں تو جدا امر ہے مگر میرے دل میں اس کی حقیقت یوں پھرتی ہے جیسے بدن میں خون ؎

بدل دردیکہ دارم از برائے طالبانِ حق نمے گردد بیان آں درد از تقریر کوتاہم

میں خوب سمجھتا ہوں کہ ان حقانی واعظوں کو کس قسم کا جانگزا درد اصلاحِ خلق کا لگا ہوا ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ / مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

نبی کا آنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ قوتِ قدسی ہوتی ہے اور ان کے دل میں لوگوں کی ہمدردی نفع رسانی اور عام خیر خواہی کا بیتاب کر دینے والا جوش ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی کیا تو اپنی جان کو ہلاک کر دے گا اس خیال سے کہ وہ مومن نہیں ہوتے اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک کافروں کی نسبت کہ وہ مسلمان کیوں نہیں ہوتے، دوسرا مسلمانوں کی نسبت کہ ان میں وہ اعلیٰ درجہ کی روحانی قوت کیوں نہیں پیدا ہوتی جو آپ پاتے ہیں۔ چونکہ ترقی تدریجاً ہوتی ہے اس لئے صحابہ کی ترقیاں بھی تدریجی طور پر ہوئی تھیں مگر انبیاء کے دل کی بناوٹ بالکل ہمدردی ہی ہوتی ہے اور پھر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو جامع جمیع کمالاتِ نبوت تھے آپ میں یہ ہمدردی کمال درجہ پر تھی آپ صحابہؓ کو دیکھ کر چاہتے تھے کہ پوری ترقیات پر پہنچیں لیکن یہ عروج ایک وقت پر مقدر تھا آخر صحابہؓ نے وہ پایا جو دنیا نے کبھی نہ پایا تھا اور وہ دیکھا جو کسی نے نہ دیکھا تھا۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۱۶ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۰ء صفحہ ۶)

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رسالت میں ایک امر ظاہر ہوتا ہے اور ایک مخفی ہوتا ہے۔ مثلاً لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ایک کلمہ ہے جسے رسالت مآب نے بایں الفاظ لوگوں کو پہنچا دیا ہے لوگ مانیں یا نہ مانیں یعنی رسالت کا کام صرف پہنچا دینا تھا مگر رسالت کے یہ ظاہری معنے ہیں۔ ہم جب اور زیادہ غور کر کے بطون کی طرف جاتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ بطور ایک جزوِ غیر منفک کے شامل ہوئی ہے۔ یہ صورت ابلاغ تک ہی محدود نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

اپنی قوتِ قدسیہ کے زور سے اس تبلیغ کو بااثر بنانے میں لانظیر نمونہ دکھلایا ہے اور قرآن کریم سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ آپ کو کس قدر سوزش اور گدازش لگی ہوئی تھی چنانچہ فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی کیا تو اپنی جان کو ہلاک کر دے گا اس فکر میں کہ یہ مومن کیوں نہیں بنتے۔ یہ پکی بات ہے کہ ہر نبی صرف لفظ لے کر نہیں آتا بلکہ اپنے اندر وہ ایک درد اور سوز و گداز بھی رکھتا ہے جو اپنی قوم کی اصلاح کے لئے ہوتا ہے اور یہ درد اور اضطراب کسی بناوٹ سے نہیں ہوتا بلکہ فطرتاً اضطراری طور پر اس سے صادر ہوتا ہے جیسے ایک ماں اپنے بچے کی پرورش میں مصروف ہوتی ہے۔ اگر بادشاہ کی طرف سے اس کو حکم بھی دیا جاوے کہ اگر وہ اپنے بچے کو دودھ نہ بھی دے اور اس طرح پر اس کے ایک دو بچے مر بھی جاویں تو اس کو معاف ہیں اور اسے کوئی باز پرس نہ ہوگی تو کیا بادشاہ کے ایسے حکم پر کوئی ماں خوش ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ بادشاہ کو گالیاں دے گی۔ وہ دودھ دینے سے رک سکتی ہی نہیں۔ یہ بات اس کی طبیعت میں طبعاً موجود ہے اور دودھ دینے میں اس کو کبھی بھی بہشت میں جانا یا اس کا معاوضہ پانا مرکوز اور ملحوظ نہیں ہوتا اور یہ جوش طبعی ہے جو اس کو فطرت نے دیا ہے ورنہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو چاہیے تھا کہ جانوروں کی مائیں بکری، بھینس یا گائے یا پرندوں کی مائیں اپنے بچوں کی پرورش سے علیحدہ ہو جاتیں۔ ایک فطرت ہوتی ہے، ایک عقل ہوتی ہے اور ایک جوش ہوتا ہے۔ ماؤں کا اپنے بچوں کی پرورش میں مصروف ہونا یہ فطرت ہے۔ اسی طرح پر مامورین جو آتے ہیں ان کی فطرت میں بھی ایک بات ہوتی ہے۔ وہ کیا؟ مخلوق کے لئے دلسوزی اور بنی نوع انسان کی خیر خواہی کے لئے ایک گدازش۔ وہ طبعی طور پر چاہتے ہیں کہ لوگ ہدایت پا جاویں اور خدا تعالیٰ میں زندگی حاصل کریں۔ پس یہ وہ سر ہے جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے دوسرے حصہ میں یعنی اظہارِ رسالت میں رکھا ہوا ہے جیسے پیغام پہنچانے والے عام طور پر پیغام پہنچا دیتے ہیں اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس پر عمل ہو یا نہ ہو۔ گویا وہ تبلیغ صرف کان ہی تک محدود ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے مامورانِ الٰہی کان تک بھی پہنچاتے ہیں اور اپنی قوتِ قدسی کے زور اور ذریعہ سے دل تک بھی پہنچاتے ہیں اور یہ بات کہ جذب اور عقدِ ہمت ایک انسان کو اس وقت دیا جاتا ہے جبکہ وہ خدا تعالیٰ کی چادر کے نیچے آجاتا ہے اور ظل اللہ بنتا ہے پھر وہ مخلوق کی ہمدردی اور بہتری کے لئے اپنے اندر ایک اضطراب پاتا ہے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس مرتبہ میں کل انبیاء علیہم السلام سے بڑھے ہوئے تھے اس لئے آپ مخلوق کی تکلیف دیکھ نہیں سکتے تھے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ /جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵، ۶)

آپؐ کی زندگی کی تقسیم دو حصوں پر کر دی گئی ایک تو مکی زندگی جو ۱۳ برس کے زمانہ کی ہے اور دوسری وہ زندگی ہے جو مدنی زندگی ہے اور وہ ۱۰ برس کی ہے۔ مکہ کی زندگی میں اسم احمد کی تجلی تھی اس وقت آپ کی دن رات خدا تعالیٰ کے حضور گریہ و بکا اور طلب استعانت اور دعا میں گزرتی تھی اگر کوئی شخص آپؐ کی اس زندگی کے بسر اوقات پر پوری اطلاع رکھتا ہو تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ جو تضرع اور زاری آپ نے اس مکی زندگی میں کی ہے وہ کبھی کسی عاشق نے اپنے محبوب و معشوق کی تلاش میں کبھی نہیں کی اور نہ کر سکے گا۔ پھر آپ کی تضرع اپنے لئے نہ تھی بلکہ یہ تضرع دنیا کی حالت کی پوری واقفیت کی وجہ سے تھی۔ خدا پرستی کا نام ونشان چونکہ مٹ چکا تھا اور آپ کی روح اور خمیر میں اللہ تعالیٰ میں ایمان رکھ کر ایک لذت اور سرور آ چکا تھا اور فطرتاً دنیا کو اس لذت اور محبت سے سرشار کرنا چاہتے تھے ادھر دنیا کی حالت کو دیکھتے تھے تو ان کی استعدادیں اور فطرتیں عجیب طرز پر واقع ہو چکی تھیں اور بڑے مشکلات اور مصائب کا سامنا تھا۔ غرض دنیا کی اس حالت پر آپ گریہ وزاری کرتے تھے اور یہاں تک کرتے تھے کہ قریب تھا کہ جان نکل جاتی۔ اسی کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ یہ آپ کی متضرعانہ زندگی تھی اور اسم احمد کا ظہور تھا۔ اس وقت آپ ایک عظیم الشان توجہ میں پڑے ہوئے تھے۔ اس توجہ کا ظہور مدنی زندگی اور اسمِ محمد کی تجلّی کے وقت ہوا جیسا کہ اس آیت سے پتہ لگتا ہے وَ اسْتَفْتَحُوْا وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (ابراھیم:۱۶) (الحکم جلد ۵ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

مامور من اللہ جب آتا ہے تو اس کی فطرت میں سچی ہمدردی رکھی جاتی ہے اور یہ ہمدردی عوام سے بھی ہوتی ہے اور جماعت سے بھی۔ اس ہمدردی میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑھے ہوئے تھے اس لئے کہ آپ کل دنیا کے لئے مامور ہو کر آئے تھے اور آپ سے پہلے جس قدر نبی آئے وہ مختص القوم اور مختص الزمان کے طور پر تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل دنیا اور ہمیشہ کے لئے نبی تھے اس لئے آپ کی ہمدردی بھی کامل ہمدردی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ اس کے ایک تو یہ معنے ہیں کہ کیا تو ان کے مومن نہ ہونے کی فکر میں اپنی جان دے دے گا۔ اس آیت سے اس درد اور فکر کا پتہ لگ سکتا ہے جو آپ کو دنیا کی تبہ حالت دیکھ کر ہوتا تھا کہ وہ مومن بن جاوے۔ یہ تو آپ کی عام ہمدردی کے لئے ہے اور یہ معنے بھی اس آیت کے ہیں کہ مومن کو مومن بنانے کی فکر میں تو اپنی جان دے دے گا یعنی ایمان کو کامل بنانے میں۔

اسی لئے دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (النساء : ۱۳۷) بظاہر تو یہ تحصیل حاصل معلوم ہوتی ہوگی لیکن جب حقیقتِ حال پر غور کیا جاوے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ کئی مراتب ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ تکمیل چاہتا ہے۔

غرض مامور کی ہمدردی مخلوق کے ساتھ اس درجہ کی ہوتی ہے کہ وہ بہت جلد اس سے متأثر ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ ؍مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

میں تو زبان ہی سے کہتا ہوں دل میں ڈالنا یہ خدا کا کام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھانے میں کیا کسر باقی رکھی تھی؟ مگر ابوجہل اور اس کے امثال نہ سمجھے۔ آپ کو اس قدر فکر اور غم تھا کہ خدا نے خود فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قدر ہمدردی تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ وہ ہلاک ہونے سے بچ جاویں مگر وہ بچ نہ سکے حقیقت میں معلم اور واعظ کا تو اتنا ہی فرض ہے کہ وہ بتا دے۔ دل کی کھڑکی تو خدا کے فضل سے کھلتی ہے نجات اسی کو ملتی ہے جو دل کا صاف ہو۔ جو صاف دل نہیں وہ اچکا اور ڈاکو ہے خدا تعالیٰ اسے بری طرح مارتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۶ مورخہ ۱۴ ؍فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

کوئی نبی اور ولی قوتِ عشقیہ سے خالی نہیں ہوتا یعنی ان کی فطرت میں حضرت احدیت نے بندگانِ خدا کی بھلائی کے لئے ایک قسم کا عشق ڈالا ہوا ہوتا ہے۔ پس وہی عشق کی آگ ان سے سب کچھ کراتی ہے اور اگر ان کو خدا کا یہ حکم بھی پہنچے کہ اگر تم دعا اور غم خواریِ خلق اللہ نہ کرو تو تمہارے اجر میں کچھ قصور نہیں۔ تب بھی وہ اپنے فطرتی جوش سے رہ نہیں سکتے اور ان کو اس بات کی طرف خیال بھی نہیں ہوتا کہ ہم کو اس جانکنی سے کیا اجر ملے گا کیونکہ ان کے جوشوں کی بناء کسی غرض پر نہیں بلکہ وہ سب کچھ قوتِ عشقیہ کی تحریک سے ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ خدا اپنے نبی کو سمجھاتا ہے کہ اس قدر غم اور درد کہ تو لوگوں کے مومن بن جانے کے لئے اپنے دل پر اٹھاتا ہے اس سے تیری جان جاتی رہے گی۔ سو وہ عشق ہی تھا جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جان جانے کی کچھ پرواہ نہ کی۔ پس حقیقی پیری مریدی کا یہی احوال ہے اور صادق اسی سے شناخت کئے جاتے ہیں کیونکہ خدا کا قدیمی احوال ہے کہ قوت عشقیہ صادقوں کے دلوں میں ضرور ہوتی ہے تا وہ سچے غم خوار بننے کے لئے لائق ٹھہریں جیسے والدین اپنے بچہ کے لئے ایک قوت عشقیہ رکھتے ہیں تو ان کی دعا بھی اپنے بچوں کی نسبت قبولیت کی

استعداد زیادہ رکھتی ہے اسی طرح جو شخص صاحبِ قوتِ عشقیہ ہے وہ خلق اللہ کے لئے حکمِ والدین رکھتا ہے اور خواہ نخواہ دوسروں کا غم اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے کیونکہ قوتِ عشقیہ اس کو نہیں چھوڑتی اور یہ خداوندِ کریم کی طرف سے ایک انتظامی بات ہے کہ اس نے بنی آدم کو مختلف فطرتوں پر پیدا کیا ہے مثلاً دنیا میں بہادروں اور جنگ جو لوگوں کی ضرورت ہے سو بعض فطرتیں جنگ جوئی کی استعداد رکھتی ہیں۔ اسی طرح دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی ضرورت ہے کہ جن کے ہاتھ پر خلق اللہ کی اصلاح ہوا کرے۔ سو بعض فطرتیں یہی استعداد لے کر آتی ہیں اور قوتِ عشقیہ سے بھری ہوئی ہوتی ہیں فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی اٰلَآءِ ظَاهِرِهَا وَ بَاطِنِهَا۔

(الحکم جلد ۲ نمبر ۲۴، ۲۵ مورخہ ۲۰۔ ۲۷ راگست ۱۸۹۸ء صفحہ ۱۲)

انبیاء خلقت کی ہدایت کے واسطے بہت توجہ کرتے ہیں۔ اسی کی طرف قرآن شریف میں اشارہ ہے کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ آنحضرتؐ کو مخلوق کی ہدایت کا اس قدر غم تھا کہ قریب تھا کہ اسی میں اپنے آپ کو ہلاک کر دیں۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۷ رجولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک طرف انبیاء و رسل اور خدا تعالیٰ کے مامورین اہلِ دنیا سے نفور ہوتے ہیں اور دوسری طرف مخلوق کے لئے ان کے دل میں اس قدر ہمدردی ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کے لئے بھی خطرہ میں ڈال دیتے ہیں اور خود ان کی جان جانے کا اندیشہ ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت قرآن شریف میں فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یہ کس قدر ہمدردی اور خیر خواہی ہے اللہ تعالیٰ نے اس میں فرمایا ہے کہ تو ان لوگوں کے مومن نہ ہونے کے متعلق اس قدر ہمّ و غم نہ کر۔ اس غم میں شاید تو اپنی جان ہی دے دے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمدردئ مخلوق میں کہاں تک بڑھ جاتے ہیں۔ اس قسم کی ہمدردی کا نمونہ کسی اور میں نہیں پایا جاتا یہاں تک کہ ماں باپ اور دوسرے اقارب میں بھی ایسی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۸ مورخہ ۳۱ راکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

وَ لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۵﴾

خدا کے نبی شہرت پسند نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے تئیں چھپانا چاہتے ہیں مگر الٰہی حکم انہیں باہر نکالتا ہے۔ دیکھو حضرت موسیٰؑ کو جب مامور کیا جانے لگا تو انہوں نے پہلے عرض کیا کہ ہارون مجھ سے زیادہ افصح ہے پھر کہا وَ لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ مگر الٰہی منشاء یہی تھا کہ وہی نبی بنیں اور وہی اس لائق تھے اس لئے حکم ہوا کہ ہم تمہارے

ساتھ ہیں تم جاؤ اور تبلیغ کرو۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۹ مورخہ ۹؍مئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۰﴾

چونکہ خدا کی غیرت عام طور پر اپنے بندوں کو انگشت نما نہیں کرنا چاہتی اس لئے جب سے کہ دنیا پیدا ہوئی ہے خدا اپنے خاص اور پیارے بندوں کو بیگانہ آدمیوں کی نظر سے کسی نہ کسی ظاہری اعتراض کے نیچے لا کر محجوب اور مستور کر دیتا ہے تا اجنبی لوگوں کی ان پر نظر نہ پڑ سکے اور تا وہ خدا کی غیرت کی چادر کے نیچے پوشیدہ رہیں یہی وجہ ہے کہ سیدنا ومولٰنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کامل انسان پر جو سراسر نورِ مجسم ہیں اندھے پادریوں اور نادان فلسفیوں اور جاہل آریوں نے اس قدر اعتراض کئے ہیں کہ اگر وہ سب اکٹھے کئے جائیں تو تین ہزار سے بھی کچھ زیادہ ہیں پھر کسی دوسرے کو کب امید ہے کہ مخالفوں کے اعتراض سے بچ سکے۔ اگر خدا چاہتا تو ایسا ظہور میں نہ آتا مگر خدا نے یہی چاہا کہ اس کے خاص بندے دنیا کے فرزندوں کے ہاتھ سے دکھ دیئے جائیں اور ستائے جائیں اور ان کے حق میں طرح طرح کی باتیں کہی جائیں اسی طرح انجیل سے ثابت ہے کہ بدقسمت یہودیوں نے حضرت عیسٰیؑ کو بھی کافر اور مکار اور گمراہ اور گمراہ کرنے والا اور فریبی ٹھہرایا یہاں تک کہ ایک چور کو ان پر ترجیح دی۔ ایسا ہی فرعون نے بھی حضرت موسیٰؑ کو کافر کر کے پکارا جیسا کہ قرآن شریف میں فرعون کا یہ کلمہ درج ہے وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ یعنی اے موسیٰ جو کام تو نے کیا وہ کیا اور تُو تو کافروں میں سے ہے۔

پس یہ کفر عجیب کفر ہے کہ ابتداء سے تمام رسول اور نبی وراثت کے طور پر نادانوں کی زبان سے اس کو لیتے آئے یہاں تک کہ آخری حصہ اس کا ہمیں بھی مل گیا پس ہمارے لئے یہ فخر کی جگہ ہے کہ ہم اس حصہ سے کہ جو نبیوں اور رسولوں اور صدیقوں کو قدیم سے ملتا آیا ہے محروم نہ رہے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ کئی گذشتہ نبیوں کی نسبت یہ حصہ ہمیں زیادہ ملا ہے۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۴۶، ۳۴۷)

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۶۳﴾

جس طرح کھانگڑ بھینس کا دودھ نکالنا بہت مشکل ہے اسی طرح سے خدا کے نشان بھی سخت تکلیف کی

حالت میں اترا کرتے ہیں جیسے حضرت موسیٰؑ کو بنی اسرائیل نے کہا تھا اِنَّا لَمُدۡرَکُوۡنَ ۔وہ ایسا سخت مشکل کا وقت تھا کہ آگے سے بھی اور پیچھے سے بھی ان کو موت ہی موت نظر آتی تھی۔ سامنے سمندر اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ اس وقت موسیٰؑ نے جواب دیا ''کَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیۡ سَیَہۡدِیۡنِ ''۔پس ایسی ضرورتوں اور ابتلاء کے اوقات میں نشان ظاہر ہوا کرتے ہیں جب کہ ایک قسم کی جان کندنی پیش آجاتی ہے۔ چونکہ خدا کا نام غیب ہے اس لئے جب نہایت ہی اشد ضرورت آبنتی ہے تو امورِ غیبیہ ظاہر ہوا کرتے ہیں۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷؍نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے آئے تو ان کو پہلے مصر میں فرعون نے یہ کام دیا ہوا تھا کہ وہ آدھے دن اینٹیں پاتھا کریں اور آدھے دن اپنا کام کیا کریں۔لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو نجات دلانے کی کوشش کی تو پھر شریروں کی شرارت سے بنی اسرائیل کا کام بڑھا دیا گیا اور انہیں حکم ملا کہ آدھے دن تو تم اینٹیں پاتھا کرو اور آدھے دن گھاس لایا کرو۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ حکم ملا اور انہوں نے بنی اسرائیل کو سنایا تو وہ بڑے ناراض ہوئے اور کہا اے موسیٰ خدا تم کو وہ دکھ دے۔ جو ہم کو ملا ہے۔اور بھی انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو بددعائیں دیں مگر موسیٰ علیہ السلام نے ان کو یہی کہا کہ تم صبر کرو۔تورات میں یہ سارا قصہ لکھا ہے کہ جوں جوں موسیٰؑ انہیں تسلی دیتے تھے وہ اور بھی افروختہ ہوتے تھے۔آخر یہ ہوا کہ مصر سے بھاگ نکلنے کی تجویز کی گئی اور مصر والوں کے کپڑے اور برتن وغیرہ جو لئے تھے وہ ساتھ ہی لے آئے۔ جب حضرت موسیٰؑ قوم کو لے کر نکل آئے تو فرعون نے اپنے لشکر کو لے کر ان کا تعاقب کیا۔ بنی اسرائیل نے جب دیکھا کہ فرعونیوں کا لشکر ان کے قریب ہے تو وہ بڑے ہی مضطرب ہوئے۔ چنانچہ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ اس وقت وہ چلائے اور کہا اِنَّا لَمُدۡرَکُوۡنَ اے موسیٰ ہم تو پکڑے گئے مگر موسیٰ نے جو نبوت کی آنکھ سے انجام کو دیکھتے تھے انہیں یہی جواب دیا کَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیۡ سَیَہۡدِیۡنِ ہرگز نہیں۔ میرا رب میرے ساتھ ہے۔تورات میں لکھا ہے کہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کیا مصر میں ہمارے لئے قبریں نہ تھیں۔اور یہ اضطراب اس وجہ سے پیدا ہوا کہ پیچھے فرعون کا لشکر اور آگے دریائے نیل تھا۔ وہ دیکھتے تھے کہ نہ پیچھے جا کر بچ سکتے ہیں اور نہ آگے جا کر۔مگر اللہ تعالیٰ قادر مقتدر خدا ہے۔ دریائے نیل میں سے انہیں راستہ مل گیا اور سارے بنی اسرائیل آرام کے ساتھ پار ہو گئے مگر فرعونیوں کا لشکر غرق ہو گیا۔ سید احمد خاں صاحب اس موقع پر لکھتے ہیں کہ یہ جوار بھاٹا تھا مگر ہم کہتے ہیں کہ کچھ ہو اس میں کوئی

شبہ نہیں ہوسکتا کہ یہ عظیم الشان معجزہ تھا جو ایسے وقت پر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے راہ پیدا کر دی اور یہی متقی کے ساتھ ہوتا ہے کہ ہر ضیق سے اسے نجات اور راہ ملتی ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ میرے ساتھ میرا رب ہے عنقریب وہ میرا راہ کھول دے گا۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۱۲، ۶۱۳ حاشیہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ اس معیت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں اور گویا کل جماعت آپ کی آگئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں کہا بلکہ کہا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ۔ اس میں کیا سر تھا کہ انہوں نے اپنے ہی ساتھ معیت کا اظہار کیا؟ اس میں یہ راز ہے کہ اللہ جامع جمیع شیون کا ہے اور اسمِ اعظم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کے ساتھ اسمِ اعظم کی معیت مع تمام صفات کے پائی جاتی ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام کی قوم شریر اور فاسق فاجر تھی۔ آئے دن لڑنے اور پتھر مارنے کو تیار ہوجاتی تھی اس لئے ان کی طرف معیت کو منسوب نہیں کیا بلکہ اپنی ذات تک اسے رکھا۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور علو مدارج کا اظہار مقصود ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۷)

بہ تحقیق میرا رب میرے ساتھ ہے وہ مجھے راہ بتلائے گا۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۶۳ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴)

میرے ساتھ میرا خدا ہے وہ مخلصی کی کوئی راہ دکھا دے گا۔ یہ قرآن شریف میں حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں ہے جبکہ فرعون نے ان کا تعاقب کیا تھا اور بنی اسرائیل نے سمجھا تھا کہ اب ہم پکڑے گئے۔

(براہینِ احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۹۸)

وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝۸۱

اصل میں انسان جوں جوں اپنے ایمان کو کامل کرتا ہے اور یقین میں پکا ہوتا جاتا ہے توں توں اللہ تعالیٰ اس کے واسطے خود علاج کرتا ہے اس کو ضرورت نہیں رہتی کہ دوائیں تلاش کرتا پھرے وہ خدا کی دوائیں کھاتا ہے اور خدا خود اس کا علاج کرتا ہے۔ بھلا کوئی دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ فلاں دوا سے فلاں مریض ضرور ہی شفا پا جاوے گا ہرگز نہیں بلکہ بعض اوقات دیکھا جاتا ہے کہ دوا الٹا ہلاکت کا موجب ہو جاتی ہے۔ اور ان

علاجوں میں سود ہندے ہوتے ہیں بعض وقت تشخیص میں غلطی ہوتی ہے بعض وقت دواؤں کے اجزاء میں غلطی ہوجاتی ہے۔غرض حتمی علاج نہیں ہوسکتا۔ہاں خدا تعالیٰ جو علاج فرماتا ہے وہ حتمی علاج ہوتا ہے اس سے نقصان نہیں ہوتا مگر ذرا یہ بات مشکل ہے کامل ایمان کو چاہتی ہے اور یقین کے پہاڑ سے پیدا ہوتی ہے۔ایسے لوگوں کا اللہ تعالیٰ خود معالج ہوتا ہے۔مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ دانت میں سخت درد تھا میں نے کسی سے دریافت کیا کہ اس کا کیا علاج ہے۔اس نے کہا کہ موٹا علاج مشہور ہے علاج دنداں اخراج دنداں۔اس کا یہ فقرہ میرے دل پر بہت گراں گزرا کیونکہ دانت بھی ایک نعمت الٰہی ہے اسے نکال دینا ایک نعمت سے محروم ہونا ہے۔اسی فکر میں تھا کہ غنودگی آئی تو زبان پر جاری ہوا وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ اس کے ساتھ ہی معاً درد ٹھہر گیا اور پھر نہیں ہوا۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۵،۶ مورخہ ۲۸ ؍نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۸)

وَ الَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ﴿۸۲﴾

وہ خدا جو مجھے مارتا ہے اور پھر زندہ کرتا ہے۔اس موت اور حیات سے مراد صرف جسمانی موت اور حیات نہیں بلکہ اس موت اور حیات کی طرف اشارہ ہے جو سالک کو اپنے مقامات و منازل سلوک میں پیش آتی ہے چنانچہ وہ خلق کی محبتِ ذاتی سے مارا جاتا ہے اور خالقِ حقیقی کی محبتِ ذاتی کے ساتھ زندہ کیا جاتا ہے اور پھر اپنے رفقاء کی محبتِ ذاتی سے مارا جاتا ہے اور رفیقِ اعلیٰ کی محبتِ ذاتی کے ساتھ زندہ کیا جاتا ہے اور پھر اپنے نفس کی محبتِ ذاتی سے مارا جاتا ہے اور محبوبِ حقیقی کی محبتِ ذاتی کے ساتھ زندہ کیا جاتا ہے۔اسی طرح کئی موتیں اس پر وارد ہوتی رہتی ہیں اور کئی حیاتیں۔یہاں تک کہ کامل حیات کے مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے سو وہ کامل حیات جو اس سفلی دنیا کے چھوڑنے کے بعد ملتی ہے وہ جسمِ خاکی کی حیات نہیں بلکہ اَور رنگ اور شان کی حیات ہے۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۳۲)

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿۹۲﴾

اس درجہ سے اوپر جو ابھی ہم نے بہشتیوں اور دوزخیوں کے لئے بیان کیا ہے ایک اور درجہ دخولِ جنت دخولِ جہنم ہے جس کو درمیانی درجہ کہنا چاہیے اور وہ حشر اجساد کے بعد اور جنتِ عظمیٰ یا جہنمِ کبریٰ میں داخل ہونے سے پہلے حاصل ہوتا ہے اور بوجہ تعلق جسدِ کامل قویٰ میں ایک اعلیٰ درجہ کی تیزی پیدا ہو کر اور خدائے تعالیٰ کی

تجلی رحم یا تجلی قہر کا حسبِ حالت اپنے کامل طور پر مشاہد ہو کر اور جنتِ عظمیٰ کو بہت قریب پا کر یا جہنمِ کبریٰ کو بہت ہی قریب دیکھ کر وہ لذات یا عقوبات ترقی پذیر ہو جاتے ہیں جیسا کہ اللہ جل شانہ آپ فرماتا ہے وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (عبس: ۳۹ تا ۴۳)۔ اس دوسرے درجہ میں بھی لوگ مساوی نہیں ہوتے بلکہ اعلیٰ درجہ کے بھی ہوتے ہیں جو بہشتی ہونے کی حالت میں بہشتی انوار اپنے ساتھ رکھتے ہیں.... ایسا ہی دوزخی ہونے کی حالت میں اعلیٰ درجہ کے کفار ہوتے ہیں کہ قبل اس کے جو کامل طور پر دوزخ میں پڑیں ان کے دلوں پر دوزخ کی آگ بھڑکائی جاتی ہے۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۲۸۴)

وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

راقم اس رسالہ نے ایک درویش کو دیکھا کہ وہ سخت گرمی کے موسم میں یہ آیتِ قرآنی پڑھ کر وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ زنبور کو پکڑ لیتا تھا اور اس کی نیش زنی سے بکلی محفوظ رہتا تھا اور خود اس راقم کے تجربہ میں بعض تاثیراتِ عجیبہ آیتِ قرآنی کی آ چکی ہیں جن سے عجائباتِ قدرت حضرت باری جل شانہ معلوم ہوتے ہیں۔ (سرمہ چشمِ آریہ، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۱۰۰)

وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۴﴾

اور کسی طور سے لوگوں کو ان کے مال کا نقصان نہ پہنچاؤ اور فساد کی نیت سے زمین پر مت پھرا کرو۔ یعنی اس نیت سے کہ چوری کریں یا ڈاکہ ماریں یا کسی کی جیب کتریں یا کسی اور ناجائز طریق سے بیگانہ مال پر قبضہ کریں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۷)

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۶﴾

فصاحت اور بلاغت کے بارہ میں فرمایا بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ اور پھر اس کی نظیر مانگی اور کہا کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو اس کی نظیر دو۔ پس عربی مبین کے لفظ سے فصاحت بلاغت کے سوا اور کیا معنے ہو سکتے ہیں۔ خاص کر

جب ایک شخص کہے کہ میں یہ تقریر ایسی زبان میں کرتا ہوں کہ تم اس کی نظیر پیش کرو تو بجز اس کے کیا سمجھا جائے گا کہ وہ کمال بلاغت کا مدعی ہے اور مبین کا لفظ بھی اسی کو چاہتا ہے۔

(جنگِ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۹۱)

اور یہ کتاب عربی فصیح بلیغ میں ہے۔ (کرامات الصادقین، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۵۹)

وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۵﴾

ہر وقت انسان کو فکر کرنی چاہیے کہ جس طرح ممکن ہو عورتوں اور مردوں کو اس امرِ الٰہی سے اطلاع کر دیوے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اپنے قبیلہ کا شیخ اسی طرح سوال کیا جائے گا جیسے کسی قوم کا نبی۔ غرض جو موقع مل سکے اسے کھونا نہیں چاہیے۔ زندگی کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ کا حکم ہوا تو آپ نے نام بنام سب کو خدا کا پیغام پہنچا دیا۔ ایسا ہی میں نے بھی کئی مرتبہ عورتوں اور مردوں کو مختلف موقعوں پر تبلیغ کی ہے اور اب بھی کبھی کبھی گھر میں وعظ سنایا کرتا ہوں۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۴۴ مورخہ ۳۰ رنومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۸﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۹﴾ وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۲۰﴾

خدا پر توکل کر جو غالب اور رحم کرنے والا ہے۔ وہی خدا جو تجھے دیکھتا ہے جب تو دعا اور دعوت کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ وہی خدا جو تجھے اس وقت دیکھتا تھا کہ جب تو تخم کے طور پر راست بازوں کی پشتوں میں چلا آتا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی بزرگ والدہ آمنہ معصومہ کے پیٹ میں پڑا۔

(تریاق القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۲۸۱)

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۲﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۳﴾

واضح ہو کہ شیطانی الہامات ہونا حق ہے اور بعض ناتمام سالک لوگوں کو ہوا کرتے ہیں اور حدیث النفس بھی ہوتی ہے جس کو اضغاث احلام کہتے ہیں اور جو شخص اس سے انکار کرے وہ قرآن شریف کی مخالفت کرتا

ہے کیونکہ قرآن شریف کے بیان سے شیطانی الہام ثابت ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تک انسان کا تزکیہ نفس پورے اور کامل طور پر نہ ہو تب تک اس کو شیطانی الہام ہوسکتا ہے اور وہ آیت عَلٰی کُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ کے نیچے آسکتا ہے مگر پاکوں کو شیطانی وسوسہ پر بلاتوقف مطلع کیا جاتا ہے۔

(ضرورت الامام، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۴۸۳، ۴۸۴)

کیا میں بتلاؤں کہ کن پر شیطان اترا کرتے ہیں۔ ہر ایک جھوٹے مفتری پر اترتے ہیں۔

(انجامِ آتھم، روحانی خزائن جلد ۱۱ صفحہ ۵۲)

کیا میں تمہیں بتلاؤں کہ کن لوگوں پر شیطان اترا کرتے ہیں۔ ہر ایک جھوٹے مفتری پر اترتے ہیں۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۶۷)

یاد رہے کہ رحمانی الہام اور وحی کے لئے اول شرط یہ ہے کہ انسان محض خدا کا ہوجائے اور شیطان کا کوئی حصہ اس میں نہ رہے کیونکہ جہاں مردار ہے ضرور ہے کہ وہاں کتے بھی جمع ہوجائیں اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ۔ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۔ مگر جس میں شیطان کا حصہ نہیں رہا اور وہ سفلی زندگی سے ایسا دور ہوا کہ گویا مرگیا اور راست باز اور وفادار بندہ بن گیا اور خدا کی طرف آ گیا اس پر شیطان حملہ نہیں کرسکتا۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۴۲)

کیا میں تم کو یہ خبر دوں کہ جنات کن لوگوں پر اترا کرتے ہیں۔ جنات انہیں پر اترا کرتے ہیں کہ جو دروغ گو اور معصیت کار ہیں۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۴۶ حاشیہ)

يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۴﴾

اور اکثر ان کی پیشینگوئیاں جھوٹی ہوتی ہیں۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۴۶ حاشیہ)

وَ الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۵﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۷﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۸﴾

اور شاعروں کی پیروی تو وہی لوگ کرتے ہیں کہ جو گمراہ ہیں کیا تمہیں معلوم نہیں کہ شاعر لوگ قافیہ اور

ردیف کے پیچھے ہر یک جنگل میں بھٹکتے پھرتے ہیں یعنی کسی حقانی صداقت کے پابند نہیں رہتے اور جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں اور ظالموں کو عنقریب معلوم ہوگا کہ ان کا مرجع اور مآب کون سی جگہ ہے۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۲۴۶ حاشیہ نمبر ۱۱)

شاعر تو اگر مر بھی جاویں تو صداقت اور راستی وضرورتِ حقہ کا اپنے کلام میں التزام نہ کرسکیں وہ تو بغیر فضول گوئی کے بول ہی نہیں سکتے اور ان کی ساری کل فضول اور جھوٹ پر ہی چلتی ہے۔ اگر جھوٹ نہیں یا فضول گوئی نہیں تو پھر شعر بھی نہیں۔ اگر تم ان کا فقرہ فقرہ تلاش کرو کہ کس قدر حقائق دقائق ان میں جمع ہیں کس قدر راستی اور صداقت کا التزام ہے۔ کس قدر حق اور حکمت پر قیام ہے۔ کس ضرورتِ حقہ سے وہ باتیں ان کے منہ سے نکلی ہیں اور کیا کیا اسرار بیمثل و مانند ان میں لپٹے ہوئے ہیں تو تمہیں معلوم ہو کہ ان تمام خوبیوں میں سے کوئی بھی خوبی ان کی مردہ عبارات میں پائی نہیں جاتی۔ ان کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ جس طرف قافیہ ردیف ملتا نظر آیا اسی طرف جھک گئے اور جو مضمون دل کو اچھا لگا وہی جھک ماری۔ نہ حق اور حکمت کی پابندی ہے اور نہ فضول گئی سے پرہیز ہے اور نہ یہ خیال ہے کہ اس کلام کے بولنے کے لئے کون سی سخت ضرورت درپیش ہے اور اس کے ترک کرنے میں کون سا سخت نقصان عائد حال ہے ناحق بے فائدہ فقرہ سے فقرہ ملاتے ہیں۔ سر کی جگہ پاؤں، پاؤں کی جگہ سر لگاتے ہیں۔ سراب کی طرح چمک تو بہت ہے پر حقیقت دیکھو تو خاک بھی نہیں۔ شعبدہ باز کی طرح صرف کھیل ہی کھیل اصلیت دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ نادار ناطاقت اور ناتواں اور گئے گزرے ہیں۔ آنکھیں اندھی اور اس پر عشوہ گری۔ ان کی نسبت نہایت ہی نرمی کیجئے تو یہ کہیے کہ وہ سب ضعیف اور ہیچ ہونے کی وجہ سے عنکبوت کی طرح ہیں اور ان کے اشعار بیتِ عنکبوت ہیں ان کی نسبت خداوند کریم نے خوب فرمایا ہے وَ الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ۔ وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ۔۔۔۔۔ وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ یعنی شاعروں کے پیچھے وہی لوگ چلتے ہیں جنہوں نے حق اور حکمت کا راستہ چھوڑ دیا ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ شاعر تو وہ لوگ ہیں جو قافیہ اور ردیف اور مضمون کی تلاش میں ہر یک جنگل میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ حقانی باتوں پر ان کا قدم نہیں جمتا اور جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ سو ظالم لوگ جو خدا کے حقانی کلام کو شاعروں کے کلام اسے تشبیہ دیتے ہیں انہیں عنقریب معلوم ہوگا کہ کس طرف پھریں گے۔

(براہین احمدیہ چہار حص، روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۴۶۷ تا ۴۷۰ حاشیہ)

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں فصاحت بلاغت کا زور تھا اس لئے آپؐ کو قرآن کریم بھی ایک معجزہ اسی رنگ کا ملا۔ یہ رنگ اس لئے اختیار کیا کہ شعراء جادو بیان سمجھے جاتے تھے اور ان کی زبان میں اتنا اثر تھا کہ وہ جو چاہتے تھے چند شعر پڑھ کر کرا لیتے تھے........ان کے پاس زبان تھی جو دلیری اور حوصلہ پیدا کر دیتی تھی۔ ہر حربہ میں وہ شعر سے کام لیتے تھے اور فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ کے مصداق تھے اس لئے اس وقت ضروری تھا کہ خدا تعالیٰ اپنا کلام بھیجتا۔ پس خدا تعالیٰ نے اپنا کلام نازل فرمایا اور اسی کلام کے رنگ میں اپنا معجزہ پیش کر دیا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴/اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تفسیر سورۃ النّمل

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۹

جب موسیٰ آیا تو پکارا گیا کہ برکت دیا گیا ہے جو آگ میں ہے اور جو آگ کے گرد ہے اور اللہ تعالیٰ پاک ہے تجسم اور تحیز سے اور وہ رب ہے تمام عالموں کا۔ اب دیکھئے اس آیت میں صاف فرما دیا کہ جو آگ میں ہے اور جو اس کے گرد میں ہے اس کو برکت دی گئی اور خدا تعالیٰ نے پکار کر اس کو برکت دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آگ میں وہ چیز تھی جس نے برکت پائی نہ کہ برکت دینے والا۔ وہ تو نُوْدِيَ کے لفظ میں آپ اشارہ فرما رہا ہے کہ اس نے آگ کے اندر اور گرد کو برکت دی۔ اس سے ثابت ہوا کہ آگ میں خدا نہیں تھا اور نہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے بلکہ اللہ جلشانہ اس وہم کا خود دوسری آیت میں ازالہ فرماتا ہے۔ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی خدا تعالیٰ اس حلول اور نزول سے پاک ہے وہ ہر ایک چیز کا رب ہے۔

(جنگِ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۰۷)

وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۱۵

اور لوگوں نے محض ظلم کی راہ سے انکار کیا حالانکہ ان کے دل یقین کر گئے۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۷۰ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴)

انہوں نے موسیٰ کے نشانوں کا انکار کیا لیکن ان کے دل یقین کر گئے۔

(الحق مباحثہ دہلی، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۱۶۶)

وَ اسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ...ان کے دل ان نشانوں پر یقین کر گئے ہیں اور دلوں میں انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ اب گریز کی جگہ نہیں۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۹۲ حاشیہ درحاشیہ نمبر ۳)

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

پھر چوتھی حالت کے بعد پانچویں حالت ہے جس کے مفاسد سے نہایت سخت اور شدید محبت نفسِ امارہ کو ہے کیونکہ اس مرتبہ پر صرف ایک لڑائی باقی رہ جاتی ہے اور وہ وقت قریب آجاتا ہے کہ حضرت عزت جل شانہ کے فرشتے اس وجود کی تمام آبادی کو فتح کرلیں اور اس پر اپنا پورا تصرف اور دخل کرلیں اور تمام نفسانی سلسلہ کو درہم برہم کردیں اور نفسانی قویٰ کے قریہ کو ویران کردیں اور اس کے نمبرداروں کو ذلیل اور پست کرکے دکھلادیں اور پہلی سلطنت پر ایک تباہی ڈال دیں اور انقلاب سلطنت پر ایسا ہی ہوا کرتا ہے اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ۔ اور یہ مومن کے لئے ایک آخری امتحان اور آخری جنگ ہے جس پر اس کے تمام مراتب سلوک ختم ہوجاتے ہیں اور اس کا سلسلہ ترقیات جو کسب اور کوشش سے ہے انتہا تک پہنچ جاتا ہے اور انسانی کوششیں اپنے اخیر نقطہ تک منزل طے کر لیتی ہیں پھر بعد اس کے صرف موہبت اور فضل کا کام باقی رہ جاتا ہے جو خلق آخر کے متعلق ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۲۳۸)

جب بادشاہ کسی گاؤں میں داخل ہوتے ہیں تو پہلا تانا بانا سب تباہ کردیتے ہیں۔ بڑے بڑے نمبردار رئیس، نواب ہی پہلے پکڑے جاتے ہیں اور بڑے بڑے نامور ذلیل کئے جاتے ہیں اور اس طرح پر ایک تغیر عظیم واقع ہوتا ہے یہی ملوک کا خاصہ ہے اور ایسا ہی ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے۔ اسی طرح پر جب روحانی سلطنت بدلتی ہے تو پہلی سلطنت پر تباہی آتی ہے۔ شیطان کے غلاموں کو قابو کیا جاتا ہے وہ جذبات اور شہوات جو انسان کی روحانی سلطنت میں مفسدہ پردازی کرتے ہیں ان کو کچل دیا جاتا ہے اور ذلیل کیا جاتا ہے اور روحانی طور پر ایک نیا سکہ بیٹھ جاتا ہے اور بالکل امن وامان کی حالت پیدا ہوجاتی ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ ؍جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

قِيۡلَ لَهَا ادۡخُلِي الصَّرۡحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتۡهُ حَسِبَتۡهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتۡ عَنۡ سَاقَيۡهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِيۡرَ ؕ قَالَتۡ رَبِّ اِنِّيۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِيۡ وَ اَسۡلَمۡتُ مَعَ سُلَيۡمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۵﴾

منجملہ انسان کی طبعی حالتوں کے جو اس کی فطرت کو لازم پڑی ہوئی ہیں ایک برتر ہستی کی تلاش ہے جس کے لئے اندر ہی اندر انسان کے دل میں ایک کشش موجود ہے اور اس تلاش کا اثر اسی وقت سے محسوس ہونے لگتا ہے جبکہ بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے کیونکہ بچہ پیدا ہوتے ہی پہلے روحانی خاصیت اپنی جو دکھاتا ہے وہ یہی ہے کہ ماں کی طرف جھکا جاتا ہے اور طبعاً اپنی ماں کی محبت رکھتا ہے اور پھر جیسے جیسے حواس اس کے کھلتے جاتے ہیں اور شگوفہ فطرت اس کا کھلتا جاتا ہے یہ کشش محبت جو اس کے اندر چھپی ہوئی تھی اپنا رنگ وروپ نمایاں طور پر دکھاتی چلی جاتی ہے پھر تو یہ ہوتا ہے کہ بجز اپنی ما کی گود کے کسی جگہ آرام نہیں پاتا اور پورا آرام اس کا اسی کے کنارِ عاطفت میں ہوتا ہے اور اگر ماں سے علیحدہ کر دیا جائے اور دور ڈال دیا جاوے تو تمام عیش اس کا تلخ ہو جاتا ہے اور اگر چہ اس کے آگے نعمتوں کا ایک ڈھیر ڈال دیا جاوے تب بھی وہ اپنی سچی خوشحالی ما کی گود میں ہی دیکھتا ہے اور اس کے بغیر کسی طرح آرام نہیں پاتا۔ سو وہ کششِ محبت جو اس کو اپنی ما کی طرف پیدا ہوتی ہے وہ کیا چیز ہے؟

درحقیقت یہ وہی کشش ہے جو معبودِ حقیقی کے لئے بچہ کی فطرت میں رکھی گئی ہے بلکہ ہر ایک جگہ جو انسان تعلقِ محبت پیدا کرتا ہے درحقیقت وہی کشش کام کر رہی ہے اور ہر ایک جگہ جو یہ عاشقانہ جوش دکھلاتا ہے درحقیقت اسی محبت کا وہ ایک عکس ہے گویا دوسری چیزوں کو اُٹھا اُٹھا کر ایک گم شدہ چیز کی تلاش کر رہا ہے جس کا اب نام بھول گیا ہے۔ سو انسان کا مال یا اولاد یا بیوی سے محبت کرنا یا کسی خوش آواز کے گیت کی طرف اس کی روح کا کھنچے جانا درحقیقت اسی گم شدہ محبوب کی تلاش ہے اور چونکہ انسان اس دقیق در دقیق ہستی کو جو آگ کی طرح ہر ایک میں مخفی اور سب پر پوشیدہ ہے اپنی جسمانی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا اور نہ اپنی ناتمام عقل سے اس کو پا سکتا ہے۔ اس لئے اس کی معرفت کے بارے میں انسان کو بڑی بڑی غلطیاں لگی ہیں اور سہو کاریوں سے اس کا حق دوسرے کو دیا گیا ہے۔ خدا نے قرآن شریف میں یہ خوب مثال دی ہے کہ دنیا ایک ایسے شیش محل کی طرح ہے جس کی زمین کا فرش نہایت مصفّا شیشوں سے کیا گیا ہے اور پھر ان شیشوں کے نیچے پانی

چھوڑا گیا ہے جو نہایت تیزی سے چل رہا ہے اب ہر ایک نظر جو شیشوں پر پڑتی ہے وہ اپنی غلطی سے ان شیشوں کو بھی پانی سمجھ لیتی ہے اور پھر انسان ان شیشوں پر چلنے سے ایسا ڈرتا ہے جیسا کہ پانی سے ڈرنا چاہیے حالانکہ وہ درحقیقت شیشے ہیں مگر صاف اور شفاف۔ سو یہ بڑے بڑے اجرام جو نظر آتے ہیں جیسے آفتاب و ماہتاب وغیرہ۔ یہ وہی صاف شیشے ہیں جن کی غلطی سے پرستش کی گئی اور ان کے نیچے ایک اعلیٰ طاقت کام کر رہی ہے جو ان شیشوں کے پردہ میں پانی کی طرح بڑی تیزی سے چل رہی ہے اور مخلوق پرستوں کی نظر کی یہ غلطی ہے کہ انہیں شیشوں کی طرف اس کام کو منسوب کر رہے ہیں جو ان کے نیچے کی طاقت دکھلا رہی ہے۔ یہی تفسیر اس آیتِ کریمہ کی ہے اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ غرض چونکہ خدا تعالیٰ کی ذات باوجود نہایت روشن ہونے کے پھر بھی نہایت مخفی ہوتی ہے اس لئے اس کی شناخت کے لئے صرف یہ نظام جسمانی جو ہماری نظروں کے سامنے ہے کافی نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ ایسے نظام پر مدار رکھنے والے باوجودیکہ اس ترتیب ابلغ اور محکم کو جو صدہا عجائبات پر مشتمل ہے نہایت غور کی نظر سے دیکھتے رہے بلکہ ہیئت اور طبعی اور فلسفہ میں وہ مہارتیں پیدا کیں کہ گویا زمین و آسمان کے اندر دھنس گئے مگر پھر بھی شکوک وشبہات کی تاریکی سے نجات نہ پا سکے اور اکثر ان کے طرح طرح کی خطاؤں میں مبتلا ہو گئے اور بیہودہ اوہام میں پڑ کر کہیں کے کہیں چلے گئے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۶۳ تا ۳۶۵)

اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ تمام کام جو یہ جسمانی آفتاب کر رہا ہے وہ سب کام اس حقیقی آفتاب کے ظل ہیں اور یہ نہیں کہ وہ صرف روحانی کام کرتا ہے بلکہ جس قدر اس جسمانی سورج کے کام ہیں وہ اس کے اپنے کام نہیں ہیں بلکہ درحقیقت اسی معبودِ حقیقی کی پوشیدہ طاقت اس کے اندر وہ تمام کام کر رہی ہے جیسا کہ اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن شریف میں ایک ملکہ کا قصہ لکھا ہے جو آفتاب پرست تھی اور اس کا نام بلقیس تھا اور وہ اپنے ملک کی باشاہ تھی اور ایسا ہوا کہ اس وقت کے نبی نے اس کو دھمکی دے بھیجی کہ تجھے ہمارے پاس حاضر ہونا چاہیے ورنہ ہمارا لشکر تیرے پر چڑھائی کرے گا اور پھر تیری خیر نہیں ہوگی۔ پس وہ ڈر گئی اور اس نبی کے پاس حاضر ہونے کے لئے اپنے شہر سے روانہ ہوئی اور قبل اس کے کہ وہ حاضر ہو اس کو متنبہ کرنے کے لئے ایک ایسا محل طیار کیا گیا جس پر نہایت مصفا شیشہ کا فرش تھا اور اس فرش کے نیچے نہر کی طرح ایک وسیع خندق طیار کی گئی تھی جس میں پانی بہتا تھا اور پانی میں مچھلیاں چلتی تھیں۔ جب وہ ملکہ اس جگہ پہنچی تو اس کو حکم دیا گیا کہ محل کے اندر آ جا تب اس نے نزدیک جا کر دیکھا کہ پانی زور سے بہہ رہا ہے اور اس میں

مچھلیاں ہیں۔ اس نظارہ سے اس پر یہ اثر ہوا کہ اس نے اپنی پنڈلیوں پر سے کپڑا اُٹھالیا کہ ایسا نہ ہو کہ پانی میں تر ہو جائے تب اس نبی نے اس ملکہ کو جس کا نام بلقیس تھا آواز دی کہ اے بلقیس تو کس غلطی میں گرفتار ہو گئی یہ تو پانی نہیں ہے جس سے ڈر کر تو نے پاجامہ اوپر اٹھالیا یہ تو شیشہ کا فرش ہے اور پانی اس کے نیچے ہے۔ اس مقام میں قرآن شریف میں یہ آیت ہے قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ یعنی اس نبی نے کہا کہ اے بلقیس تو کیوں دھوکا کھاتی ہے یہ تو شیش محل کے شیشے ہیں جو اوپر کی سطح پر بطور فرش کے لگائے گئے ہیں اور پانی جو زور سے بہہ رہا ہے وہ تو ان شیشوں کے نیچے ہے نہ کہ یہ خود پانی ہیں تب وہ سمجھ گئی کہ میری مذہبی غلطی پر مجھے ہوشیار کیا گیا ہے اور میں نے فی الحقیقت جہالت کی راہ اختیار کر رکھی تھی جو سورج کی پوجا کرتی تھی تب وہ خدائے واحد لاشریک پر ایمان لائی اور اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے یقین کر لیا کہ وہ طاقتِ عظمیٰ جس کی پرستش کرنی چاہیے وہ تو اور ہے اور میں دھوکہ میں رہی اور سطحی چیز کو معبود ٹھہرایا اور اس نبی کی تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ دنیا ایک شیش محل ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور عناصر وغیرہ جو کچھ کام کر رہے ہیں یہ دراصل ان کے کام نہیں یہ تو بطور شیشوں کے ہیں بلکہ ان کے نیچے ایک طاقت مخفی ہے جو خدا ہے یہ سب اس کے کام ہیں اس نظارہ کو دیکھ کر بلقیس نے سچے دل سے سورج کی پوجا سے توبہ کی اور سمجھ لیا کہ وہ طاقت ہی اور ہے کہ سورج وغیرہ سے کام کراتی ہے اور یہ تو صرف شیشے ہیں۔ (نسیمِ دعوت، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۴۱۰، ۴۱۱)

مختلف رنگوں اور پیرایوں اور عالموں میں جو دنیا کا نظام قائم رکھنے کے لئے زمین آسمان کی چیزیں کام کر رہی ہیں۔ یہ وہ نہیں کام کرتیں بلکہ خدائی طاقت ان کے نیچے کام کر رہی ہے جیسا کہ دوسری آیت میں بھی فرمایا صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ یعنی دنیا ایک شیش محل ہے جس کے شیشوں کے نیچے زور سے پانی چل رہا ہے اور نادان سمجھتا ہے کہ یہی شیشے پانی ہیں حالانکہ پانی ان کے نیچے ہے۔

(نسیمِ دعوت، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۴۲۵)

قرآن شریف میں ایک شاہزادی بلقیس نام کا ایک عجیب قصہ لکھا ہے جو سورج کی پوجا کرتی تھی شائد وید کی پیرو تھی حضرت سلیمان نے اس کو بلایا اور اس کے آنے سے پہلے ایسا محل طیار کیا جس کا فرش شیشہ کا تھا اور شیشہ کے نیچے پانی بہہ رہا تھا۔ جب بلقیس نے حضرت سلیمانؑ کے پاس جانے کا قصد کیا تو اس نے اس شیشہ کو پانی سمجھا اور اپنا پاجامہ پنڈلی سے اوپر اٹھالیا۔ حضرت سلیمان نے کہا کہ دھوکہ مت کھا یہ پانی نہیں ہے بلکہ یہ شیشہ ہے پانی اس کے نیچے ہے تب وہ عقلمند عورت سمجھ گئی کہ اس پیرایہ میں میرے مذہب کی غلطی انہوں

نے ظاہر کی ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ سورج اور چاند اور دوسرے روشن اجرام شیشہ کی مانند ہیں اور ایک پوشیدہ طاقت ہے جو ان کے پردہ کے نیچے کام کر رہی ہے اور وہی خدا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں اس جگہ فرمایا صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ یعنی یہ ایک محل ہے شیشوں سے بنایا گیا۔سو دنیا کو خدا نے شیش محل سے مثال دی ہے جاہل ان شیشوں کی پرستش کرتے ہیں اور دانا اس پوشیدہ طاقت کے پرستار ہیں مگر وید نے اس شیش محل کی طرف کچھ اشارہ نہیں کیا اور ان ظاہر شیشوں کو پرمیشور سمجھ لیا اور پوشیدہ طاقت سے بے خبر رہا۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۹۰)

ہمارا تو یہ ایمان اور مذہب ہے کہ ایک فوق الفوق قادر ہستی ہے جو ہم پر کام کرتی ہے جدھر چاہتی ہے لے جاتی ہے وہ خالق ہے ہم مخلوق ہیں۔وہ حی قیوم ہے اور ہم ایک عاجز مخلوق۔قرآن شریف میں جو حضرت سلیمانؑ اور بلقیس کا ذکر ہے کہ اس نے پانی کو دیکھ کر اپنی پنڈلی سے کپڑا اُٹھایا۔اس میں بھی یہی تعلیم ہے جو حضرت سلیمانؑ نے اس عورت کو دی تھی وہ دراصل آفتاب پرستی کرتی تھی۔اس کو اس طریق سے انہوں نے سمجھایا کہ جیسے یہ پانی شیشہ کے اندر چل رہا ہے دراصل او پر شیشہ ہی ہے۔اسی طرح پر آفتاب کو روشنی اور ضیاء بخشنے والی ایک اور زبردست طاقت ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰؍اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

اس جگہ ایک قرآنی نکتہ کو جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو اس کی آفتاب پرستی کی غلطی پر آگاہ کرنے کے لئے صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ کی شکل میں دکھایا یاد رکھنے کے قابل ہے چنانچہ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اجرامِ علوی و اجسام سفلی میں نظر آتا ہے جن میں سے بعض کی جاہل لوگ پرستش بھی کرتے ہیں تمام یہ چیزیں ہیچ اور معدوم محض ہیں پرستش کے لائق نہیں۔ اور جو کچھ بظاہر ان میں طاقتیں نظر آتی ہیں ان کی طرف منسوب کرنا ایک دھوکہ ہے بلکہ ایک ہی طاقتِ عظمٰی ان سب کے نیچے پوشیدہ ہے کہ جو درحقیقت ان سے الگ ہے اور وہی یہ سب کرشمے دکھلا رہی ہے جیسا اس صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ کے نیچے پانی تھا اور اس صَرْحٌ کا عین نہیں تھا بلکہ اس سے الگ تھا مگر بلقیس کی نظر سقیم میں عین دکھائی دیا تھا تب ہی اس نے ان شیشوں کو بہتے پانی کے دریا کی طرح سمجھا اور اپنی پنڈلیوں پر سے پاجامہ اُٹھا لیا۔ یہ اس کو ایسا ہی دھوکا لگا تھا جیسا اس کو آفتاب پرستی میں لگا تھا کہ وہ طاقتِ عظمٰی اس کو نظر نہ آئی کہ جو در پردہ آفتاب سے عجائب کام ظہور میں لاتی اور اس سے الگ تھی۔اسی طرح دنیا ایک ایسے شیش محل کی طرح ہے جس کی زمین کا فرش نہایت مصفّا شیشوں سے کیا گیا اور پھر ان شیشوں کے نیچے پانی چھوڑا گیا ہے جو

نہایت تیزی سے چل رہا ہے۔ اب ہر ایک نظر جو شیشوں پر پڑتی ہے وہ اپنی غلطی سے ان شیشوں کو بھی پانی سمجھ لیتی ہے اور پھر انسان ان شیشوں پر چلنے سے ایسا ڈرتا ہے جیسے پانی سے۔ حالانکہ وہ درحقیقت شیشے ہیں۔ سو یہ نکتہ کہ جو تمام عالم کے انکشاف حقیقت کے لئے عمدہ ترین اصول ہے اہل اللہ سے بہت مناسبت رکھتا ہے اور جس طرح اللہ جل شانہ نے بلقیس کی نسبت فرمایا ہے فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ یعنی بلقیس نے اس شیش محل کو جس کا فرش مصفّا اور شفاف شیشے تھے اور نیچے ان کے پانی بہتا تھا اپنی غلط فہمی سے بہتا پانی خیال کیا۔ ایسا ہی اہل اللہ کی نسبت لوگ دھوکا کھاتے ہیں یعنی وہ پانی جو ان کی شیشوں کے فرش کے نیچے یعنی ان کی فانی حالت کے تحت منجانب اللہ بہتا ہے اور کبھی اپنی سختی اور کبھی اپنی نرمی دکھاتا ہے اور کبھی تلخ اور شور اور بے مزہ کی صورت میں اور کبھی شیریں اور خوشگوار پانی کی شکل میں نظر آتا ہے اور کبھی طوفان کی طرح قوت غضبی کے زور سے بہتا ہے اور کبھی نہایت آہستگی اختیار کرتا ہے۔ اس پانی کو جاہل خیال کرتا ہے کہ یہ نفسانی جذبات کا پانی ہے اور اہل اللہ کی شانِ عظیم سے منکر ہو جاتا ہے یا شک میں پڑ جاتا ہے حالانکہ ان کا نفس بہت سے صیقلوں کے شیشہ کی صفت پر آ گیا ہے اور جو کچھ ایک جاہل کو پانی اور پانی کا زور نظر آتا ہے وہ الٰہی چشمہ ہے جو اس شیشہ کے نیچے بہتا ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝

اور شہر میں نو[۹] شخص ایسے تھے جن کا پیشہ ہی فساد تھا اور اصلاح کے روادار نہ تھے انہوں نے باہم قسمیں کھائیں کہ رات کو پوشیدہ طور پر شبخون مار کر اس شخص کو اور اس کے گھر والوں کو قتل کر دو اور پھر ہم اس کے وارث

کو جو خون کا دعویدار ہوگا یہ کہیں گے کہ ہم تو ان لوگوں کو قتل کرنے کے وقت اس موقع پر حاضر نہ تھے اور ہم سچ سچ کہتے ہیں یعنی یہ بہانہ بنائیں گے کہ ہم تو قتل کرنے کے وقت فلاں فلاں جگہ گئے ہوئے تھے جیسا کہ اب بھی مجرم لوگ ایسے ہی بہانے بنایا کرتے ہیں تا مقدمہ نہ چلے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو دیکھ کہ ان کے مکر کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے ان کو اور ان کے تمام قوم کو ہلاک کر دیا اور یہ گھر جو ویران پڑے ہوئے ہیں یہ انہیں کے گھر ہیں ہم نے اس لئے ان کو یہ سزا دی کہ یہ ہمارے برگزیدہ بندوں پر ظلم کرتے تھے اور باز نہیں آتے تھے۔ پس ہمارا یہ عذاب ان لوگوں کے لئے ایک نشان ہے جو جانتے ہیں اور ہم نے ان ظالم لوگوں کے ہاتھ سے ان ایمانداروں کو نجات دے دی جو متقی اور پرہیز گار تھے۔ سو خدا کا مکر یہ تھا کہ جب شریر آدمی شرارت میں بڑھتے گئے تو ایک مدت تک خدا نے اپنے ارادۂ عذاب کو مخفی رکھا اور جب ان کی شرارت نہایت درجہ تک پہنچ گئی بلکہ انہوں نے ایک بڑا مکر کر کے خدا کے برگزیدوں کو قتل کرنا چاہا تب وہ پوشیدہ عذاب خدا نے ان پر ڈال دیا جس کی ان کو کچھ بھی خبر نہ تھی اور ان کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ اس طرح ہم نیست و نابود کئے جائیں گے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کے برگزیدہ بندوں کو ستانا اچھا نہیں آخر خدا پکڑتا ہے کچھ مدت تک تو خدا اپنے ارادہ کو مخفی رکھتا ہے اور وہی اس کا ایک مکر ہے مگر جب شریر آدمی اپنی شرارت کو انتہاء تک پہنچا دیتا ہے تب خدا اپنے ارادہ کو ظاہر کر دیتا ہے پس نہایت بدقسمت وہ لوگ ہوتے ہیں جو خدا کے برگزیدہ بندوں کے مقابل پر محض شرارت کے جوش سے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں آخر خدا ان کو ہی ہلاک کرتا ہے اس کے بارہ میں رومی صاحب کا یہ شعر نہایت عمدہ ہے۔

تا دلِ مردِ خدا نامد بدرد ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۰۱، ۲۰۲)

وَ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ یعنی کافروں نے اسلام کے مٹانے کے لئے ایک مکر کیا اور ہم نے بھی ایک مکر کیا یعنی یہ کہ ان کو اپنی مکاریوں میں بڑھنے دیا تا وہ ایسے درجہ شرارت پر پہنچ جائیں کہ جو سنت اللہ کے موافق عذاب نازل ہونے کا درجہ ہے۔ اس مقام میں شاہ عبد القادر صاحب کی طرف سے موضح القرآن میں سے ایک نوٹ ہے جس کی عبارت ہم بلفظہٖ درج کرتے ہیں اور وہ یہ ہے یعنی ان کے ہلاک ہونے کے اسباب پورے ہوتے تھے۔ جب تک شرارت حد کو نہ پہنچی تب تک ہلاک نہیں ہوئے۔ تم عبارت دیکھو صفحہ ۵۲۸ قرآن مطبع فتح الکریم۔ ان تمام آیات سے ثابت ہوا کہ عذابِ الٰہی جو دنیا میں نازل

ہوتا ہے وہ تبھی کسی پر نازل ہوتا ہے کہ جب وہ شرارت اور ظلم اور تکبر اور علو اور غلو میں نہایت کو پہنچ جاتا ہے یہ نہیں کہ ایک کافر خوف سے مرا جاتا ہے اور پھر بھی عذاب الٰہی کے لئے اس پر صاعقہ پڑے اور ایک مشرک اندیشۂ عذاب سے جاں بلب ہو اور پھر بھی اس پر پتھر برسیں۔ خداوند تعالیٰ نہایت درجہ کا رحیم اور حلیم ہے۔ عذاب کے طور پر صرف اسی کو اس دنیا میں پکڑتا ہے جو اپنے ہاتھ سے عذاب کا سامان تیار کرے۔

(انوار الاسلام، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۱۵،۱۶)

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۳﴾

خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں ایک جگہ پر اپنی شناخت کی یہ علامت ٹھہرائی ہے کہ تمہارا خدا وہ خدا ہے جو بیقراروں کی دعا سنتا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ پھر جب کہ خدا تعالیٰ نے دعا کی قبولیت کو اپنی ہستی کی علامت ٹھہرائی ہے تو پھر کس طرح کوئی عقل اور حیا والا گمان کر سکتا ہے کہ دعا کرنے پر کوئی آثار صریحہ اجابت کے مترتب نہیں ہوتے اور محض ایک رسمی امر ہے جس میں کچھ بھی روحانیت نہیں۔ میرے خیال میں ہے کہ ایسی بے ادبی کوئی سچے ایمان والا ہرگز نہیں کرے گا جبکہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے کہ جس طرح زمین و آسمان کی صفت پر غور کرنے سے سچا خدا پہنچانا جاتا ہے اسی طرح دعا کی قبولیت کو دیکھنے سے خدا تعالیٰ پر یقین آتا ہے۔ (ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۲۵۹، ۲۶۰)

کلامِ الٰہی میں لفظ مضطر سے وہ ضرر یافتہ مراد ہیں جو محض ابتلاء کے طور پر ضرر یافتہ ہوں نہ سزا کے طور پر۔ لیکن جو لوگ سزا کے طور پر کسی ضرر کے تختۂ مشق ہوں وہ اس آیت کے مصداق نہیں ہیں ورنہ لازم آتا ہے کہ قومِ نوحؑ اور قومِ لوط اور قومِ فرعون وغیرہ کی دعائیں اس اضطرار کے وقت میں قبول کی جاتیں مگر ایسا نہیں ہوا اور خدا کے ہاتھ نے ان قوموں کو ہلاک کر دیا۔ (دافع البلاء، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۲۳۱)

دوسری شرط قبولیت دعا کے واسطے یہ ہے کہ جس کے واسطے انسان دعا کرتا ہو اس کے لئے دل میں درد ہو۔ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳۲ مورخہ ۳۱/اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۳)

یاد رکھو کہ خدا بڑا بے نیاز ہے جب تک کثرت سے اور بار بار اضطراب سے دعا نہیں کی جاتی وہ پروا نہیں کرتا۔ دیکھو کسی کی بیوی یا بچہ بیمار ہو یا کسی پر سخت مقدمہ آ جاوے تو ان باتوں کے واسطے اس کو کیسا اضطراب

ہوتا۔ پس دعا میں بھی جب تک سچی تڑپ اور حالتِ اضطراب پیدا نہ ہو تب تک وہ بالکل بے اثر اور بیہودہ کام ہے۔ قبولیت کے واسطے اضطراب شرط ہے جیسا کہ فرمایا اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۶ مورخہ ۲؍ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞

خدا چاہتا ہے کہ نیکوں کو بچائے اور بدوں کو ہلاک کرے۔ اگر وقت اور تاریخ بتلائی جائے تو ہر ایک شریر سے شریر اپنے واسطے بچاؤ کا سامان کر سکتا ہے۔ اگر وقت کے نہ بتلانے سے پیشگوئی قابل اعتراض ہو جاتی ہے تو پھر تو قرآن شریف کی پیشگوئیوں کا بھی یہی حال ہے۔ وہاں بھی اس قسم کے لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ یہ وعدہ کب پورا ہوگا ہمیں وقت اور تاریخ بتلاؤ۔ مگر بات یہ ہے کہ وعید کی پیشگوئیوں میں تعین نہیں ہوتا ورنہ کافر بھی بھاگ کر بچ جائے۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۱۰ مورخہ ۸؍ جون ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۞

بخاری کے صفحہ ۱۸۳ میں یہ حدیث جو لکھی ہے قَالَ هَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا اس حدیث کو حضرت عائشہ صدیقہ نے اس کے سیدھے اور حقیقی معنے کے رو سے قبول نہیں کیا اس عذر سے کہ یہ قرآن کے معارض ہے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى اور ابنِ عمر کی حدیث کو صرف اسی وجہ سے رد کر دیا ہے کہ ایسے معنے معارض قرآن ہیں۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۶۰۹)

وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ۞ وَ يَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۞ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَ لَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞ وَ وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ۞

دابۃ الارض سے مراد کوئی لایعقل جانور نہیں بلکہ بقول حضرت علی رضی اللہ عنہ آدمی کا نام ہی دابۃ الارض

ہے اور اس جگہ لفظ دابۃ الارض سے ایک ایسا طائفہ انسانوں کا مراد ہے جو آسمانی روح اپنے اندر نہیں رکھتے لیکن زمینی علوم وفنون کے ذریعہ سے منکرینِ اسلام کو لاجواب کرتے ہیں اور اپنا علمِ کلام اور طریق مناظرہ تائید دین کی راہ میں خرچ کر کے بجان و دل خدمتِ شریعت غرّا بجالاتے ہیں۔ سو وہ چونکہ درحقیقت زمینی ہیں آسمانی نہیں اور آسمانی روح کامل طور پر اپنے اندر نہیں رکھتے اس لئے دابۃ الارض کہلاتے ہیں اور چونکہ کامل تزکیہ نہیں رکھتے اور نہ کامل وفاداری، اس لئے چہرہ ان کا تو انسانوں کا ہے مگر بعض اعضاء ان کے بعض دوسرے حیوانات سے مشابہ ہیں۔ اسی کی طرف اللہ جل شانہ اشارہ فرماتا ہے وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ یعنی جب ایسے دن آئیں گے جو کفار پر عذاب نازل ہو اور ان کا وقتِ مقدر قریب آجائے گا تو ہم ایک گروہ دابۃ الارض کا زمین میں سے نکالیں گے وہ گروہ متکلمین کا ہوگا جو اسلام کی حمایت میں تمام ادیانِ باطلہ پر حملہ کرے گا یعنی وہ علماء ظاہر ہوں گے جن کو علمِ کلام اور فلسفہ میں یدِ طولیٰ ہوگا۔ وہ جابجا اسلام کی حمایت میں کھڑے ہو جائیں گے اور اسلام کی سچائیوں کو استدلالی طور پر مشارق مغارب میں پھیلائیں گے اور اس جگہ اَخْرَجْنَا کا لفظ اس وجہ سے اختیار کیا کہ آخری زمانہ میں ان کا خروج ہوگا نہ حدوث یعنی تخمی طور پر یا کم مقدار کے طور پر تو پہلے ہی سے تھوڑے بہت ہر یک زمانہ میں وہ پائے جائیں گے لیکن آخری زمانہ میں بکثرت اور نیز اپنے کمال لائق کے ساتھ پیدا ہوں گے اور حمایتِ اسلام میں جابجا واعظین کے منصب پر کھڑے ہو جائیں گے اور شمار میں بہت بڑھ جائیں گے۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۳۶۹، ۳۷۰)

آثار القیامۃ میں لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھا گیا کہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ دابۃ الارض آپ ہی ہیں تب آپ نے جواب دیا کہ دابۃ الارض میں تو کچھ چارپایوں اور کچھ پرندوں کی بھی مشابہت ہوگی مجھ میں وہ کہاں ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ دابۃ الارض اسم جنس ہے جس سے ایک طائفہ مراد ہے۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۳۶۹ حاشیہ)

دابۃ الارض یعنی وہ علماء و واعظین جو آسمانی قوت اپنے اندر نہیں رکھتے ابتداء سے چلے آتے ہیں لیکن قرآن کا مطلب یہ ہے کہ آخری زمانہ میں ان کی حد سے زیادہ کثرت ہوگی اور ان کے خروج سے مراد وہی ان کی کثرت ہے۔

اور یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جیسی ان چیزوں کے بارے میں جو آسمانی قوت اپنے اندر نہیں

رکھتیں اور آخری زمانہ میں پورے جوش اور طاقت کے ساتھ ظہور کریں گی خروج کا لفظ استعمال ہوا ہے ایسا ہی اس شخص کے بارے میں جو حدیثوں میں لکھا ہے کہ آسمانی وحی اور قوت کے ساتھ ظہور کرے گا نزول کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ سو ان دونوں لفظوں خروج اور نزول میں درحقیقت ایک ہی امر مدّ نظر رکھا گیا ہے۔ یعنی اس بات کا سمجھانا منظور ہے کہ یہ ساری چیزیں جو آخری زمانہ میں ظاہر ہونے والی ہیں باعتبار اپنی قوتِ ظہور کے خروج اور نزول کی صفت سے متصف کی گئی ہیں جو آسمانی قوت کے ساتھ آنے والا تھا اس کو نزول کے لفظ سے یاد کیا گیا اور جو زمینی قوت کے ساتھ نکلنے والا تھا اس کو خروج کے لفظ کے ساتھ پکارا گیا تا نزول کے لفظ کے ساتھ آنے والے کی ایک عظمت سمجھی جائے اور خروج کے لفظ سے ایک خفت اور حقارت ثابت ہو اور نیز یہ بھی معلوم ہو کہ نازل خارج پر غالب ہے۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۳۷۳، ۳۷۴)

زمینی لوگ دابۃ الارض ہیں مسیح السماء نہیں ہیں۔ مسیح السماء آسمان سے اترتا ہے اور اس کا خیال آسمان کو مسح کر کے آتا ہے اور روح القدس اس پر نازل ہوتا ہے اس لئے وہ آسمانی روشنی ساتھ رکھتا ہے لیکن دابۃ الارض کے ساتھ زمین کی غلاظتیں ہوتیں ہیں اور نیز وہ انسان کی پوری شکل نہیں رکھتا بلکہ اس کے بعض اجزاء مسخ شدہ بھی ہوتے ہیں۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۳۷۵، ۳۷۴)

احادیث میں دابۃ الارض کو بھی ایک خاص نام رکھ کر بیان کیا ہے لیکن احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی استعمال کی رو سے عام ہے اور دابۃ الارض کو صحیح مسلم میں ایسے پیرایہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ ایک طرف تو اس کو دجال کی جساسہ ٹھہرادیا گیا ہے اور اسی کی رفیق اور اسی جزیرہ میں رہنے والی جہاں وہ ہے اور ایک طرف حرم مکہ معظّمہ میں صفا کے نیچے اس کو جگہ دے رکھی ہے گویا وہ اس ارضِ مقدس کے نیچے ہے نہ دجال کے پاس اور بیان کیا گیا ہے کہ اسی میں سے اس کا خروج ہوگا۔ اس استعارہ سے یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ دابۃ الارض درحقیقت اسم جسم[1] ایسے علماء کے لئے ہے جو ذوجہتین واقع ہیں۔ ایک تعلق ان کا دین اور حق سے ہے اور ایک تعلق ان کا دنیا اور دجالیت سے۔ اور آخری زمانہ میں ایسے مولویوں اور ملاؤں کا پیدا ہونا کئی جگہ بخاری میں لکھا ہے۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ لوگ حدیث خیر البریہ پڑھیں گے اور قرآن کی بھی تلاوت کرتے ہوں گے لیکن قرآن ان کے حلق کے نیچے نہیں اترے گا۔ سو یہ وہی زمانہ ہے۔ انہیں لوگوں کی ملاقات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈرایا ہے اور فرمایا ہے فَاعْتَزِلْ تِلْكَ الْفِرَقَ كُلَّهَا وَلَوْ اَنْ تَعُضَّ بِاَصْلِ شَجَرَةٍ حَتّٰى يُدْرِكَكَ الْمَوْتُ وَ اَنْتَ عَلٰى ذٰلِكَ۔ صفحہ ۵۰۹ بخاری۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۵۹۳، ۵۹۴)

---

[1] نقل مطابق اصل ''اسم جنس'' پڑھا جائے۔ ناشر

رؤیا لکھتا ہوں جو طاعون کی نسبت مجھے ہوئی اور وہ یہ کہ مَیں نے ایک جانور دیکھا جس کا قد ہاتھی کے قد کے برابر تھا مگر مُنہ آدمی کے مُنہ سے ملتا تھا اور بعض اعضاء دوسرے جانوروں سے مشابہ تھے اور مَیں نے دیکھا کہ وہ یُوں ہی قدرت کے ہاتھ سے پیدا ہو گیا اور مَیں ایک ایسی جگہ پر بیٹھا ہوں جہاں چاروں طرف بَن ہیں جن میں بیل، گدھے، گھوڑے، کتے، سور، بھیڑیے، اونٹ وغیرہ ہر ایک قسم کے موجود ہیں اور میرے دل میں ڈالا گیا کہ یہ سب انسان ہیں جو بدعملوں سے اِن صورتوں میں ہیں۔ اور پھر مَیں نے دیکھا کہ وہ ہاتھی کی ضخامت کا جانور جو مختلف شکلوں کا مجموعہ ہے جو محض قدرت سے زمین میں سے پَیدا ہو گیا ہے وہ میرے پاس آ بیٹھا ہے اور قطب کی طرف اُس کا منہ ہے خاموش صورت ہے آنکھوں میں بہت حیا ہے اور بار بار چند منٹ کے بعد اُن بنوں میں سے کسی بَن کی طرف دوڑتا ہے اور جب بَن میں داخل ہوتا ہے تو اُس کے داخل ہونے کے ساتھ ہی شور قیامت اُٹھتا ہے اور ان جانوروں کو کھانا شروع کرتا ہے اور ہڈیوں کے چابنے کی آواز آتی ہے۔ تب وہ فراغت کرکے پھر میرے پاس آ بیٹھتا ہے اور شاید دس منٹ کے قریب بیٹھا رہتا ہے اور پھر دوسرے بَن کی طرف جاتا ہے اور وہی صورت پیش آتی ہے جو پہلے آئی تھی اور پھر میرے پاس آ بیٹھتا ہے۔ آنکھیں اُس کی بہت لمبی ہیں اور مَیں اس کو ہر ایک دفعہ جو میرے پاس آتا ہے خوب نظر لگا کر دیکھتا ہوں اور وہ اپنے چہرہ کے اندازہ سے مجھے یہ بتلاتا ہے کہ میرا اِس میں کیا قصور ہے مَیں مامور ہوں اور نہایت شریف اور پرہیزگار جانور معلوم ہوتا ہے اور کچھ اپنی طرف سے نہیں کرتا بلکہ وہی کرتا ہے جو اس کو حکم ہوتا ہے۔ تب میرے دل میں ڈالا گیا کہ یہی طاعون ہے اور یہی وہ دابّۃ الارض ہے جس کی نسبت قرآن شریف میں وعدہ تھا کہ آخری زمانہ میں ہم اس کو نکالیں گے اور وہ لوگوں کو اس لئے کاٹے گا کہ وہ ہمارے نشانوں پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ۔ اور جب مسیح موعود کے بھیجنے سے خدا کی حجت اُن پر پوری ہو جائے گی تو ہم زمین میں سے ایک جانور نکال کر کھڑا کریں گے وہ لوگوں کو کاٹے گا اور زخمی کرے گا اس لئے کہ لوگ خدا کے نشانوں پر ایمان نہیں لائے تھے۔ دیکھو سورۃ النمل الجزو نمبر ۲۰۔

اور پھر آگے فرمایا ہے وَ يَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ۔ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَ لَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ وَ وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ۔ ترجمہ۔ اُس دن ہم ہر ایک اُمت میں سے اس گروہ کو جمع کریں گے جو ہمارے

نشانوں کو جھٹلاتے تھے اور اُن کو ہم جُدا جُدا جماعتیں بناویں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ عدالت میں حاضر کئے جائیں گے تو خدائے عزّوجلّ اُن کو کہے گا کہ کیا تم نے میرے نشانوں کی بغیر تحقیق کے تکذیب کی یہ تم نے کیا کیا اوران پر بوجہ اُن کے ظالم ہونے کے حجت پُوری ہوجائے گی اور وہ بول نہ سکیں گے۔ سُورۃ النمل الجزو نمبر ۲۰۔

اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہی دابّۃ الارض جو ان آیات میں مذکور ہے جس کا مسیح موعود کے زمانہ میں ظاہر ہونا ابتدا سے مقرر ہے۔ یہی وہ مختلف صورتوں کا جانور ہے جو مجھے عالم کشف میں نظر آیا اور دل میں ڈالا گیا کہ یہ طاعون کا کیڑا ہے اور خدا تعالیٰ نے اس کا نام دابّۃ الارض رکھا کیونکہ زمین کے کیڑوں میں سے ہی یہ بیماری پیدا ہوتی ہے اسی لئے پہلے چُوہوں پر اس کا اثر ہوتا ہے اور مختلف صُورتوں میں ظاہر ہوتی ہے اور جیسا کہ انسان کو ایسا ہی ہر ایک جانور کو یہ بیماری ہوسکتی ہے اِسی لئے کشفی عالم میں اس کی مختلف شکلیں نظر آئیں۔ اور اس بیان پر کہ دابّۃ الارض درحقیقت مادہ طاعون کا نام ہے جس سے طاعون پیدا ہوتی ہے مفصلہ ذیل قرائن اور دلائل ہیں۔

(۱) اوّل یہ کہ دابّۃ الارض کے ساتھ عذاب کا ذکر کیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ یعنی جب اُن پر آسمانی نشانوں اور عقلی دلائل کے ساتھ حجت پوری ہوجائے گی تب دابّۃ الارض زمین میں سے نکالا جائے گا۔ اب ظاہر ہے کہ دابّۃ الارض عذاب کے موقعہ پر زمین سے نکالا جائے گا نہ یہ کہ یُوں ہی بیہودہ طور پر ظاہر ہوگا جس کا نہ کچھ نفع نہ نقصان۔ اور اگر کہو کہ طاعون تو ایک مرض ہے مگر دابّۃ الارض لغوی معنوں کے رُو سے ایک کیڑا ہونا چاہیئے جو زمین میں سے نکلے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حال کی تحقیقات سے یہی ثابت ہوا ہے کہ طاعون کو پیدا کرنے والا وہی ایک کیڑا ہے جو زمین میں سے نکلتا ہے بلکہ ٹیکا لگانے کے لئے وہی کیڑے جمع کئے جاتے ہیں اور اُن کا عرق نکالا جاتا ہے اور خوردبین سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی شکل یُوں ہے (۰۰) یعنی بہ شکل دو نقطہ۔ گویا آسمان پر بھی نشان کسوف خسوف دو کے رنگ میں ظاہر ہوا اور ایسا ہی زمین میں۔

(۲) دوسرا قرینہ یہ ہے کہ قرآن شریف کے بعض مقامات بعض کی تفسیر ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن شریف میں جہاں کہیں یہ مرکب لفظ آیا ہے۔ اس سے مُراد کیڑا لیا گیا ہے مثلاً یہ آیت فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ (سبا : ۱۵) یعنی ہم نے سلیمان پر جب موت کا حکم جاری کیا تو جنّات کو کسی نے اُن کے مرنے کا پتہ نہ دیا مگر گھن کے کیڑے نے کہ جو سلیمان کے عصا

کو کھاتا تھا۔ سورۃ السبا الجزو نمبر ۲۲۔ اب دیکھو اِس جگہ بھی ایک کیڑے کا نام دابّۃ الارض رکھا گیا بس اِس سے زیادہ دابّۃ الارض کے اصلی معنوں کی دریافت کے لئے اور کیا شہادت ہوگی کہ خود قرآن شریف نے اپنے دوسرے مقام میں دابّۃ الارض کے معنے کیڑا کیا ہے۔ سو قرآن کے برخلاف اس کے اور معنی کرنا یہی تحریف اور اِلحاد اور دَجل ہے۔

(۳) تیسرا قرینہ یہ ہے کہ آیت میں صریح معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے نشانوں کی تکذیب کے وقت میں کوئی امام الوقت موجود ہونا چاہئیے کیونکہ وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ کا فقرہ یہی چاہتا ہے کہ اتمام حجت کے بعد یہ عذاب ہو اور یہ تو متفق علیہ عقیدہ ہے کہ خروج دابّۃ الارض آخری زمانہ میں ہوگا جبکہ مسیح موعود ظاہر ہوگا تا کہ خدا کی حجت دنیا پر پُوری کرے۔ پس ایک منصف کو یہ بات جلد تر سمجھ آسکتی ہے کہ جبکہ ایک شخص موجود ہے جو مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور آسمان اور زمین میں بہت سے نشان اس کے ظاہر ہو چکے ہیں تو اب بلا شبہ دابّۃ الارض یہی طاعون ہے جس کا مسیح کے زمانہ میں ظاہر ہونا ضروری تھا اور چونکہ یاجوج ماجوج موجود ہے اور مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ کی پیشگوئی تمام دنیا میں پُوری ہو رہی ہے اور دجّالی فتنے بھی انتہا تک پہنچ گئے ہیں اور پیشگوئی يُتْرَكَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا يُسْعٰى عَلَيْهَا بھی بخوبی ظاہر ہو چکی ہے اور شراب اور زنا اور جھوٹ کی بھی کثرت ہوگئی ہے اور مسلمانوں میں یہودیت کی فطرت بھی جوش مار رہی ہے تو صرف ایک بات باقی تھی جو دابّۃ الارض زمین میں سے نکلے سو وہ بھی نکل آیا۔ اِس بات پر جھگڑنا جہالت ہے کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں جگہ پھٹے گی اور دابّۃ الارض وہاں سے سر نکالے گا پھر تمام دنیا میں چکر مارے گا کیونکہ اکثر پیشگوئیوں پر استعارات کا رنگ غالب ہوتا ہے جب ایک بات کی حقیقت کھل جائے تو ایسے اوہام باطلہ کے ساتھ حقیقت کو چھوڑنا کمال جہالت ہے اِسی عادت سے بدبخت یہودی قبول حق سے محروم رہ گئے۔

(۴) قرینہ چہارم دابّۃ الارض کے طاعون ہونے پر یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ میں ایک رنگ میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ کسی وقت بعض مسلمان بھی وہ یہودی بن جائیں گے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں تھے جو آخر کار طاعون وغیرہ بلاؤں سے ہلاک کئے گئے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدیم سے یہ عادت ہے کہ جب ایک قوم کو کسی فعل سے منع کرتا ہے تو ضرور اس کی تقدیر میں یہ ہوتا ہے کہ بعض ان میں سے اس فعل کے ضرور مرتکب ہوں گے .... چونکہ خدا تعالیٰ جانتا تھا کہ آخری زمانہ میں اِسی اُمّت میں سے مسیح موعود آئے گا اور بعض یہودی صفت مسلمانوں میں سے اس کو کافر قرار دیں گے اور قتل کے درپے ہوں گے اور اس کی سخت

توہین وتحقیر کریں گے اور نیز جانتا تھا کہ اس زمانہ میں تثلیث کا مذہب ترقی پر ہوگا اور بہت سے بدقسمت انسان عیسائی ہوجائیں گے اِس لئے اُس نے مسلمانوں کو یہ دُعا سکھلائی اور اس دُعا میں مغضوب علیہم کا جو لفظ ہے وہ بلند آواز سے کہہ رہا ہے کہ وہ لوگ جو اسلامی مسیح کی مخالفت کریں گے وہ بھی خدا تعالیٰ کی نظر میں مغضوب علیہم ہوں گے جیسا کہ اسرائیلی مسیح کے مخالف مغضوب علیہم تھے اور حضرت مسیح خود انجیل میں اشارہ کرتے ہیں کہ میرے منکروں پر مَرِیْ یعنی طاعون پڑے گی اور بعد اس کے دُوسرے عذاب بھی نازل ہوں گے۔ اس لئے ضروری تھا کہ مسیح اسلامی کی تائید میں بھی یہ باتیں ظہور میں آتیں۔ اور بھی دلائل اس بات پر بہت ہیں کہ یہی دابّۃ الارض جس کا قرآن شریف میں ذکر ہے طاعون ہے اور بلاشبہ یہ زمینی بیماری ہے اور زمین میں سے ہی نکلتی ہے۔ (نزول المسیح، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۴۱۵ تا ۴۲۰)

یہ جو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا کہ وہ دابّۃ الارض یعنی طاعون کا کیڑا زمین میں سے نکلے گا اس میں یہی بھید ہے کہ تا وہ اس بات کی طرف اشارہ کرے کہ وہ اُس وقت نکلے گا کہ جب مسلمان اور ان کے علماء زمین کی طرف جھک کر خود دابّۃ الارض بن جائیں گے۔ ہم اپنی بعض کتابوں میں یہ لکھ آئے ہیں کہ اس زمانہ کے ایسے مولوی اور سجادہ نشین جو متقی نہیں ہیں اور زمین کی طرف جھکے ہوئے ہیں یہ دابّۃ الارض ہیں اور اب ہم نے اِس رسالہ میں یہ لکھا ہے کہ دابّۃ الارض طاعون کا کیڑا ہے۔ ان دونوں بیانوں میں کوئی شخص تناقض نہ سمجھے۔ قرآن شریف ذوالمعارف ہے اور کئی وجوہ سے اس کے معنی ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد نہیں اور جس طرح قرآن شریف یک دفعہ نہیں اُترا اسی طرح اس کے معارف بھی دِلوں پر یکدفعہ نہیں اُترتے۔ اسی بنا پر محققین کا یہی مذہب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معارف بھی یکدفعہ آپ کو نہیں ملے بلکہ تدریجی طور پر آپ نے علمی ترقیات کا دائرہ پُورا کیا ہے۔ ایسا ہی مَیں ہوں جو بروزی طور پر آپ کی ذات کا مظہر ہوں۔ آنحضرت کی تدریجی ترقی میں سِرّ یہ تھا کہ آپ کی ترقی کا ذریعہ محض قرآن تھا پس جبکہ قرآن شریف کا نزول تدریجی تھا اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکمیل معارف بھی تدریجی تھی اور اسی قدم پر مسیح موعود ہے جو اِس وقت تم میں ظاہر ہوا۔ علم غیب خدا تعالیٰ کا خاصہ ہے جس قدر وہ دیتا ہے اُسی قدر ہم لیتے ہیں۔ پہلے اُسی نے غیب سے مجھے یہ فہم عطا کیا کہ ایسے سُست زندگی والے جو خدا اور اُس کے رسول پر ایمان تو لاتے ہیں مگر عملی حالت میں بہت کمزور ہیں یہ لوگ دابۃ الارض ہیں یعنی زمین کے کیڑے ہیں آسمان سے ان کو کچھ حصہ نہیں۔ اور مقدر تھا کہ آخری زمانہ میں یہ لوگ بہت ہوجائیں گے اور اپنے ہونٹوں سے

اسلام کی شہادت دیں گے مگر ان کے دل تاریکی میں ہوں گے۔ یہ تو وہ معنی ہیں جو پہلے ہم نے شائع کئے اور یہ معنے بجائے خود صحیح اور درست ہیں۔ اب ایک اور معنے خدا تعالیٰ کی طرف سے اس آیت کے متعلق کھلے جن کو ابھی ہم نے بیان کر دیا ہے یعنی یہ کہ دابّۃ الارض سے مراد وہ کیڑا بھی ہے جو مقدر تھا جو مسیح موعود کے وقت میں زمین میں سے نکلے اور دنیا کو ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے تباہ کرے۔ یہ خوب یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جیسے یہ آیت دو معنوں پر مشتمل ہے ایسے ہی صدہا نمونے اسی قسم کے کلام الٰہی میں پائے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے اُس کو معجزانہ کلام کہا جاتا ہے جو ایک ایک آیت دس دس پہلو پر مشتمل ہوتی ہے اور وہ تمام پہلو صحیح ہوتے ہیں بلکہ قرآن شریف کے حروف اور اُن کے اعداد بھی معارف مخفیہ سے خالی نہیں ہوتے۔

(نزول المسیح، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۴۲۱ تا ۴۲۲)

خدا تعالیٰ فرماتا ہے.... کہ جب قرب قیامت ہوگا ہم زمین میں سے ایک کیڑا نکالیں گے جو لوگوں کو کاٹے گا اس لئے کہ انہوں نے ہمارے نشانوں کو قبول نہیں کیا.... اور یہ صریح طور پر طاعون کی نسبت پیشگوئی ہے کیونکہ طاعون بھی ایک کیڑا ہے۔ اگرچہ پہلے طبیبوں نے اس کیڑے پر اطلاع نہیں پائی لیکن خدا جو عالم الغیب ہے وہ جانتا تھا کہ طاعون کی جڑھ اصل میں کیڑا ہی ہے جو زمین میں سے نکلتا ہے اس لئے اس کا نام دابّۃ الارض رکھا یعنی زمین کا کیڑا۔ (لیکچر سیالکوٹ، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۲۴۰)

دابّۃ الارض کے معنے طاعون کے بھی ہیں جیسا کہ قرآن شریف کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ یعنی جب لوگوں پر حجت پوری ہوجائے گی تو ہم ان کے لئے زمین سے ایک کیڑا نکالیں گے جو لوگوں کو اس واسطے کاٹے گا کہ وہ خدا تعالیٰ کے نشانوں پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ تُكَلِّمُهُمْ کے معنی اقرب الموارد میں صاف کاٹنے کے کئے ہیں۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۰ رمئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵ حاشیہ)

دابّۃ الارض کے دو معنے ہیں۔ ایک تو وہ علماء جن کو آسمان سے حصہ نہیں ملا وہ زمین کے کیڑے ہیں۔ دوسرے دابّۃ الارض سے مراد طاعون ہے۔ دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ (سبا : ۱۵) قرآن شریف سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب تک انسان میں روحانیت پیدا نہ ہو یہ زمین کا کیڑا ہے اور طاعون کی نسبت بھی سب نبیوں نے پیشگوئی کی تھی کہ مسیح کے وقت پھیلے گی۔ تُكَلِّمُ النَّاسَ۔ تکلیم کاٹنے کو بھی کہتے ہیں اور خود قرآن شریف نے ہی فیصلہ کر دیا ہے۔ اس سے آگے لکھ دیا ہے کہ وہ اس لئے لوگوں کو کھائے گی کہ ہمارے مامور پر

ایمان نہیں لائے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱؍اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

دابۃ الارض طاعون کو کہتے ہیں اس لئے کہ اس کے کیڑے تو زمینی ہی ہوتے ہیں۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰؍نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

جب گمراہی اور ضلالت کا زمانہ ہوگا ایسے وقت میں لوگوں کا ایمان خدا پر صرف ایک بچوں کی کھیل کی طرح ہوگا تب ہم ان میں ایک کیڑا نکالیں گے جو ان کو کاٹے گا۔ غرض یہ (طاعون۔ ناقل) خدا کا ایک قہر ہے جس سے بچنے کے واسطے ہر ایک کو لازم ہے کہ اپنی نجات کا آپ سامان کرے۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۵، ۶ مورخہ ۲۸؍نومبر و ۵؍دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح موعود جس کے وقت کے متعلق یہ پیشگوئی ہے۔ اس کے دعاوی کا بہت بڑا انحصار اور دارو مدار نشانات پر ہوگا اور خدا نے اسے بھی بہت سے نشانات عطا فرما رکھے ہوں گے کیونکہ یہ جو فرمایا کہ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ یعنی اس عذاب کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے نشانات کی کچھ بھی پروا نہ کی اور ان کو نہ مانا اس واسطے ان کو یہ سزا ملی۔ ان نشانات سے مراد صرف مسیح موعود کے نشانات ہیں ورنہ یہ امر تو ٹھیک نہیں کہ گناہ تو زید کرے اور اس کی سزا عمرو کو ملے جو اس سے تیرہ سو سال بعد آیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اگر لوگوں نے نشانات دیکھے اور ان سے انکار کیا تو اس انکار کی سزا تو ان کو اسی وقت مل گئی اور وہ تباہ اور برباد ہو گئے اور اگر آیت سے وہی نشانات مراد ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ظاہر ہوئے تھے تو اب ہزاروں لاکھوں مسلمان ایسے ہیں کہ اگر ان سے پوچھا بھی جاوے کہ بتاؤ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کون کون سے نشانات ظاہر ہوئے تو ہزاروں میں سے شاید کوئی ہی ایسا نکلے جس کو اس طرح پر آپ کے نشانات کا علم ہو ورنہ عام طور سے اب مسلمانوں کو خبر تک بھی نہیں کہ وہ نشانات کیا تھے اور کس طرح خدا نے آپ کی تائید میں ان کو ظاہر فرمایا مگر کیا اس لاعلمی سے کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ لوگ سارے کے سارے ان نشانات سے منکر ہیں اور ان کو وہ نہیں مانتے حالانکہ وہ مومن بھی ہیں اگر ان کو علم ہو تو وہ ماننے بیٹھے ہیں ان کو کوئی انکار نہیں ان لوگوں کے متعلق تو ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشانات نہ ماننے کا لفظ لا سکتے ہی نہیں کیونکہ انہوں نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی نبوت کی تفاصیل سمیت مان لیا ہوا ہے وہ انکار کیسے کر سکتے ہیں اور دیگر مذاہب کے لوگوں پر وہ نشانات اب حجت نہیں کیونکہ انہوں نے وہ دیکھے نہیں ہیں جنہوں نے دیکھ کر انکار کیا تھا وہ ہلاک ہو چکے۔ موجودہ زمانہ کے لوگوں نے آپ

کے نشانات دیکھے ہی نہیں تو وہ اس انکار کی وجہ سے ہلاک کیسے ہو سکتے ہیں؟

پس معلوم ہوا کہ ان نشانات سے مراد مسیح موعود ہی کے نشانات ہیں جن کے انکار کی وجہ سے عذاب کی تنبیہ ہے اور خدا کا غضب ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے مسیح موعود کے نشانات سے انکار کیا ہے اور یہ خدائی فیصلہ ہے جس کو رد نہیں کر سکتا۔ یہ نص صریح ہے اس بات پر کہ طاعون مسیح موعود کے انکار کی وجہ سے آئی ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ /اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ ۝۹۰

نیکی کرنے والوں کو قیامت کے دن اس نیکی سے زیادہ بدلہ ملے گا اور وہ ہر ایک ڈر سے اس دن امن میں رہیں گے۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۴۷، ۱۴۸)

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ۭ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۹۱

بدی کرنے والے اس دن جہنم میں گرائے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ یہ جزا در حقیقت وہی تمہارے اعمال ہیں جو تم دنیا میں کرتے تھے یعنی خدا تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرے گا بلکہ نیکی کے اعمال جنت کی صورت میں اور بدی کے اعمال دوزخ کی صورت میں ظاہر ہو جائیں گے۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۴۸)

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۹۴

اور کہہ خدا سب کامل صفتوں کا مالک ہے عنقریب وہ تمہیں اپنے نشان دکھلائے گا ایسے نشان کہ تم ان کو شناخت کر لو گے اور خدا تمہارے عملوں سے غافل نہیں ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۴ حاشیہ)

اور یہ کہ سب خوبیاں اللہ کے لئے ہیں وہ تمہیں ایسے نشان دکھائے گا جنہیں تم شناخت کر لو گے۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۴۴۳)

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تفسیر سورۃ القصص

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَ لَا تَخَافِيْ وَ لَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۸

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَاٰيَاتِهٖ فَقَدْ وَجَبَ عَلَيْهِ أَنْ يُّؤْمِنَ بِأَنَّ اللّٰهَ يُوْحِيْ إِلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ رَسُوْلًا كَانَ أَوْ غَيْرَ رَسُوْلٍ وَّيُكَلِّمُ مَنْ يَّشَآءُ نَبِيًّا كَانَ أَوْ مِنَ الْمُحَدَّثِيْنَ۔ أَلَا تَرٰى أَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ أَخْبَرَ فِيْ كِتَابِهٖ أَنَّهٗ كَلَّمَ أُمَّ مُوْسٰى وَقَالَ لَا تَخَافِيْ وَ لَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۔ وَ كَذٰلِكَ

جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات پر ایمان لاتا ہے اس پر واجب ہے کہ وہ اس بات پر بھی ایمان لائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کی طرف چاہے وحی کرتا ہے خواہ وہ رسول ہو یا غیر رسول اور وہ جس سے چاہتا ہے کلام کرتا ہے خواہ وہ نبی ہو یا محدثوں میں سے کوئی ہو۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن مجید) میں یہ خبر دی ہے کہ اس نے (موسیٰ علیہ السلام) کی والدہ سے کلام کیا اور اس سے کہا لَا تَخَافِيْ وَ لَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ پھر اس طرح اس نے مسیح ناصری علیہ السلام کے حواریوں کی طرف بھی وحی کی اور ذوالقرنین سے بھی اس نے کلام کیا اور اس نے ہمیں اس بات کے متعلق اپنی کتاب میں خبر دی ہے۔ (ترجمہ از مرتب)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ إِنَّ بَابَ الْإِلْهَامِ مَسْدُوْدٌ عَلٰى هٰذِهِ الْأُمَّةِ، وَمَا تَدَبَّرَ فِي الْقُرْاٰنِ حَقَّ التَّدَبُّرِ، وَمَا لَقِيَ الْمُلْهَمِيْنَ. فَاعْلَمْ أَيُّهَا الرَّشِيْدُ أَنَّ هٰذَا الْقَوْلَ بَاطِلٌ بِالْبَدَاهَةِ، وَيُخَالِفُ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ وَشَهَادَاتِ الصَّالِحِيْنَ. أَمَّا كِتَابُ اللهِ. فَأَنْتَ تَقْرَأُ فِي الْقُرْاٰنِ الْكَرِيْمِ اٰيَاتٍ تُؤَيِّدُ قَوْلَنَا هٰذَا، وَقَدْ أَخْبَرَ اللهُ تَعَالٰى فِيْ كِتَابِهِ الْمُحْكَمِ عَنْ بَعْضِ رِجَالٍ وَّنِسَاءٍ كَلَّمَهُمْ رَبُّهُمْ وَخَاطَبَهُمْ وَأَمَرَهُمْ وَنَهَاهُمْ، وَمَا كَانُوْا مِنَ الْأَنْبِيَآءِ وَلَا رُسُلِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. أَلَا تَقْرَأُ فِي الْقُرْاٰنِ وَ لَا تَخَافِيْ وَ لَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ.

فَتَدَبَّرْ أَيُّهَا الْمُنْصِفُ الْعَاقِلُ كَيْفَ لَا يَجُوْزُ مُكَالَمَاتُ اللهِ بِبَعْضِ رِجَالِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ الَّتِيْ هِيَ خَيْرُ الْأُمَمِ وَقَدْ كَلَّمَ اللهُ نِسَآءَ قَوْمٍ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ، وَقَدْ أَتَاكُمْ مَثَلُ الْأَوَّلِيْنَ

(حمامة البشرٰی صفحہ، روحانی خزائن جلد ۷، صفحہ ۲۹۷)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس امت میں الہام کا دروازہ بند ہے ایسے لوگوں نے قرآن کریم پر پوری طرح تدبر نہیں کیا اور نہ ہی وہ ملہمین سے ملے ہیں۔ پس اے صاحبِ رشد! جان لے کہ یہ بات بالکل غلط ہے اور کتاب اللہ، سنت نبوی اور صالحین کی شہادت کے خلاف ہے۔ کتاب اللہ ہی کو دیکھو تم اس میں بہت سی ایسی آیات پڑھو گے جو ہماری بات کی تائید کرتی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محکم کتاب میں بعض مردوں اور عورتوں سے متعلق خبر دی ہے کہ ان کے رب نے ان سے کلام کیا اور انہیں مخاطب کیا۔ انہیں بعض باتوں کے کرنے کا حکم دیا اور بعض امور سے منع کیا اور وہ رب العالمین کی طرف سے نہ تو نبی تھے اور نہ ہی رسول۔ کیا تو قرآن کریم میں یہ آیت نہیں پڑھتا جس میں حضرت موسیٰؑ کی ماں کو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ وَ لَا تَخَافِيْ وَ لَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۔

پس اے منصف اور عقل مند تم اس بات پر غور کرو کہ اس امت میں جو خیر الامم ہے کیوں بعض مردوں سے خدا تعالیٰ کا کلام کرنا جائز نہیں حالانکہ اس نے تم سے پہلی امتوں کی عورتوں سے بھی کلام کیا ہے اور پہلوں کی مثالیں تمہارے پاس موجود ہیں۔ (ترجمہ از مرتب)

وَ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ١ۗ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ١ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ١ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ١ۗ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ١ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۶

موسیٰ پر الزام مُکّا مارنے کا جو عیسائی لگاتے ہیں اس کی نسبت فرمایا کہ وہ گناہ نہیں تھا ان کا ایک اسرائیلی بھائی نیچے دبا ہوا تھا طبعی جوش سے انہوں نے ایک مکا مارا۔ وہ مر گیا۔ جیسے اپنی جان بچانے کے لئے اگر کوئی خون بھی کر دے تو وہ جرم نہیں ہوتا۔ موسیٰؑ کا قول قرآن شریف میں ہے هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ یعنی قبطی نے اس اسرائیلی کو عملِ شیطان (فاسد ارادہ) سے دبایا ہوا تھا۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷؍نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۵)

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۝۳۴

انبیاء کو خدا ذلیل نہیں کیا کرتا۔ انبیاء کی قوتِ ایمانی یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جان دے دینا وہ اپنی سعادت جانیں۔ اگر کوئی موسیٰ علیہ السلام کے قصہ پر نظر ڈال کر اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ وہ ڈرتے تھے تو یہ بالکل فضول امر ہے (اور اس ڈر سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ ان کو جان کی فکر تھی بلکہ ان کو یہ خیال تھا کہ منصبِ رسالت کی بجا آوری میں کہیں اس کا اثر اچھا نہ پڑے)۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۴؍ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۵۸)

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝۳۷

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ .... ہم نے اپنے بزرگوں میں یعنی اولیاء سلف میں یہ نہیں سنا۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۷۰)

ان کی بدقسمتی یہ ہے کہ جب ان کو وہ اصل اسلام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے پیش کیا جاتا ہے اور قرآن شریف کے ساتھ ثابت کر کے دکھایا جاتا ہے کہ تم غلطی پر ہو تو کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا اسی طرح مانتے آئے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ کیا اتنی بات کہہ کر یہ اپنے آپ کو بری کر سکتے ہیں؟

نہیں بلکہ قرآن شریف کے موافق اور خدا تعالیٰ کی سنت قدیم کے مطابق اس قول سے بھی ایک حجت ان پر پوری ہوتی ہے جب کبھی کوئی خدا کا مامور اور مرسل آتا ہے تو مخالفوں نے اس کی تعلیم کو سن کر یہی کہا ہے مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷ر جون ۱۹۰۲ء صفحہ ۴، ۵)

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۳۹

اَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ .... لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ..... اپنے رفیق کو کہا کہ کسی فتنہ یا آزمائش کی آگ بھڑکا تا میں موسیٰ کے خدا پر .... مطلع ہو جاؤں کہ کیوں کر وہ اس کی مدد کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہے یا نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جھوٹا ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۶۰۹ حاشیہ)

وَ لَوْ لَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۸

تا عذاب کے نازل ہونے پر گمراہ لوگ یہ نہ کہیں کہ اے خدا تو نے قبل از عذاب اپنا رسول کیوں نہ بھیجا تا ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے اور مومن بن جاتے۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۶۵۰)

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۝۶۰

یعنی ہم نے کبھی کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر صرف ایسی حالت میں کہ جب اس کے رہنے والے ظلم پر کمر بستہ ہوں۔

یاد رہے کہ اگرچہ شرک بھی ایک ظلم بلکہ ظلم عظیم ہے مگر اس جگہ ظلم سے مراد وہ سرکشی ہے جو حد سے گزر

جائے اور مفسدانہ حرکات انتہا تک پہنچ جائیں ورنہ اگر مجرد شرک ہو جس کے ساتھ ایذا اور تکبر اور فساد منضم نہ ہو اور ایسا تجاوز از حد نہ ہو جو واعظوں پر حملہ کریں اور ان کے قتل کرنے پر آمادہ ہوں یا معصیت پر پورے طور پر سرنگوں ہو کر بالکل خوفِ خدا دل سے اُٹھا دیں تو ایسے شرک یا کسی اور گنہ کے لئے وعدہ عذابِ آخرت ہے اور دینوی عذاب صرف اعتداء اور سرکشی اور حد سے زیادہ بڑھنے کے وقت نازل ہوتا ہے۔

(انوارالاسلام، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۱۵)

کوئی بستی نہیں ہلاک ہوتی مگر اس حالت میں کہ جب اس کے اہل ظلم پر کمر بستہ ہوں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۴ مورخہ ۱۱ر ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۶۶)

ہم کسی بستی کو بھی ہلاک نہیں کرتے جب تک کہ ان کے درمیان کوئی رسول نہ بھیجیں۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۴۲۲، ۴۲۳)

وَ هُوَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَ الْاٰخِرَةِ ۫ وَ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۷۱﴾

اس کے لئے تمام محامد ثابت ہیں اور دنیا و آخرت میں وہی منعم حقیقی ہے اور اسی کے ہاتھ میں ہر یک حکم ہے اور وہی تمام چیزوں کا مرجع و مآب ہے۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۲۱ حاشیہ)

فَأَوْمٰى فِيْهِ إِلٰى أَحْمَدَيْنِ وَجَعَلَهُمَا مِنْ نُّعَمَائِهِ الْكَاثِرَةِ۔ فَالْأَوَّلُ مِنْهُمَا أَحْمَدُ الْمُصْطَفٰى وَرَسُوْلُنَا الْمُجْتَبٰى۔ وَالثَّانِيْ أَحْمَدُ اٰخِرِ الزَّمَانِ۔ الَّذِيْ سُمِّيَ مَسِيْحًا وَّمَهْدِيًّامِّنَ اللّٰهِ الْمَنَّانِ۔ وَقَدِ اسْتُنْبِطَتْ هٰذِهِ النُّكْتَةُ مِنْ قَوْلِهٖ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"۔ فَلْيَتَدَبَّرْ مَنْ كَانَ مِنَ الْمُتَدَبِّرِيْنَ۔

(اعجاز المسیح، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۱۳۹)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دو احمدوں کا ذکر فرما کر ہر دو کو اپنی بے پایاں نعمتوں میں شمار کیا ہے۔ ان میں سے پہلے احمد تو ہمارے نبی احمد مصطفیٰ اور رسول مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور دوسرا احمد احمدِ آخر الزمان ہے جس کا نام محسن خدا کی طرف سے مسیح اور مہدی بھی رکھا گیا ہے۔ یہ نکتہ میں نے خدا تعالیٰ کے قول اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے اخذ کیا ہے پس ہر غور و فکر کرنے والے کو غور کرنا چاہیے۔ (ترجمہ از مرتب)

أَنَّهٗ تَعَالٰى مَا اخْتَارَ لِنَفْسِهٖ هٰهُنَا

اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی ذات کی چار صفات کو

أَرْبَعَةً مِّنَ الصِّفَاتِ۔ إِلَّا لِيُرِيَ نَمُوْذَجَهَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا قَبْلَ الْمَمَاتِ۔ فَأَشَارَ فِيْ قَوْلِهٖ "لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ" إِلٰى أَنَّ هٰذَا النَّمُوْذَجَ يُعْطٰى لِصَدْرِ الْإِسْلَامِ۔ ثُمَّ لِلْاٰخِرِيْنَ مِنَ الْأُمَّةِ الدَّاخِرَةِ۔ وَ كَذَالِكَ قَالَ فِيْ مَقَامٍ اٰخَرَ وَهُوَ أَصْدَقُ الْقَائِلِيْنَ "ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ"۔[1] فَقَسَّمَ زَمَانَ الْهِدَايَةِ وَالْعَوْنِ وَالنُّصْرَةِ۔ إِلٰى زَمَانِ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ وَإِلَى الزَّمَانِ الْاٰخِرِ الَّذِيْ هُوَ زَمَانُ مَسِيْحِ هٰذِهِ الْمِلَّةِ۔ وَ كَذَالِكَ قَالَ "وَ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ"۔[2] فَأَشَارَ إِلَى الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ وَجَمَاعَتِهٖ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ۔ فَثَبَتَ بِنُصُوْصٍ بَيِّنَةٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ۔ اِنَّ هٰذِهِ الصِّفَاتِ قَدْ ظَهَرَتْ فِيْ زَمَنِ نَبِيِّنَا ثُمَّ تَظْهَرُ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ۔ وَ هُوَ زَمَانٌ يَكْثُرُ فِيْهِ الْفِسْقُ وَالْفَسَادُ۔ وَيَقِلُّ الصَّلَاحُ وَالسَّدَادُ۔

(اعجاز المسیح، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۱۵۳، ۱۵۵)

محض اس لئے اختیار کیا ہے کہ تا وہ اس دنیا میں ہی انسان کو (یعنی دنیا کی) موت سے پہلے ان صفات کا نمونہ دکھائے پس اس نے اپنے کلام لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَ الْاٰخِرَةِ میں اشارہ فرمایا کہ یہ نمونہ آغازِ اسلام میں بھی عطا کیا جائے گا اور پھر امت کی خواری کے بعد اس کے آخری لوگوں کو بھی (عطا کیا جائے گا) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ (قرآن مجید میں) فرمایا ہے اور وہ بات کرنے والوں میں سے سب سے زیادہ سچا ہے۔ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہدایت، مدد اور نصرت کے زمانہ کو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ پر اور اس آخری زمانہ پر جو اس امت کے مسیح کا زمانہ ہے تقسیم کر دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ۔ اس میں مسیح موعود، اس کی جماعت اور ان کے تابعین کی طرف اشارہ فرمایا ہے پس قرآن کریم کی نصوصِ بینہ سے ثابت ہوا کہ یہ صفات ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ظاہر ہوئیں پھر آخری زمانہ میں بھی ظاہر ہوں گی۔ اور آخری زمانہ ایسا زمانہ ہے جس میں بدکاری اور ہر قسم کی خرابیاں بکثرت پھیل جائیں گی اور راستی بہت ہی کم ہو جائے گی۔ (ترجمہ از مرتب)

وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْأَزَلِ إِلٰى أَبَدِ الْاٰبِدِيْنَ۔ وَلِذَالِكَ سَمّٰى اللّٰهُ نَبِيَّهٗ أَحْمَدَ۔ وَ كَذَالِكَ سَمّٰى بِهٖ

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی بعثت اور پچھلی بعثت میں بلکہ ازل سے ابد الآباد تک سب تعریف اسی کے لئے ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کا نام احمد رکھا اور

[1] الواقعة: ۴۰، ۴۱ [2] الجمعة: ۴

الْمَسِيْحَ الْمَوْعُوْدَ لِيُشِيْرَ إِلٰى مَا تَعَمَّدَ. وَإِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَمْدَ عَلٰى رَأْسِ الْفَاتِحَةِ. ثُمَّ أَشَارَ إِلَى الْحَمْدِ فِيْ اٰخِرِ هٰذِهِ السُّوْرَةِ. فَإِنَّ اٰخِرَهَا لَفْظُ الضَّآلِّيْنَ. وَهُمُ النَّصَارٰى الَّذِيْنَ أَعْرَضُوْا عَنْ حَمْدِ اللّٰهِ وَأَعْطَوْا حَقَّهٗ لِأَحَدٍ مِّنَ الْمَخْلُوْقِيْنَ. فَإِنَّ حَقِيْقَةَ الضَّلَالَةِ هِيَ تَرْكُ الْمَحْمُوْدِ الَّذِيْ يَسْتَحِقُّ الْحَمْدَ وَالثَّنَآءَ. كَمَا فَعَلَ النَّصَارٰى وَنَحَتُوْا مِنْ عِنْدِهِمْ مَحْمُوْدًا اٰخَرَ وَبَالَغُوْا فِي الْإِطْرَآءِ وَاتَّبَعُوا الْأَهْوَآءَ. وَبَعُدُوْا مِنْ عَيْنِ الْحَيَاةِ. وَهَلَكُوْا كَمَا يَهْلَكُ الضَّالُّ فِي الْمَوْمَاةِ. وَإِنَّ الْيَهُوْدَ هَلَكُوْا فِيْ أَوَّلِ أَمْرِهِمْ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ الْقَهَّارِ. وَالنَّصَارٰى سَلَكُوْا قَلِيْلًا ثُمَّ ضَلُّوْا وَفَقَدُوا الْمَآءَ فَمَاتُوْا فِيْ فَلَاةٍ مِّنَ الْاِضْطِرَارِ. فَحَاصِلُ هٰذَا الْبَيَانِ أَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ أَحْمَدَيْنِ فِيْ صَدْرِ الْإِسْلَامِ وَفِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ. وَأَشَارَ إِلَيْهِمَا بِتَكْرَارِ لَفْظِ الْحَمْدِ فِيْ أَوَّلِ الْفَاتِحَةِ وَفِيْ اٰخِرِهَا لِأَهْلِ الْعِرْفَانِ. وَفَعَلَ كَذَالِكَ لِيَرُدَّ عَلَى النَّصْرَانِيِّيْنَ. وَأَنْزَلَ أَحْمَدَيْنِ

اسی طرح مسیح موعود کا بھی یہی نام رکھا تا اس نے جو قصد کیا تھا اس کی طرف اشارہ فرمائے۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورہ فاتحہ کے ابتداء میں الحمد لکھا ہے پھر اس سورت کے آخر میں بھی الحمد کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ اس کے آخر میں الضالین کا لفظ ہے اور وہ نصاریٰ ہیں جنہوں نے خدا تعالیٰ کی حمد کرنے سے منہ موڑ لیا اور اس کا حق مخلوق کے ایک فرد کو دے دیا کیونکہ گمراہی کی حقیقت یہ ہے کہ اس قابلِ تعریف ہستی کو جو حمد وثناء کی مستحق ہے چھوڑ دیا جائے جیسا کہ نصاریٰ نے کیا ہے۔ انہوں نے اپنے پاس سے ایک اور قابلِ تعریف معبود بنا لیا ہے اور انہوں نے اس کی تعریف میں بڑا مبالغہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی اور زندگی کے چشمہ سے دور نکل گئے اور اس طرح ہلاک ہو گئے جس طرح ایک راہ گم کردہ شخص بیابان میں ہلاک ہو جاتا ہے اور یہود تو اپنی ابتدا میں ہی ہلاک ہو گئے تھے اور خدائے قہار کے غضب کے مورد بن گئے تھے۔ نصاریٰ چند قدم چلے پھر گمراہ ہو گئے اور روحانی پانی کھو دیا اور آخر کار لاچار ہو کر بیابانوں میں ہی مر گئے۔ پس خلاصہ بیان یہ ہے اللہ تعالیٰ نے دو احمد پیدا کئے ایک اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اور ایک آخری زمانہ میں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرفان کے لئے سورۃ فاتحہ کے شروع میں اور اس کے آخر میں الحمد کا لفظاً ومعناً تکرار کر کے ان دونوں (احمدوں) کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور خدا نے ایسا عیسائیوں کی تردید کے لئے کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے دو احمد آسمان سے اتارے تا وہ دونوں پہلوں اور پچھلوں کی

حمایت کے لئے دو دیواروں کی طرح ہو جائیں۔ (ترجمہ از مرتب)	مِنَ السَّمَآءِ لِيَكُوْنَا كَالْجِدَارَيْنِ لِحِمَايَةِ الْأَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ. (اعجاز المسیح، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۱۹۷، ۱۹۸)

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۸۶﴾

لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ تجھے اسی جگہ پھیر لائے گا جہاں سے تو نکالا گیا ہے یعنی مکہ میں جس سے کفار نے آنحضرت کو نکال دیا تھا۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی جلد ۱ صفحہ ۲۵۸ حاشیہ)

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۹﴾

تو بجز خدا کے کسی اور سے مرادیں مت مانگ۔ سب ہلاک ہو جائیں گے۔ ایک اسی کی ذات باقی رہ جاوے گی۔ اسی کے ہاتھ میں حکم ہے اور وہی تمہارا مرجع ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۲۱ حاشیہ در حاشیہ)

دوسرا حصہ اس توحید کا یہ ہے کہ جیسا کہ کوئی چیز بجز خدا کے خود بخود موجود نہیں ایسا ہی ہر ایک چیز بجز خدا کے اپنی ذات میں فانی اور ہالک ہونے سے بَری نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ یعنی ہر ایک چیز معرض ہلاکت میں ہے اور مرنے والی ہے بجز خدا کی ذات کے کہ وہ موت سے پاک ہے اور اسی طرح ایک اور آیت میں فرمایا كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (الرحمٰن: ۲۷) یعنی ہر ایک جو زمین پر ہے آخر مرے گا پس جیسا کہ خدا نے اس آیت میں کہ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ہے لفظ كُلّ کے ساتھ جو احاطہ تامہ کے لئے آتا ہے ہر ایک چیز کو جو اس کے سوا ہے مخلوق میں داخل کر دیا۔ ایسا ہی اس لفظ کُل کے ساتھ اس آیت میں جو كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ہے اور نیز اس آیت میں کہ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ہے ہر ایک چیز کے لئے بجز اپنی ذات کے موت ضروری ٹھہرا دی۔ پس جیسا کہ جسمی ترکیب میں اِنحلال ہو کر جسم پر موت آتی ہے ایسا ہی رُوحانی صفات میں تغیرات پیدا ہو کر رُوح پر موت آجاتی ہے مگر جو لوگ وجہ اللہ میں

محو ہو کر مرتے ہیں وہ بباعث اس اِتّصال کے جو اُن کو حضرت عزت سے ہو جاتا ہے دوبارہ زندہ کئے جاتے ہیں اور اُن کی زندگی خدا کی زندگی کا ایک ظِل ہوتا ہے اور پلید روحوں میں بھی عذاب دینے کے لئے ایک حس پیدا کی جاتی ہے مگر وہ نہ مُردوں میں داخل ہوتے ہیں نہ زندوں میں جیسا کہ ایک شخص جب سخت درد میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ بدحواسی کی زندگی اس کے لئے موت کے برابر ہوتی ہے اور زمین و آسمان اُس کی نظر میں تاریک دکھائی دیتے ہیں۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۶۵،۱۶۶)

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تفسیر سورۃ العنکبوت

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۚ﴿۲﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿۳﴾

کیا یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بے امتحان کئے صرف زبانی ایمان کے دعویٰ سے چھوٹ جاویں گے۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۶۰۸ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

جو شخص ایمان لاتا ہے اُسی کو عرفان دیا جاتا ہے۔ ایمان اس بات کو کہتے ہیں کہ اُس حالت میں مان لینا کہ جبکہ ابھی علم کمال تک نہیں پہنچا اور شکوک وشبہات سے ہنوز لڑائی ہے۔ پس جو شخص ایمان لاتا ہے یعنی باوجود کمزوری اور نہ مہیّا ہونے کل اسباب یقین کے اس بات کو اغلب احتمال کی وجہ سے قبول کر لیتا ہے وہ حضرت احدیّت میں صادق اور راستباز شمار کیا جاتا ہے اور پھر اس کو موہبت کے طور پر معرفتِ تامّہ حاصل ہوتی ہے اور ایمان کے بعد عرفان کا جام اس کو پلایا جاتا ہے۔ اسی لئے ایک مردِ متقی رسولوں اور نبیوں اور مامورین من اللہ کی دعوت کو سن کر ہر ایک پہلو پر ابتداء امر میں ہی حملہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ حصہ جو کسی مامور من اللہ کے منجانب اللہ ہونے پر بعض صاف اور کھلے کھلے دلائل سے سمجھ آ جاتا ہے اُسی کو اپنے اقرار اور ایمان کا ذریعہ ٹھہرا لیتا ہے اور وہ حصہ جو سمجھ نہیں آتا اُس میں سنّتِ صالحین کے طور پر استعارات اور مجازات قرار دیتا ہے۔ اور اس طرح تناقض کو درمیان سے اُٹھا کر صفائی اور اخلاص کے ساتھ ایمان لے آتا ہے تب خدا تعالیٰ اُس کی حالت پر رحم کر کے اور اس کے ایمان پر راضی ہو کر اور اُس کی دعاؤں کو سُن کر معرفتِ تامّہ کا

دروازہ اُس پر کھولتا ہے اور الہام اور کشوف کے ذریعہ سے اور دوسرے آسمانی نشانوں کے وسیلہ سے یقین کامل تک اُس کو پہنچاتا ہے۔ (ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۲۶۱)

کیا لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ میں اسی قدر پر راضی ہو جاؤں کہ وہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لائے اور ابھی ان کا امتحان نہ کیا جائے۔ (الوصیت، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۲۷)

کتاب بحر الجواہر میں لکھا ہے کہ ابوالخیر نام ایک یہودی تھا جو پارسا طبع اور راستباز آدمی تھا۔ اور خدا تعالیٰ کو واحد لاشریک جانتا تھا۔ ایک دفعہ وہ بازار میں چلا جاتا تھا تو ایک مسجد سے اُس کو آواز آئی کہ ایک لڑکا قرآن شریف کی یہ آیت پڑھ رہا تھا الٓمّٓ ۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۔ یعنی کیا لوگ گمان کرتے ہیں کہ یونہی وہ نجات پا جاویں گے صرف اس کلمہ سے کہ ہم ایمان لائے۔ اور ابھی خدا کی راہ میں اُن کا امتحان نہیں کیا گیا کہ کیا ان میں ایمان لانے والوں کی سی استقامت اور صدق اور وفا بھی موجود ہے یا نہیں؟ اِس آیت نے ابوالخیر کے دل پر بڑا اثر کیا اور اُس کے دل کو گداز کر دیا۔ تب وہ مسجد کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہو کر زار زار رویا۔ رات کو حضرت سیّدنا و مولانا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی خواب میں آئے اور فرمایا یَا اَبَا الْخَيْرِ اَعْجَبَنِيْ اَنَّ مِثْلَكَ مَعَ كَمَالِ فَضْلِكَ يُنْكِرُ بِنُبُوَّتِيْ۔ یعنی اے ابوالخیر مجھے تعجب آیا کہ تیرے جیسا انسان باوجود اپنے کمال فضل اور بزرگی کے میری نبوت سے انکار کرے۔ پس صبح ہوتے ہی ابوالخیر مسلمان ہو گیا اور اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ میں اِس بات کو بالکل سمجھ نہیں سکتا کہ ایک شخص خدا تعالیٰ پر ایمان لاوے اور اُس کو واحد لاشریک سمجھے اور خدا اُس کو دوزخ سے تو نجات دے مگر نابینائی سے نجات نہ دے حالانکہ نجات کی جڑھ معرفت ہے۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۵۰، ۱۵۱)

مومن کو چاہئے کہ دوسرے کے حالات سے عبرت پکڑے کیا تم تعجب کرتے ہو کہ جس امتحان میں خدا تعالیٰ نے یہودیوں کو ڈالا تھا وہی امتحان تمہارا ابھی کیا گیا ہو۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۶۰۱)

یہ غلطی ہے جو کہا جاتا ہے کہ کسی ولی کے پاس جا کر صدہا ولی فی الفور بن گئے۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ جب تک انسان آزمایا نہ جاوے فتن میں نہ ڈالا جاوے وہ کب ولی بن سکتا ہے.... اہل اللہ مصائب شدائد کے بعد درجات پاتے ہیں لوگوں کا یہ خیالِ

خام ہے کہ فلاں شخص فلاں کے پاس جا کر بلا مجاہدہ و تزکیہ ایک دم میں صدیقین میں داخل ہو گیا۔ قرآن کو دیکھو کہ خدا کس طرح تم پر راضی ہو جب تک نبیوں کی طرح مصائب و زلازل نہ آویں جنہوں نے بعض وقت تنگ آ کر یہ بھی کہہ دیا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (البقرۃ : ۲۱۵) اللہ کے بندے ہمیشہ بلاؤں میں ڈالے گئے پھر خدا نے ان کو قبول کیا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷؍جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۷)

رضوان و قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لئے دو ہی طریق ہیں۔ ایک تو تشریعی احکام سے ترقی ہوتی ہے۔ اسی لئے تشریعی تکالیف فرمائیں مگر یہ وہ تکالیف ہیں جن سے انسان بچ سکتا ہے دوسرے وہ تکالیف ہیں جو خدا انسان کے سر پر ڈالتا ہے۔ کسی کے ہاتھ میں تازیانہ دے کر اسے کہا جائے کہ تو اپنے بدن پر آپ مار تو وہ حتی الامکان ایسا نہ کرے گا کیونکہ انسان اپنے تئیں دکھ نہیں دینا چاہتا پس جو تکالیف اختیار میں ہیں ان سے بچ کر وہ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچتا مگر جو تکالیف خدا کی طرف سے ہوں وہ جب انسان پر پڑتی ہیں اور وہ ان پر صبر کرتا ہے تو اس کی ترقی کا موجب ہو جاتی ہیں۔ ... غرض کہ تکالیف دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ حصہ ہے جو احکام پر مشتمل ہے مگر اس میں بہانوں کی گنجائش ہے صوم و زکوٰۃ و صلوٰۃ و حج جب تک پورا اخلاق نہ ہو۔ انسان ان سے پہلو تہی کر سکتا ہے پس اس کسر کو نکالنے کے لئے تکالیفِ سماویہ کا ورود ہوتا ہے تا کہ جو کچھ انسانی ہاتھ سے پورا نہیں ہوا وہ خدا کی مدد سے پورا ہو جائے۔ آریہ کہتے ہیں تکالیف کسی پچھلے کرم کی سزا میں ہیں ہم کہتے ہیں یہ آئندہ ترقیات کے لئے ہیں ورنہ جپ تپ کرنا بھی ایک سزا ہو گا۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۵؍جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

ابتلا ضروری ہے جیسے یہ آیت اشارہ کرتی ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۶)

بہت سے لوگ یہاں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پھوک مار کر عرش پر پہنچائے اور واصلین سے ہو جاویں ایسے لوگ ٹھٹھہ کرتے ہیں وہ انبیاء کے حالات کو دیکھیں یہ غلطی ہے جو کہا جاتا ہے کہ کسی ولی کے پاس جا کر صدہا ولی فی الفور بن گئے۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ جب تک انسان آزمایا نہ جاوے۔ فتن میں نہ ڈالا جاوے وہ کب ولی بن سکتا ہے۔ ایک مجلس میں بایزید وعظ فرما رہے تھے وہاں ایک مشائخ زادہ بھی جو ایک لمبا سلسلہ رکھتا تھا اس کو آپ سے اندرونی بغض

تھا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ خاصہ ہے کہ پرانے خاندانوں کو چھوڑ کر کسی اور کو لے لیتا ہے جیسے بنی اسرائیل کو چھوڑ کر بنی اسماعیل کو لے لیا کیونکہ وہ لوگ عیش وعشرت میں پڑ کر خدا کو بھول گئے ہوئے ہیں۔ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (اٰلِ عمران: ۱۴۱) سو اس شیخ زادے کو خیال آیا کہ یہ ایک معمولی خاندان کا آدمی ہے کہاں سے ایسا صاحبِ خوارق آ گیا لوگ اس طرف جھکتے ہیں اور ہماری طرف نہیں آتے۔ یہ باتیں خدا تعالیٰ نے بایزید پر ظاہر کیں۔ انہوں نے ایک قصہ کے رنگ میں یہ بیان شروع کیا کہ ایک جگہ مجلس میں رات کے وقت ایک لمپ .... جل رہا تھا۔ تیل اور پانی میں بحث ہوئی۔ پانی نے تیل کو کہا کہ تو کثیف اور گندہ ہے اور باوجود کثافت کے میرے اوپر آتا ہے۔ میں ایک مصفا چیز ہوں اور طہارت کے لئے استعمال کیا جاتا ہوں لیکن نیچے ہوں۔ اس کا باعث کیا ہے۔ تیل نے کہا کہ جس قدر صعوبتیں میں نے کھینچی ہیں تو نے کہاں وہ جھیلی ہیں جس کے باعث یہ بلندی مجھے نصیب ہوئی۔ ایک زمانہ تھا جب میں بویا گیا۔ زمین میں مخفی رہا۔ خاکسار ہوا پھر خدا کے ارادہ سے بڑھا۔ بڑھنے نہ پایا کہ کاٹا گیا۔ پھر طرح طرح کی مشقتوں کے بعد صاف کیا گیا۔ کولہوؤں میں پیسا گیا۔ پھر تیل بنا اور آگ لگائی گئی۔ کیا ان مصائب کے بعد بھی میں بلندی حاصل نہ کرتا یہ ایک مثال ہے کہ اہل اللہ مصائب شدائد کے بعد درجات پاتے ہیں۔ لوگوں کا یہ خیال خام ہے کہ فلاں شخص فلاں کے پاس جا کر بلا مجاہدہ وتزکیہ ایک دم میں صدیقین میں داخل ہو گیا۔ قرآن کو دیکھو کہ خدا کس طرح تم پر راضی ہو جب تک نبیوں کی طرح تم پر مصائب وزلازل نہ آویں جنہوں نے بعض وقت تنگ آ کر یہ بھی کہہ دیا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (البقرۃ: ۲۱۵) اللہ کے بندے ہمیشہ بلاؤں میں ڈالے گئے۔ پھر خدا نے ان کو قبول کیا۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۲، ۴۳)

غرض اس سلسلہ میں جو ابتلاؤں کا سلسلہ ہوتا ہے بہت سی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں اور بہت سی موتوں کو قبول کرنا پڑتا ہے ہم قبول کرتے ہیں کہ ان انسانوں میں جو اس سلسلہ میں داخل ہوتے ہیں ان میں بعض بزدل بھی ہوتے ہیں۔ شجاع بھی ہوتے ہیں۔ بعض ایسے بزدل ہوتے ہیں کہ صرف قوم کی کثرت کو دیکھ کر ہی الگ ہو جاتے ہیں۔ انسان بات کو تو پورا کر لیتا ہے مگر ابتلا کے سامنے ٹھہرنا مشکل ہے۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ یعنی کیا لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ایمان لائیں اور امتحان نہ ہو۔ غرض امتحان ضروری شے ہے اس سلسلہ میں جو داخل ہوتا ہے وہ ابتلا سے خالی نہیں رہ سکتا۔ ہمارے بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ وہ ایک طرف ہیں اور باپ الگ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ راگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

قرآن شریف سے صاف پایا جاتا ہے کہ ایمان کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ ابتلاء آویں جیسے فرمایا اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ یعنی کیا لوگ خیال کرتے ہیں کہ صرف اٰمَنَّا کہنے سے چھوڑے جائیں اور وہ فتنوں میں نہ پڑیں۔

انبیاء علیہم السلام کو دیکھو اوائل میں کس قدر دکھ ملتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف دیکھو کہ آپؐ کو مکی زندگی میں کس قدر دکھ اٹھانے پڑے۔ طائف میں جب آپ گئے تو اس قدر آپؐ کے پتھر مارے کہ خون جاری ہوگیا تب آپؐ نے فرمایا کہ کیسا وقت ہے میں کلام کرتا ہوں اور لوگ منہ پھیر لیتے ہیں اور پھر کہا کہ اے میرے رب میں اس دکھ پر صبر کروں گا جب تک کہ تو راضی ہو جاوے۔

اولیاء اور اہل اللہ کا یہی مسلک اور عقیدہ ہوتا ہے سید عبد القادر جیلانی لکھتے ہیں کہ عشق کا خاصہ ہے کہ مصائب آتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے ۔

عشقا! ببرآ! تو مغز گرداں خوردی   باشیر دلاں چہ رستمی ہا کردی

اکنوں کہ بما روئے نبرد آوردی   ہر حیلہ کہ داری نکنی نامردی

مصائب اور تکالیف پر اگر صبر کیا جاوے اور خدا تعالیٰ کی قضا کے ساتھ رضا ظاہر کی جاوے تو وہ مشکل کشائی کا مقدمہ ہوتی ہیں۔ ؎

ہر بلا کیں قوم را او دادہ است   زیر آں یک گنج ہا بنہادہ است

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تکالیف کا نتیجہ تھا کہ مکہ فتح ہوگیا۔ دعا میں خدا تعالیٰ کے ساتھ شرط باندھنا بڑی غلطی اور نادانی ہے۔ جن مقدس لوگوں نے خدا کے فضل اور فیوض کو حاصل کیا۔ انہوں نے اس طرح حاصل کیا کہ خدا کی راہ میں مر مر کر فنا ہو گئے۔ خدا تعالیٰ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو دس دن کے بعد گمراہ ہو جانے والے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نفس پر خود گواہی دیتے ہیں جبکہ لوگوں سے شکوہ کرتے ہیں کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوئی۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰ راکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۴)

مصیبت اور مشکلات بھی انسان کے ایمان کے پرکھنے کا ایک ذریعہ ہیں چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷ راکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

جب سے نبوت کا سلسلہ جاری ہوا ہے یہی قانون چلا آیا ہے قبل از وقت ابتلاء ضرور آتے ہیں تا کچھوں

اور پکوں میں امتیاز ہو اور مومنوں اور منافقوں میں بین فرق نمودار ہو اسی لئے خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ یہ لوگ یہ گمان کر بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا ہی کہنے پر نجات پا جائیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کا کوئی امتحان نہ ہو یہ کبھی نہیں ہوتا۔ دنیا میں بھی امتحان اور آزمائش کا سلسلہ موجود ہے جب دنیوی نظام میں یہ نظیر موجود ہے تو روحانی عالم میں یہ کیوں نہ ہو؟ بغیر امتحان اور آزمائش کے حقیقت نہیں کھلتی۔ آزمائش کے لفظ سے یہ کبھی دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کو جو عالم الغیب اور يَعْلَمُ السِّرَّ وَ الْخَفِيَّ ہے۔ امتحان یا آزمائش کی ضرورت ہے اور بدوں امتحان اور آزمائش کے اس کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ ایسا خیال کرنا نہ صرف غلطی ہے بلکہ کفر کی حد تک پہنچتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان صفات کا انکار ہے۔ امتحان یا آزمائش سے اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ تا حقائق مخفیہ کا اظہار ہو جاوے اور شخص زیر امتحان پر اس کی حقیقتِ ایمان منکشف ہو کر اسے معلوم ہو جاوے کہ وہ کہاں تک اللہ کے ساتھ صدق، اخلاص اور وفا رکھتا ہے اور ایسا ہی دوسرے لوگوں کو اس کی خوبیوں پر اطلاع ملے۔ پس یہ خیال باطل ہے اگر کوئی کرے کہ اللہ تعالیٰ جو امتحان کرتا ہے تو اس سے پایا جاتا ہے کہ اس کو علم نہیں اس کو تو ذرہ ذرہ کا علم ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ ایک آدمی کی ایمانی کیفیتوں کے اظہار کے لئے اس پر ابتلاء آویں اور وہ امتحان کی چکی میں پیسا جاوے۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے۔ ؎

ہر بلا کیں قوم راحق دادہ است   زیر آں گنج کرم بنہادہ است

ابتلاؤں اور امتحانوں کا آنا ضروری ہے بغیر اس کے کشفِ حقائق نہیں ہوتا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۶ مورخہ ۱۴ رفروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

تھوڑے ابتلا کا ہونا ضروری ہے جیسے لکھا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طرف تو مکہ میں فتح کی خبریں دی جاتی تھیں اور ایک طرف ان کو جان کی بھی خیر نظر نہ آتی تھی۔ اگر نبوت کا دل نہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا۔ یہ اسی دل کا حوصلہ تھا۔ بعض ابتلا صرف تبدیلی کے واسطے ہوتے ہیں۔ عملی نمونے ایسے اعلیٰ درجہ کے ہوں کہ ان سے تبدیلیاں ہوں اور ایسی تبدیلی ہو کہ خود انسان محسوس کرے کہ اب میں وہ نہیں ہوں جو کہ میں پہلے تھا بلکہ اب میں ایک اور انسان ہوں۔ اس وقت خدا کو راضی کر و حتی کہ تم کو بشارتیں ہوں۔ (البدر جلد اول نمبر ۹ مورخہ ۲۶ ردسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶۸)

بیعت کرنا صرف زبانی اقرار ہی نہیں بلکہ یہ تو اپنے آپ کو فروخت کر دینا ہے خواہ ذلّت ہو نقصان ہو۔

کچھ ہی کیوں نہ ہو کسی کی پرواہ نہ کی جاوے۔ مگر دیکھو اب کس قدر ایسے لوگ ہیں جو اپنے اقرار کو پورا کرتے ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کو آزمانا چاہتے ہیں۔ پس یہی سمجھ رکھا ہے کہ اب ہمیں مطلقاً کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیے اور ایک پُرامن زندگی بسر ہو حالانکہ انبیاؤں اور قطبوں پر مصائب آئے اور وہ ثابت قدم رہے مگر یہ ہیں کہ ہر ایک تکلیف سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں۔ بیعت کیا ہوئی گویا خدا تعالیٰ کو رشوت دینی ہوئی حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ یعنی کیا یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ یہ فقط کلمہ پڑھ لینے پر ہی چھوڑ دیئے جاویں گے اور ان کو ابتلاؤں میں نہیں ڈالا جاوے گا۔ پھر یہ لوگ بلاؤں سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ ہر ایک شخص کو جو ہمارے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے جان لینا چاہیے کہ جب تک آخرت کے سرمایہ کا فکر نہ کیا جاوے کچھ نہ بنے گا اور یہ ٹھیکہ کرنا کہ ملک الموت میرے پاس نہ پھٹکے۔ میرے کنبے کا نقصان نہ ہو میرے مال کا بال بیکا نہ ہو۔ ٹھیک نہیں ہے۔ خود شرطِ وفا دکھلاوے اور ثابت قدمی وصدق سے مستقل رہے۔ اللہ تعالیٰ مخفی راہوں سے اس کی رعایت کرے گا۔ اور ہر ایک قدم پر ان کا مددگار بن جاوے گا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۴ مورخہ ۳۰؍جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

جب اللہ تعالیٰ کسی آسمانی سلسلہ کو قائم کرتا ہے تو ابتلاء اس کی جزو ہوتے ہیں۔ جو اس سلسلہ میں داخل ہوتا ہے ضروری ہوتا ہے کہ اس پر کوئی نہ کوئی ابتلاء آوے تا کہ اللہ تعالیٰ سچے اور مستقل مزاجوں میں امتیاز کردے اور صبر کرنے والوں کے مدارج میں ترقی ہو۔ ابتلاء کا آنا بہت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ کیا لوگ گمان کر بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا کہنے پر ہی چھوڑ دیئے جاویں کہ ہم ایمان لائے اور ان پر کوئی ابتلاء نہ آوے ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے کہ وہ غداروں اور کچوں کو الگ کردے۔ پس ایمان کے بعد ضروری ہے کہ انسان دکھ اُٹھاوے بغیر اس کے ایمان کا کچھ مزا ہی نہیں ملتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو کیا کیا مشکلات پیش آئیں اور انہوں نے کیا کیا دکھ اُٹھائے۔ آخر ان کے صبر پر اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑے بڑے مدارج اور مراتبِ عالیہ عطا کئے۔ انسان جلد بازی کرتا ہے اور ابتلاء آتا ہے تو اس کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ دنیا ہی رہتی ہے اور نہ دین ہی رہتا ہے مگر جو صبر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہوتا ہے اور ان پر انعام واکرام کرتا ہے اس لئے کسی ابتلاء پر گھبرانا نہیں چاہیے۔ ابتلاء مومن کو اللہ تعالیٰ کے اور بھی قریب کردیتا ہے اور اس کی وفاداری کو مستحکم بناتا ہے لیکن کچے اور غدار کو الگ کردیتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۳۱ مورخہ ۲۴؍اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۴)

انعام و برکات امتحان وابتلاء کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ یاد رکھو کہ ہمیشہ عظیم الشان نعمت ابتلاء سے آتی ہے اور ابتلاء مومن کے لئے شرط ہے جیسے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ یعنی کیا لوگ گمان کر بیٹھے ہیں کہ وہ اتنا ہی کہہ دینے پر چھوڑ دیئے جاویں کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہ جاویں۔ایمان کے امتحان کے لئے مومن کو ایک خطرناک آگ میں پڑنا پڑتا ہے مگر اس کا ایمان اس آگ سے اس کو صحیح سلامت نکال لاتا ہے اور وہ آگ اس پر گلزار ہوجاتی ہے۔مومن ہوکر ابتلاء سے کبھی بےفکر نہیں ہونا چاہیے اور ابتلاء پر زیادہ ثباتِ قدم دکھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔اور حقیقت میں جو سچا مومن ہے ابتلاء میں اس کے ایمان کی حلاوت اور لذت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور اس کے عجائبات پر اس کا ایمان بڑھتا ہے اور وہ پہلے سے بہت زیادہ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرتا اور دعاؤں سے فتحیاب اِجابت چاہتا ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ انسان خواہش تو اعلیٰ مدارج اور مراتب کی کرے اور ان تکالیف سے بچنا چاہے جو ان کے حصول کے لئے ضروری ہیں یقیناً یاد رکھو کہ ابتلاء اور امتحان ایمان کی شرط ہے اس کے بغیر ایمان ایمانِ کامل ہوتا ہی نہیں اور کوئی عظیم الشان نعمت بغیر ابتلاء ملتی ہی نہیں۔دنیا میں بھی عام قاعدہ یہی ہے کہ دنیوی آسائشوں اور نعمتوں کے حاصل کرنے کے لئے قسم قسم کی مشکلات اور رنج وتعب اُٹھانے پڑتے ہیں طرح طرح کے امتحانوں میں سے ہوکر گزرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر کامیابی کی شکل نظر آتی ہے اور پھر بھی وہ محض خدا تعالیٰ کے فضل پر موقوف ہے۔ پھر خدا تعالیٰ جیسی نعمت عظمیٰ جس کی کوئی نظیر ہی نہیں یہ بدوں امتحان کیسے میسر آسکے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ ؍جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

خدا تعالیٰ کی راہ میں جب تک انسان بہت سی مشکلات اور امتحانات میں پورا نہ اترے وہ کامیابی کا سرٹیفکیٹ حاصل نہیں کرسکتا۔اسی لئے فرمایا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ کیا لوگ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محض اتنی ہی بات پر راضی ہوجاوے کہ وہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہ جاویں.... کامل ایمان دار بننے کے لئے مجاہدات کی ضرورت ہے اور مختلف ابتلاؤں اور امتحانوں سے ہوکر نکلنا پڑتا ہے۔

گویند سنگ لعل شود در مقامِ صبر آرے شود و لیکن بخونِ جگر شود

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۴ ؍مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

کیا انسانوں نے گمان کرلیا ہے کہ ہم صرف اٰمَنَّا ہی کہہ کر چھٹکارا پالیں گے اور کیا وہ آزمائش میں نہ

ڈالے جاویں گے۔ سو اصل مطلب یہ ہے کہ یہ آزمائش اسی لئے ہے کہ خدا تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ آیا ایمان لانے والے نے دین کو ابھی دنیا پر مقدم کیا ہے یا نہیں۔ آج کل اس زمانہ میں جب لوگ خدا کی راہ کو اپنے مصالح کے برخلاف پاتے ہیں یا بعض جگہ حکام سے ان کو کچھ خطرہ ہوتا ہے تو وہ خدا کی راہ سے انکار کر بیٹھتے ہیں ایسے لوگ بے ایمان ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ فی الواقعہ خدا ہی احکم الحاکمین ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ خدا کی راہ بہت دشوار گزار ہے اور یہ بالکل سچ ہے کہ جب تک انسان خدا کی راہ میں اپنی کھال اپنے ہاتھ سے نہ اتار لے تب تک وہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں مقبول نہیں ہوتا۔ ہمارے نزدیک بھی ایک بے وفا نوکر کسی قدر و منزلت کے قابل نہیں۔ جو نوکر صدق اور وفا نہیں دکھلاتا وہ کبھی قبولیت نہیں پاتا۔ اسی طرح جنابِ الٰہی میں وہ شخص پرلے درجہ کا بے ادب ہے جو چندروزہ دنیوی منافع پر نگاہ رکھ کر خدا کو چھوڑتا ہے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۳۰ مورخہ ۸؍اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ صرف منہ سے کہہ دینا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں کافی ہے اور کوئی امتحانی مشکل پیش نہ آئے گی یہ بالکل غلط خیال ہے۔ اللہ تعالیٰ مومن پر ابتلا بھیج کر امتحان کرتا ہے۔ تمام راستبازوں سے خدا کی یہی سنت ہے۔ وہ مصائب اور شدائد میں ضرور ڈالے جاتے ہیں۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

ابتلاؤں کا آنا ضروری ہے اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ یعنی کیا لوگ گمان کر بیٹھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے اتنی ہی بات پر راضی ہو جاوے کہ وہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ وہ ابھی امتحان میں نہیں ڈالے گئے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۱ مورخہ ۱۰؍جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

اکثر یہی چاہتے ہیں کہ ہتھیلی پر سرسوں جمادی جاوے۔ وہ نہیں جانتے کہ دین کے کاموں میں کس قدر صبر اور حوصلہ کی حاجت ہے۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ وہ دنیا جس کے لئے وہ رات دن مرتے اور ٹکریں مارتے ہیں اس کے کاموں کے لئے تو برسوں انتظار کرتے ہیں۔ کسان بیج بو کر کتنے عرصہ تک منتظر رہتا ہے لیکن دین کے کاموں میں آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ پھونک مار کر ولی بنا دو اور پہلے ہی دن چاہتے ہیں کہ عرش پر پہنچ جاویں حالانکہ نہ اس راہ میں کوئی محنت اور مشقت اُٹھائی اور نہ کسی ابتلاء کے نیچے آیا۔ خوب یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون اور آئین نہیں ہے یہاں ہر ترقی تدریجی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ نری اتنی باتوں سے خوش نہیں ہوسکتا کہ

ہم کہہ دیں ہم مسلمان ہیں یا مومن ہیں چنانچہ اس نے فرمایا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ یعنی کیا یہ لوگ گمان کر بیٹھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اتنے ہی کہنے پر راضی ہو جاوے اور یہ لوگ چھوڑ دیئے جاویں کہ وہ کہہ دیں ہم ایمان لائے اور ان کی کوئی آزمائش نہ ہو۔ یہ امر سنت اللہ کے خلاف ہے کہ پھونک مار کر ولی بنا دیا جاوے۔ اگر یہی سنت ہوتی تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے اور اپنے جاں نثار صحابہؓ کو پھونک مار کر ہی ولی بنا دیتے ان کو امتحان میں ڈلوا کر ان کے سر نہ کٹواتے اور خدا تعالیٰ ان کی نسبت یہ نہ فرماتا مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (الاحزاب: ۲۴) پس جب دنیا بغیر مشکلات اور محنت کے ہاتھ نہیں آتی تو عجب بیوقوف ہے وہ انسان جو دین کو حلوائے بے دود سمجھتا ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ دین سہل ہے مگر ہر نعمت مشقت کو چاہتی ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۷ ؍جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم مومن ہیں اور مسلمان ہیں لیکن وہ اصل میں نہیں ہوتے۔ زبانی اقرار تو ایک آسان بات ہے لیکن کر کے دکھانا اور بات ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ الآیۃ یعنی کیا لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ مومن اور پکے ایمان دار ہیں اور ابھی وہ آزمائے نہیں گئے۔ پس جب تک آزمائش نہ ہو ایمان کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ بہت لوگ ہیں جو آزمائش کے وقت پھسل جاتے ہیں اور تکلیف کے وقت ان کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے۔ (اخبار بدر جلد ۶ نمبر ۹ مورخہ ۲۸ ؍فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۰)

کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ صرف اتنا کہہ دینے سے ہی کہ ہم ایمان لائے چھوٹ جائیں گے اور ان کا امتحان نہ لیا جاوے گا۔ امتحان کا ہونا تو ضروری ہے اور امتحان بڑی چیز ہے۔ سب پیغمبروں نے امتحان سے ہی درجے پائے ہیں۔ یہ زندگی دنیا کی بھروسہ والی زندگی نہیں ہے۔ کچھ ہی کیوں نہ ہو آخر چھوڑنی پڑتی ہے۔ مصائب کا آنا ضروری ہے۔ دیکھو ایوبؑ کی کہانی میں لکھا ہے کہ طرح طرح کی تکالیف اسے پہنچیں اور بڑے بڑے مصائب نازل ہوئے اور اس نے صبر کئے رکھا۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ؍ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

اصل میں ابتلاؤں کا آنا ضروری ہے۔ اگر انسان عمدہ عمدہ کھانے گوشت پلاؤ اور طرح طرح کے آرام و راحت میں زندگی بسر کر کے خدا کو ملنے کی خواہش کرے تو یہ محال ہے۔ بڑے بڑے زخموں اور سخت سے سخت ابتلاؤں کے بغیر انسان خدا کو مل ہی نہیں سکتا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ غرض بغیر امتحان کے تو بات بنتی ہی نہیں اور پھر امتحان بھی ایسا جو کہ کمر توڑنے والا ہو۔

ہمارے نبی کریم صلعم کا سب سے بڑھ کر مشکل امتحان ہوا تھا جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (الم نشرح : ۳، ۴)۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ رستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ صرف زبانی قیل وقال پر ہی ان کو چھوڑ دیا جائے گا اور صرف اتنا کہنے سے ہی کہ ہم ایمان لے آئے دیندار سمجھے جاویں گے اور ان کا امتحان نہ ہوگا بلکہ امتحان اور آزمائش کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ سب انبیاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ترقی مدارج کے لئے آزمائش ضروری ہے اور جب تک کوئی شخص آزمائش اور امتحان کی منازل طے نہیں کرتا دیندار نہیں بن سکتا۔

(اخبار بدر جلد ۶ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

خدا کے مامور پر ایمان لانے کے ساتھ ابتلاء ضروری ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ کیا لوگوں نے سمجھا کہ چھوڑے جائیں گے یہ کہنے پر کہ ہم ایمان لائے اور آزمائے نہ جائیں گے۔ گویا ایمان کی شرط ہے آزمایا جانا۔ صحابہ کرامؓ کیسے آزمائے گئے۔ ان کی قوم نے طرح طرح کے عذاب دیئے۔ ان کے اموال پر بھی ابتلاء آئے۔ جانوں پر بھی، خویش واقارب پر بھی۔ اگر ایمان لانے کے بعد آسائش کی زندگی آجاوے تو اندیشہ کرنا چاہیے کہ میرا ایمان صحیح نہیں کیونکہ یہ سنت اللہ کے خلاف ہے کہ مومن پر ابتلاء نہ آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہ جب اپنی رسالت پر ایمان لائے تو اسی وقت سے مصائب کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ عزیزوں سے جدا ہوئے۔ میل ملاپ بند کیا گیا۔ ملک سے نکالے گئے۔ دشمنوں نے زہر تک دے دیا۔ تلواروں کے سامنے زخم کھائے۔ اخیر عمر تک یہی حال رہا۔ پس جب ہمارے مقتداء و پیشوا کے ساتھ ایسا ہوا تو پھر اس پر ایمان لانے والے کون ہیں جو بچے رہیں۔ ایسے ابتلاء جب آویں تو مردانہ طریق سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ ابتلاء اسی واسطے آتے ہیں کہ صادق جدا ہوجائے اور کاذب جدا۔ خدا رحیم ہے مگر وہ غنی اور بے نیاز بھی ہے۔ جب انسان اپنے ایمان کو استقامت کے ساتھ مدد نہ دے تو خدا کی مدد بھی منقطع ہوجاتی ہے۔ بعض آدمی صرف اتنی سی بات سے دہریہ ہوجاتے ہیں کہ ان کا لڑکا مرگیا یا بیوی مرگئی یا رزق کی تنگی ہوگئی حالانکہ یہ ایک ابتلاء تھا جس میں پورا نکلتے تو انہیں اس سے بڑھ کر دیا جاتا اور رزق کی تنگی سے پراگندہ دل ہونا مومن کا کام متقی کا شیوہ نہیں۔ یہ جو

پراگندہ روزی پراگندہ دِل

کہتے ہیں اس کے یہ معنے ہیں کہ جو پراگندہ دل ہو وہ پراگندہ روزی رہتا ہے اور اول تو صادقوں کے سوانح دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خود اپنے تئیں پراگندہ روزی بنا لیا۔ دیکھو حضرت ابوبکرؓ تاجر تھے بڑے معزز۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر سب کو دشمن بنا لیا۔ کاروبار میں بھی فرق آ گیا۔ یہاں تک کہ اپنے شہر سے بھی نکلے۔ یہ بات خوب یاد رکھو کہ سچی تقویٰ ایسی چیز ہے جس سے تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں اور کل پراگندگیوں سے نجات ملتی ہے۔ (اخبار بدر جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۰ر فروری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

جو لوگ خدائی امتحان میں پاس ہو جاتے ہیں پھر ان کے واسطے ہر طرح کے آرام و آسائش، رحمت اور فضل کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ دیکھو قرآن شریف میں صاف فرمایا ہے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ صرف زبان سے کہہ لینا تو آسان ہے مگر کچھ کر کے دکھانا اور خدائی امتحان میں پاس ہونا بڑی بات ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۷ مورخہ ۶ر مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۸)

خدا بڑا بے نیاز ہے۔ اس کو اس بات کی کیا پرواہ ہے کہ کوئی جہنم میں جاوے یا کہ بہشت میں جاوے کسی کے دوزخ میں جانے سے خدا کا کچھ بگڑتا نہیں اور کسی کے بہشت میں جانے سے سنورتا نہیں۔ خدا کا اس میں ذاتی نفع یا نقصان کچھ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ یعنی کیا بس اتنی بات سے کہ لوگ زبان سے اتنا کہہ دیں کہ ہم ایمان لائے خدا راضی ہو جاتا ہے اور حال یہ کہ ابھی ان کے اس قول کا امتحان نہیں کیا گیا کہ آیا وہ حقیقتاً مومن ہیں بھی یا کہ نہیں اور ان کے اس قول کا صدق و کذب ظاہر نہیں ہوا۔ پس سچی اور پکی بات یہی ہے کہ انسان اول صدق، اخلاص اور گدازش اختیار کر کے اپنے اوپر ہزاروں موتیں بسر کرے جب جا کر اللہ رحم کرتا ہے اور اس کی طرف جھانکتا ہے۔ جنتر منتر سے ولی بن جانے والے خیالات کے لوگ اور صرف ایک چھوہ سے آسمانی خزانوں کے مالک بن جانے کے خیالات رکھنے والے ہمیشہ محروم رہتے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۴ مورخہ ۲ر اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

انسان دنیوی امتحان کے واسطے کیا کیا تیاریاں کرتا ہے اور کس قدر فکر اور غم اس کو ہوتا ہے اور کیسی کیسی شاقہ محنت برداشت کرتا ہے۔ بے فکری ہے تو کس سے؟ دینی امتحان سے۔ نہیں محنت کی جاتی تو کس کے واسطے؟ دین کے امتحان کے واسطے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ بھی ایک امتحان کی طرف متوجہ کرتا ہے اس کا بھی کچھ فکر کرنا چاہیے اس امتحان کے واسطے

بھی کچھ تیاری کرنی ازبس لازمی ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۱ مورخہ ۶ رمئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

خطرناک مشکلات میں ثابت قدم رہنا اور قدم آگے ہی آگے اُٹھانا اور خدائی امتحان میں پاس ہوجانا سچے اور حقیقی ایمان کی دلیل ہے۔ مشکلات کا آنا اور ابتلاؤں کا آنا مومن پر ضروری ہے تا ظاہر ہو کہ کون سچا مومن اور کون صرف زبانی ایمان کا مدعی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۴ رجولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۸)

یہ ضرور ہے کہ مخالف بھی ہوں کیونکہ سنت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ ہر شخص جو خدا کی طرف قدم اُٹھاتا ہے اس کے لئے امتحان ضروری رکھا ہوا ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ امتحان خدا کی عادت ہے۔ یہ خیال نہ کرو کہ عالم الغیب خدا کو امتحان کی کیا ضرورت ہے؟ یہ اپنی سمجھ کی غلطی ہے اللہ تعالیٰ امتحان کا محتاج نہیں ہے انسان خود محتاج ہے تا کہ اس کو اپنے حالات کی اطلاع ہو اور اپنے ایمان کی حقیقت کھلے۔ مخالفانہ رائے سن کر اگر مغلوب ہوجاوے تو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ قوت نہیں ہے۔ جس قدر علوم وفنون دنیا میں ہیں بدوں امتحان ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ خدا کا امتحان یہی ہے کہ انسان سمجھ جاوے کہ میری حالت کیسی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ مامور من اللہ کے دشمن ضرور ہوتے ہیں جو ان کو تکلیفیں اور اذیتیں دیتے ہیں۔ توہین کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں سعید الفطرت اپنی روشن ضمیری سے ان کی صداقت کو پالیتے ہیں۔ پس ماموروں کے مخالفوں کا وجود بھی اس لئے ضروری ہے جیسے پھولوں کے ساتھ کانٹے کا وجود ہے۔ تریاق بھی ہے تو زہریں بھی ہیں۔ کوئی ہم کو کسی نبی کے زمانہ کا پتہ دے جس کے مخالف نہ ہوئے ہوں اور جنہوں نے اس کو دکاندار، ٹھگ، جھوٹا، مفتری، نہ کہا ہو۔ موسیٰ علیہ السلام پر بھی افترا کر دیا یہاں تک کہ ایک پلید نے تو زنا کا اتہام لگا دیا اور ایک عورت کو پیش کر دیا۔ غرض ان پر ہر قسم کے افترا کئے جاتے ہیں تا لوگ آزمائے جائیں اور یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ خدا کے لگائے ہوئے پودے ان نابکاروں کی پھونکوں سے معدوم کئے جاویں۔ یہی ایک نشان اور تمیز ہوتی ہے ان کے خدا کی طرف سے ہونے کی کہ مخالف کوشش کرتے ہیں کہ وہ نابود ہوجائیں اور وہ بڑھتے اور پھولتے ہیں۔ ہاں جو خدا کی طرف سے نہ ہو وہ آخر معدوم اور نیست و نابود ہوجاتا ہے لیکن جس کو خدا نے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے وہ کسی کی کوشش سے نابود نہیں ہوسکتا۔ وہ کاٹنا چاہتے ہیں اور یہ بڑھتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوسکتا ہے کہ خدا کا ہاتھ ہے جو اس کو تھامے ہوئے ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کس قدر عظیم الشان معجزہ ہے کہ ہر طرف سے مخالفت ہوتی تھی مگر آپ ہر میدان میں کامیاب ہی ہوتے تھے۔ صحابہؓ کے لئے یہ کیسی دل خوش کرنے والی دلیل تھی جب وہ اس نظارے کو دیکھتے تھے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۴ مورخہ ۳۱؍جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

ہم ابتلاء سے کسی طرح بھاگ نہیں سکتے۔ خدا تعالیٰ نے ترقیات کا ذریعہ صرف ابتلاء ہی رکھا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ۔

(مکتوباتِ احمد جلد دوم صفحہ ۹۹)

ابتلاؤں کا آنا ضروری ہے مومن کو چاہیے کہ ایک بہادر کی طرح ان کو قبول کرے۔ خدا تعالیٰ مومن کو تباہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ ابتلاؤں کو اس لئے نازل کرتا ہے کہ اس کے گناہ بخشے اور اس کا مرتبہ زیادہ کرے۔

(مکتوباتِ احمدیہ جلد ۵ حصہ اول صفحہ ۱۲ (مکتوب نمبر ۲۸ بنام حضرت سیٹھ عبد الرحمن صاحب مدراسی)

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدۡخِلَنَّہُمۡ فِی الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۰﴾

یعنی ہماری یہی سنت مستمرہ قدیمہ ہے کہ جو لوگ ایمان لاویں اور عمل صالح کریں ہم ان کو صالحین میں داخل کرلیا کرتے ہیں۔ اب حضرت مولوی صاحب دیکھئے کہ لَنُدۡخِلَنَّہُمۡ میں نون ثقیلہ ہے لیکن اگر اس جگہ آپ کی طرز پر معنے کئے جائیں تو اس قدر فساد لازم آتا ہے جو کسی پر پوشیدہ نہیں کیونکہ اس صورت میں ماننا پڑتا ہے کہ یہ قاعدہ آئندہ کے لئے باندھا گیا ہے اور اب تک کوئی نیک اعمال بجالا کر صلحاء میں داخل نہیں کیا گیا۔ گویا آئندہ کے لئے گنہگار لوگوں کی تو یہ منظور ہے اور پہلے اس سے دروازہ بند ہو رہا ہے۔ سو آپ سوچیں کہ ایسے معنے کرنا کس قدر مفاسد کو مستلزم ہے۔ (الحق مباحثہ دہلی، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۱۶۴)

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے ہم ان کو ضرور ضرور صالحین میں داخل کر دیتے ہیں۔

اس پر بعض اعتراض کرتے ہیں کہ اعمالِ صالحہ کرنے والے صالحین ہوتے ہیں پھر ان کو صالحین میں داخل کرنے سے کیا مراد ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اس میں ایک لطیف نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو بیان فرماتا ہے کہ صلاحیت کی دو قسم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ انسان تکالیف شاقہ اٹھا کر نیکیوں کا بوجھ اُٹھاتا ہے۔ نیکیاں کرتا ہے لیکن ان کے کرنے میں اسے تکلیف اور بوجھ معلوم ہوتا ہے اور اندر نفس کے کشاکش موجود ہوتی ہے اور جب وہ نفس کی مخالفت کرتا ہے تو سخت تکلیف محسوس ہوتی ہے لیکن جب وہ اعمالِ صالحہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر

ایمان لاتا ہے جیسا کہ اس آیت کا منشاء ہے۔ اس وقت وہ تکالیفِ شاقہ اور محنتیں جو خود نیکیوں کے لئے برداشت کرتا ہے اُٹھ جاتی ہیں اور طبعی طور پر وہ صلاحیت کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ تکالیف تکالیف نہیں رہتی ہیں اور نیکیوں کو ایک ذوق اور لذت سے کرتا ہے اور ان دونوں میں یہی فرق ہوتا ہے کہ پہلا نیکی کرتا ہے مگر تکلیف اور تکلف سے اور دوسرا ذوق اور لذت سے۔ وہ نیکی اس کی غذا ہو جاتی ہے جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا اور وہ تکلف اور تکلیف جو پہلے ہوتی تھی۔ اب ذوق وشوق اور لذت سے بدل جاتی ہے یہ مقام ہوتا ہے صالحین کا جن کے لئے فرمایا لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ۔

اس مقام پر پہنچ کر کوئی فتنہ اور فساد مومن کے اندر نہیں رہتا۔ نفس کی شرارتوں سے محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کے جذبات پر فتح پا کر مطمئن ہو کر دارالامان میں داخل ہو جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۲ مورخہ ۱۷؍جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲ و الحکم جلد ۸ نمبر ۳ مورخہ ۲۴؍جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَ لَىِٕنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَ لَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۱

اور بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زبانی تو ایمان کے دعوے کرتے ہیں اور مومن ہونے کی لاف وگزاف مارتے رہتے ہیں۔ لیکن جب معرضِ امتحان وابتلا میں آتے ہیں تو ان کی حقیقت کھل جاتی ہے اس فتنہ وابتلا کے وقت ان کا ایمان اللہ تعالیٰ پر ویسا نہیں رہتا بلکہ شکایت کرنے لگتے ہیں۔ اسے عذابِ الٰہی قرار دیتے ہیں حقیقت میں وہ لوگ بڑے ہی محروم ہیں جن کو صالحین کا مقام حاصل نہیں ہوتا کیونکہ یہی تو وہ مقام ہے جہاں انسان ایمانی مدارج کے ثمرات کو مشاہدہ کرتا ہے اور اپنی ذات پر ان کا اثر پاتا ہے اور نئی زندگی اسے ملتی ہے لیکن یہ زندگی پہلے ایک موت کو چاہتی ہے اور یہ انعام و برکات امتحان و ابتلا کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں....

یقیناً یاد رکھو کہ ابتلا اور امتحان ایمان کی شرط ہے اس کے بغیر ایمان، ایمانِ کامل ہوتا ہی نہیں اور کوئی عظیم الشان نعمت بغیر ابتلا ملتی ہی نہیں ہے۔ دنیا میں بھی عام قاعدہ یہی ہے کہ دنیوی آسائشوں اور نعمتوں کے حاصل کرنے کے لئے قسم قسم کی مشکلات اور رنج وتعب اُٹھانے پڑتے ہیں طرح طرح کے امتحانوں میں

سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر کامیابی کی شکل نظر آتی ہے اور پھر بھی وہ محض خدا تعالیٰ کے فضل پر موقوف ہے پھر خدا تعالیٰ جیسی نعمتِ عظمیٰ جس کی کوئی نظیر ہی نہیں یہ بدوں امتحان کیسے میسر آ سکے۔

پس جو چاہتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو پاوے اسے چاہیے کہ وہ ہر ایک ابتلا کے لئے طیار ہو جاوے۔ جب اللہ تعالیٰ کوئی سلسلہ قائم کرتا ہے جیسا کہ اس وقت اس نے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے تو جو لوگ اس میں اولاً داخل ہوتے ہیں ان کو قسم قسم کی تکالیف اُٹھانی پڑتی ہیں ہر طرف سے گالیاں اور دھمکیاں سننی پڑتی ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ یہاں تک کہ ان کو کہا جاتا ہے کہ ہم تم کو یہاں سے نکال دیں گے یا اگر ملازم ہے تو اس کے موقوف کرانے کے منصوبے ہوتے ہیں۔ جس طرح ممکن ہوتا ہے تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں اور اگر ممکن ہو تو جان لینے سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ ایسے وقت میں جو لوگ ان دھمکیوں کی پروا کرتے ہیں اور امتحان کے ڈر سے کمزوری ظاہر کرتے ہیں۔ یاد رکھو خدا تعالیٰ کے نزدیک ان کے ایمان کی ایک پیسہ بھی قیمت نہیں ہے کیونکہ وہ ابتلا کے وقت خدا سے نہیں انسان سے ڈرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت کی پروا نہیں کرتا وہ بالکل ایمان نہیں لایا کیونکہ دھمکی کو اس کے مقابلہ میں وقعت دیتا اور ایمان چھوڑنے کو طیار ہو جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صالحین میں داخل ہونے سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ خلاصہ اور مفہوم ہے اس آیت کا وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ رجنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۱، ۲)

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَ اعْبُدُوْهُ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۱۸

تم اے مشرکو بجز خدا کے صرف بے جان بتوں کی پرستش کرتے ہو اور سراسر جھوٹ پر جم رہے ہو۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۷ ۴۳ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ ارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۳۷

اور فساد کی نیت سے زمین پر مت پھرا کرو۔ یعنی اس نیت سے کہ چوری کریں یا ڈاکہ ماریں یا کسی کی

جیب کتریں یا کسی اور ناجائز طریق سے بیگانہ مال پر قبضہ کریں اور پھر فرمایا کہ تم اچھی چیزوں کے عوض میں خبیث اور ردی چیزیں نہ دیا کرو...

ان تمام آیات میں خدا تعالیٰ نے تمام طریقے بد دیانتی کے بیان فرما دیئے اور ایسا کلام کلی کے طور پر فرمایا جس میں کسی بد دیانتی کا ذکر باہر نہ رہ جائے۔ صرف یہ نہیں کہا کہ تو چوری نہ کر تا ایک نادان یہ نہ سمجھ لے کہ چوری میرے لئے حرام ہے مگر دوسرے ناجائز طریقے سب حلال ہیں۔ اس کلمہ جامع کے ساتھ تمام ناجائز طریقوں کو حرام ٹھہرانا یہی حکمت بیانی ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۷، ۳۴۸)

وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَ مَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

جس طرح آفتاب کا قدر آنکھ ہی سے پیدا ہوتا ہے اور روزِ روشن کے فوائد اہلِ بصارت ہی پر ظاہر ہوتے ہیں اسی طرح خدا کی کلام کا کامل طور پر انہیں کو قدر ہوتا ہے کہ جو اہل عقل ہیں جیسا کہ خدائے تعالیٰ نے آپ فرمایا ہے وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَ مَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ یعنی یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں پر ان کو معقول طور پر وہی سمجھتے ہیں کہ جو صاحبِ علم اور دانشمند ہیں۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۳۰۰، ۳۰۱ حاشیہ ۱۱)

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۶﴾

نماز میں لذت اور سرور بھی عبودیت اور ربوبیت کے ایک تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ جب تک اپنے آپ کو عدمِ محض یا مشابہ بالعدم قرار دے کر جو ربوبیت کا ذاتی تقاضا ہے نہ ڈال دے اس کا فیضان اور پرتو اس پر نہیں پڑتا اور اگر ایسا ہو تو پھر اعلیٰ درجہ کی لذت حاصل ہوتی ہے جس سے بڑھ کر کوئی حظ نہیں ہے۔ اس مقام پر انسان کی روح جب ہمہ نیستی ہو جاتی ہے تو وہ خدا کی طرف ایک چشمہ کی طرح بہتی ہے اور ماسوی اللہ سے اسے انقطاع ہو جاتا ہے اس وقت خدائے تعالیٰ کی محبت اس پر گرتی ہے۔ اس اتصال کے وقت ان دو جوشوں سے جو اوپر کی طرف سے ربوبیت کا جوش اور نیچے کی طرف سے عبودیت کا جوش ہوتا ہے ایک خاص

کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا نام صلوٰۃ ہے۔ پس یہی وہ صلوات ہے جو سیئات کو بھسم کر جاتی ہے اور اپنی جگہ ایک نور اور چمک چھوڑ دیتی ہے جو سالک کو راستہ کے خطرات اور مشکلات کے وقت ایک منور شمع کا کام دیتی ہے اور ہر قسم کے خس و خاشاک اور ٹھوکر کے پتھروں اور خار و خس سے جو اس کی راہ میں ہوتے ہیں آگاہ کر کے بچاتی ہے اور یہی وہ حالت ہے جبکہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ کا اطلاق اس پر ہوتا ہے .... کیونکہ اس کے شمع دانِ دل میں ایک روشن چراغ رکھا ہوا ہوتا ہے اور یہ درجہ کامل تذلل کامل نیستی اور فروتنی اور پوری اطاعت سے حاصل ہوتا ہے پھر گناہ کا خیال اسے آ کیوں کر سکتا ہے اور انکار اس میں پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ فحشاء کی طرف اس کی نظر اُٹھ ہی نہیں سکتی۔ غرض اسے ایسی لذت، ایسا سرود حاصل ہوتا ہے میں نہیں سمجھ سکتا کہ اسے کیوں کر بیان کروں۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۲/اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۵، ۶)

نماز ہی ایک ایسی نیکی ہے جس کے بجالانے سے شیطانی کمزوری دور ہوتی ہے اور اسی کا نام دعا ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ انسان اس میں کمزور رہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جس قدر اصلاح اپنی کرے گا وہ اسی ذریعہ سے کرے گا۔ پس اس کے واسطے پاک صاف ہونا شرط ہے... جب تک گندگی انسان میں ہوتی ہے اس وقت تک شیطان اس سے محبت کرتا ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴ مورخہ ۱۳/فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۷)

اپنے دلوں میں خدا تعالیٰ کی محبت اور عظمت کا سلسلہ جاری رکھیں اور اس کے لئے نماز سے بڑھ کر اور کوئی شے نہیں ہے کیونکہ روزہ تو ایک سال کے بعد آتے ہیں اور زکوٰۃ صاحبِ مال کو دینی پڑتی ہے مگر نماز ہے کہ ہر ایک (حیثیت کے آدمی کو) پانچوں وقت ادا کرنی پڑتی ہے اسے ہرگز ضائع نہ کریں۔ اسے بار بار پڑھو اور اس خیال سے پڑھو کہ میں ایسی طاقت والے کے سامنے کھڑا ہوں کہ اگر اس کا ارادہ ہو تو ابھی قبول کر لیوے اسی حالت میں بلکہ اسی ساعت میں بلکہ اسی سیکنڈ میں۔ کیونکہ دوسرے دنیوی حاکم تو خزانوں کے محتاج ہیں اور ان کو فکر ہوتی ہے کہ خزانہ خالی نہ ہو جاوے اور ناداری کا ان کو فکر لگا رہتا ہے مگر خدا تعالیٰ کا خزانہ ہر وقت بھرا بھرایا ہے۔ جب اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو صرف یقین کی حاجت ہوتی ہے کہ اسے اس امر پر یقین ہو کہ میں ایک سمیع، علیم اور خبیر اور قادر ہستی کے سامنے کھڑا ہوا ہوں اگر اسے لہر آجاوے تو ابھی دے دیوے۔ بڑی تضرع سے دعا کرے ناامید اور بدظن ہرگز نہ ہووے اور اگر اس طرح کرے تو (اس راحت کو) جلدی دیکھ لے گا اور خدا تعالیٰ کے اَور اَور فضل بھی شاملِ حال ہوں گے اور خود خدا بھی ملے گا۔ تو یہ طریق ہے جس پر کاربند ہونا چاہیے مگر ظالم فاسق کی دعا قبول نہیں ہوا کرتی کیونکہ وہ خدا تعالیٰ سے لاپرواہ

ہے اور خدا تعالیٰ بھی اس سے لاپرواہ ہے۔ ایک بیٹا اگر باپ کی پرواہ نہ کرے اور ناخلف ہو تو باپ کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی تو خدا کو کیوں ہو۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴ مورخہ ۱۳ ؍فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۸)

نماز بھی گناہوں سے بچنے کا ایک آلہ ہے۔ نماز کی یہ صفت ہے کہ یہ انسان کو گناہ اور بدکاری سے ہٹا دیتی ہے۔ سو تم ویسی نماز کی تلاش کرو اور اپنی نماز کو ایسی بنانے کی کوشش کرو۔ نماز نعمتوں کی جان ہے اللہ تعالیٰ کے فیض اسی نماز کے ذریعہ سے آتے ہیں سو اس کو سنوار کر ادا کرو تا کہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمت کے وارث بنو۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ ؍مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

نماز ہر ایک مسلمان پر فرض ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قوم اسلام لائی اور عرض کی کہ یا رسول اللہ ہمیں نماز معاف فرما دی جاوے کیونکہ ہم کاروباری آدمی ہیں۔ مویشی وغیرہ کے سبب سے کپڑوں کا کوئی اعتماد نہیں ہوتا اور نہ ہمیں فرصت ہوتی ہے تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ دیکھو جب نماز نہیں تو ہے ہی کیا؟ وہ دین ہی نہیں جس میں نماز نہیں۔ نماز کیا ہے؟ یہی کہ اپنے عجز نیاز اور کمزوریوں کو خدا کے سامنے پیش کرنا اور اسی سے اپنی حاجت روائی چاہنا۔ کبھی اس کی عظمت اور اس کے احکام کی بجا آوری کے واسطے دست بستہ کھڑا ہونا اور کبھی کمال مذلت اور فروتنی سے اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔ اس سے اپنی حاجات کا مانگنا یہی نماز ہے۔ ایک سائل کی طرح کبھی اس مسئول کی تعریف کرنا کہ تو ایسا ہے تو ایسا ہے۔ اس کی عظمت اور جلال کا اظہار کر کے اس کی رحمت کو جنبش دلانا اور پھر اس سے مانگنا۔ پس جس دین میں یہ نہیں وہ دین ہی کیا ہے۔

انسان ہر وقت محتاج ہے کہ اس سے اس کی رضا کی راہیں مانگتا رہے اور اس کے فضل کا اسی سے خواستگار ہو کیونکہ اسی کی دی ہوئی توفیق سے کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اے خدا ہم کو توفیق دے کہ ہم تیرے ہو جائیں اور تیری رضا پر کاربند ہو کر تجھے راضی کر لیں۔ خدا کی محبت، اسی کا خوف، اسی کی یاد میں دل لگا رہنے کا نام نماز ہے اور یہی دین ہے۔ پھر جو شخص نماز ہی سے فراغت حاصل کرنی چاہتا ہے اس نے حیوانوں سے بڑھ کر کیا کیا؟ وہی کھانا پینا اور حیوانوں کی طرح سو رہنا۔ یہ تو دین ہرگز نہیں۔ یہ سیرتِ کفار ہے بلکہ جو دم غافل وہ دم کافر والی بات بالکل راست اور صحیح ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں ہے کہ اذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِيْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ (البقرۃ: ۱۵۸) یعنی اے میرے بندو تم مجھے یاد کیا کرو اور میری یاد میں مصروف رہا کرو میں بھی تم کو نہ بھولوں گا تمہارا خیال رکھوں گا۔ اور میرا شکر کیا کرو، میرے انعامات کی قدر کیا کرو اور کفر نہ کیا کرو۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذکر الٰہی کے ترک اور اس سے غفلت کا نام کفر ہے۔ پس جو دَم غافل وہ دَم کافر والی بات صاف ہے۔

یہ پانچ وقت تو خدا تعالیٰ نے بطور نمونہ کے مقرر فرمائے ہیں ورنہ خدا کی یاد میں تو ہر وقت دل کو لگا رہنا چاہیے اور کبھی کسی وقت بھی غافل نہ ہونا چاہیے۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہر وقت اسی کی یاد میں غرق ہونا بھی ایک ایسی صفت ہے کہ انسان اس سے انسان کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے اور خدا تعالیٰ پر کسی طرح کی امید اور بھروسہ کرنے کا حق رکھ سکتا ہے۔ اصل میں قاعدہ ہے کہ اگر انسان نے کسی خاص منزل پر پہنچنا ہے اس کے واسطے چلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جتنی لمبی وہ منزل ہوگی اتنا ہی زیادہ تیزی، کوشش اور محنت اور دیر تک اسے چلنا ہوگا۔ سو خدا تک پہنچنا بھی تو ایک منزل ہے اور اس کا بعد اور دوری بھی لمبی۔ پس جو شخص خدا سے ملنا چاہتا ہے اور اس کے دربار میں پہنچنے کی خواہش رکھتا ہے اس کے واسطے نماز ایک گاڑی ہے جس پر سوار ہوکر وہ جلد تر پہنچ سکتا ہے اور جس نے نماز ترک کر دی وہ کیا پہنچے گا۔

اصل میں مسلمانوں نے جب سے نماز کو ترک کیا یا اسے دل کی تسکین، آرام اور محبت سے اس کی حقیقت سے غافل ہوکر پڑھنا ترک کیا ہے تب ہی سے اسلام کی حالت بھی معرضِ زوال میں آئی ہے۔ وہ زمانہ جس میں نمازیں سنوار کر پڑھی جاتی تھیں غور سے دیکھ لو کہ اسلام کے واسطے کیسا تھا۔ ایک دفعہ تو اسلام نے تمام دنیا کو زیر پا کر دیا تھا۔ جب سے اسے ترک کیا وہ خود متروک ہو گئے ہیں۔ دردِ دل سے پڑھی ہوئی نماز ہی ہے کہ تمام مشکلات سے انسان کو نکال لیتی ہے۔ ہمارا بارہا کا تجربہ ہے کہ اکثر کسی مشکل کے وقت دعا کی جاتی ہے ابھی نماز میں ہی ہوتے ہیں کہ خدا نے اس امر کو حل اور آسان کر دیا ہوا ہوتا ہے۔

نماز میں کیا ہوتا ہے یہی کہ عرض کرتا ہے، التجا کے ہاتھ بڑھاتا ہے اور دوسرا اس کی عرض کو اچھی طرح سنتا ہے۔ پھر ایک ایسا وقت بھی ہوتا ہے کہ جو سنتا تھا وہ بولتا ہے اور گذارش کرنے والے کو جواب دیتا ہے۔ نمازی کا یہی حال ہے۔ خدا کے آگے سربسجود رہتا ہے اور خدا کو اپنے مصائب اور حوائج سناتا ہے۔ پھر آخر سچی اور حقیقی نماز کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک وقت جلد آ جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس کے جواب کے واسطے بولتا اور اس کو جواب دے کر تسلی دیتا ہے۔ بھلا یہ بجز حقیقی نماز کے ممکن ہے۔ ہرگز نہیں اور پھر جن کا خدا ہی ایسا نہیں وہ بھی گئے گزرے ہیں۔ ان کا کیا دین اور کیا ایمان ہے۔ وہ کس امید پر اپنے اوقات ضائع کرتے ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱؍مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۷، ۸)

نماز کیا ہے؟ ایک قسم کی دعا ہے جو انسان کو تمام برائیوں اور فواحش سے محفوظ رکھ کر حسنات کا مستحق اور انعامِ الٰہیہ کا مورد بنا دیتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اللہ اسمِ اعظم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام صفات کو اس کے تابع رکھا ہے اب ذرا غور کرو نماز کی ابتداء اذاں سے شروع ہوتی ہے اذاں اللہ اکبر سے شروع ہوتی ہے یعنی اللہ کے نام سے شروع ہو کر لا الہ الا اللہ یعنی اللہ ہی پر ختم ہوتی ہے یہ فخر اسلامی عبادت ہی کو ہے کہ اس میں اول اور آخر میں اللہ تعالیٰ ہی مقصود ہے نہ کچھ اور۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اس قسم کی عبادت کسی قوم اور ملت میں نہیں ہے۔ پس نماز جو دعا ہے اور جس میں اللہ کو جو خدائے تعالیٰ کا اسمِ اعظم ہے مقدم رکھا ہے۔ ایسا ہی انسان کا اسمِ اعظم استقامت ہے۔ اسمِ اعظم سے مراد یہ ہے کہ جس ذریعہ سے انسانیت کے کمالات حاصل ہوں۔

(منقول از ٹریکٹ نمبر ۱ ''حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدۃ الوجود پر ایک خط'' مرتبہ شیخ یعقوب علی صاحب صفحہ ۱۸)

نماز ایسی چیز ہے کہ اس سے دنیا بھی سنور جاتی ہے اور دین بھی.... نماز تو وہ چیز ہے کہ انسان اس کے پڑھنے سے ہر ایک طرح کی بدعملی اور بے حیائی سے بچایا جاتا ہے مگر جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اس طرح کی نماز پڑھنی انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتی اور یہ طریق خدا کی مدد اور استعانت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اور جب تک انسان دعاؤں میں نہ لگا رہے اس طرح کا خشوع اور خضوع پیدا نہیں ہو سکتا اس لئے چاہیے کہ تمہارا دن اور تمہاری رات غرض کوئی گھڑی دعاؤں سے خالی نہ ہو۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳ مورخہ ۱۰؍جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

وَ لَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖۗ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَ قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

اس مسئلہ میں کسی سمجھدار مسلمان کو اختلاف نہیں کہ دینی حمایت کے لئے ہمیں کسی جوش یا اشتعال کی تعلیم نہیں دی گئی بلکہ ہمارے لئے قرآن میں یہ حکم ہے وَ لَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اور دوسری جگہ یہ حکم ہے کہ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (النحل:۱۲۶) اس کے معنے یہی ہیں کہ نیک طور پر اور ایسے طور پر جو مفید ہو عیسائیوں سے مجادلہ کرنا چاہیے اور حکیمانہ طریق اور ایسے ناصحانہ طور کا پابند ہونا چاہیے کہ ان کو فائدہ بخشے۔

(مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۲۱۷)

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَ مِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ۞ وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۞ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۞

مضمون پڑھنے والے نے بیان کیا کہ قرآن بائبل کی نقل ہے اس سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی بیبا کی اور دروغ گوئی میں کہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے دنیا میں کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ قرآن شریف تیئیس[۲۳] برس برابر یہود اور نصاریٰ کے رُوبرو اترتا رہا مگر کسی نے یہ اعتراض نہ کیا کہ قرآن شریف بائبل کی نقل ہے اور خود ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے اور نہ لکھ سکتے تھے اور نہ پڑھ سکتے تھے اور نصاریٰ اور یہود کے علماء سخت دشمن تھے اس صورت میں کیوں کر ممکن تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نصاریٰ اور یہود کی کتابوں میں سے کچھ نقل کر سکتے تھے چنانچہ اس بارے میں قرآن شریف میں یہ آیات ہیں وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَ مِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ۔ وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ۔ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ۔ الجزو نمبر ۲۱ سورۃ العنکبوت (ترجمہ) اور اے پیغمبر! جس طرح اگلے پیغمبروں پر ہم نے کتابیں اتاری تھیں اسی طرح تجھ پر یہ کتاب اُتاری ہے۔ پس جن کو تجھ سے پہلے ہم نے کتاب دی ہے اُن کے سمجھدار اور سعید لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان مشرکین اہلِ مکہ سے بھی سوچنے والے لوگ ایمان لاتے ہیں اور ان دونوں فرقوں میں سے وہ لوگ ایمان نہیں لاتے جنہوں نے دیدہ ودانستہ کفر کو اپنے لئے اختیار کرلیا ہے۔ اور اے پیغمبر! قرآن سے پہلے نہ تو تم کوئی کتاب ہی پڑھتے تھے اور نہ تم اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے اگر ایسا ہوتا تو ان بے دین لوگوں کو شبہ کرنے کی کوئی گنجائش ہوتی مگر اب تو اُن کا شبہ سراسر ہٹ دھرمی ہے یعنی جبکہ یہ امر ثابت شدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محض ناخواندہ اور اُمّی تھے اور کوئی نہیں ثابت کرسکا کہ آپ لکھ سکتے یا پڑھ سکتے تھے تو پھر ایسے شبہات ایمانداری کے برخلاف ہیں اور پھر فرمایا کہ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو قرآن شریف کے حقائق اور معارف کا علم دیا گیا ہے اُن کے نزدیک تو قرآن شریف خدا کے کھلے

کھلے نشان ہیں یعنی اعتراض وہی لوگ کرتے ہیں جو قرآن شریف میں کچھ تدبر نہیں کرتے اور اس کے معجزانہ مرتبہ سے بے خبر ہیں اور تدبّر کرنے والے تو ایک ہی نظر سے شناخت کر جاتے ہیں کہ یہ کلام انسانی طاقتوں سے برتر ہے کیونکہ وہ اعجازی صفت اپنے اندر رکھتا ہے۔ علاوہ اس کے یہ کہ وہ عین ضرورت کے وقت آیا ہے اور اس وقت آیا ہے جبکہ دنیا خدا کے راہ کو بھول چکی تھی اور جن بیماروں کے لئے آیا اُن کو اس نے چنگا کر کے دکھلا دیا اور نہ توریت اور نہ انجیل وہ اصلاح کر سکی جو قرآن شریف نے کی۔ کیونکہ توریت کی تعلیم پر چلنے والے یعنی یہودی ہمیشہ بار بار بُت پرستی میں پڑتے رہے چنانچہ تاریخ جاننے والے اس پر گواہ ہیں اور وہ کتابیں کیا باعتبار علمی تعلیم کے اور کیا باعتبار عملی تعلیم کے سراسر ناقص تھیں اس لئے اُن پر چلنے والے بہت جلد گمراہی میں پھنس گئے۔ انجیل پر ابھی تینس ۳۰ برس بھی نہیں گزرے تھے کہ بجائے خدا کی پرستش کے ایک عاجز انسان کی پرستش نے جگہ لے لی یعنی حضرت عیسیٰ خدا بنائے گئے اور تمام نیک اعمال کو چھوڑ کر ذریعہ معافی گناہ یہ ٹھہرا دیا کہ اُن کے مصلوب ہونے اور خدا کا بیٹا ہونے پر ایمان لایا جائے پس کیا یہی کتابیں تھیں جن کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل کی بلکہ سچ تو یہ بات ہے کہ وہ کتابیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ردّی کی طرح ہو چکی تھیں اور بہت جھوٹ اُن میں ملائے گئے تھے جیسا کہ کئی جگہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے کہ وہ کتابیں محرف مبدّل ہیں اور اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہیں چنانچہ اس واقعہ پر اس زمانہ میں بڑے بڑے محقق انگریزوں نے بھی شہادت دی ہے۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۶۴ تا ۲۶۶)

اور اس سے پہلے تو کسی کتاب کو نہیں پڑھتا تھا اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا تا باطل پرستوں کو شک کرنے کی کوئی وجہ بھی ہوتی بلکہ وہ آیاتِ بینات ہیں جو اہل علم لوگوں کے سینوں میں ہیں اور ان سے انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو ظالم ہیں۔

ان تمام آیات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امی ہونا بکمال وضاحت ثابت ہوتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر آنحضرتؐ فی الحقیقت امی اور ناخواندہ نہ ہوتے تو بہت سے لوگ اس دعویٰ امیت کی تکذیب کرنے والے پیدا ہو جاتے کیونکہ آنحضرتؐ نے کسی ایسے ملک میں یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ جس ملک کے لوگوں کو آنحضرتؐ کے حالات اور واقعات سے بے خبر اور ناواقف قرار دے سکیں بلکہ وہ تمام لوگ ایسے تھے جن میں آنحضرتؐ نے ابتداء عمر سے نشوونما پایا تھا اور ایک حصہ کلاں عمر اپنی کا اُن کی مخالطت اور مصاحبت میں بسر کیا تھا۔ پس اگر فی الواقع جنابِ ممدوح امی نہ ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ اپنے اُمّی ہونے کا ان لوگوں کے سامنے

نام بھی لے سکتے جن پر کوئی حال ان کا پوشیدہ نہ تھا اور جو ہر وقت اس گھات میں لگے ہوئے تھے کہ کوئی خلاف گوئی ثابت کریں اور اس کو مشتہر کر دیں۔ جن کا عناد اس درجہ تک پہنچ چکا تھا کہ اگر بس چل سکتا تو کچھ جھوٹ موٹ سے ہی ثبوت بنا کر پیش کر دیتے اور اسی جہت سے ان کو ان کی ہر یک بدظنی پر ایسا مسکت جواب دیا جاتا تھا کہ وہ ساکت اور لاجواب رہ جاتے تھے۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۶۹ تا ۵۷۲)

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ یعنی قرآن آیات بینات ہیں جو اہلِ علم کے سینوں میں ہیں پس ظاہر ہے کہ اس آیت کے یہی معنی ہیں کہ مومنوں کو قرآن کریم کا علم اور نیز اس پر عمل عطا کیا گیا ہے اور جبکہ قرآن کی جگہ مومنوں کے سینے ٹھہرے تو پھر یہ آیت کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر: ۱۰) بجز اس کے اور کیا معنی رکھتی ہے کہ قرآن سینوں سے محو نہیں کیا جائے گا جس طرح کہ توریت اور انجیل یہود اور نصاریٰ کے سینوں سے محو کی گئی اور گو توریت اور انجیل ان کے ہاتھوں اور ان کے صندوقوں میں تھی لیکن ان کے دلوں سے محو ہوگئی یعنی ان کے دل اس پر قائم نہ رہے اور انہوں نے توریت اور انجیل کے اپنے دلوں میں قائم اور بحال نہ کیا۔ غرض یہ آیت بلند آواز سے پکار رہی ہے کہ کوئی حصہ تعلیم قرآن کا برباد اور ضائع نہیں ہوگا اور جس طرح روزِ اول سے اس کا پودہ دلوں میں جمایا گیا یہی سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ (شھادۃ القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۵۰، ۳۵۱)

وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۵۱ اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۵۲ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۵۳ وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ لَوْ لَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَ لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۵۴

کہتے ہیں کیوں نہ اُتریں اس پر نشانیاں کہ وہ نشانیاں (جو تم مانگتے ہو یعنی عذاب کی نشانیاں) وہ تو

خدائے تعالیٰ کے پاس اور خاص اس کے اختیار میں ہیں اور میں تو صرف ڈرانے والا ہوں۔ یعنی میرا کام فقط یہ ہے کہ عذاب کے دن سے ڈراؤں نہ یہ کہ اپنی طرف سے عذاب نازل کروں اور پھر فرمایا کہ کیا ان لوگوں کے لئے (جو اپنے پر کوئی عذاب کی نشانی وارد کرانی چاہتے ہیں) یہ رحمت کی نشانی کافی نہیں جو ہم نے تجھ پر (اے رسول اُمّی) وہ کتاب (جو جامع کمالات ہے) نازل کی جو اُن پر پڑھی جاتی ہے یعنی قرآن شریف جو ایک رحمت کا نشان ہے۔ جس سے درحقیقت وہی مطلب نکلتا ہے جو کفّار عذاب کے نشانوں سے پورا کرنا چاہتے ہیں کیونکہ کفّار مکہ اس غرض سے عذاب کا نشان مانگتے تھے کہ تا وہ ان پر وارد ہو کر انہیں حق الیقین تک پہنچادے۔ صرف دیکھنے کی چیز نہ رہے کیونکہ مجرد رویت کے نشانوں میں ان کو دھوکے کا احتمال تھا اور چشم بندی وغیرہ کا خیال سو اس وہم اور اضطراب کے دور کرنے کے لئے فرمایا کہ ایسا ہی نشان چاہتے ہو جو تمہارے وجودوں پر وارد ہو جائے تو پھر عذاب کے نشان کی کیا حاجت ہے؟ کیا اس مدّعا کے حاصل کرنے کے لئے رحمت کا نشان کافی نہیں؟ یعنی قرآن شریف جو تمہاری آنکھوں کو اپنی پُرنور اور تیز شعاعوں سے خیرہ کر رہا ہے اور اپنی ذاتی خوبیاں اور اپنے حقائق اور معارف اور اپنے فوق العادت خواص اس قدر دکھلا رہا ہے جس کے مقابلہ و معارضہ سے تم عاجز رہ گئے ہو اور تم پر اور تمہاری قوم پر ایک خارق عادت اثر ڈال رہا ہے اور دلوں پر وارد ہو کر عجیب در عجیب تبدیلیاں دکھلا رہا ہے۔ مدت ہائے دراز کے مردے اس سے زندہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور مادرزاد اندھے جو بے شمار پشتوں سے اندھے ہی چلے آتے تھے۔ آنکھیں کھول رہے ہیں اور کفر اور الحاد کی طرح طرح کی بیماریاں اس سے اچھی ہوتی چلی جاتی ہیں اور تعصب کے سخت جذامی اس سے صاف ہوتے جاتے ہیں۔ اس سے نور ملتا ہے اور ظلمت دُور ہوتی ہے اور وصل الٰہی میسر آتا ہے اور اس کی علامات پیدا ہوتی ہیں۔ سو تم کیوں اس رحمت کے نشان کو چھوڑ کر جو ہمیشہ کی زندگی بخشتا ہے عذاب اور موت کا نشان مانگتے ہو؟ پھر بعد اس کے فرمایا کہ یہ قوم تو جلدی سے عذاب ہی مانگتی ہے۔ رحمت کے نشانوں سے فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتی۔ اُن کو کہہ دے کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ عذاب کی نشانیاں وابستہ باوقات ہوتی ہیں تو یہ عذابی نشانیاں بھی کب کی نازل ہوگئی ہوتیں اور عذاب ضرور آئے گا اور ایسے وقت میں آئے گا کہ ان کو خبر بھی نہیں ہوگی۔

اب انصاف سے دیکھو! کہ اس آیت میں کہاں معجزات کا انکار پایا جاتا ہے یہ آیتیں تو بآواز بلند پکار رہی ہیں کہ کفّار نے ہلاکت اور عذاب کا نشان مانگا تھا۔ سو اوّل انہیں کہا گیا کہ دیکھو تم میں زندگی بخش نشان موجود ہے یعنی قرآن جو تم پر وارد ہو کر تمہیں ہلاک کرنا نہیں چاہتا بلکہ ہمیشہ کی حیات بخشتا ہے مگر جب عذاب کا نشان

تم پر وارد ہوا تو وہ تمہیں ہلاک کرے گا۔ پس کیوں تم ناحق اپنا مرنا ہی چاہتے ہو اور اگر تم عذاب ہی مانگتے ہو تو یادرکھو کہ وہ بھی جلد آئے گا۔ پس اللہ جل شانہٗ نے ان آیات میں عذاب کے نشان کا وعدہ دیا اور قرآن شریف میں جو رحمت کے نشان ہیں اور دلوں پر وارد ہو کر اپنا خارق عادت اثر ان پر ظاہر کرتے ہیں ان کی طرف توجہ دلائی۔ پر معترض کا یہ گمان کہ اس آیت میں لا نافیہ جنس معجزات کی نفی پر دلالت کرتا ہے۔ جس سے کل معجزات کی نفی لازم آتی ہے۔ محض صَرف ونحو سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ یادرکھنا چاہئے کہ نفی کا اثر اُسی حد تک محدود ہوتا ہے جو متکلّم کے ارادہ میں متعین ہوتی ہے۔ خواہ وہ ارادہ تصریحاً بیان کیا گیا ہو یا اشارۃً۔ مثلاً کوئی کہے کہ اب سردی کا نام ونشان باقی نہیں رہا، تو ظاہر ہے کہ اس نے اپنے بلدہ کی حالت موجودہ کے موافق کہا ہے اور گو اس نے بظاہر اپنے شہر کا نام بھی نہیں لیا مگر اس کے کلام سے یہ سمجھنا کہ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ کل کوہستانی ملکوں سے بھی سردی جاتی رہی اور سب جگہ سخت اور تیز دھوپ پڑنے لگی اور اس کی دلیل یہ پیش کرنا کہ جس لا کو اس نے استعمال کیا ہے وہ نفی جنس کا لا ہے۔ جس کا تمام جہان پر اثر پڑنا چاہئے، درست نہیں۔ مکہ کے مغلوب بُت پرست جنہوں نے آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آنجناب کے معجزات کو معجزہ کر کے مان لیا اور جو کفر کے زمانہ میں بھی صرف خشک منکر نہیں تھے بلکہ روم اور ایران میں بھی جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو متعجبانہ خیال سے ساحر مشہور کرتے تھے اور گو بے جا پیرایوں میں ہی سہی، مگر نشانوں کا اقرار کر لیا کرتے تھے۔ جن کے اقرار قرآن شریف میں موجود ہیں۔ وہ اپنے ضعیف اور کمزور کلام میں جو انوار ساطعہ نبوت محمدیہ کے نیچے دبے ہوئے تھے کیوں لا نافیہ استعمال کرنے لگے۔ اگر ان کو ایسا ہی لمبا چوڑا انکار ہوتا تو وہ بالآخر نہایت درجہ کے یقین سے جو انہوں نے اپنے خونوں کے بہانے اور اپنی جانوں کے فدا کرنے سے ثابت کر دیا تھا مشرف بالاسلام کیوں ہو جاتے؟ اور کفر کے ایام میں جو اُن کے بار بار کلمات قرآن شریف میں درج ہیں وہ یہی ہیں کہ وہ اپنی کوتہ بینی کے دھوکہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام ساحر رکھتے تھے۔ جیسا کہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَ يَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (القمر: ۳) یعنی جب کوئی نشان دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ پکا جادو ہے۔ پھر دوسری جگہ فرماتا ہے وَ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ٝ وَ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ (ص: ۵) یعنی انہوں نے اس بات سے تعجب کیا کہ انہیں میں سے ایک شخص اُن کی طرف بھیجا گیا اور بے ایمانوں نے کہا کہ یہ تو جادوگر کذّاب ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جبکہ وہ نشانوں کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جادوگر

کہتے تھے اور پھر اس کے بعد انہیں نشانوں کو معجزہ کر کے مان بھی لیا اور جزیرہ کا جزیرہ مسلمان ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک معجزات کا ہمیشہ کے لئے سچے دل سے گواہ بن گیا تو پھر ایسے لوگوں سے کیوں کر ممکن ہے کہ وہ عام طور پر نشانوں سے صاف منکر ہو جاتے اور انکار معجزات میں ایسا لا نافیہ استعمال کرتے جو اُن کی حد حوصلہ سے باہر اور ان کی مستمر رائے سے بعید تھا بلکہ قرائن سے آفتاب کی طرح ظاہر ہے کہ جس جس جگہ پر قرآن شریف میں کفّار کی طرف سے یہ اعتراض لکھا گیا ہے کہ کیوں اس پیغمبر پر کوئی نشانی نہیں اُتری؟ ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ اُن کا مطلب یہ ہے کہ جو نشانیاں ہم مانگتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی نشانی کیوں نہیں اُترتی۔

اب قصہ کوتاہ یہ کہ آپ نے آیت متذکرہ بالا کے لا نافیہ کو قرائن کی حد سے زیادہ کھینچ دیا ہے ایسا لا نافیہ عربوں کے کبھی خواب میں بھی نہیں آیا ہوگا۔ ان کے دل تو اسلام کی حقیت سے بھرے ہوئے تھے۔ تب ہی تو سب کے سب بجز معدودے چند کہ جو اس عذاب کو پہنچ گئے تھے جس کا اُن کو وعدہ دیا گیا تھا بالآخر مشرف بالاسلام ہو گئے تھے اور یاد رہے کہ ایسا لا نافیہ حضرت مسیح کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے۔ فریسیوں نے مسیح کے نشانات طلب کئے اُس نے آہ کھینچ کر کہا کہ اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں میں تم سے سچ کہتا ہوں اِس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان نہیں دیا جائے گا۔ دیکھو مرقس ۸ باب ۱۱۔

اب دیکھو کیسا حضرت مسیح نے صفائی سے انکار کر دیا ہے اگر غور فرمائیں تو آپ کا اعتراض اس اعتراض کے آگے کچھ بھی چیز نہیں کیونکہ آپ نے فقط کفار کا انکار پیش کیا اور وہ بھی نہ عام انکار بلکہ خاص نشانات کے بارے میں اور ظاہر ہے کہ دشمن کا انکار بکلّی قابل اطمینان نہیں ہوتا کیونکہ دشمن خلاف واقعہ بھی کہہ جاتا ہے مگر حضرت مسیح تو آپ اپنے مُنہ سے معجزات کے دکھلانے سے انکار کر رہے ہیں اور نفی صدور معجزات کو زمانہ کے ساتھ متعلق کر دیا ہے اور فرماتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کو کوئی نشان دیا نہ جائے گا پس اس سے بڑھ کر انکار معجزات کے بارے میں اور کون سا بیان واضح ہو سکتا ہے اور اس لا نافیہ سے بڑھ کر پھر اور کون سا لا نافیہ ہوگا۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۴۲۸ تا ۴۳۵)

واضح ہو کہ قرآن شریف میں نشان مانگنے کے سوالات کفّار کی طرف سے صرف ایک دو جگہ نہیں بلکہ کئی مقامات میں یہی سوال کیا گیا ہے اور ان سب مقامات کو بنظر یکجائی دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ کفّارِ مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین قسم کے نشانات مانگا کرتے تھے۔

(۱) وہ نشان جو عذاب کی صورت میں فقط اپنے اقتراح سے کفّارِ مکہ نے طلب کئے تھے۔

(۲) دوسرے وہ نشان جو عذاب کی صورت میں یا مقدمہ عذاب کی صورت میں پہلی اُمتوں پر وارد کئے گئے تھے۔

(۳) تیسرے وہ نشان جس سے پردہ غیبی بکلّی اُٹھ جائے، جس کا اُٹھ جانا ایمان بالغیب کے بکلّی برخلاف ہے۔ سو عذاب کے نشان ظاہر ہونے کے لئے جو سوال کئے گئے ہیں ان کا جواب تو قرآن شریف میں یہی دیا گیا ہے کہ تم منتظر رہو، عذاب نازل ہوگا۔ ہاں ایسی صورت کا عذاب نازل کرنے سے انکار کیا گیا ہے جس کی پہلے تکذیب ہو چکی ہے تاہم عذاب نازل ہونے کا وعدہ دیا گیا ہے جو آخر غزوات کے ذریعہ سے پورا ہو گیا۔ لیکن تیسری قسم کا نشان دکھلانے سے بکلّی انکار کیا گیا ہے اور خود ظاہر ہے کہ ایسے سوال کا جواب انکار ہی تھا نہ اور کچھ۔ کیونکہ کفّار کہتے تھے کہ تب ہم ایمان لائیں گے کہ جب ہم ایسا نشان دیکھیں کہ زمین سے آسمان تک نردبان رکھی جائے اور تو ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نردبان کے ذریعہ سے زمین سے آسمان پر چڑھ جائے اور فقط تیرا آسمان پر چڑھنا ہم ہرگز قبول نہیں کریں گے جب تک آسمان سے ایک ایسی کتاب نہ لاوے جس کو ہم پڑھ لیں اور پڑھیں بھی اپنے ہاتھ میں لے کر۔ یا تو ایسا کر کہ مکہ کی زمین میں جو ہمیشہ پانی کی تکلیف رہتی ہے۔ شام اور عراق کے ملک کی طرح نہریں جاری ہو جائیں اور جس قدر ابتدا دنیا سے آج تک ہمارے بزرگ مر چکے ہیں، سب زندہ ہو کر آ جائیں اور اس میں قصی بن کلاب بھی ہو کیونکہ وہ بڑھا ہمیشہ سچ بولتا تھا۔ اس سے ہم پوچھیں گے کہ تیرا دعویٰ حق ہے یا باطل؟ یہ سخت سخت خود تراشیدہ نشان تھے جو وہ مانگتے تھے اور پھر بھی نہ صاف طور پر بلکہ شرط پر شرط لگانے سے جن کا ذکر قرآن شریف میں جابجا آیا ہے۔ پس سوچنے والے کے لئے عرب کے شریروں کی ایسی درخواستیں ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ظاہرہ وآیات بیّنہ ورسولانہ ہیئت پر صاف اور کھلی کھلی دلیل ہے۔ خدا جانے ان دل کے اندھوں کو ہمارے مولیٰ وآقا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار صداقت نے کس درجہ تک عاجز وتنگ کر رکھا تھا اور کیا کچھ آسمانی تائیدات وبرکات کی بارشیں ہو رہی تھیں کہ جن سے خیرہ ہو کر اور جن کی ہیئت سے منہ پھیر کر سراسر ٹالنے اور بھاگنے کی غرض سے ایسی دور از صواب درخواستیں پیش کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے معجزات کا دکھلانا ایمان بالغیب کی حد سے باہر ہے۔ یوں تو اللہ جلشانہٗ قادر ہے کہ زمین سے آسمان تک زینہ رکھ دیوے۔ جس کو سب لوگ دیکھ لیویں اور دو چار ہزار کیا دو چار کروڑ آدمیوں کو زندہ کر کے ان کے منہ سے

اُن کی اولاد کے سامنے صدق نبوت کی گواہی دلا دیوے۔ یہ سب کچھ وہ کرسکتا ہے مگر ذرا سوچ کر دیکھو کہ اس انکشاف تام سے ایمان بالغیب جو مدار ثواب اور اجر ہے دور ہو جاتا ہے اور دنیا نمونہ محشر ہو جاتی ہے۔ پس جس طرح قیامت کے میدان میں جو انکشاف تام کا وقت ہوگا ایمان کام نہیں آتا۔ اِسی طرح اس انکشاف تام سے بھی ایمان لانا کچھ مفید نہیں بلکہ ایمان اسی حد تک ایمان کہلاتا ہے کہ جب کچھ اخفا بھی باقی رہے جب سارے پردے کھل گئے تو پھر ایمان ایمان نہیں رہتا اسی وجہ سے سارے نبی ایمان بالغیب کی رعایت سے معجزے دکھلاتے رہے ہیں کبھی کسی نبی نے ایسا نہیں کیا کہ ایک شہر کا شہر زندہ کر کے ان سے اپنی نبوت کی گواہی دلاوے یا آسمان تک نردبان رکھ کر اور سب کے روبرو چڑھ کر تمام دنیا کو تماشا دکھلاوے۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اوران کے جوابات صفحہ ۴۳۳ تا ۴۳۴ حاشیہ)

دیکھو! کسی خاص شخص کی پرواہ نہ خدا کو منظور ہوا کرتی ہے اور نہ ہی اس کے رسول کسی خاص شخص کی ہدایت کے لئے زور دیا کرتے ہیں بلکہ ان کی دعائیں اور اضطراب عام خلقِ خدا کے واسطے ہوتے ہیں دیکھو رسولِ اکرمؐ سے بھی معجزات مانگے گئے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے کیا جواب دیا وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ نے اقتراح کو منع کیا ہے اور تجربہ بتاتا ہے کہ اقتراح کرنے والے لوگ ہمیشہ ہدایت سے محروم ہی رہتے ہیں کیونکہ خدا نہ ان کی مرضی اور خواہشات کا تابع ہوتا ہے اور نہ وہ ہدایت پاتے ہیں۔ دیکھ لو جب نشانات اور معجزات اقتراحی رنگ میں طلب کئے گئے جب ہی یہی جواب ملا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل: ۹۴)۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۴ مورخہ ۲/اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی ان کو کہہ دو کہ نشان اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں جس نشان کو چاہتا ہے اسی نشان کو ظاہر کرتا ہے بندہ کا اس پر زور نہیں ہے کہ جبر کے ساتھ اس سے ایک نشان لیوے یہ جبر اور اقتدار تو آپ ہی کی کتابوں میں پایا جاتا ہے بقول آپ کے مسیح اقتداری معجزات دکھلاتا تھا اور اس نے شاگردوں کو بھی اقتدار بخشا اور آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ اب بھی حضرت مسیحؑ زندہ حیّ قیوم، قادرِ مطلق، عالم الغیب دن رات آپ کے ساتھ ہے جو چاہو وہی دے سکتا ہے پس آپ حضرت مسیحؑ سے درخواست کریں کہ ان تینوں بیماروں کو آپ کے ہاتھ رکھنے سے اچھا کر دیویں تا نشانی ایمان داری کی آپ میں باقی رہ جاوے ورنہ یہ تو مناسب نہیں کہ ایک طرف اہلِ حق کے ساتھ بحیثیت سچے عیسائی ہونے کے مباحثہ کریں اور جب سچے عیسائی کے

نشان مانگے جائیں تب کہیں کہ ہم میں استطاعت نہیں اس بیان سے تو آپ اپنے پر ایک اقبالی ڈگری کراتے ہیں کہ آپ کا مذہب اس وقت زندہ مذہب نہیں ہے لیکن ہم جس طرح پر خدا تعالیٰ نے ہمارے سچے ایمان دار ہونے کے نشان ٹھہرائے ہیں اس التزام سے نشان دکھلانے کو تیار ہیں۔ اگر نشان نہ دکھلا سکیں تو جو سزا چاہیں دے دیں اور جس طرح کی چھری چاہیں ہماری گلے میں پھیر دیں اور وہ طریق نشان نمائی کا جس کے لئے ہم مامور ہیں وہ یہ ہے کہ ہم خدا تعالیٰ سے جو ہمارا سچا اور قادر خدا ہے اس مقابلہ کے وقت جو ایک سچے اور کامل نبی کا انکار کیا جاتا ہے تضرع سے کوئی نشان مانگیں تو وہ اپنی مرضی سے نہ ہمارا محکوم اور تابع ہو کر جس طرح چاہے گا نشان دکھلائے گا۔ آپ خوب سوچیں کہ حضرت مسیحؑ بھی باوجود آپ کے اس قدر غلو کے اقتداری نشانات کے دکھلانے سے عاجز رہے۔ دیکھئے مرقس ۸۔۱۱، ۱۲۔ یہ لکھا ہے ’’تب فریسی نکلے اور اس سے حجت کر کے یعنی جس طرح اب اس وقت مجھ سے حجت کی گئی اس کے امتحان کے لئے آسمان سے کوئی نشان چاہا اس نے اپنے دل سے آہ کھینچ کے کہا کہ اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان دیا نہ جائے گا۔ اب دیکھئے کہ یہودیوں نے اسی طرز سے نشان مانگا تھا۔ حضرت مسیحؑ نے آہ کھینچ کر نشان دکھلانے سے انکار کر دیا۔ پھر اس سے بھی عجب طرح کا ایک اور مقام دیکھئے کہ جب مسیحؑ صلیب پر کھینچے گئے تو تب یہودیوں نے کہا کہ اس نے اوروں کو بچایا پر آپ کو نہیں بچا سکتا اگر اسرائیل کا بادشاہ ہے تو اب صلیب سے اتر آوے تو ہم اس پر ایمان لاویں گے۔ اب ذرا نظر غور سے اس آیت کو سوچیں کہ یہودیوں نے صاف عہد اور اقرار کر لیا تھا کہ اب صلیب سے اتر آوے تو وہ ایمان لاویں گے لیکن حضرت مسیحؑ اتر نہیں سکے۔ ان تمام مقامات سے صاف ظاہر ہے کہ نشان دکھلانا اقتداری طور پر انسان کا کام نہیں ہے بلکہ خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ ایک اور مقام میں حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں یعنی متی ۱۲۔۳۸ کہ اس زمانہ کے بد اور حرامکار لوگ نشان ڈھونڈتے ہیں پر یونس نبی کے نشان کے سوا کوئی نشان دکھلایا نہ جائے گا۔ اب دیکھئے کہ اس جگہ حضرت مسیحؑ نے ان کی درخواست کو منظور نہیں کیا بلکہ وہ بات پیش کی جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ان کو معلوم تھی۔ اسی طرح میں بھی وہ بات پیش کرتا ہوں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھ کو معلوم ہے۔ میرا دعویٰ نہ خدائی کا ہے اور نہ اقتدار کا اور میں ایک مسلمان آدمی ہوں جو قرآن شریف کی پیروی کرتا ہوں اور قرآن شریف کی تعلیم کی رو سے اس موجودہ نجات کا مدعی ہوں۔

(جنگِ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۵۵، ۱۵۶)

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۸﴾

بغیر مرنے کے کوئی اس جہان سے ہمیشہ کے لئے رخصت نہیں ہوسکتا۔ وجہ یہ کہ اس دنیا سے نکلنے اور بہشت میں داخل ہونے کا موت ہی دروازہ ہے كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۳۹۶)

ہر نفس موت کا مزا چکھے گا اور پھر ہماری طرف واپس کئے جاؤ گے۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۳۸۵ حاشیہ)

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۵﴾

وہ کامل حیات جو اس سفلی دنیا کے چھوڑنے کے بعد ملتی ہے وہ جسمِ خاکی کی حیات نہیں بلکہ اَور رنگ اور شان کی حیات ہے۔ قال اللہ تعالیٰ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۳۲)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۹﴾

افترا کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور مفتری ہمیشہ خائب و خاسر رہتا ہے قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا کہ اگر تو افترا کرے تو تیری رگِ جان ہم کاٹ ڈالیں گے اور ایسا ہی فرمایا مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (الانعام: ۲۲) ایک شخص ان باتوں پر ایمان رکھ کر افترا کی جرأت کیوں کر کر سکتا ہے۔ ظاہری گورنمنٹ میں ایک شخص اگر فرضی چپڑاسی بن جائے تو اس کو سزا دی جاتی ہے اور وہ جیل میں بھیجا جاتا ہے تو کیا خدا کی ہی مقتدر حکومت میں یہ اندھیر ہے کہ کوئی جھوٹا دعویٰ مامور من اللہ ہونے کا کرے اور پکڑا نہ جائے بلکہ اس کی تائید کی جائے۔ اس طرح تو دہریت پھیلتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی ساری کتابوں میں لکھا ہے کہ مفتری ہلاک کیا جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۲ مورخہ ۱۰ را پریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

بھلا یہ کیوں کر ہو سکے کہ جو شخص نہایت لا پروائی سے سستی کر رہا ہے وہ ایسا ہی خدا کے فیض سے مستفیض ہو جائے جیسے وہ شخص کہ جو تمام عقل اور تمام زور اور تمام اخلاص سے اس کو ڈھونڈتا ہے اسی کی طرف ایک دوسرے مقام میں بھی اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے اور وہ یہ ہے وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو بالضرور اپنی راہیں دکھلا دیا کرتے ہیں۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۵۶۶، ۵۶۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کریں گے ہم ان کو وہ اپنی خاص راہیں آپ دکھلا دیں گے جو مجرد عقل اور قیاس سے سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ (سرمہ چشم آریہ، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۱۷۵ حاشیہ)

جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں اور کریں گے ہم ان کو اپنی راہیں دکھلا رہے ہیں اور دکھلائیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر اس جگہ مجرد استقبال مراد لیا جائے تو اس سے معنے فاسد ہو جائیں گے اور یہ کہنا پڑے گا کہ یہ وعدہ صرف آئندہ کے لئے ہے اور حال میں جو لوگ مجاہدہ میں مشغول ہیں یا پہلے مجاہدات بجالا چکے ہیں وہ خدا تعالیٰ کی راہوں سے بے نصیب ہیں بلکہ اس آیت میں عادتِ مستمرہ جاریہ دائرہ میں الازمنۃ الثلٰثہ کا بیان ہے جس کا حاصل مطلب یہ ہے کہ ہماری یہی عادت ہے کہ مجاہدہ کرنے والوں کو اپنی راہیں دکھلا دیا کرتے ہیں۔ کسی زمانہ کی خصوصیت نہیں بلکہ سنت مستمرہ دائرہ سائرہ کا بیان ہے جس کے اثر سے کوئی زمانہ باہر نہیں۔ (الحق مباحثہ دہلی، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۱۶۳)

اس آیت کو نازل ہوئے تیرہ سو برس گزر گیا ہے اور کچھ شک نہیں کہ برطبق مضمون اس آیت کے ہر یک جو اس عرصہ میں مجاہدہ کرتا رہا ہے وہ وعدہ لَنَهْدِيَنَّهُمْ سے حصہ مقسومہ لیتا رہا ہے اور اب بھی لیتا ہے اور آئندہ بھی لے گا۔ (الحق مباحثہ دہلی، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۱۹۲)

جس طرح ہماری دنیوی زندگی میں صریح نظر آتا ہے کہ ہمارے ہر ایک فعل کے لئے ایک ضروری نتیجہ ہے اور وہ نتیجہ خدائے تعالیٰ کا فعل ہے۔ ایسا ہی دین کے متعلق بھی یہی قانون ہے جیسا کہ خدائے تعالیٰ ان دو مثالوں میں صاف فرماتا ہے اَلَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ یعنی جو لوگ اس فعل کو بجالائے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کی جستجو میں پوری پوری کوشش کی تو اس فعل

کے لئے لازمی طور پر ہمارا یہ فعل ہوگا کہ ہم ان کو اپنی راہ دکھا دیں گے اور جن لوگوں نے کجی اختیار کی اور سیدھی راہ پر چلنا نہ چاہا تو ہمارا فعل اس کی نسبت یہ ہوگا کہ ہم ان کے دلوں کو کج کر دیں گے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۸۹)

جو لوگ ہماری راہ میں ہر ایک طور سے کوشش بجالاتے ہیں ہم ان کو اپنی راہیں دکھا دیا کرتے ہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۱۹)

جو لوگ ہماری راہ میں جو صراطِ مستقیم ہے مجاہدہ کریں گے تو ہم ان کو اپنی راہیں بتلا دیں گے اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی راہیں وہی ہیں جو انبیاء کو دکھلائی گئی تھیں۔ (شھادۃ القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۵۲)

جو لوگ ہماری راہ میں اور ہماری طلب کے لئے طرح طرح کی کوششیں اور محنتیں کرتے ہیں ہم ان کو اپنی راہ دکھلا دیتے ہیں۔ (لیکچر لاہور، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۱۵۹)

جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں اور ہماری طلب میں کوشش کو انتہاء تک پہنچا دیتے ہیں انہیں کے لئے ہمارا یہ قانونِ قدرت ہے کہ ہم ان کو اپنی راہ دکھلا دیا کرتے ہیں۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۱۷)

جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ اختیار کرتے ہیں اور جو کچھ ان سے اور ان کی قوتوں سے ہو سکتا ہے بجالاتے ہیں تب عنایت حضرت احدیت ان کا ہاتھ پکڑتی ہے اور جو کام ان سے نہیں ہو سکتا تھا وہ آپ کر دکھلاتی ہے۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۳۴ حاشیہ)

قرآن شریف میں یہ وعدہ ہے کہ جو شخص سچے دل سے خدا تعالیٰ پر ایمان لائے گا خدا اس کو ضائع نہیں کرے گا اور حق اس پر کھول دے گا اور راہِ راست اس کو دکھائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا پس اس آیت کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والا ضائع نہیں کیا جاتا آخر اللہ تعالیٰ پوری ہدایت اس کو کر دیتا ہے۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۴۹)

انسان کے دل پر کئی قسم کی حالتیں وارد ہوتی رہتی ہیں۔ آخر خدا تعالیٰ سعید روحوں کی کمزوری کو دور کرتا ہے اور پاکیزگی اور نیکی کی قوت بطور موہبت عطا فرماتا ہے۔ پھر اس کی نظر میں وہ سب باتیں مکروہ ہو جاتی ہیں جو خدا تعالیٰ کی نظر میں مکروہ ہیں۔ اور وہ سب راہیں پیاری ہو جاتی ہیں جو خدا تعالیٰ کو پیاری ہیں۔ تب اس کو ایک ایسی طاقت ملتی ہے جس کے بعد ضعف نہیں اور ایک ایسا جوش عطا ہوتا ہے جس کے بعد کسل نہیں اور ایسی تقویٰ دی جاتی ہے کہ جس کے بعد معصیت نہیں اور رب کریم ایسا راضی ہو جاتا ہے کہ جس کے بعد خطا

نہیں۔مگر یہ نعمت دیر کے بعد عطا ہوتی ہے۔اول اول انسان اپنی کمزوریوں سے بہت سی ٹھوکریں کھاتا ہےاور اسفل کی طرف گر جاتا ہےمگر آخر اس کو صادق پا کر طاقتِ بالا کھینچ لیتی ہے۔اس کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جل شانہ فرماتا ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی نُثَبِّتُهُمْ عَلَى التَّقْوٰى وَالْاِیْمَانِ وَ نَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَ الْمَحَبَّةِ وَ الْعِرْفَانِ وَ سَنُیَسِّرُهُمْ لِفِعْلِ الْخَیْرَاتِ وَ تَرْكِ الْعِصْیَانِ۔
(مکتوباتِ احمد جلد دوم صفحہ ۵۰، ۵۱)

روح القدس کی تائید جو مومن کے شامل ہوتی ہے وہ محض خدا تعالیٰ کا انعام ہوتا ہے جو ان کو ملتا ہے جو سچے دل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن شریف پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ کسی مجاہدہ سے نہیں ملتا محض ایمان سے ملتا ہےاور مفت ملتا ہےصرف یہ شرط ہے کہ ایسا شخص ایمان میں صادق ہو اور قدم میں استوار اور امتحان کے وقت صابر ہو لیکن خدائے عزوجل کی لُدنّی ہدایت جو اس آیت میں مذکور ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وہ بجز مجاہدہ کے نہیں ملتی۔مجاہدہ کرنے والا ابھی مثل اندھے کے ہوتا ہےاور اس میں اور بینا ہونے میں ابھی بہت فاصلہ ہوتا ہےمگر روح القدس کی تائید اس کو نیک ظن کر دیتی ہے اور اس کو قوت دیتی ہے جو وہ مجاہدہ کی طرف راغب ہو اور مجاہدہ کے بعد انسان کو ایک اور روح ملتی ہے جو پہلی روح سے بہت قوی اور زبردست ہوتی ہےمگر یہ نہیں کہ دو۲ روحیں ہیں۔روح القدس ایک ہی ہےصرف فرق مراتبِ قوت کا ہے جیسا کہ دو خدا نہیں ہیں صرف ایک خدا ہےمگر وہی خدا جن خاص تجلیات کے ساتھ ان لوگوں کا ناصر اور مربی ہوتا اور ان کے لئے خارق عادت عجائبات دکھاتا ہے وہ دوسروں کو ایسے عجائباتِ قدرت ہرگز نہیں دکھلاتا۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۴۲۵، ۴۲۶)

پھر وہ لوگ روح القدس کی طاقت سے بہرہ ور ہو کر ان مجاہدات میں لگے کہ اپنے پاک اعمال کے ساتھ شیطان پر غالب آ جائیں تب انہوں نے خدا کے راضی کرنے کے لئے ان مجاہدات کو اختیار کیا کہ جن سے بڑھ کر انسان کے لئے متصور نہیں۔انہوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کا خس وخاشاک کی طرح بھی قدر نہ کیا۔آخر وہ قبول کئے گئے اور خدا نے ان کے دلوں کو گناہ سے بکلی بیزار کر دیا اور نیکی کی محبت ڈال دی جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو اپنی راہ دکھا دیا کرتے ہیں۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۴۲۵)

جو ہمارے راہ میں مجاہدہ کرے گا ہم اس کو اپنی راہیں دکھلا دیں گے۔ یہ تو وعدہ ہے اور ادھر یہ دعا ہے کہ

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الفاتحۃ:۶) سو انسان کو چاہیے کہ اس کو مدنظر رکھ کر نماز میں بالحاح دعا کرے اور تمنا رکھے کہ وہ بھی ان لوگوں میں سے ہو جاوے جو ترقی اور بصیرت حاصل کر چکے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس جہان سے بے بصیرت اور اندھا اٹھایا جاوے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۹)

سارا مدار مجاہدہ پر ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا جو لوگ ہم میں ہو کر کوشش کرتے ہیں ہم ان کے لئے اپنی تمام راہیں کھول دیتے ہیں۔ مجاہدہ کے بدوں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ کہتے کہ سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نظر میں چور کو قطب بنا دیا۔ دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں اور ایسی ہی باتوں نے لوگوں کو ہلاک کر دیا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی کی جھاڑ پھونک سے کوئی بزرگ بن جاتا ہے۔ جو لوگ خدا کے ساتھ جلدی کرتے ہیں وہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں ہر چیز کی ترقی تدریجی ہے۔ روحانی ترقی بھی اسی طرح ہوتی ہے اور بدوں مجاہدہ کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور مجاہدہ بھی وہ جو خدا تعالیٰ میں ہو کر۔ یہ نہیں کہ قرآن کریم کے خلاف خود ہی بے فائدہ ریاضتیں اور مجاہدہ جوگیوں کی طرح تجویز کر بیٹھے۔ یہی کام ہے جس کے لئے خدا نے مجھے مامور کیا ہے تا کہ میں دنیا کو دکھلا دوں کہ کس طرح پر انسان اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ نہ سب محروم رہتے ہیں اور نہ سب ہدایت پاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۱۶ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۰ء صفحہ ۶)

جو لوگ ہم میں ہو کر سعی اور مجاہدہ کرتے ہیں آخر ہم ان کو اپنی راہوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں ان پر دروازے کھولے جاتے ہیں یہ سچی بات ہے کہ جو ڈھونڈتے ہیں پاتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا

اے خواجہ درد نیست ورنہ طبیب ہست

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱؍ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۸)

مجاہدہ ایک ایسی شے ہے کہ اس کے بدوں انسان کسی ترقی کے بلند مقام کو پا نہیں سکتا۔ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا جو لوگ ہم میں ہو کر مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیتے ہیں۔ غرض مجاہدہ کرو اور خدا میں ہو کر کرو تا کہ خدا کی راہیں تم پر کھلیں اور ان راہوں پر چل کر تم اس لذت کو حاصل کر سکو جو خدا میں ملتی ہے۔ اس مقام پر مصائب اور مشکلات کی کچھ حقیقت نہیں رہتی یہ وہ مقام ہے جس کو قرآن شریف کی اصطلاح میں شہید کہتے ہیں۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۰؍ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۱، ۲)

خدا تعالیٰ تو ہر ایک انسان کو اپنی معرفت کے رنگ سے رنگین کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کو خدا نے اپنی صورت پر پیدا کیا ہے اور اسی لئے فرمایا ہے وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲ مورخہ ۱۷؍جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

صدق بڑی چیز ہے اس کے بغیر عمل صالحہ کی تکمیل نہیں ہوتی۔ خدا تعالیٰ اپنی سنت نہیں چھوڑتا اور انسان اپنا طریق نہیں چھوڑنا چاہتا اس لئے فرمایا ہے وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا خدا تعالیٰ میں ہو کر جو مجاہدہ کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ اپنی راہیں کھول دیتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰؍اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

اس دین کی جڑ تقویٰ اور نیک بختی ہے اور یہ ممکن نہیں جب تک خدا پر یقین نہ ہو اور یقین سوائے خدا کے اور سے ملتا نہیں اسی لئے فرمایا وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۸ مورخہ ۲۴؍اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

مجاہدات پر اللہ تعالیٰ کی راہیں کھلتی ہیں اور نفس کا تزکیہ ہوتا ہے جیسے فرمایا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (الشمس:۱۰) اور وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۶ مورخہ ۲۴؍دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

تقویٰ کا مرحلہ بڑا مشکل ہے اسے وہی طے کر سکتا ہے جو بالکل خدا کی مرضی پر چلے۔ جو وہ چاہے وہ کرے اپنی مرضی نہ کرے۔ بناوٹ سے کوئی حاصل کرنا چاہے تو ہرگز نہ ہوگا اس لئے خدا کے فضل کی ضرورت ہے اور وہ اسی طرح سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو دعا کرے اور ایک طرف کوشش کرتا رہے خدا تعالیٰ نے دعا اور کوشش دونوں کی تاکید فرمائی ہے۔ اُدْعُوْنِيْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں تو دعا کی تاکید فرمائی ہے اور جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا میں کوشش کی۔ جب تک تقویٰ نہ ہوگی اولیاء الرحمٰن میں ہرگز داخل نہ ہوگا اور جب تک یہ نہ ہوگا حقائق اور معارف ہرگز نہ کھلیں گے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲ مورخہ ۸؍جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

اس میں شک نہیں ہے کہ انسان بعض اوقات تدبیر سے فائدہ اُٹھاتا ہے لیکن تدبیر پر کلی بھروسہ کرنا سخت نادانی اور جہالت ہے جب تک تدبیر کے ساتھ دعا نہ ہو کچھ نہیں اور دعا کے ساتھ تدبیر نہ ہو تو کچھ فائدہ نہیں۔ جس کھڑکی کی راہ سے معصیت آتی ہے پہلے ضروری ہے کہ اس کھڑکی کو بند کیا جاوے۔ پھر نفس کی کشاکش کے لئے دعا کرتا رہے۔ اسی کے واسطے کہا ہے وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ اس میں کس

قدر ہدایت تدابیر کو عمل میں لانے کے واسطے کی گئی ہے۔تدابیر میں بھی خدا کو نہ چھوڑے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰؍مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا میں مجاہدہ سے مراد یہی مشق ہے کہ ایک طرف دعا کرتا رہے دوسری طرف کامل تدبیر کرے۔آخر اللہ تعالیٰ کا فضل آجاتا ہے اور نفس کا جوش وخروش دب جاتا اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور ایسی حالت ہو جاتی ہے جیسے آگ پر پانی ڈال دیا جاوے بہت سے انسان ہیں جو نفسِ امارہ ہی میں مبتلا ہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰؍مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۸)

گناہوں سے پاک ہونے کے واسطے بھی اللہ تعالیٰ ہی کا فضل درکار ہے۔جب اللہ تعالیٰ اس کے رجوع اور توبہ کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں غیب سے ایک بات پڑ جاتی ہے اور وہ گناہ سے نفرت کرنے لگتا ہے اور اس حالت کے پیدا ہونے کے لئے حقیقی مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا جو مانگتا ہے اسی کو ضرور دیا جاتا ہے اسی لئے میں کہتا ہوں کہ دعا جیسی کوئی چیز نہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰؍مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

خدا تعالیٰ کا یہ سچا وعدہ ہے کہ جو شخص صدق دل اور نیک نیتی کے ساتھ اس کی راہ کی تلاش کرتے ہیں وہ ان پر ہدایت و معرفت کی راہیں کھول دیتا ہے جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہم میں ہو کر مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیتے ہیں۔ہم میں ہو کر سے یہ مراد ہے کہ محض اخلاص اور نیک نیتی کی بناء پر خدا جوئی اپنا مقصد رکھ کر۔لیکن اگر کوئی استہزاء اور ٹھٹھے کے طریق پر آزمائش کرتا ہے وہ بدنصیب محروم رہ جاتا ہے۔پس اسی پاک اصول کی بناء پر اگر تم سچے دل سے کوشش کرو اور دعا کرتے رہو تو وہ غفور الرحیم ہے لیکن اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی پروا نہیں کرتا وہ بے نیاز ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۸ مورخہ ۳۱؍مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

جس قدر کاروبار دنیا کے ہیں سب میں اول انسان کو کچھ کرنا پڑتا ہے۔جب وہ ہاتھ پاؤں ہلاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی برکت ڈال دیتا ہے۔اسی طرح پر خدا تعالیٰ کی راہ میں وہی لوگ کمال حاصل کرتے ہیں جو مجاہدہ کرتے ہیں اس لئے فرمایا ہے وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔پس کوشش کرنی چاہیے کیونکہ مجاہدہ ہی کامیابیوں کی راہ ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸، ۳۹ مورخہ ۱۰ تا ۱۷؍نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

جو لوگ کوشش کرتے ہیں ہماری راہ میں انجام کار راہنمائی پر پہنچ جاتے ہیں۔جس طرح وہ دانہ تخم ریزی

کا بدوں کوشش اور آبپاشی کے بے برکت رہتا بلکہ خود بھی فنا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تم بھی اس اقرار کو ہر روز یاد نہ کرو گے اور دعائیں نہ مانگو گے کہ خدایا ہماری مدد کر تو فضلِ الٰہی وارد نہیں ہوگا اور بغیر امدادِ الٰہی کے تبدیلی ناممکن ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸، ۳۹ مورخہ ۱۰ تا ۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

مثل مشہور ہے جو یندہ یابندہ۔ جو شخص دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اس کے لئے کھولا جاتا ہے اور قرآن شریف میں بھی فرمایا گیا ہے وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہماری طرف آتے ہیں اور ہمارے لئے مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کے واسطے اپنی راہ کھول دیتے ہیں اور صراطِ مستقیم پر چلا دیتے ہیں۔ لیکن جو شخص کوشش ہی نہیں کرتا وہ کس طرح اس راہ کو پا سکتا ہے۔ خدایابی اور حقیقی کامیابی اور نجات کا یہی گُر اور اصول ہے۔ انسان کو چاہیے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں مجاہدہ کرنے سے تھکے نہیں۔ نہ درماندہ ہو اور نہ اس راہ میں کوئی کمزوری ظاہر کرے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۴۱، ۴۲ مورخہ ۳۰ نومبر تا ۱۰ دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۶۔ الحکم جلد ۸ نمبر ۴۳، ۴۴ مورخہ ۱۷ تا ۲۴ دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

جو شخص خدا کی طرف رجوع کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی طرف رجوع کرے گا۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ جہاں تک بس چل سکے وہ اپنی طرف سے کوتاہی نہ کرے۔ پھر جب اس کی کوشش اس کے اپنے انتہائی نکتہ پر پہنچے گی تو وہ خدا کے نور کو دیکھ لے گا۔ وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ جو حق کوشش کا اس کے ذمہ ہے اسے بجالائے یہ نہ کرے کہ اگر پانی ۲۰ ہاتھ نیچے کھودنے سے نکلتا ہے تو وہ صرف ۲ ہاتھ کھود کر ہمت ہار دے۔ ہر ایک کام میں کامیابی کی یہی جڑ ہے کہ ہمت نہ ہارے۔ پھر اس امت کے لئے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر کوئی پورے طور سے دعا و تزکیہ نفس سے کام لے گا سب وعدے قرآن شریف کے اس کے ساتھ پورے ہو کر رہیں گے۔ ہاں جو خلاف کرے گا وہ محروم رہے گا کیونکہ اس کی ذات غیور ہے اس نے اپنی طرف آنے کی راہ ضرور رکھی ہے لیکن اس کے دروازے تنگ بنائے ہیں پہنچتا وہی ہے جو تلخیوں کا شربت پی لیوے۔ لوگ دنیا کی فکر میں درد برداشت کرتے ہیں حتی کہ بعض اسی میں ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے ایک کانٹے کی درد بھی برداشت کرنا پسند نہیں کرتے۔ جب تک اس کی طرف سے صدق اور صبر اور وفاداری کے آثار ظاہر نہ ہوں تو ادھر سے رحمت کے آثار کیسے ظاہر ہوں۔ (البدر جلد ۴ نمبر ۳ مورخہ ۲۰ /جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ہمیں کوئی محنت اور مشقت نہ کرنی پڑے وہ بیہودہ خیال کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے

قرآن شریف میں صاف فرمایا ہے وَ الَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا لَنَہۡدِیَنَّہُمۡ سُبُلَنَا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے دروازوں کے کھلنے کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہے اور وہ مجاہدہ اسی طریق پر ہو جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے۔ اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ اور اسوہ حسنہ ہے۔ بہت سے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور پھر سبز پوش یا گیروے پوش فقیروں کی خدمت میں جاتے ہیں کہ وہ پھونک مار کر کچھ بنا دیں یہ بیہودہ بات ہے۔ ایسے لوگ جو شرعی امور کی پابندیاں نہیں کرتے اور ایسے بیہودہ دعوے کرتے ہیں وہ خطرناک گناہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے بھی اپنے مراتب کو بڑھانا چاہتے ہیں کیونکہ ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور وہ مشتِ خاک ہو کر خود ہدایت دینے کے مدعی ہوتے ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰/جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

اسلام اور دوسرے مذاہب میں جو امتیاز ہے وہ یہی ہے کہ اسلام حقیقی معرفت عطا کرتا ہے جس سے انسان کی گناہ آلودہ زندگی پر موت آجاتی ہے اور پھر اسے ایک نئی زندگی عطا کی جاتی ہے جو بہشتی زندگی ہوتی ہے۔۔۔۔ اب سوال ہوتا ہے کہ جبکہ یہ مابہ الامتیاز ہے تو کیوں ہر شخص نہیں دیکھ لیتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سنت اللہ اسی پر واقع ہوئی ہے کہ یہ بات بجز مجاہدہ، توبہ اور تبتل تام کے نہیں ملتی چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ الَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا لَنَہۡدِیَنَّہُمۡ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کریں گے انہی کو یہ راہ ملے گی۔ پس جو لوگ خدا کی وصایا اور احکام پر عمل نہ کریں بلکہ ان سے اعراض کریں ان پر یہ دروازہ کس طرح کھل جائے یہ نہیں ہوسکتا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷/اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

ہمت مرداں مددِ خدا۔ صدق اور وفا سے خدا کو طلب کرنا موجب فتحیابی ہے۔ وَ الَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا لَنَہۡدِیَنَّہُمۡ سُبُلَنَا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰/اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۷ حاشیہ)

یاد رکھنا چاہیے کہ ایمان بغیر اعمال کے ایسا ہے جیسے کوئی باغ بغیر انہار کے۔ جو درخت لگایا جاتا ہے اگر مالک اس کی آبپاشی کی طرف توجہ نہ کرے تو ایک دن خشک ہو جائے گا اسی طرح ایمان کا حال ہے۔ وَ الَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا یعنی تم ہلکے ہلکے کام پر نہ رہو بلکہ اس راہ میں بڑے بڑے مجاہدات کی ضرورت ہے نفس کو بیل سے مشابہت دی گئی ہے۔ (اخبار بدر جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۵/جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

ہمارے راہ کے مجاہد راستہ پاویں گے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اس راہ میں پیمبر کے ساتھ مل کر جدوجہد

کرنا ہوگا ایک دو گھنٹہ کے بعد بھاگ جانا مجاہد کا کام نہیں بلکہ جان دینے کے لئے تیار رہنا اس کا کام ہے۔سو متقی کی نشانی استقامت ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷؍جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۷)

خدا تعالیٰ مغز اور حقیقت کو چاہتا ہے رسم اور نام کو پسند نہیں کرتا۔ جب انسان سچے دل سے سچے اسلام کی تلاش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اس کو اپنی راہیں دکھا دیتا ہے جیسے فرمایا وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔خدا تعالیٰ بخیل نہیں۔اگر انسان مجاہدہ کرے گا تو وہ یقیناً اپنی راہ کو ظاہر کر دے گا۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۱؍فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

جو شخص محض اللہ تعالیٰ سے ڈر کر اس کی راہ کی تلاش میں کوشش کرتا ہے اور اس سے اس امر کی گرہ کشائی کے لئے دعائیں کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے قانون کے موافق (وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہم میں ہو کر کوشش کرتے ہیں ہم اپنی راہیں ان کو دکھا دیتے ہیں) خود ہاتھ پکڑ کر راہ دکھا دیتا ہے اور اسے اطمینانِ قلب عطا کرتا ہے اور اگر خود دل ظلمت کدہ اور زبان دعا سے بوجھل ہو اور اعتقاد شرک و بدعت سے ملوث ہو تو وہ دعا ہی کیا ہے اور وہ طلب ہی کیا ہے جس پر نتائج حسنہ مترتب ہوں۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۰؍مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳، ۱۴)

جو محنت کرتا ہے اور خدا کے عشق اور محبت میں محو ہو جاتا ہے وہ دوسروں سے ممتاز اور خدا کا منظورِ نظر ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی خود دستگیری کرتا ہے جیسے فرمایا وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہماری خاطر مجاہدات کرتے ہیں آخر ہم ان کو اپنا راستہ دکھا دیتے ہیں جتنے اولیاء، انبیاء اور بزرگ لوگ گزرے ہیں انہوں نے خدا کی راہ میں جب بڑے بڑے مجاہدات کئے تو آخر خدا نے اپنے دروازے ان پر کھول دیئے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱ مورخہ ۲؍جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

توبہ استغفار وصول الی اللہ کا ذریعہ ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا پوری کوشش سے اس کی راہ میں لگے رہو منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔اللہ تعالیٰ کو کسی سے بخل نہیں۔
(بدر جلد ۷ نمبر ۲ مورخہ ۱۶؍جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

بموجب تعلیم قرآن شریف ہمیں یہ امر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اپنے کرم، رحم، لطف اور مہربانیوں کے صفات بیان کرتا ہے اور رحمٰن ہونا ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف فرماتا ہے کہ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم: ۴۰) اور وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا فرما

کر اپنے فیض کو سعی اور مجاہدہ میں منحصر فرماتا ہے نیز اس میں صحابہ رضی اللہ کا طرزِ عمل ہمارے واسطے ایک اسوہ حسنہ اور عمدہ نمونہ ہے۔ صحابہؓ کی زندگی میں غور کر کے دیکھو بھلا انہوں نے محض معمولی نمازوں سے ہی وہ مدارج حاصل کر لئے تھے؟ نہیں۔ بلکہ انہوں نے تو خدا کی رضا کے حصول کے واسطے اپنی جانوں تک کی پرواہ نہیں کی اور بھیڑ بکریوں کی طرح خدا کی راہ میں قربان ہو گئے جب جا کر کہیں ان کو یہ رتبہ حاصل ہوا تھا۔ اکثر لوگ ہم نے ایسے دیکھے ہیں وہ یہی چاہتے ہیں کہ ایک پھونک مار کر ان کو وہ درجات دلا دیئے جاویں اور عرش تک ان کی رسائی ہو جاوے۔

ہمارے رسول اکرمؐ سے بڑھ کر کون ہوگا۔ وہ افضل البشر، افضل الرسل والانبیاء تھے جب انہوں نے ہی پھونک سے وہ کام نہیں کئے تو اور کون ہے جو ایسا کر سکے۔ دیکھو آپ نے غارِ حراء میں کیسے کیسے ریاضات کئے۔ خدا جانے کتنی مدت تک تضرعات اور گریہ وزاری کیا کئے۔ تزکیہ کے لئے کیسی کیسی جانفشانیاں اور سخت سے سخت محنتیں کیا کئے جب جا کر کہیں خدا کی طرف سے فیضان نازل ہوا۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۴ مورخہ ۲/اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۱)

جو لوگ خدا میں ہو کر خدا پانے کے واسطے تڑپ اور گدازش سے کوشش کرتے ہیں ان کی محنت اور کوشش ضائع نہیں جاتی اور ضرور ان کی راہبری اور ہدایت کی جاتی ہے۔ جو کوئی صدق اور خلوصِ نیت سے خدا کی طرف قدم اٹھاتا ہے خدا اس کی طرف راہ نمائی کے واسطے بڑھتا ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ تدبر کرے اور حق طلبی کی سچی تڑپ اور پیاس اپنے اندر پیدا کرے۔ معلومات کے وسیع کرنے کی جو سبیل اللہ تعالیٰ نے بنائی ہیں ان پر کاربند ہو۔ خدا بھی بے نیاز ہو جاتا ہے اس شخص سے جو خدا سے لاپروائی کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۴ مئی/۱۹۰۸ء صفحہ ۱، ۲)

اپنے نفس کی تبدیلی کے واسطے سعی کرو۔ نماز میں دعائیں مانگو۔ صدقہ خیرات سے اور دوسرے ہر طرح کے حیلہ سے۔ وَ الَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا میں شامل ہو جاؤ۔ جس طرح بیمار طبیب کے پاس جاتا، دوائی کھاتا، مسہل لیتا، خون نکلواتا، ٹکور کرواتا اور شفا حاصل کرنے کے واسطے ہر طرح کی تدبیر کرتا ہے۔ اسی طرح اپنی روحانی بیماریوں کو دور کرنے کے واسطے ہر طرح کی کوشش کرو۔ صرف زبان سے نہیں بلکہ مجاہدہ کے جس قدر طریق خدا تعالیٰ نے فرمائے ہیں وہ سب بجالاؤ۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۸/نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

یہ جو فرمایا کہ وَ الَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا یعنی ہمارے راہ کے مجاہد راستہ پاویں گے اس

کے معنے یہ ہیں کہ اس راہ میں پیمبر کے ساتھ مل کر جدو جہد کرنا ہوگا۔ ایک دو گھنٹہ کے بعد بھاگ جانا مجاہد کا کام نہیں بلکہ جان دینے کے لئے طیار رہنا اس کا کام ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۲)

جو ہمارے راہ میں مجاہدہ کرے گا ہم اس کو اپنی راہیں دکھلا دیں گے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۹)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو کیا کوئی ولی بننا ہے؟ افسوس انہوں نے کچھ قدر نہ کی۔ بے شک انسان نے ولی بننا ہے۔ اگر وہ صراطِ مستقیم پر چلے گا تو خدا بھی اس کی طرف چلے گا اور پھر ایک جگہ پر اس کی ملاقات ہوگی۔ اس کی اس طرف سے حرکت خواہ آہستہ ہوگی لیکن اس کے مقابل خدا تعالیٰ کی حرکت بہت جلد ہوگی چنانچہ یہ آیت اسی طرف اشارہ کرتی ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا الخ

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۷)

خدا کی طرف سعی کرنے والا کبھی بھی ناکام نہیں رہتا۔ اس کا سچا وعدہ ہے کہ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا خدائے تعالیٰ کی راہوں کی تلاش میں جو جویا ہوا وہ آخر منزلِ مقصود پر پہنچا۔ دنیوی امتحانوں کے لئے تیاریاں کرنے والے راتوں کو دن بنا دینے والے طالب علموں کی محنت اور حالت کو ہم دیکھ کر رحم کھا سکتے ہیں تو کیا اللہ تعالیٰ جس کا رحم اور فضل بے حد اور بے انت ہے اپنی طرف آنے والے کو ضائع کر دے گا۔ ہرگز نہیں! ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۶۱، ۱۶۲)

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جو جذب کی قوت لے کر نکلتی ہے وہ دوسرے کو جذب کرتی ہے۔ اس جذب میں اس قدر قوت ہوتی ہے کہ دنیا اور مافیہا کی ساری باتیں اس میں بھسم ہو جاتی ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے فضل اور فیض کو اپنی طرف کھینچنے لگتی ہے اور اسی سلسلہ کو باقی تمام سلسلوں پر تقدم اور فوق ہو جاتا ہے لیکن اس کے لئے مجاہدہ صحیحہ کی ضرورت ہے اس کے بغیر یہ راہ نہیں کھلتی۔ جیسا کہ فرمایا وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۲ مورخہ ۱۰؍اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

جس طرح ہر ایک کاشتکار کو تخم ریزی اور آبپاشی کے علاوہ بھی محنت اور کوشش کرنی پڑتی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ نے روحانی فیوض برکات کے ثمراتِ حسنہ کے حصول کے واسطے بھی مجاہدات لازمی اور ضروری رکھے ہیں چنانچہ فرماتا ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۴؍جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تفسیر سورۃ الرُّوم

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓـمّٓ ۚ﴿۲﴾ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۙ﴿۳﴾ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَ ہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِہِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ ۙ﴿۴﴾ فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ ۬ؕ لِلّٰہِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَ مِنۡۢ بَعۡدُ ؕ وَ یَوۡمَئِذٍ یَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۵﴾

جبکہ خدائے تعالیٰ کے قانون قدرت نے مکاشفات اور رؤیائے صالحہ کے لئے یہی اصل مقرّر کر دیا ہے کہ وہ اکثر استعارات سے پُر ہوتے ہیں تو اس اصل سے معنے کو پھیرنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ ہمیشہ پیشگوئیاں ظاہر پر ہی محمول ہوتی ہیں اگر الحاد نہیں تو اور کیا ہے؟ صوم اور صلوٰۃ کی طرح پیشگوئی کو بھی ایک حقیقت منکشفہ سمجھنا بڑی غلطی اور بڑا بھارا دھوکہ ہے۔ یہ احکام تو وہ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھلا دیئے اور بکلّی اُن کا پردہ اُٹھا دیا۔ مگر کیا ان پیشگوئیوں کے حق میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا ہے کہ یہ من کل الوجوہ مکشوف ہیں اور ان میں کوئی ایسی حقیقت اور کیفیت مخفی نہیں جو ظہور کے وقت سمجھ آ سکے اگر کوئی ایسی حدیث صحیح موجود ہے تو کیوں پیش نہیں کی جاتی۔..... آپ لوگ جانتے ہیں کہ جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ابوجہل سے شرط لگائی اور قرآن شریف کی وہ پیشگوئی مدار شرط رکھی کہ الٓـمّٓ۔ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ۔ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَ ہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِہِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ۔ فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ۔ اور تین برس کا عرصہ ٹھہرایا تو آپؐ پیشگوئی کی صورت کو دیکھ کر فی الفور دور اندیشی کو کام میں لائے اور شرط کی کسی قدر ترمیم کرنے کے لئے

ابو بکر صدیق کو حکم فرمایا اور فرمایا کہ بِضۡعِ سِنِیۡنَ کا لفظ مجمل ہے اور اکثر نو برس تک اطلاق پاتا ہے۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۳۱۰،۳۱۱)

اُن بادشاہوں کے مثیلوں کا قرآن شریف میں ذکر ہے جنہوں نے یہودیوں کے سلاطین کی بد چلنی کے وقت اُن کے ممالک پر قبضہ کیا جیسا کہ آیت غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۙ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَ ہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِہِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ سے ظاہر ہوتا ہے۔ حدیثوں سے ثابت ہے کہ روم سے مراد نصاریٰ ہیں۔ اور وہ آخری زمانہ میں پھر اسلامی ممالک کے کچھ حصے دبالیں گے۔ اور اسلامی بادشاہوں کے ممالک اُن کی بدچلنیوں کے وقت میں اُسی طرح نصاریٰ کے قبضے میں آجائیں گے جیسا کہ اسرائیلی بادشاہوں کی بدچلنیوں کے وقت رومی سلطنت نے ان کا ملک دبالیا تھا پس واضح ہو کہ یہ پیشگوئی ہمارے اس زمانہ میں پوری ہو گئی۔ مثلاً روس نے جو کچھ رومی سلطنت کو خدا کی ازلی مشیت سے نقصان پہنچایا وہ پوشیدہ نہیں۔ اور اس آیت میں جبکہ دوسرے طور پر معنے کئے جائیں غالب ہونے کے وقت میں روم سے مراد قیصر روم کا خاندان نہیں کیونکہ وہ خاندان اسلام کے ہاتھ سے تباہ ہو چکا بلکہ اس جگہ بروزی طور پر روم سے روس اور دوسری عیسائی سلطنتیں مراد ہیں جو عیسائی مذہب رکھتی ہیں۔ یہ آیت اوّل اس موقعہ پر نازل ہوئی تھی جبکہ کسریٰ شاہ ایران نے بعض حدود پر لڑائی کر کے قیصر شاہ روم کو مغلوب کر دیا تھا۔ پھر جب اس پیشگوئی کے مطابق بِضۡعِ سِنِیۡنَ میں قیصر روم شاہِ ایران پر غالب آ گیا تو پھر یہ آیت نازل ہوئی کہ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۙ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ الخ جس کا مطلب یہ تھا کہ رومی سلطنت اب تو غالب آ گئی مگر پھر بِضۡعِ سِنِیۡنَ میں اسلام کے ہاتھ سے مغلوب ہوں گے۔ مگر باوجود اس کے کہ دوسری قراءت میں غَلَبَتۡ کا صیغہ ماضی معلوم تھا اور سَیُغۡلَبُوۡنَ کا صیغہ مضارع مجہول تھا مگر پھر بھی پہلی قراءت جس میں غُلِبَتِ کا صیغہ ماضی مجہول تھا اور سَیَغۡلِبُوۡنَ مضارع معلوم تھا منسوخ التلاوت نہیں ہوئی۔ بلکہ اِسی طرح جبرائیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن شریف سُناتے رہے جس سے اس سنت اللہ کے موافق جو قرآن شریف کے نزول میں ہے یہ ثابت ہوا کہ ایک مرتبہ پھر مقدر ہے کہ عیسائی سلطنت روم کے بعض حدود کو پھر اپنے قبضہ میں کر لے گی۔ اِسی بنا پر احادیث میں آیا ہے کہ مسیح کے وقت میں سب سے زیادہ دنیا میں روم ہوں گے یعنی نصاریٰ۔

اس تحریر سے ہماری غرض یہ ہے کہ قرآن اور احادیث میں روم کا لفظ بھی بروزی طور پر آیا ہے یعنی روم سے اصل روم مراد نہیں ہیں بلکہ نصاریٰ مراد ہیں۔ (تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۳۰۷،۳۰۸)

حدیثوں میں بظاہر یہ تناقض پایا جاتا ہے کہ مسیح موعود کے مبعوث ہونے کے وقت ایک طرف تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ یاجوج ماجوج تمام دنیا میں پھیل جائیں گے اور دوسری طرف یہ بیان ہے کہ تمام دنیا میں عیسائی قوم کا غلبہ ہوگا جیسا کہ حدیث یَکْسِرُ الصَّلِیْبَ سے بھی سمجھا جاتا ہے کہ صلیبی قوم کا اس زمانہ میں بڑا عروج اور اقبال ہوگا۔ ایسا ہی ایک دوسری حدیث سے بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ اس زمانہ میں رومیوں کی کثرت اور قوت ہوگی یعنی عیسائیوں کی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رومی سلطنت عیسائی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ بھی قرآن شریف میں فرماتا ہے غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ اس جگہ بھی روم سے مراد عیسائی سلطنت ہے اور پھر بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیح موعود کے ظہور کے وقت دجّال کا تمام زمین پر غلبہ ہوگا اور تمام زمین پر بغیر مکہ معظّمہ کے دجّال محیط ہو جائے گا۔

اب ... بتلاویں کہ یہ تناقض کیوں کر دور ہوسکتا ہے اگر دجال تمام زمین پر محیط ہو جائے گا تو عیسائی سلطنت کہاں ہوگی۔ ایسا ہی یاجوج ماجوج جن کی عام سلطنت کی قرآن شریف خبر دیتا ہے وہ کہاں جائیں گے۔ سو یہ غلطیاں ہیں جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں .... واقعات ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ دونوں صفات یاجوج ماجوج اور دجال ہونے کی یورپین قوموں میں موجود ہیں کیونکہ یاجوج ماجوج کی تعریف حدیثوں میں یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کے ساتھ لڑائی میں کسی کو طاقت مقابلہ نہیں ہوگی اور مسیح موعود بھی صرف دعا سے کام لے گا اور یہ صفت کھلے کھلے طور پر یورپ کی سلطنتوں میں پائی جاتی ہے اور قرآن شریف بھی اس کا مصدّق ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ۔ اور دجّال کی نسبت حدیثوں میں یہ بیان ہے کہ وہ دجل سے کام لے گا اور مذہبی رنگ میں دنیا میں فتنہ ڈالے گا۔ سو قرآن شریف میں یہ صفت عیسائی پادریوں کی بیان کی گئی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ اس تقریر سے ظاہر ہے کہ یہ تینوں ایک ہی ہیں۔ اسی وجہ ہے سورۃ الفاتحہ میں دائمی طور پر یہ دعا سکھلائی گئی کہ تم عیسائیوں کے فتنہ سے پناہ مانگو یہ نہیں کہا کہ تم دجّال سے پناہ مانگو۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۸۵، ۸۶)

قرآن شریف بہت سی پیشگوئیوں سے بھرا پڑا ہے جیسا کہ روم اور ایران کی سلطنت کی نسبت ایک زبردست پیشگوئی قرآن شریف میں موجود ہے اور یہ اس وقت کی پیشگوئی ہے جب کہ مجوسی سلطنت نے ایک لڑائی میں رُومی سلطنت پر فتح پائی تھی اور کچھ زمین اُن کے ملک کی اپنے قبضہ میں کر لی تھی تب مشرکین مکہ نے

فارسیوں کی فتح اپنے لئے ایک نیک فال سمجھی تھی اور اس سے یہ سمجھا تھا کہ چونکہ فارسی سلطنت مخلوق پرستی میں ہمارے شریک ہے ایسا ہی ہم بھی اس نبی کا استیصال کریں گے جس کی شریعت اہل کتاب سے مشابہت رکھتی ہے تب خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں یہ پیشگوئی نازل فرمائی کہ آخر کار رُومی سلطنت کی فتح ہوگی اور چونکہ روم کی فتح کی نسبت یہ پیشگوئی ہے اس لئے اس سورت کا نام سورۃ الروم رکھا گیا ہے اور چونکہ عرب کے مشرکوں نے مجوسیوں کی سلطنت کی فتح کو اپنی فتح کے لئے ایک نشان سمجھ لیا تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے اس پیشگوئی میں یہ بھی فرما دیا کہ جس روز پھر روم کی فتح ہوگی اس روز مسلمان بھی مشرکوں پر فتحیاب ہوں گے چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اس بارہ میں قرآن شریف کی آیت یہ ہے الٓمّٓ ۔ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۔ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۔ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ (ترجمہ) میں خدا ہوں جو سب سے بہتر جانتا ہوں ۔ رُومی سلطنت بہت قریب، زمین میں مغلوب ہوگئی ہے اور وہ لوگ پھر نو سال تک تین سال کے بعد مجوسی سلطنت پر غالب ہو جائیں گے اُس دن مومنوں کے لئے بھی ایک خوشی کا دن ہوگا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور تین سال کے بعد نو ۹ سال کے اندر پھر رُومی سلطنت ایرانی سلطنت پر غالب آ گئی اور اسی دن مسلمانوں نے بھی مشرکوں پر فتح پائی کیونکہ وہ دن بدر کی لڑائی کا دن تھا جس میں اہل اسلام کو فتح ہوئی تھی۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۲۰)

لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ..... پہلے بھی خدا کا حکم ہے اور پیچھے بھی خدا کا ہی حکم ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۱۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

میں اللہ بہت جاننے والا ہوں ۔ رومی اپنی سرحد میں اہل فارس سے مغلوب ہو گئے ہیں اور بہت ہی جلد چند سال میں یقیناً غالب ہونے والے ہیں ۔ پہلے اور آئندہ آنے والے واقعات کا علم اور ان کے اسباب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں جس دن رومی غالب ہوں گے وہی دن ہوگا جب مومن بھی خوشی کریں گے۔

اب غور کر کے دیکھو کہ یہ کیسی حیرت انگیز اور جلیل القدر پیشگوئی ہے۔ ایسے وقت میں یہ پیشگوئی کی گئی جب مسلمانوں کی کمزور اور ضعیف حالت خود خطرہ میں تھی ۔ نہ کوئی سامان تھا نہ طاقت تھی ۔ ایسی حالت میں مخالف کہتے تھے کہ یہ گروہ بہت جلد نیست و نابود ہو جائے گا۔ مدت کی قید بھی اس میں لگا دی اور پھر يَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ کہہ کر دوہری پیشگوئی بنا دی یعنی جس روز رومی فارسیوں پر غالب آئیں گے اس دن مسلمان بھی بامراد ہو کر خوش ہوں گے چنانچہ جس طرح یہ پیشگوئی کی تھی اسی طرح بدر کے روز پوری ہوگئی۔

ادھر رومی غالب ہوئے اور ادھر مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۳۰؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

آنحضرت کے زمانہ میں ایرانی لوگ مشرک تھے اور قیصر روم جو کہ عیسائی تھا در اصل موحد تھا اور مسیح کو ابن اللہ نہیں مانتا تھا اور جب اس کے سامنے مسیح کا وہ ذکر جو قرآن میں درج ہے پیش کیا گیا تو اس نے کہا کہ میرے نزدیک مسیح کا درجہ اس سے ذرہ بھی زیادہ نہیں جو قرآن نے بتلایا ہے۔ حدیث میں بھی اس کی گواہی بخاری میں موجود ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ وہی کلام ہے جو کہ توریت میں ہے اور اس کی حیثیت نبوت سے بڑھ کر نہیں ہے۔

اسی پر یہ آیت نازل ہوئی کہ الٓمّٓ ۔ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۔ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَ ہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِہِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ ۔ فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ ۬ؕ لِلّٰہِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَ مِنۡۢ بَعۡدُ ؕ وَ یَوۡمَئِذٍ یَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۔ یعنی روم اب مغلوب ہوگیا ہے مگر تھوڑے عرصہ میں (۹ سال میں) پھر غالب ہوگا۔ عیسائی لوگ نہایت شرارت سے کہتے ہیں کہ آنحضرت نے دونوں طاقتوں کا اندازہ کر لیا تھا اور پھر فراست سے یہ پیشگوئی کر دی تھی۔ ہم کہتے ہیں کہ اسی طرح مسیح بھی بیماروں کو دیکھ کر اندازہ کر لیا کرتا تھا جو اچھے ہونے کے قابل نظر آتے تھے ان کا سلب امراض کر دیتا۔ اس طرح تو سارے معجزات ان کے ہاتھ سے جاتے ہیں۔ یَوۡمَئِذٍ یَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۔ اس دن مومنوں کو دو خوشیاں ہوں گی ایک تو جنگِ بدر کی فتح، دوسری روم والی پیشگوئی کے پورا ہونے کی۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷؍نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۴)

یہ بات ہر ایک وسیع المعلومات شخص پر ظاہر ہے کہ اپنے مکاشفات کے متعلق اکثر نبیوں سے بھی اجتہادی غلطیاں ہوئی ہیں اور ان کے شاگردوں سے بھی۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے بِضۡعِ کے لفظ کو جو آیت سَیَغۡلِبُوۡنَ فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ میں داخل ہے تین برس میں محدود سمجھ لیا تھا اور یہ غلطی تھی جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو متنبہ کیا۔ (مکتوبات احمد جلد دوم صفحہ ۷۷)

قرآن کریم کی پیشگوئیوں کے تذکرہ پر فرمایا کہ الٓمّٓ ۔ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۔ میں کیسی عظیم الشان پیشگوئی ہے۔ ایرانی مشرک تھے اور رومن عیسائی تھے مگر قیصر روم نے جس کا نام ہرقل ہے جیسا کہ بخاری میں درج ہے اسلام کی عظمت کا اعتراف کیا تھا اور وہ اس طرح پر موحد ہی تھا۔ غرض جب ایرانیوں نے رومیوں پر فتح پائی تو کفارِ مکہ نے یہ سمجھ لیا کہ ہم بھی غالب ہوں گے اور مسلمان مغلوب ہو جائیں گے لیکن خدا تعالیٰ نے اس پیشگوئی میں ان کو بتا دیا کہ ایرانی پھر مغلوب ہو جائیں گے بعض نے اس پیشگوئی کو اٹکل کہا مگر انہیں یہ معلوم

نہیں کہ اس میں دوہری پیشگوئی ہے کہ اسی دن اسلام کی بھی فتح ہوگی چنانچہ بدر کی لڑائی میں جب فتح ہوئی اسی دن ایرانی مغلوب ہوئے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ ؍نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰۤى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۱﴾

انہوں نے ہمارے نشانوں کو جھٹلایا اور وہ پہلے سے ہنسی کر رہے تھے۔

(مجموعہ اشتہارات جلد اول صفحہ ۱۳۷)

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿۲۳﴾

بولیوں کی تحقیق کی طرف توجہ دلانے والا بجز قرآن کریم کے اور کوئی دنیا میں ظاہر نہیں ہوا۔ اسی پاک کلام نے یہ فرمایا وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ یعنی خدا تعالیٰ کی ہستی اور توحید کے نشانوں میں سے زمین آسمان کا پیدا کرنا بولیوں اور رنگوں کا اختلاف ہے۔ درحقیقت خدا شناسی کے لئے یہ بڑا نشان ہیں مگر ان کے لئے جو اہل علم ہیں اب دیکھو کہ کس قدر تحقیق السنہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس کو خدا شناسی کا مدار ٹھہرا دیا ہے۔

(منن الرحمٰن، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۱۶۳، ۱۶۴ حاشیہ)

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۱﴾

شاید کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ خدا نے اعتقاد توحید کو سب انسانوں میں فطرتی بیان کیا ہے اور فرمایا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ الجزو نمبر ۲۱۔ یعنی توحید پر قائم ہونا انسان کی فطرت میں داخل ہے جس پر انسانی پیدائش کی بنیاد ہے۔ اور نیز فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى۔ الجزو نمبر ۹ (الاعراف: ۱۷۳) یعنی ہر یک روح نے ربوبیت الٰہیہ کا اقرار کیا۔ کسی نے انکار نہ کیا۔ یہ بھی فطرتی

اقرار کی طرف اشارہ ہے اور نیز فرمایا وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ الجزو نمبر ۲۷۔ (الذاریات:۵۷) یعنی میں نے جن وانس کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری پرستش کریں۔ یہ بھی اسی کی طرف اشارہ ہے کہ پرستش الٰہی ایک فطرتی امر ہے۔ پس جب توحید الٰہی اور پرستش الٰہی سب بنی آدم کے لئے فطرتی امر ہوا اور کوئی آدمی سرکشی اور بے ایمانی کے لئے پیدا نہ کیا گیا تو پھر جو امور برخلاف خدادانی و خداترسی ہیں کیوں کر فطرتی امر ہو سکتے ہیں۔

یہ شبہ صرف ایک صداقت کی غلط فہمی ہے کیونکہ وہ امر جو آیات مندرجۂ بالا سے ثابت ہوتا ہے وہ تو صرف اسی قدر ہے کہ انسان کی فطرت میں رجوع الی اللہ اور اقرار وحدانیت کا تخم بویا گیا۔ یہ کہاں آیات موصوفہ میں لکھا ہے کہ وہ تخم ہر یک فطرت میں مساوی ہے بلکہ جابجا قرآن شریف میں اسی بات کی تصریح ہے کہ وہ تخم بنی آدم میں متفاوت المراتب ہے۔ کسی میں نہایت کم۔ کسی میں متوسط۔ کسی میں نہایت زیادہ۔ جیسا ایک جگہ فرمایا ہے فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ۔ الجزو نمبر ۲۲۔ (فاطر:۳۳) یعنی بنی آدم کی فطرتیں مختلف ہیں۔ بعض لوگ ظالم ہیں جن کے نور فطرتی کو قویٰ بہیمیہ یا غضبیہ نے دبایا ہوا ہے۔ بعض درمیانی حالت میں ہیں۔ بعض نیکی اور رجوع الی اللہ میں سبقت لے گئے ہیں۔ اسی طرح بعض کی نسبت فرمایا۔ وَ اجْتَبَيْنٰهُمْ۔ الجزو نمبر ۷۔ (الانعام:۸۸) اور ہم نے ان کو چن لیا یعنی وہ باعتبار اپنی فطرتی قوتوں کے دوسروں میں سے چیدہ اور برگزیدہ تھے۔ اس لئے قابل رسالت و نبوت ٹھہرے۔ اور بعض کی نسبت فرمایا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ۔ الجزو نمبر ۹ (الاعراف:۱۸۰) یعنی ایسے ہیں جیسے چارپائے اور نور فطرتی ان کا اس قدر کم ہے کہ ان میں اور مویشی میں کچھ تھوڑا ہی فرق ہے۔ پس دیکھنا چاہیئے کہ اگرچہ خدائے تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ تخم توحید ہر یک نفس میں موجود ہے۔ لیکن ساتھ ہی اُس کے یہ بھی کئی مقامات میں کھول کر بتلا دیا ہے کہ وہ تخم سب میں مساوی نہیں۔ بلکہ بعض کی فطرتوں پر جذبات نفسانی ان کے ایسے غالب آ گئے ہیں کہ وہ نور کالمفقود ہو گیا ہے۔ پس ظاہر ہے کہ قویٰ بہیمیہ یا غضبیہ کا فطرتی ہونا وحدانیت الٰہی کے فطرتی ہونے کو منافی نہیں ہے خواہ کوئی کیسا ہی ہوا پرست اور نفس امّارہ کا مغلوب ہو پھر بھی کسی نہ کسی قدر نور فطرتی اس میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً جو شخص بوجہ غلبہ قوائے شہویہ یا غضبیہ چوری کرتا ہے یا خون کرتا ہے یا حرام کاری میں مبتلا ہوتا ہے تو اگرچہ یہ فعل اس کی فطرت کا مقتضا ہے لیکن بمقابلہ اُس کے نور صلاحیت جو اس کی فطرت میں رکھا گیا ہے وہ اس کو اسی وقت جب اس سے کوئی حرکت بے جا صادر ہو جائے ملزم کرتا ہے جس

کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا۔ الجزو نمبر ۳۰۔ (الشمس : ۹) یعنی ہر یک انسان کو ایک قسم کا خدا نے الہام عطا کر رکھا ہے جس کو نور قلب کہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ نیک اور بد کام میں فرق کر لینا۔ جیسے کوئی چور یا خونی چوری یا خون کرتا ہے تو خدا اس کے دل میں اسی وقت ڈال دیتا ہے کہ تو نے یہ کام برا کیا اچھا نہیں کیا۔ لیکن وہ ایسے القاء کی کچھ پرواہ نہیں رکھتا کیونکہ اس کا نور قلب نہایت ضعیف ہوتا ہے اور عقل بھی ضعیف اور قوت بہیمیہ غالب اور نفس طالب۔ سو اس طور کی طبیعتیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں جن کا وجود روزمرہ کے مشاہدات سے ثابت ہوتا ہے۔ ان کے نفس کا شورش اور اشتعال جو فطرتی ہے کم نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جو خدا نے لگا دیا اس کو کون دور کرے۔ ہاں خدا نے ان کا ایک علاج بھی رکھا ہے۔ وہ کیا ہے؟ توبہ و استغفار اور ندامت یعنی جب کہ برا فعل جو ان کے نفس کا تقاضا ہے ان سے صادر ہو یا حسب خاصہ فطرتی کوئی برا خیال دل میں آوے تو اگر وہ توبہ اور استغفار سے اس کا تدارک چاہیں تو خدا اس گناہ کو معاف کر دیتا ہے۔ جب وہ بار بار ٹھوکر کھانے سے بار بار نادم اور تائب ہوں تو وہ ندامت اور توبہ اس آلودگی کو دھو ڈالتی ہے۔ یہی حقیقی کفارہ ہے جو اس فطرتی گناہ کا علاج ہے۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ الجزو نمبر ۵۔ (النساء : ۱۱۱) یعنی جس سے کوئی بد عملی ہو جائے یا اپنے نفس پر کسی نوع کا ظلم کرے اور پھر پشیمان ہو کر خدا سے معافی چاہے تو وہ خدا کو غفور و رحیم پائے گا۔ اس لطیف اور پُر حکمت عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جیسے لغزش اور گناہ نفوس ناقصہ کا خاصہ ہے جو ان سے سرزد ہوتا ہے اس کے مقابلہ پر خدا کا ازلی اور ابدی خاصہ مغفرت و رحم ہے اور اپنی ذات میں وہ غفور و رحیم ہے یعنی اس کی مغفرت سرسری اور اتفاقی نہیں بلکہ وہ اس کی ذات قدیم کی صفت قدیم ہے جس کو وہ دوست رکھتا ہے اور جوہر قابل پر اس کا فیضان چاہتا ہے۔ یعنی جب کبھی کوئی بشر بروقت صدور لغزش و گناہ بہ ندامت و توبہ خدا کی طرف رجوع کرے تو وہ خدا کے نزدیک اس قابل ہو جاتا ہے کہ رحمت اور مغفرت کے ساتھ خدا اس کی طرف رجوع کرے۔ اور یہ رجوع الٰہی بندۂ نادم اور تائب کی طرف ایک یا دو مرتبہ میں محدود نہیں بلکہ یہ خدائے تعالیٰ کی ذات میں خاصہ دائمی ہے اور جب تک کوئی گنہگار توبہ کی حالت میں اس کی طرف رجوع کرتا ہے وہ خاصہ اس کا ضرور اس پر ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ پس خدا کا قانون قدرت یہ نہیں ہے کہ جو ٹھوکر کھانے والی طبیعتیں ہیں وہ ٹھوکر نہ کھاویں یا جو لوگ قویٰ بہیمیہ یا غضبیہ کے مغلوب ہیں ان کی فطرت بدل جاوے بلکہ اُس کا قانون جو قدیم سے بندھا چلا آتا ہے یہی ہے کہ ناقص لوگ جو بمقتضائے

اپنے ذاتی نقصان کے گناہ کریں وہ توبہ اور استغفار کر کے بخشے جائیں۔ لیکن جو شخص بعض قوتوں میں فطرتاً ضعیف ہے وہ قوی نہیں ہوسکتا۔ اس میں تبدیل پیدائش لازم آتی ہے اور وہ بداہتاً محال ہے اور خود مشہود و محسوس ہے کہ مثلاً جس کی فطرت میں سریع الغضب ہونے کی خصلت پائی جاتی ہے وہ بطی الغضب ہرگز نہیں بن سکتا بلکہ ہمیشہ دیکھا جاتا ہے کہ ایسا آدمی غضب کے موقع پر آثار غضب بلا اختیار ظاہر کرتا ہے اور ضبط سے باہر آجاتا ہے یا کوئی ناگفتنی بات زبان پر لے آتا ہے۔ اور اگر کسی لحاظ سے کچھ صبر بھی کرے تو دل میں تو ضرور پیچ و تاب کھاتا ہے۔ پس یہ احمقانہ خیال ہے کہ کوئی منتر جنتر یا کوئی خاص مذہب اختیار کرنا اس کی طبیعت کو بدلا دے گا۔ اسی جہت سے اُس نبی معصوم نے جس کی لبوں پر حکمت جاری تھی فرمایا خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ یعنی جو لوگ جاہلیت میں نیک ذات ہیں وہی اسلام میں بھی داخل ہو کر نیک ذات ہوتے ہیں۔ غرض طبائع انسانی جواہر کانی کی طرح مختلف الاقسام ہیں۔ بعض طبیعتیں چاندی کی طرح روشن اور صاف۔ بعض گندھک کی طرح بدبودار اور جلد بھڑکنے والی۔ بعض زیبق کی طرح بےثبات اور بے قرار۔ بعض لوہے کی طرح سخت اور کثیف۔ اور جیسا یہ اختلاف طبائع بدیہی الثبوت ہے ایسا ہی انتظام ربانی کے بھی موافق ہے۔ کچھ بے قاعدہ بات نہیں۔ کوئی ایسا امر نہیں کہ قانون نظام عالم کے برخلاف ہو بلکہ آسائش و آبادی عالم اسی پر موقوف ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر تمام طبیعتیں ایک ہی مرتبہ استعداد پر ہوتیں تو پھر مختلف طور کے کام (جو مختلف طور کی استعدادوں پر موقوف تھے) جن پر دنیا کی آبادی کا مدار تھا حیز التوا میں رہ جاتے۔ کیونکہ کثیف کاموں کے لئے وہ طبیعتیں مناسب حال ہیں جو کثیف ہیں اور لطیف کاموں کے لئے وہ طبیعتیں مناسبت رکھتی ہیں جو لطیف ہیں۔ یونانی حکیموں نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے کہ جیسے بعض انسان حیوانات کے قریب قریب ہوتے ہیں۔ اسی طرح عقل تقاضا کرتی ہے کہ بعض انسان ایسے بھی ہوں جن کا جوہرِ نفس کمال صفوت اور لطافت پر واقعہ ہو۔ تا جس طرح طبائع انسانی کا سلسلہ نیچے کی طرف اس قدر متنزل نظر آتا ہے کہ حیوانات سے جا کر اتصال پکڑ لیا ہے اسی طرح اوپر کی طرف بھی ایسا متصاعد ہو کہ عالم اعلیٰ سے اتصال پکڑ لے۔

اب جبکہ ثابت ہو گیا کہ افراد بشریہ عقل میں۔ قویٰ اخلاقیہ میں۔ نور قلب میں متفاوت المراتب ہیں تو اسی سے وحی ربانی کا بعض افراد بشریہ سے خاص ہونا یعنی ان سے جو من کل الوجوہ کامل ہیں بہ پایہ ثبوت پہنچ گیا۔ کیونکہ یہ بات تو خود ہر یک عاقل پر روشن ہے کہ ہر یک نفس اپنی استعداد و قابلیت کے موافق انوار الٰہیہ

کو قبول کرتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اس کے سمجھنے کے لئے آفتاب نہایت روشن مثال ہے۔ کیونکہ ہر چند آفتاب اپنی کرنیں چاروں طرف چھوڑ رہا ہے۔ لیکن اس کی روشنی قبول کرنے میں ہر یک مکان برابر نہیں۔ جس مکان کے دروازے بند ہیں اس میں کچھ روشنی نہیں پڑ سکتی اور جس میں بمقابل آفتاب ایک چھوٹا سا روزنہ ہے اس میں روشنی تو پڑتی ہے مگر تھوڑی جو بکلی ظلمت کو نہیں اٹھا سکتی۔ لیکن وہ مکان جس کے دروازے بمقابل آفتاب سب کے سب کھلے ہیں اور دیواریں بھی کسی کثیف شے سے نہیں بلکہ نہایت مصفّٰی اور روشن شیشہ سے ہیں۔ اس میں صرف یہی خوبی نہیں ہوگی کہ کامل طور پر روشنی قبول کرے گا۔ بلکہ اپنی روشنی چاروں طرف پھیلاوے گا اور دوسروں تک پہنچاوے گا۔ یہی مثال موخر الذکر نفوس صافیہ انبیاء کے مطابق حال ہے۔ یعنی جن نفوس مقدسہ کو خدا اپنی رسالت کے لئے چن لیتا ہے وہ بھی رفع حجب اور مکمل صفوت میں اس شیش محل کی طرح ہوتے ہیں جس میں نہ کوئی کثافت ہے اور نہ کوئی حجاب باقی ہے۔ پس ظاہر ہے کہ جن افراد بشریہ میں وہ کمال تام موجود نہیں۔ ایسے لوگ کسی حالت میں مرتبہ رسالت الٰہی نہیں پا سکتے۔ بلکہ یہ مرتبہ قسام ازل سے انہیں کو ملا ہوا ہے جن کے نفوس مقدسہ حجب ظلمانی سے بکلی پاک ہیں۔ جن کو اغشیہ جسمانی سے بغایت درجہ آزادگی ہے۔ جن کا تقدس وتنزہ اس درجہ پر ہے جس کے آگے خیال کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔ وہی نفوس تامہ کاملہ وسیلہ ہدایت جمیع مخلوقات ہیں اور جیسے حیات کا فیضان تمام اعضاء کو قلب کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ ایسا ہی حکیم مطلق نے ہدایت کا فیضان انہیں کے ذریعہ سے مقرر کیا ہے۔ کیونکہ وہ کامل مناسبت جو مفیض اور مستفیض میں چاہیئے وہ صرف انہیں کو عنایت کی گئی ہے۔ اور یہ ہرگز ممکن نہیں کہ خداوند تعالیٰ جو نہایت تجرد وتنزہ میں ہے ایسے لوگوں پر افاضہ انوار وحی مقدس اپنے کا کرے جن کی فطرت کے دائرہ کا اکثر حصہ ظلمانی اور دود آمیز ہے اور نیز نہایت تنگ اور منقبض اور جن کی طبائع خسیسہ کدورات سفلیہ میں منغمس اور آلودہ ہیں۔ اگر ہم اپنے تئیں آپ ہی دھوکا نہ دیں تو بے شک ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ مبدء قدیم سے اتصال تام پانے کے لئے اور اس قدوس اعظم کا ہمکلام بننے کے لئے ایک ایسی خاص قابلیت اور نورانیت شرط ہے کہ جو اس مرتبہ عظیم کی قدر اور شان کے لائق ہے۔ یہ بات ہرگز نہیں کہ ہر یک شخص جو عین نقصان اور فرومائیگی اور آلودگی کی حالت میں ہے اور صدہا حجب ظلمانیہ میں محجوب ہے وہ باوصف اپنی پست فطرتی اور دون ہمتی کے اس مرتبہ کو پا سکتا ہے۔　　(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۱۸۴ تا ۱۹۰ حاشیہ)

وہ قرآن کریم ہے کتابِ مکنون میں ہے جس کے ایک معنے یہ ہیں کہ صحیفۂ فطرت میں اس کی نقلیں منقوش

ہیں یعنی اس کا یقین فطری ہے جیسا کہ فرمایا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا۔

(الحق مباحثہ لدھیانہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۳۰)

اسلام انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے اور خدا نے انسان کو اسلام پر پیدا کیا اور اسلام کے لئے پیدا کیا ہے۔ یعنی یہ چاہا ہے کہ انسان اپنے تمام قویٰ کے ساتھ اس کی پرستش اور اطاعت اور محبت میں لگ جائے۔ اسی وجہ سے اس قادر کریم نے انسان کو تمام قویٰ اسلام کے مناسب حال عطا کئے ہیں۔.... انسان کو جو کچھ اندرونی اور بیرونی اعضاء دیئے گئے ہیں یا جو کچھ قوتیں عنایت ہوئی ہیں، اصل مقصود ان سے خدا کی معرفت اور خدا کی پرستش اور خدا کی محبت ہے۔ اسی وجہ سے انسان دنیا میں ہزاروں شغلوں کو اختیار کر کے پھر بھی بجز خدا کے اپنی سچی خوشحالی کسی میں نہیں پاتا۔ بڑا دولتمند ہو کر، بڑا عہدہ پا کر، بڑا تاجر بن کر، بڑی بادشاہی تک پہنچ کر، بڑا فلاسفر کہلا کر آخر ان دنیوی گرفتاریوں سے بڑی حسرتوں کے ساتھ جاتا ہے اور ہمیشہ دل اس کا دنیا کے استغراق سے اس کو ملزم کرتا رہتا ہے اور اس کے مکروں اور فریبوں اور ناجائز کاموں میں کبھی اس کا کانشنس اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ ایک دانا انسان اس مسئلہ کو اس طرح بھی سمجھ سکتا ہے کہ جس چیز کے قویٰ ایک اعلیٰ سے اعلیٰ کام کر سکتے ہیں اور پھر آگے جا کر ٹھہر جاتے ہیں۔ وہی اعلیٰ کام اس کی پیدائش کی علت غائی سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً بیل کا کام اعلیٰ سے اعلیٰ قلبہ رانی یا آبپاشی یا بار برداری ہے۔ اس سے زیادہ اس کی قوتوں میں کچھ ثابت نہیں ہوا۔ سو بیل کی زندگی کا مدعا یہی تین چیزیں ہیں۔ اس سے زیادہ کوئی قوت اس میں پائی نہیں جاتی۔ مگر جب ہم انسان کی قوتوں کو ٹٹولتے ہیں کہ ان میں اعلیٰ سے اعلیٰ کون سی قوت ہے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ خدائے اعلیٰ برتر کی اس میں تلاش پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ چاہتا ہے کہ خدا کی محبت میں ایسا گداز اور محو ہو کہ اس کا اپنا کچھ بھی نہ رہے سب خدا کا ہو جائے۔ وہ کھانے اور سونے وغیرہ طبعی امور میں دوسرے حیوانات کو اپنا شریک غالب رکھتا ہے۔ صنعت کاری میں بعض حیوانات اس سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ بلکہ شہد کی مکھیاں بھی ہر ایک پھول کا عطر نکال کر ایسا شہد نفیس پیدا کرتی ہیں کہ اب تک اس صنعت میں انسان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ پس ظاہر ہے کہ انسان کا اعلیٰ کمال خدا تعالیٰ کا وصال ہے۔ لہٰذا اس کی زندگی کا اصل مدعا یہی ہے کہ خدا کی طرف اس کے دل کی کھڑکی کھلے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۱۵، ۴۱۶)

وَأَمَّا الرَّجُلُ الْمُحَمَّدِيُّ فَقَدْ أُمِرَ لَهٗ | ایک مسلمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جیسے وہ شریعتِ قانونیہ

أَنْ يَّتَّبِعَ الشَّرِيْعَةَ الْفِطْرِيَّةَ كَمَا يَتَّبِعُ الشَّرِيْعَةَ الْقَانُوْنِيَّةَ، وَلَا يَقْطَعُ أَمْرًا إِلَّا بَعْدَ شَهَادَةِ الشَّرِيْعَةِ الْفِطْرِيَّةِ. وَلِذَالِكَ سُمِّيَ الْإِسْلَامُ دِيْنَ الْفِطْرَةِ لِلُزُوْمِ الْفِطْرَةِ لِهٰذِهِ الْمِلَّةِ، وَإِلَيْهِ أَشَارَ نَبِيُّنَاصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَلَوْ أَفْتَاكَ الْمُفْتُوْنَ". فَانْظُرْ كَيْفَ رَغَّبَ فِي الشَّرِيْعَةِ الْفِطْرِيَّةِ وَلَمْ يَقْنَعْ عَلٰى مَا قَالَ الْعَالِمُوْنَ. فَالْمُسْلِمُ الْكَامِلُ مَنْ يَّتَّبِعُ الشَّرِيْعَتَيْنِ، وَيَنْظُرُ بِالْعَيْنَيْنِ، فَيُهْدَى إِلَى الصِّرَاطِ وَلَا يَخْدَعُهُ الْخَادِعُوْنَ. وَلِذَالِكَ ذَكَرَ اللّٰهُ فِيْ مَحَامِدِ الْإِسْلَامِ أَنَّهٗ شَرِيْعَةٌ فِطْرِيَّةٌ، حَيْثُ قَالَ ''فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ''. وَهٰذَا مِنْ أَعْظَمِ فَضَائِلِ هٰذِهِ الْمِلَّةِ وَمَنَاقِبِ تِلْكَ الشَّرِيْعَةِ. فَإِنَّهٗ يُوْجِدُ فِيْ هٰذَا التَّعْلِيْمِ مَدَارُ الْأَمْرِ عَلَى الْقُوَّةِ الْقُدْسِيَّةِ الْقَاضِيَّةِ الْمَوْجُوْدَةِ فِي النَّشْأَةِ الْإِنْسَانِيَّةِ الْمُوصِلَةِ إِلٰى كَمَالٍ تَامٍّ فِيْ مَرَاتِبِ الْمَحْوِيَّةِ، فَلَا يَبْقٰى مَعَهَا مَنْفَذٌ لِّلتَّصَرُّفَاتِ النَّفْسَانِيَّةِ، لِمَا فِيْهِ عَمَلٌ عَلَى الشَّهَادَةِ الْفِطْرِيَّةِ. وَأَمَّا التَّوْرَاةُ

کی پیروی کرتا ہے ویسے ہی شریعتِ فطریہ کی بھی پیروی کرے اور کسی امر کا قطعی فیصلہ شریعتِ فطریہ کی شہادت کے بغیر نہ کرے۔ اور چونکہ اس ملت کے ساتھ فطرت لازم ہے اس لئے اسلام کو دینِ فطرت کہا جاتا ہے اور اسی کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے کہ تو اپنے دل سے فتویٰ طلب کر خواہ تجھے مفتی بھی فتویٰ دیں پس غور کرو کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعتِ فطریہ کی طرف رغبت دلائی ہے اور اس بات کو کافی سمجھنے کا ارشاد نہیں فرمایا جو عالم لوگ بیان کرتے ہیں۔ پس کامل مسلم وہ ہے جو دو شریعتوں کی پیروی کرے اور دو آنکھوں کے ساتھ دیکھے۔ سو ایسے شخص کی ہی سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی کی جائے گی اور اس کو دھوکہ دینے والے دھوکہ نہیں دے سکیں گے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسلام کی خوبیوں میں سے اس خوبی کا ذکر کیا ہے کہ وہ ایک فطری قانون ہے جیسا کہ فرمایا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا اور یہ اس ملت کے فضائل میں سے سب سے بڑی فضیلت ہے اور اس شریعت کی خوبیوں میں سے سب سے بڑی خوبی ہے کیونکہ اس تعلیم میں حکم کا دارومدار اس قوتِ قدسیہ پر ہے جو فیصلہ کرنے والی اور انسانی سرشت میں موجود ہے اور فنا کے مراتب میں کمال تک پہنچانے والی ہے اور اس کی موجودگی میں تصرفاتِ نفسانیہ کے لئے کوئی راہ باقی نہیں رہتی کیونکہ اس میں فطرت کی شہادت پر عمل کیا جاتا ہے لیکن تورات اور

وَالْاِنْجِيْلُ فَيَتْرُكَانِ الْاِنْسَانَ اِلٰى حَدٍّ هُوَ أَبْعَدُ مِنَ الشَّهَادَةِ الْفِطْرِيَّةِ الْقُدْسِيَّةِ، وَأَقْرَبُ اِلٰى دَخْلِ اِفْرَاطِ الْقُوَّةِ الْغَضَبِيَّةِ، أَوْ تَفْرِيْطِ الْقُوَّةِ الْوَاهِمَةِ، حَتّٰى يُمْكِنَ أَنْ يُّسَمَّى الْمُنْتَقِمُ فِيْ بَعْضِ الْمَوَاضِعِ ذِئْبًا مُؤْذِيًا عِنْدَ الْعُقَلَآءِ ، أَوْ يُسَمَّى الَّذِيْ عَفَا فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ وَأَغْضٰى مَثَلًا عِنْدَ رُؤْيَةِ فِسْقِ أَهْلِهٖ دَيُّوْثًا وَّقِيْحًا عِنْدَ أَهْلِ الْغَيْرَةِ وَالْحَيَآءِ. وَلِذَالِكَ تَرٰى فِيْ بَعْضِ الْمَوَاضِعِ رَجُلًا سَرَّهٗ تَعْلِيْمُ الْعَفْوِ يَتْرُكُ حَقِيْقَةَ الْعَفْوِ وَالرَّحْمَةِ، وَيُجَاوِزُ حُدُوْدَ الْغَيْرَةِ الْاِنْسَانِيَّةِ. فَإِنَّ الْعَفْوَ فِيْ كُلِّ مَحَلٍّ لَّيْسَ بِمَحْمُوْدٍ عِنْدَ الْعَاقِلِيْنَ، وَ كَذَالِكَ الْاِنْتِقَامُ فِيْ كُلِّ مَقَامٍ لَّيْسَ بِخَيْرٍ عِنْدَ الْمُتَدَبِّرِيْنَ. فَلَا شَكَّ أَنَّهٗ مَنْ أَوْجَبَ الْعَفْوَ عَلٰى نَفْسِهٖ فِيْ كُلِّ مَقَامٍ بِمُتَابَعَةِ الْاِنْجِيْلِ فَقَدْ وَضَعَ الْاِحْسَانَ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ فِيْ بَعْضِ الْحَالَاتِ، وَمَنْ أَوْجَبَ الْاِنْتِقَامَ عَلٰى نَفْسِهٖ فِيْ كُلِّ مَقَامٍ بِمُتَابَعَةِ التَّوْرَاةِ فَقَدْ وَضَعَ الْقِصَاصَ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ وَانْحَطَّ مِنْ مَّدَارِجِ الْحَسَنَاتِ. وَأَمَّا الْقُرْاٰنُ فَقَدْ رَغَّبَ فِيْ مِثْلِ هٰذِهِ الْمَوَاضِعِ اِلٰى شَهَادَةِ الشَّرِيْعَةِ الْفِطْرِيَّةِ الَّتِيْ تَنْبَعُ مِنْ عَيْنِ الْقُوَّةِ الْقُدْسِيَّةِ، وَتَنْزِلُ مِنْ رُّوْحِ الْأَمِيْنِ فِيْ جَذْرِ الْقُلُوْبِ الصَّافِيَّةِ،

انجیل انسان کو اس مقام پر چھوڑ دیتی ہیں جو انسان کی پاکیزہ فطرت کی شہادت سے بہت دور ہے اور قوتِ غضبیہ اور قوتِ واہمہ کی افراط وتفریط کے دخل کے زیادہ قریب ہے یہاں تک کہ عقلمندوں کے نزدیک یہ بھی ممکن ہے کہ بعض مواقع پر انتقام لینے والے کو موذی بھیڑیے کا نام دیا جائے یا جو شخص بے موقع عفو سے کام لیتا ہے یا اپنے اہل کے فسق کو دیکھ کر چشم پوشی کرتا ہے ممکن ہے اسے اربابِ غیرت اور اہل حیا دیوث قرار دیں اس لئے تم بعض مواقع پر دیکھو گے کہ ایک شخص جو عفو کی تعلیم کو اچھا سمجھتا ہے وہ رحم اور عفو کی حقیقت کو چھوڑ دیتا ہے اور غیرتِ انسانی کی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے کیونکہ عقلمندوں کے نزدیک بے موقع عفو قابلِ تعریف نہیں اور نہ ہی تدبر کرنے والوں کے نزدیک انتقام ہر جگہ لائق تحسین ہے پس اس میں شک نہیں کہ جو شخص انجیل کی پیروی میں ہر جگہ اپنے نفس پر عفو کو لازم کر لیتا ہے تو گویا بعض حالات میں وہ احسان کو بے محل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے اور جو شخص تورات کی پیروی میں ہر جگہ انتقام کو ضروری قرار دیتا ہے تو وہ بعض اوقات بے موقع قصاص لینے کا فیصلہ کر دیتا ہے اور حسنات کی بلندیوں سے گر جاتا ہے لیکن قرآن کریم نے ان جگہوں میں اس شریعتِ فطریہ کی شہادت کی طرف رغبت دلائی ہے جو قوتِ قدسیہ کے چشمہ سے پھوٹتی ہے اور جبریل کی طرف سے

وَقَالَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ [1] فَانْظُرْ إِلٰى هٰذِهِ الدَّقِيْقَةِ الرُّوْحَانِيَّةِ، فَإِنَّهٗ أَمْرٌ بِالْعَفْوِ عَنِ الْجَرِيْمَةِ بِشَرْطِ أَنْ يَّتَحَقَّقَ فِيْهِ إِصْلَاحٌ لِّنَفْسٍ، وَإِلَّا فَجَزَاءُ السَّيِّئَةِ بِالسَّيِّئَةِ. وَلَمَّا كَانَ الْقُرْاٰنُ خَاتَمَ الْكُتُبِ وَأَكْمَلَهَا وَأَحْسَنَ الصُّحُفِ وَأَجْمَلَهَا، وَضَعَ أَسَاسَ التَّعْلِيْمِ عَلٰى مُنْتَهٰى مِعْرَاجِ الْكَمَالِ، وَجَعَلَ الشَّرِيْعَةَ الْفِطْرِيَّةَ زَوْجًا لِّلشَّرِيْعَةِ الْقَانُوْنِيَّةِ فِيْ كُلِّ الْأَحْوَالِ، لِيَعْصِمَ النَّاسَ مِنَ الضَّلَالِ، وَأَرَادَ أَنْ يَّجْعَلَ الْإِنْسَانَ كَالْمَيِّتِ لَا يَتَحَرَّكُ إِلَى الْيَمِيْنِ وَلَا إِلَى الشِّمَالِ، وَلَا يَقْدِرُ عَلٰى عَفْوٍ وَّلَا عَلَى انْتِقَامٍ إِلَّا بِحُكْمِ الْمَصْلِحَةِ مِنَ اللّٰهِ ذِي الْجَلَالِ.

(خطبہ الہامیہ، روحانی خزائن جلد ۱۶ صفحہ ۳۱۵، ۳۱۶)

پاک دل کی گہرائیوں میں اترتی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۔پس روحانی نکتہ پر غور کریں کیونکہ اس میں جرم کو معاف کرنے کا حکم ہے بشرطیکہ اس سے نفس کی اصلاح ہوتی ہو ورنہ برائی کا بدلہ برائی ہی ہے۔اور چونکہ قرآن کریم خاتم الکتب اور کامل کتاب اور خوبصورت اور بہترین صحیفہ ہے اس لئے اس نے اپنی تعلیم کی بنیاد انتہائی کمال پر رکھی ہے اور تمام حالات میں شریعتِ فطریہ کو شریعتِ قانونیہ کا جوڑا قرار دیا ہے تا لوگوں کو گمراہی سے بچائے اور اس نے چاہا کہ انسانی نفس کو ایک ایسے مردہ کی طرح کر دے جو دائیں بائیں حرکت نہیں کر سکتا اور نہ وہ خدائے ذوالجلال کے مصلحت آمیز حکم کے بغیر عفو یا انتقام پر قادر ہو سکتا ہے۔

(ترجمہ از مرتب)

ایک علم کا ذریعہ انسانی کانشنس بھی ہے جس کا نام خدا کی کتاب میں انسانی فطرت رکھا ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا یعنی خدا کی فطرت جس پر لوگ پیدا کئے گئے ہیں۔اور وہ نقش فطرت کیا ہے؟ یہی ہے کہ خدا کو واحد لاشریک، خالق الکل، مرنے اور پیدا ہونے سے پاک سمجھنا۔اور ہم کانشنس کو علم الیقین کے مرتبہ پر اس لئے کہتے ہیں کہ گو بظاہر اس میں ایک علم سے دوسرے علم کی طرف انتقال نہیں پایا جاتا جیسا کہ دھوئیں کے علم سے آگ کے علم کی طرف انتقال پایا جاتا ہے۔لیکن ایک قسم کے باریک انتقال سے یہ مرتبہ خالی نہیں ہے۔اور وہ یہ ہے کہ ہر ایک چیز میں خدا نے ایک نامعلوم خاصیت رکھی ہے جو بیان اور تقریر میں نہیں آ سکتی۔لیکن اس چیز پر نظر ڈالنے اور اس کا تصور کرنے سے

[1] الشوریٰ: ۴۱

بلاتوقف اس خاصیت کی طرف ذہن منتقل ہوجاتا ہے۔غرض وہ خاصیت اس وجود کوایسی لازم پڑی ہوتی ہے جیسا کہ آگ کو دھواں لازم ہے۔مثلاً جب ہم خدا تعالیٰ کی ذات کی طرف توجہ کرتے ہیں کہ کیسی ہونی چاہئے آیا خدا ایسا ہونا چاہئے کہ ہماری طرح پیدا ہو اور ہماری طرح دکھ اٹھاوے اور ہماری طرح مرے تو معاً اس تصور سے ہمارا دل دکھتا اور کانشنس کانپتا ہے اور اس قدر جوش دکھلاتا ہے کہ گویا اس خیال کو دھکے دیتا ہے اور بول اٹھتا ہے کہ وہ خدا جس کی طاقتوں پر تمام امیدوں کا مدار ہے۔وہ تمام نقصانوں سے پاک اور کامل اور قوی چاہئے اور جب ہی کہ خدا کا خیال ہمارے دل میں آتا ہے معاً توحید اور خدا میں دھوئیں اور آگ کی طرح بلکہ اس سے بہت زیادہ ملازمت تامہ کا احساس ہوتا ہے۔لہٰذا جو علم ہمیں ہمارے کانشنس کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے وہ علم الیقین کے مرتبہ میں داخل ہے۔لیکن اس پر ایک اور مرتبہ ہے جو عین الیقین کہلاتا ہے اور اس مرتبہ سے اس طور کا علم مراد ہے کہ جب ہمارے یقین اور اس چیز میں جس پر کسی نوع کا یقین کیا گیا ہے کوئی درمیانی واسطہ نہ ہو۔مثلاً جب ہم قوت شامہ کے ذریعہ سے ایک خوشبو یا بدبو کو معلوم کرتے ہیں اور یا ہم قوت ذائقہ کے ذریعہ سے شیریں یا نمکین پر اطلاع پاتے ہیں یا قوت حاسّہ کے ذریعہ سے گرم یا سرد کو معلوم کرتے ہیں تو یہ تمام معلومات ہمارے عین الیقین کی قسم میں داخل ہیں۔مگر عالم ثانی کے بارے میں ہمارا علم الٰہیات تب عین الیقین کی حد تک پہنچتا ہے کہ جب خود بلاواسطہ ہم الہام پاویں خدا کی آواز کو اپنے کانوں سے سنیں اور خدا کے صاف اور صحیح کشفوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ہم بے شک کامل معرفت کے حاصل کرنے کے لئے بلاواسطہ الہام کے محتاج ہیں اور اس کامل معرفت کی ہم اپنے دل میں بھوک اور پیاس بھی پاتے ہیں۔اگر خدا تعالیٰ نے ہمارے لئے پہلے سے اس معرفت کا سامان میسر نہیں کیا تو یہ پیاس اور بھوک ہمیں کیوں لگادی ہے۔کیا ہم اس زندگی میں جو ہماری آخرت کے ذخیرہ کے لئے یہی ایک پیمانہ ہے اس بات پر راضی ہو سکتے ہیں کہ ہم اس سچے اور کامل اور قادر اور زندہ خدا پر صرف قصوں اور کہانیوں کے رنگ میں ایمان لاویں یا محض عقلی معرفت پر کفایت کریں۔جو اب تک ناقص اور ناتمام معرفت ہے۔کیا خدا کے سچے عاشقوں اور حقیقی دلدادوں کا دل نہیں چاہتا کہ اس محبوب کے کلام سے لذت حاصل کریں؟ کیا جنہوں نے خدا کے لئے تمام دنیا کو برباد کیا، دل کو دیا، جان کو دیا، وہ اس بات پر راضی ہو سکتے ہیں کہ صرف ایک دھندلی سی روشنی میں کھڑے رہ کر مرتے رہیں اور اس آفتاب صداقت کا مُنہ نہ دیکھیں کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اُس زندہ خدا کا **انا الموجود** کہنا وہ معرفت کا مرتبہ عطا کرتا ہے کہ اگر دنیا کے تمام فلاسفروں کی خود تراشیدہ

کتابیں ایک طرف رکھیں اور ایک طرف انا الموجود خدا کا کہنا تو اس کے مقابل وہ تمام دفتر ہیچ ہیں جو فلاسفر کہلا کر اندھے رہے۔ وہ ہمیں کیا سکھائیں گے۔ غرض اگر خدا تعالیٰ نے حق کے طالبوں کو کامل معرفت دینے کا ارادہ فرمایا ہے تو ضرور اس نے اپنے مکالمہ اور مخاطبہ کا طریق کھلا رکھا ہے۔ اس بارے میں اللہ جل شانہ قرآن شریف میں یہ فرماتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحة :۶،۷)۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۴۳ تا ۴۴۷)

روح کا خدائے واحد لاشریک کا طلبگار رہنا اور بغیر خدا کے وصال کے کسی چیز میں سچی خوشحالی نہ پانا یہ انسانی فطرت میں داخل ہے یعنی خدا نے اس خواہش کو انسانی روح میں پیدا کر رکھا ہے جو انسانی روح کسی چیز سے تسلی اور سکینت بجز وصالِ الٰہی کے نہیں پا سکتی۔ پس اگر انسانی روح میں یہ خواہش موجود ہے تو ضرور ماننا پڑتا کہ روح خدا کی پیدا کردہ ہے جس نے اس میں یہ خواہش ڈال دی مگر یہ خواہش تو درحقیقت انسانی روح میں موجود ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسانی روح درحقیقت خدا کی پیدا کردہ ہے یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس قدر دو چیزوں میں کوئی ذاتی تعلق درمیان ہو اسی قدر ان میں اس تعلق کی وجہ سے محبت بھی پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ ماں کو اپنے بچہ سے محبت ہوتی ہے اور بچہ کو اپنی ماں سے کیونکہ وہ اس کے خون سے پیدا ہوا ہے اور اس کے رحم میں پرورش پائی ہے پس اگر روحوں کو خدا تعالیٰ کے ساتھ کوئی تعلق پیدائش کا درمیان نہیں اور وہ قدیم سے خود بخود ہیں تو عقل قبول نہیں کر سکتی کہ ان کی فطرت میں خدا تعالیٰ کی محبت ہو اور جب ان کی فطرت میں پرمیشر کی محبت نہیں تو وہ کسی طرح نجات پا ہی نہیں سکتیں۔ (چشمہ مسیحی، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۶۴)

(آیت فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا کے) معنی یہی ہیں کہ اسلام فطرتی مذہب ہے۔ انسان کی بناوٹ جس مذہب کو چاہتی ہے وہ اسلام ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اسلام میں بناوٹ نہیں ہے۔ اس کے تمام اصول فطرت انسانی کے موافق ہیں تثلیث اور کفارہ کی طرح نہیں ہیں جو سمجھ میں نہیں آسکتے۔ عیسائیوں نے خود مانا ہے کہ جہاں تثلیث نہیں گئی وہاں توحید کا مطالبہ ہوگا کیونکہ فطرت کے موافق توحید ہی ہے۔ اگر قرآن شریف نہ بھی ہوتا تب بھی انسانی فطرت توحید ہی کو مانتی کیونکہ وہ باطنی شریعت کے موافق ہے۔ ایسا ہی اسلام کی کل تعلیم باطنی شریعت کے موافق ہے برخلاف عیسائیوں کی تعلیم کے جو مخالف ہے۔ دیکھو حال ہی میں امریکہ میں طلاق کا قانون خلاف انجیل پاس کرنا پڑا۔ یہ دقت کیوں پیش آئی اس لئے کہ انجیل کی تعلیم فطرت کے موافق نہ تھی۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

فطر کے معنے پھاڑنے کے ہیں اور فطرت سے یہ مراد ہے کہ انسان خاص طور پر پھاڑا گیا ہے۔ جب آسمان سے قوت آتی ہے تو نیک قوتیں پھٹنی شروع کر دیتی ہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ رفروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَ اتَّقُوْهُ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۲﴾

تفسیر حسینی میں زیر تفسیر آیت وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ لکھا ہے کہ کتاب تیسیر میں شیخ محمد ابن اسلم طوسی سے نقل کیا ہے کہ ایک حدیث مجھے پہنچی ہے کہ آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ ’’جو کچھ مجھ سے روایت کرو پہلے کتاب اللہ پر عرض کرلو اگر وہ حدیث کتاب اللہ کے موافق ہو تو وہ حدیث میری طرف سے ہوگی ورنہ نہیں‘‘۔سو میں نے اس حدیث کو کہ مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ قرآن سے مطابق کرنا چاہا اور تیس سال اس بارہ میں فکر کرتا رہا مجھے یہ آیت ملی وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔

(الحق مباحثہ لدھیانہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۴۰)

قرآن مجید نے خود حدیث کو اپنا خادم ومفسر قرار دیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں بعض احکام ایسے طور پر بیان کئے ہیں کہ وہ بلا تفصیل صاحبِ حدیث صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی مسلمان مخاطب قرآن کی سمجھ میں نہ آتے اور نہ وہ دستور العمل ٹھہرائے جاسکتے۔ ایک حکم نماز ہی کو دیکھ لو قرآن میں اس کی نسبت صرف یہ ارشاد ہے اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اور کہیں اس کی تفسیر نہیں ہے کہ نماز کیوں کر قائم کی جائے۔ صاحب الحدیث آنحضرت صلعم (بِاَبِیْ ھُوَ وَ اُمِّیْ) نے قولی وفعلی حدیثوں سے بتایا کہ نماز یوں پڑھی جاتی ہے تو وہ حکمِ قرآن سمجھ وعمل میں آیا۔ (الحق مباحثہ لدھیانہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۵۵)

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنا قانونِ قدرت یہ بتلاتا ہے کہ انسان کی زندگی میں صرف چار واقعات ہیں۔ پہلے وہ پیدا کیا جاتا ہے پھر تکمیل اور تربیت کے لئے روحانی اور جسمانی طور پر رزقِ مقسوم اسے ملتا ہے۔ پھر اس پر موت وارد ہوتی ہے پھر وہ زندہ کیا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان آیات میں کوئی ایسا کلمہ استثنائی نہیں

جس کی رو سے مسیح کے واقعاتِ خاصہ باہر رکھے گئے ہوں حالانکہ قرآن کریم اول سے آخر تک یہ التزام رکھتا ہے کہ اگر کسی واقعہ کے ذکر کرنے کے وقت کوئی فردِ بشر باہر نکالنے کے لائق ہو تو فی الفور اس قاعدہ کلیہ سے اس کو باہر نکال لیتا ہے یا اس کے واقعاتِ خاصہ بیان کر دیتا ہے۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۳۴)

اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں رزق دیا پھر تمہیں مارے گا پھر زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے معبودوں میں سے جو انسانوں میں سے ہیں کوئی ایسا کرسکتا ہے۔ پاک ہے خدا ان بہتانوں سے جو مشرک لوگ اس پر لگا رہے ہیں۔ (جنگِ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۶۸)

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۲﴾

وہ رسول اس وقت آیا کہ جب جنگل اور دریا میں فساد ظاہر ہو گیا یعنی تمام روئے زمین پر ظلمت اور ضلالت پھیل گئی اور کیا اُمّی لوگ اور کیا اہل کتاب اور اہلِ علم سب کے سب بگڑ گئے اور کوئی حق پر قائم نہ رہا اور یہ سب فساد اس لئے ہوا کہ لوگوں کے دلوں سے خلوص اور صدق اُٹھ گیا اور ان کے اعمال خدا کے لئے نہ رہے بلکہ ان میں بہت سا خلل واقع ہو گیا اور وہ سب رو بدنیا ہو گئے اور رو بحق نہ رہے اس لئے امدادِ الٰہی ان سے منقطع ہو گئی سو خدا نے اپنی حجت پوری کرنے کے لئے ان کے لئے اپنا رسول بھیجا تا ان کو ان کے بعض عملوں کا مزہ چکھا دے اور تا ایسا ہو کہ وہ رجوع کریں۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۳۳، ۶۳۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ تھا کہ میں تمام قوموں کے لئے آیا ہوں سو قرآن شریف نے تمام قوموں کو ملزم کیا ہے کہ وہ طرح طرح کے شرک اور فسق اور فجور میں مبتلا ہیں جیسا کہ وہ فرماتا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ یعنی دریا بھی بگڑ گئے اور جنگل بھی بگڑ گئے۔ (نور القرآن نمبر ۱، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۳۳۶)

ہمارے سید و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت میں مبعوث ہوئے تھے جبکہ دنیا ہر ایک پہلو سے خراب اور تباہ ہو چکی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ یعنی جنگل بھی بگڑ گئے اور دریا بھی بگڑ گئے۔ یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جو اہل کتاب کہلاتے ہیں وہ بھی بگڑ گئے اور جو دوسرے لوگ ہیں جن کو الہام کا پانی نہیں ملا وہ بھی بگڑ گئے۔ پس قرآن شریف کا کام دراصل

مردوں کو زندہ کرنا تھا۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۲۸)

یہ بات ہر ایک عقلِ سلیم قبول کر لے گی کہ کمال اصلاح کی نوبت کمال فساد کے بعد آتی ہے۔ طبیب کا یہ کام نہیں کہ وہ چنگے بھلے لوگوں کو وہ دوائیں دے جو عین بیماری کے غلبہ کے وقت دینی چاہئیں اسی لئے قرآن شریف نے پہلے یہ بیان کر دیا کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی تمام دنیا میں فساد پھیل گیا اور ہر ایک قسم کے گناہ اور معاصی کا طوفان برپا ہو گیا اور پھر ہر ایک بدعقیدگی اور بدعملی کے بارے میں مکمل ہدایتیں پیش کر کے فرمایا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (المائدۃ : ۴) یعنی آج میں نے تمہارا دین کامل مکمل کر دیا۔ مگر کسی پہلے زمانہ میں جس میں ابھی طوفانِ ضلالت بھی جوش میں نہیں آیا تھا مکمل کتاب کیوں کر انسانوں کو مل سکتی ہے۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۴۷، ۱۴۸)

پادری فنڈل صاحب مصنف میزان الحق جو عیسائی مذہب کا سخت حامی ایک یورپین انگریز ہے وہ اپنی کتاب میزان الحق میں لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں سب قوموں سے زیادہ بگڑی ہوئی عیسائی قوم تھی اور ان کی بدچلنیاں عیسائی مذہب کی عار اور ننگ کا موجب تھیں اور خود قرآن شریف بھی اپنے نزول کی ضرورت کے لئے یہ آیت پیش کرتا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی جنگل بھی بگڑ گئے اور دریا بھی بگڑ گئے۔ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ کوئی قوم خواہ وحشیانہ حالت رکھتی ہیں اور خواہ عقلمندی کا دعویٰ کرتی ہیں فساد سے خالی نہیں ہیں۔ (پیغام صلح، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۴۶۲)

یہ امتِ مرحومہ ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوئی ہے کہ جس کے لئے آفات پیدا ہونے لگی ہیں۔ انسان کی حرکت گناہوں اور معاصی کی طرف ایسی ہے جیسے کہ ایک پتھر نیچے کو چلا جاتا ہے۔ اُمت مرحومہ اس لئے کہلاتی ہے کہ معاصی کا زور ہو گیا جیسے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ اور دوسری جگہ فرمایا يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (الروم : ۲۰)۔ ان سب آیات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے دو نقشے دکھائے ہیں۔ اول الذکر میں تو اس زمانہ کا جبکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت بھی چونکہ دنیا کی حالت بہت ہی قابلِ رحم ہو گئی تھی۔ اخلاق، اعمال، عقائد سب کا نام ونشان اُٹھ گیا تھا۔ اس لئے اس امت کو مرحومہ کہا گیا کیونکہ اس وقت بڑے ہی رحم کی ضرورت تھی اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (الانبیاء : ۱۰۸)

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۶، ۱۴۷)

قرآن شریف جس وقت نازل ہوا ہے کیا اس وقت نظامِ روحانی یہ نہیں چاہتا تھا کہ خدا کا کلام نازل ہو اور کوئی مرد آسمانی آوے جو اس گم شدہ متاع کو واپس دلائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ بعثت کی تاریخ پڑھو تو معلوم ہو جاوے گا کہ دنیا کہ کیا حالت تھی۔ خدا تعالیٰ کی پرستش دنیا سے اُٹھ گئی تھی اور توحید کا نقشِ پا مٹ چکا تھا۔ باطل پرستی اور معبودانِ باطلہ کی پرستش نے اللہ جلشانہ کی جگہ لے رکھی تھی۔ دنیا پر جہالت اور ظلمت کا ایک خوفناک پردہ چھایا ہوا تھا۔ دنیا کے تختہ پر کوئی ملک، کوئی قطعہ، کوئی سرزمین ایسی نہ رہ گئی تھی جہاں خدائے واحد ہاں حی و قیوم خدا کی پرستش ہوتی ہو۔ عیسائیوں کی مردہ پرست قوم تثلیث کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی اور ویدوں میں توحید کا بیجا دعویٰ کرنے والے ہندوستان کے رہنے والے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کے پجاری تھے۔ غرض خود خدا تعالیٰ نے جو نقشہ اس وقت کی حالت کا ان الفاظ میں کھینچا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یہ بالکل سچا ہے اور اس سے بہتر انسانی زبان اور قلم اس حالت کو بیان نہیں کر سکتی۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۰/جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

ہمارے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ..... اعتقادی اور عملی حالت بالکل خراب ہو گئی تھی اور نہ صرف عرب کی بلکہ کل دنیا کی حالت بگڑ چکی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ اس فسادِ عظیم کے وقت خدا تعالیٰ نے اپنے کامل اور پاک بندہ کو مامور کر کے بھیجا جس کے سبب سے تھوڑی ہی مدت میں ایک عجیب تبدیلی واقع ہو گئی۔ مخلوق پرستی کی بجائے خدا تعالیٰ پوجا گیا بد اعمالیوں کی بجائے اعمالِ صالحہ نظر آنے لگے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷/اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

دریا بھی بگڑ گئے اور جنگل بھی بگڑ گئے۔ دریاؤں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو پانی دیا گیا یعنی شریعت اور کتاب اللہ ملی اور جنگل سے مراد وہ ہیں جن کو اس سے حصہ نہیں ملا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ کتاب بھی بگڑ گئے اور مشرک بھی۔ الغرض آپ کا زمانہ ایسا زمانہ تھا کہ دنیا میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷/مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

جو تقویٰ اختیار کرتا ہے وہ ہمارے ساتھ ہی ہے خواہ اس نے ہماری دعوت سنی ہو یا نہ سنی ہو کیونکہ یہی غرض ہے ہماری بعثت کی۔ اس وقت تقویٰ عنقا یا کبریت کی طرح ہو گیا ہے۔ کسی کام میں خلوص نہیں رہا بلکہ ملونی ملی ہوئی ہے۔ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس ملونی کو جلا کر خلوص پیدا کرو۔ اس وقت ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ کا نمونہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت یورپ اور دیگر ممالک کی بگڑی ہوئی حالتوں کا علم نہ تھا

خدا تعالیٰ کی وحی پر ایمان تھا اور اب عرفان کی حالت پیدا ہوگئی ہے جو چاہے ان ممالک میں جا کر دیکھ لے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲ مورخہ ۱۷؍جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰،۱۱)

اس وقت لوگ روحانی پانی کو چاہتے ہیں۔ زمین بالکل مرچکی ہے۔ یہ زمانہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ کا ہوگیا ہے۔ جنگل اور سمندر بگڑ چکے ہیں۔ جنگل سے مراد مشرک لوگ اور بحر سے مراد اہلِ کتاب ہیں۔ جاہل و عالم بھی مراد ہوسکتے ہیں۔ غرض انسانوں کے ہر طبقہ میں فساد واقع ہوگیا ہے جس پہلو اور جس رنگ میں دیکھو دنیا کی حالت بدل گئی ہے۔ روحانیت باقی نہیں رہی اور نہ اس کی تاثیریں نظر آتی ہیں اخلاقی اور عملی کمزوریوں میں ہر چھوٹا بڑا مبتلا ہے۔ خدا پرستی اور خدا شناسی کا نام ونشان مٹا ہوا نظر آتا ہے اس لئے اس وقت ضرورت ہے کہ آسمانی پانی اور نورِ نبوت کا نزول ہو اور مستعد دلوں کو روشنی بخشے۔ خدا تعالیٰ کا شکر کرو۔ اس نے اپنے فضل سے اس وقت اس نور کو نازل کیا ہے مگر تھوڑے ہیں جو اس نور سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱؍مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں آنا اور پھر وہاں سے رخصت ہونا قطعی دلیل آپ کی نبوت پر ہے۔ آئے آپ اس وقت جبکہ زمانہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ کا مصداق تھا اور ضرورت ایک نبی کی تھی۔ ضرورت پر آنا بھی ایک دلیل ہے اور آپ اس وقت دنیا سے رخصت ہوئے جب اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ (النصر : ۲) کا آوازہ دیا گیا اس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آپ کس قدر عظیم الشان کامیابی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۷؍جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

آنحضرتؐ کی آمد اس وقت ہوئی کہ زمانہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ کا مصداق تھا اور گئے اس وقت جبکہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ (النصر : ۲) کی سند آپ کو مل گئی۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۴؍ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۵۷)

صحابہ کرامؓ سارے ہی باخدا اور عاقل تھے مگر آنحضرت ان سے بڑھ کر ایسے وفادار تھے کہ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا اس لئے آپ کو سانپوں اور درندوں اور خاردار کانٹوں والا جنگل اس کے درندے، حیوانات، انسانی شکل میں دکھلائے گئے۔ پھر ملک بھی ایسا اس کے سپرد کیا کہ جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی شریر النفس نہ تھا۔ پھر آئے ایسے وقت پر کہ تمام مردہ اور فساد کی جڑھ تھے جیسے فرمایا ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ اور گئے ایسے وقت پر کہ فرمایا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (المائدۃ : ۴) اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ

وَ الْفَتْحُ (النصر : ۲)۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸، ۳۹ مورخہ ۱۰ تا ۱۷/ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۸)

میں جانتا ہوں کہ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش قسمتی ثابت ہوتی ہے اور کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں۔ امورِ رسالت میں یہ کامیابی اور سعادت کسی اور کو نہیں ملی۔ آپ کی آمد کا وہ وقت تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے خود ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ سے بیان کیا ہے یعنی نہ خشکی میں امن تھا نہ تری میں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب سب بگڑ چکے تھے اور قسم قسم کے فساد اور خرابیاں ان میں پھیلی ہوئی تھیں۔ گویا زمانہ کی حالت بالطبع تقاضا کرتی تھی کہ اس وقت ایک زبردست ہادی اور مصلح پیدا ہو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مبعوث فرمایا اور پھر آپؐ ایسے وقت دنیا سے رخصت ہوئے جب آپ کو یہ آواز آ گئی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدۃ : ۴) یہ آواز کسی اور نبی اور رسول کو نہیں آئی۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۴۳ مورخہ ۱۰/ دسمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

آپ کے متعلق ایک ایسا نکتہ ہے جو آپ کی عظمت کو اور بھی بڑھا دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ ایسے وقت تشریف لائے جبکہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ کا وقت تھا یعنی اہلِ کتاب بھی بگڑ چکے تھے اور غیر اہلِ کتاب بھی بگڑے ہوئے تھے اور یہ بات مخالفوں کی تصدیق سے بھی ثابت ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۷ مورخہ ۳۱/ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

آنحضرت اس وقت مبعوث ہوئے تھے جب فسق و فجور، شرک اور بت پرستی اپنے انتہاء کو پہنچ چکی تھی اور ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ والا معاملہ ہو رہا تھا اور گئے اس وقت تھے جب وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (النصر : ۳) والا نظارہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا تھا اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کی نظیر تمام دنیا میں نہیں پائی جاتی اور یہی تو کاملیت ہے کہ جس مقصود کے لئے آئے تھے اس کو پورا کر کے دکھا دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو صلیب کا ہی منہ دیکھتے پھرے اور یہودیوں سے رہائی نہ پا سکے مگر ہمارے نبی کریم صلعم نے غالب ہو کر وہ اخلاق دکھائے جن کی نظیر نہیں۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱/ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

قرآن (مجید) ایک ایسی پاک کتاب ہے جو اس وقت دنیا میں آئی تھی جب کہ بڑے بڑے فساد پھیلے ہوئے تھے اور بہت سی اعتقادی اور عملی غلطیاں رائج ہو گئی تھیں اور تقریباً سب کے سب لوگ بداعمالیوں اور بدعقیدگیوں میں گرفتار تھے اسی کی طرف اللہ جل شانہ قرآن مجید میں اشارہ فرماتا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ

وَ الْبَحْرِ یعنی تمام لوگ کیا اہلِ کتاب اور کیا دوسرے سب کے سب بدعقیدگیوں میں مبتلا تھے اور دنیا میں فسادِ عظیم برپا تھا۔ غرض ایسے زمانہ میں خدا تعالیٰ نے تمام عقائدِ باطلہ کی تردید کے لئے قرآنِ مجید جیسی کامل کتاب ہماری ہدایت کے لئے بھیجی جس میں کُل مذاہب باطلہ کا رد موجود ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱ مورخہ ۲؍جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ یعنی دریا بھی بگڑ گئے اور خشک زمین بھی بگڑ گئی مطلب یہ کہ جس قوم کے ہاتھ میں کتابِ آسمانی تھی وہ بھی بگڑ گئی اور جن کے ہاتھ میں کتاب آسمانی نہیں تھی اور خشک جنگل کی طرح تھے وہ بھی بگڑ گئے اور یہ امر ایک ایسا سچا واقعہ ہے کہ ہر ایک ملک کی تاریخ اس پر گواہ ناطق ہے۔ کیا آریہ ورت کے دانا مورخ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ آنجناب کے ظہور کا زمانہ درحقیقت ایسا ہی تھا اور بت خانوں کو اس قدر عزت دی گئی تھی کہ گویا وید کا اصل مذہب یہی ہے۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۷۹، ۳۸۰)

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ۝۴۳

کہہ زمین پر سیر کرو پھر دیکھو کہ جو تم سے پہلے کافر اور سرکش گزر چکے ہیں ان کا کیا انجام ہوا اور اکثر ان میں سے مشرک ہی تھے۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۳۴)

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۸

اور ہم نے تجھ سے پہلے کئی پیغمبران کی قوم کی طرف بھیجے اور وہ بھی روشن نشان لائے۔ پس آخر ہم نے ان مجرم لوگوں سے بدلہ لیا جنہوں نے ان نبیوں کو قبول نہیں کیا تھا اور ابتدا سے یہی مقرر ہے کہ مومنوں کی مدد کرنا ہم پر ایک حق لازم ہے یعنی قدیم سے عادتِ الٰہیہ اسی طرح پر جاری ہے کہ سچے نبی ضائع نہیں چھوڑے جاتے اور ان کی جماعت متفرق اور پراگندہ نہیں ہوتی بلکہ ان کو مدد ملتی ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۱ حاشیہ نمبر ۱۱)

یعنی ہم جو ابتدا سے مومنوں کے لئے نصرت اور مدد کا وعدہ دے چکے ہیں اس لئے ہم اپنے پر یہ حق ٹھہراتے ہیں کہ ان کی مدد کریں ورنہ دوسرا شخص اس پر کوئی حق نہیں ٹھہرا سکتا۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۴، ۳۵)

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝۴۹ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِیْنَ ۝۵۰ فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰى ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۵۱

خدائے تعالیٰ وہ ذاتِ کریم و رحیم ہے کہ جو بر وقتِ ضرورت ایسی ہوائیں چلاتا ہے جو بدلی کو اُبھارتی ہیں پھر خدائے تعالیٰ اس بدلی کو جس طرح چاہتا ہے آسمان میں پھیلا دیتا ہے اور اس کو تہہ بہ تہہ رکھتا ہے پھر تو دیکھتا ہے کہ اس کے بیچ میں سے مینہ نکلتا ہے پھر جن بندوں کو اپنے بندوں میں سے اس مینہ کا پانی پہنچاتا ہے تو وہ خوش وقت ہو جاتے ہیں اور ناگہانی طور پر خدا ان کے غم کو خوشی کے ساتھ مبدل کر دیتا ہے اور مینہ کے اترنے سے پہلے ان کو بباعث نہایت سختی کے کچھ امید باقی نہیں رہتی پھر یک دفعہ خدائے تعالیٰ ان کی دستگیری فرماتا ہے یعنی ایسے وقت میں بارانِ رحمت نازل ہوتا ہے جب لوگوں کے دل ٹوٹ جاتے ہیں اور مینہ برسنے کی کوئی امید باقی نہیں رہتی اور پھر فرمایا کہ تو خدا کی رحمت کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھ اور اس کی رحمت کی نشانیوں پر غور کر کہ وہ کیوں کر زمین کو اس کے مرنے کے پیچھے زندہ کرتا ہے بیشک وہی خدا ہے جس کی یہ بھی عادت ہے کہ جب لوگ روحانی طور پر مر جاتے ہیں اور سختی اپنی نہایت کو پہنچ جاتی ہے تو اسی طرح وہ ان کو بھی زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر اور توانا ہے۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۲۷ تا ۵۲۹)

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ۝۵۵

خدا وہ خدا ہے جس نے تمہیں ضعف سے پیدا کیا پھر ضعف کے بعد قوت دے دی پھر قوت کے بعد

ضعف اور پیرانہ سالی دی ۔ یہ آیت بھی صریح طور پر اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ کوئی انسان اس قانونِ قدرت سے باہر نہیں اور ہر یک مخلوق اس محیط قانون میں داخل ہے کہ زمانہ اس کی عمر پر اثر کر رہا ہے یہاں تک کہ تاثیر زمانہ..... سے وہ پیر فرتوت بن جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۲۹، ۴۳۰)

یہ آیت تمام انسانوں کے لئے ہے یہاں تک کہ تمام انبیاء علیہم السلام اس میں داخل ہیں اور خود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو نبیوں کے سردار ہیں وہ بھی اس سے باہر نہیں آپ پر بھی پیرانہ سالی کے علامات ظاہر ہو گئے تھے اور چند بال سفید ریش مبارک میں آ گئے تھے اور آپ خود اپنی آخری عمر میں آثار پیرانہ سالی کے ضعف کے اپنے اندر محسوس کرتے تھے لیکن بقول ہمارے مخالفین کے حضرت عیسیٰ اس سے بھی باہر ہیں وہ کہتے کہ یہ ایک خصوصیت ان کی ہے جو فوق العادت ہے اور یہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدائی پر ایک دلیل ہے۔ (براہینِ احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۳۹۵)

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تفسیر سورۃ لقمان

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۴﴾

خدا کے ساتھ کسی دوسری چیز کو ہرگز شریک مت ٹھہراؤ۔ خدا کا شریک ٹھہرانا سخت ظلم ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۲۱ حاشیہ)

شرک تین قسم کا ہے اول یہ کہ عام طور پر بت پرستی، درخت پرستی وغیرہ کی جاوے۔ یہ سب سے عام اور موٹی قسم کا شرک ہے دوسری قسم شرک کی یہ ہے کہ اسباب پر حد سے زیادہ بھروسہ کیا جاوے کہ فلاں کام نہ ہوتا تو میں ہلاک ہو جاتا یہ بھی شرک ہے تیسری قسم شرک کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے وجود کے سامنے اپنے وجود کو بھی کوئی شے سمجھا جاوے۔ موٹے شرک میں تو آج کل اس روشنی اور عقل کے زمانہ میں کوئی گرفتار نہیں ہوتا البتہ اس مادی ترقی کے زمانہ میں شرک فی الاسباب بہت بڑھ گیا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱؍مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود و کارساز جاننا ایک ناقابل عفو گناہ ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ۔ یہاں شرک سے یہی مراد نہیں کہ پتھروں وغیرہ کی پرستش کی جاوے بلکہ یہ ایک

شرک ہے کہ اسباب کی پرستش کی جاوے اور معبوداتِ دنیا پر زور دیا جاوے اسی کا نام ہی شرک ہے۔ اور معاصی کی مثال تو حقہ کی سی ہے کہ اس کے چھوڑ دینے سے کوئی دقت و مشکل کی بات نظر نہیں آتی مگر شرک کی مثال افیم کی سی ہے کہ وہ عادت ہو جاتی ہے جس کا چھوڑنا محال ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۴ مورخہ ۳۰؍جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

یاد رکھو شرک کی کئی قسمیں ہوتی ہیں ان میں سے ایک شرکِ جلی کہلاتا ہے دوسرا شرکِ خفی۔ شرکِ جلی کی مثال تو عام طور پر یہی ہے جیسے یہ بت پرست لوگ بتوں، درختوں یا اور اشیاء کو معبود سمجھتے ہیں اور شرکِ خفی یہ ہے کہ انسان کسی شے کی تعظیم اسی طرح کرے جس طرح اللہ تعالیٰ کی کرتا ہے یا کرنی چاہیے یا کسی شے سے اللہ تعالیٰ کی طرح محبت کرے یا اس سے خوف کرے یا اس پر توکل کرے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷؍نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۷)

وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ۫ وَّ اتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

اگر تجھے اس بات کی طرف بہکاویں کہ تو میرے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہراوے تو ان کا کہا مت مان۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۲۱ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

وَ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿۱۹﴾

اسلام ایک وسیع مذہب ہے اس میں اسلام کا مدار نیات پر رکھتا ہے۔ بدر کی لڑائی میں ایک شخص میدانِ جنگ میں نکلا جو اترا کر چلتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو یہ چال بہت بری ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا مگر اس وقت یہ چال خدا تعالیٰ کو بہت ہی پسند ہے کیونکہ یہ اس کی راہ میں اپنی جان تک نثار کرتا ہے اور اس کی نیت اعلیٰ درجہ کی ہے۔

غرض اگر نیت کا لحاظ نہ رکھا جائے تو بہت مشکل پڑتی ہے۔ اسی طرح پر ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ جن کا تہ بند نیچے ڈھلکتا ہے وہ دوزخ میں جاویں گے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو پڑے کیونکہ ان کا تہ بند بھی ویسا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تو ان میں سے نہیں ہے۔ غرض نیت کو بہت بڑا دخل ہے اور حفظِ مراتب ضروری شے ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۴ رمئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

وَ اقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَ اغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴿۲۰﴾

ہمارا مطلب و مدعا یہ ہے کہ ایسے امور کی موشگافی اور تہ بینی کی امید سے اپنی عقلوں اور فکروں کو آوارہ مت کرو جو تمہاری بساط سے باہر ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ بہتیرے ایسے لوگ ہیں کہ ناجائز فکروں میں پڑ کر اپنی اس معین اور مقرر وسعت سے جو قدرت نے ان کو دے رکھی ہے باہر چلے جاتے ہیں اور اپنی محدود عقل سے کل کائنات کے عمیق در عمیق رازوں کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ سو یہ افراط ہے جیسے بکلی تحقیق و تفتیش سے منہ پھیر لینا تفریط ہے۔ اللہ جل شانہ فرماتا ہے وَ اقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ یعنی اپنی چال میں توسط اختیار کر۔ نہ ایسا فکر کو منجمد کر لینا چاہیے کہ جو ہزارہا نکات و لطائف الٰہیات قابلِ دریافت ہیں ان کی تحصیل سے محروم رہ جائیں اور نہ اس قدر تیزی کرنی چاہیے کہ ان فکروں میں پڑ جائیں کہ خدائے تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے اور یا اس نے اس قدر ارواح اور اجسام کس طرح بنا لئے ہیں اور یا اُس نے کیوں کر اکیلا ہونے کی حالت میں اس قدر وسیع عالم بنا ڈالا ہے۔ (سرمہ چشم آریہ، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۱۶۶، ۱۶۷)

خود نبی صلعم نے بوحی الٰہی استنباط احکامِ قرآن کر کے قرآن ہی سے یہ مسائل زائدہ لئے ہیں جس حالت میں قرآن کریم صاف ظاہر کرتا ہے کہ کل خبائث حرام کئے گئے تو کیا آپ کے نزدیک درندے اور گدھے طیبات میں سے ہیں؟ جن کے حرام کرنے کے لئے کسی حدیث کی واقعی طور پر ضرورت تھی۔ گدھے کی مذمت خود اللہ جل شانہ فرماتا ہے اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ۔ پھر جو اس کی نظر میں کسی وجہ سے منکر اور مکروہ اور خبائث میں داخل ہے وہ کس طرح حلال ہو جاتا؟ اور تمام درندے بدبو سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ چڑیا گھر میں جا کر دیکھو کہ شیر اور بھیڑیا اور چیتا وغیرہ اس قدر بدبو رکھتے ہیں کہ پاس کھڑا ہونا مشکل ہوتا ہے۔ پھر اگر یہ خبائث میں داخل نہیں ہیں تو اور کیا ہیں؟

(الحق مباحثہ لدھیانہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۱۰۶)

نہ بہت اونچا بولا کرو نہ بہت نیچا درمیان کو نگاہ رکھو یعنی باستثناء وقتِ ضرورت کے چلنے میں بھی نہ بہت تیز چلو اور نہ بہت آہستہ۔ درمیان کو نگاہ رکھو۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۷)

اِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ ۚ وَ يُنَزِّلُ الۡغَيۡثَ ۚ وَ يَعۡلَمُ مَا فِى الۡاَرۡحَامِ ؕ وَ مَا تَدۡرِىۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَكۡسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدۡرِىۡ نَفۡسٌۢ بِاَىِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ خَبِيۡرٌ ﴿۳۵﴾

ایک آریہ صاحب نے.... بصورت اعتراض پیش کیا تھا کہ لڑکا لڑکی کے پیدا ہونے کی شناخت دائیوں کو بھی ہوتی ہے یعنی دائیاں بھی معلوم کر سکتی ہیں کہ لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی۔ واضح رہے کہ ایسا اعتراض کرنا معترض صاحب کی سراسر حیلہ سازی وحق پوشی ہے کیونکہ اول تو کوئی دائی ایسا دعویٰ نہیں کر سکتی بلکہ ایک حاذق طبیب بھی ایسا دعویٰ ہرگز نہیں کر سکتا کہ اس امر میں میری رائے قطعی اور یقینی ہے جس میں تخلف کا امکان نہیں صرف ایک اٹکل ہوتی ہے کہ جو بارہا خطا جاتی ہے۔ (مجموعہ اشتہارات جلد اول صفحہ ۹۹)

(عِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ پر حضرت اقدسؑ نے فرمایا۔)

یہ بات واقعی ہے اور قرآن کریم سے بھی ثابت ہے کہ ساعت سے اس جگہ مراد یہودیوں کی تباہی کا زمانہ ہے۔ وہ وہی زمانہ تھا اور جس ساعت کے یہ لوگ منتظر ہیں اس کا تو ابھی تک کہیں پتہ بھی نہیں ہے۔ ایک پہلو سے اول مسیحؑ کے وقت یہودیوں نے بدبختی لے لی اور دوسرے وقت میں نصاریٰ نے بدبختی کا حصہ لے لیا۔ مسلمانوں نے بھی پوری مشابہت یہود سے کر لی۔ اگر ان کی سلطنت یا اختیار ہوتا تو ہمارے ساتھ بھی مسیحؑ والا معاملہ کرتے۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تفسیر سورۃ السَّجدۃ

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗۤ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۶﴾

وَإِنَّ زَمَانَ خَلْقِي أَلْفٌ سَادِسٌ لَا رَيْبَ فِيْهِ، فَاسْأَلِ الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ. وَنَطَقَ بِهِ التَّوْرَاةُ الَّتِيْ يُؤْمِنُ بِهَا الْمُسْلِمُوْنَ، وَلَمْ يَثْبُتْ بِنُصُوْصٍ صَرِيْحَةٍ مَا يُخَالِفُ هٰذِهِ الْعِدَّةَ وَيَعْلَمُهُ الْعَالِمُوْنَ. فَمَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَّكْفُرُوْا بِعِدَّةِ التَّوْرَاةِ وَمَا قَالَ النَّبِيُّوْنَ. وَكَيْفَ وَمَا خَالَفَهُ الْقُرْاٰنُ بَلْ صَدَّقَهٗ سُوْرَةُ الْعَصْرِ فَأَيْنَ يَفِرُّوْنَ؟ بَلْ إِلَيْهِ يُشِيْرُ قَوْلُهٗ تَعَالٰى "يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ

لاریب میری پیدائش کا زمانہ چھٹا ہزار ہے پس تو اہل علم لوگوں سے دریافت کرلے اور تورات نے بھی جس پر مسلمان ایمان رکھتے ہیں یہی بیان کیا ہے اور نصوصِ صریحہ سے اس گنتی کے خلاف کوئی بات ثابت نہیں اور اہلِ علم اسے خوب جانتے ہیں۔ پس ان کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ تورات کی گنتی اور انبیاء کے بیان کا انکار کریں اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ خود قرآن کریم نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ سورۃ العصر نے اس کی تصدیق کر دی ہے پس وہ اس حقیقت سے بھاگ کر کہاں جا سکتے ہیں بلکہ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ قول اشارہ کرتا ہے کہ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ

السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ‘‘ وَاقْرَؤُوْا مَعَهَا اٰيَةَ ’’اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ‘‘. هٰذِهٖ اٰيَةٌ كَتَبْنَاهَا مِنْ سُوْرَةِ السَّجْدَةِ، وَمِنَ السُّنَّةِ أَنَّهَا تُقْرَأُ فِيْ صَلٰوةِ الْفَجْرِ مِنَ الْجُمُعَةِ، وَإِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَقُوْلُ فِيْ هٰذِهِ السُّوْرَةِ إِنَّهٗ دَبَّرَ أَمْرَ الشَّرِيْعَةِ بِإِنْزَالِ الْفُرْقَانِ الْحَمِيْدِ، وَأَكْمَلَ لِلنَّاسِ دِيْنَهُمْ بِالْكَلَامِ الْمَجِيْدِ، ثُمَّ يَأْتِيْ بَعْدَ ذَالِكَ زَمَانٌ تَمْتَدُّ ضَلَالَتُهٗ إِلٰى أَلْفِ سَنَةٍ، وَيُرْفَعُ كِتَابُ اللّٰهِ إِلَيْهِ وَيَعْرُجُ إِلَى اللّٰهِ أَمْرُهٗ بِشِقَّيْهِ، يَعْنِيْ يُضَاعُ فِيْهِ حَقُّ اللّٰهِ وَحَقُّ الْعِبَادِ، وَتَهُبُّ صَرَاصِرُ الْفَسَادِ عَلٰى قِسْمَيْهِ، وَيَفْشُو الْكَذِبُ وَالْفِرْيَةُ، يَعْنِي الْفِتَنَ الدَّجَّالِيَّةَ، وَيَظْهَرُ الْفِسْقُ وَالْكُفْرُ وَالشِّرْكُ، وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُعْرِضِيْنَ عَنْ رَّبِّهِمْ وَظٰهِرِيْنَ عَلَيْهِ. ثُمَّ يَأْتِيْ بَعْدَ ذَالِكَ أَلْفٌ اٰخَرُ يُغَاثُ فِيْهِ النَّاسُ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَيُرْسَلُ اٰدَمُ اٰخِرِ الزَّمَانِ لِيُجَدِّدَ الدِّيْنَ، وَإِلَيْهِ أَشَارَ فِيْ اٰيَةٍ هِيَ بَعْدَ هٰذِهِ الْاٰيَةِ أَعْنِيْ قَوْلَهٗ ’’وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ‘‘.[1] وَإِنَّ هٰذَا الْإِنْسَانَ هُوَ

فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ اور اس کے ساتھ آیتِ قرآنیہ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ بھی پڑھو۔ یہ آیت ہم نے سورہ سجدہ سے لی ہے اور یہ سنتِ نبویؐ ہے کہ یہ سورۃ ہر جمعہ کو صبح کی نماز میں پڑھی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں بیان فرمایا ہے کہ اس نے قرآن کریم نازل کر کے اپنی شریعت کے حکم کو اپنی تدبیر کے مطابق قائم کر دیا اور کلام مجید کے ساتھ لوگوں کے لئے ان کے دین کو مکمل کر دیا۔ اس کے بعد پھر ایک زمانہ ایسا آئے گا جس کی ضلالت ایک ہزار سال تک ممتد رہے گی اور کتاب اللہ اٹھالی جائے گی اور قرآن کریم کے احکام اپنے دونوں حصوں سمیت اللہ کی طرف عروج کر جائیں گے یعنی اس زمانہ میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں ضائع کر دیئے جائیں گے اور اس کی دونوں قسموں پر فساد کی تند ہوائیں چلیں گی اور جھوٹ اور افترا یعنی دجالی فتنے پھیل جائیں گے اور نافرمانی، کفر اور شرک عام ہو جائے گا تو مجرم لوگوں کو اپنے رب سے سرتابی کرتے ہوئے اور خدا تعالیٰ کی مخالفت میں سرگرم دیکھے گا۔ پھر اس کے بعد دوسرا ہزار سال آئے گا جس میں رب العالمین کی طرف سے لوگوں کی فریاد رسی کی جائے گی اور آدم آخر زمان کو تجدیدِ دین کے لئے مبعوث کیا جائے گا۔ چنانچہ اس کی طرف اس کے بعد کی آیت یعنی وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہ موعود انسان مسیح موعود

[1] السجدۃ:۸

الْمَسِيْحُ الْمَوْعُوْدُ وَقُدِّرَ بَعْثُهٗ بَعْدَ انْقِضَآءِ أَلْفِ سَنَةٍ مِنَ الْقُرُوْنِ الَّتِيْ هِيَ خَيْرُ الْقُرُوْنِ، وَاتَّفَقَ عَلَيْهِ مَعْشَرُ النَّبِيِّيْنَ. وَقَدْ جَآءَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ أُمَّتِيْ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ، ثُمَّ إِنَّ بَعْدَهُمْ قَوْمٌ يَشْهَدُوْنَ وَلَا يُسْتَشْهَدُوْنَ، وَيَخُوْنُوْنَ وَلَا يُؤْتَمَنُوْنَ، وَيُنْذِرُوْنَ وَلَا يُوْفُوْنَ، وَيَظْهَرُ فِيْهِمُ السَّمَنُ. وَفِيْ رِوَايَةٍ وَيَحْلِفُوْنَ وَلَا يُسْتَحْلَفُوْنَ. فَظَهَرَ مِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ الَّذِيْ هُوَ الْمُتَّفَقُ عَلَيْهِ أَنَّ الزَّمَانَ الْمَحْفُوْظَ مِنْ غَلَبَةِ الْكَذِبِ الَّذِيْ هُوَ مِنَ الصِّفَاتِ الدَّجَّالِيَّةِ وَزَمَانَ الصِّدْقِ وَالصَّلَاحِ وَالْعِفَّةِ لَا يُجَاوِزُ ثَلَاثَ مِائَةٍ مِّنْ قَرْنِ سَيِّدِنَا خَيْرِ الْبَرِيَّةِ، ثُمَّ بَعْدَ ذَالِكَ يَأْتِيْ زَمَانٌ كَلَيْلٍ سَجٰى عِنْدَ غَيْبَةِ بَدْرٍ اخْتَفٰى، وَفِيْهِ يَفْشُو الْكَذِبُ وَيَهْوِيْ مِنَ الْأَهْوَآءِ مَنْ هَوٰى، وَيَزِيْدُ كُلَّ يَوْمٍ زُوْرٌ وَأَحَادِيْثُ تُفْتَرٰى. فَإِذَا بَلَغَ الْكَذِبُ إِلٰى حَدِّ الْكَمَالِ فَيَنْتَهِيْ يَوْمًا إِلٰى ظُهُوْرِ الدَّجَّالِ، وَهُوَ اٰخِرُ أَيَّامِ هٰذَا الْأَلْفِ كَمَا يَقْتَضِيْهِ سِلْسِلَةُ التَّرَقِّيْ فِي الزُّوْرِ وَالْإِفْتِعَالِ، وَكَمَا هُوَ

ہی ہے اور اس کی بعثت کا زمانہ خیر القرون سے ایک ہزار سال ختم ہونے کے بعد ہی مقدر تھا اور اسی پر انبیاء کی جماعت نے اتفاق کیا ہے اور بخاری اور مسلم میں عمران بن حصین سے یہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کا بہترین زمانہ میری صدی ہے، اس کے بعد بہتر لوگ وہ ہیں جو ان کے بعد آئیں گے اور پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہوں گے۔ پھر ان کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو بغیر گواہی مانگے کے گواہی دیں گے اور وہ خائن ہوں گے اور ان کو امانت دار نہیں سمجھا جائے گا۔ وہ نذریں مانیں گے لیکن انہیں پورا نہیں کریں گے۔ وہ خوب موٹے تازے نظر آئیں گے۔ اور ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ حلف طلب کئے بغیر حلف اُٹھائیں گے۔ اس متفق علیہ حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جھوٹ کی کثرت جو دجالی صفات میں سے ایک صفت ہے اس سے محفوظ زمانہ اور صدق اور صلاح اور عفت کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تین سو سال کی مدت سے تجاوز نہیں کرے گا پھر اس کے بعد ایک ایسی تاریک رات آئے گی جس میں ماہِ کامل چھپ گیا ہو اس زمانہ میں جھوٹ عام ہو جائے گا اور نفسانی خواہشات کی طرف وہ راغب ہوں گے جو انہیں پسند کرتے ہیں اور جھوٹ ہر روز پھیلتا جائے گا اور جھوٹی احادیث وضع کی جائیں گی۔ پس جب جھوٹ اپنے کمال کو پہنچ جائے گا تو وہ ایک دن دجال کے ظہور

مَفْهُوْمُ حَدِيْثِ رَسُوْلِ اللهِ ذِي الْجَلَالِ. وَذَالِكَ الزَّمَانُ هُوَ الزَّمَانُ الَّذِيْ يَعْرُجُ أَمْرُ اللهِ إِلَيْهِ وَالْهُدٰى، وَيُرْفَعُ الْقُرْاٰنُ إِلَى السَّمَاوَاتِ الْعُلٰى، وَقَدْ شَهِدَتِ الْوَاقِعَاتُ الْخَارِجِيَّةُ أَنَّ هٰذَا الزَّمَانَ الْفَاسِدَ امْتَدَّ إِلٰى أَلْفِ سَنَةٍ. أَعْنِيْ إِلٰى هٰذَا الزَّمَانِ، حَتّٰى صَارَ الصِّلُّ كَالْأُفْعُوَانِ. فَفَهِمْنَا مِنْ هٰذَا بِالْيَقِيْنِ التَّامِّ وَالْعِرْفَانِ، أَنَّ قَوْلَهٗ تَعَالٰى "يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ" يَتَعَلَّقُ بِهٰذِهِ الْمُدَّةِ الَّتِيْ مَرَّتْ فِي الضَّلَالَةِ وَالْفِسْقِ وَالطُّغْيَانِ، وَكَثُرَ فِيْهِ الْمُشْرِكُوْنَ، إِلَّا قَلِيْلٌ مِّنَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ. وَإِنَّهٗ أَلْفُ سَنَةٍ مَّا زَادَ عَلَيْهِ وَمَا نَقَصَ، فَأَيُّ دَلِيْلٍ أَكْبَرُ مِنْ هٰذَا لَوْ كُنْتُمْ تَفَكَّرُوْنَ. وَإِنْ لَّمْ تَقْبَلُوْا فَبَيِّنُوْا لَنَا مَا مَعْنٰى هٰذِهِ الْاٰيَةِ مِنْ دُوْنِ هٰذَا الْمَعْنٰى إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. أَتَظُنُّوْنَ أَنَّ الْقِيَامَةَ هِيَ أَلْفُ سَنَةٍ كَسَنَوَاتِ مُدَّةِ الدُّنْيَا أَوْ تَصْعَدُ الْأَعْمَالُ إِلَى اللهِ فِيْ يَوْمِ الْقِيَامَةِ فِيْ مُدَّةٍ كَمِثْلِهَا، وَلَا يَعْلَمُهَا اللهُ قَبْلَهَا؟ اِتَّقُوا اللهَ أَيُّهَا الْمُسْرِفُوْنَ! وَأَيُّ شَهَادَةٍ أَكْبَرُ

کے زمانہ تک جا پہنچے گا اور وہ اس ہزار سال کے آخری دن ہوں گے۔ جیسا کہ فریب اور افترا میں ترقی کا سلسلہ اس کا تقاضا کرتا ہے اور جیسا کہ خدائے ذوالجلال کے رسول کی حدیث کا مفہوم ہے یہ وہ زمانہ ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ کا امر اور ہدایت اس کی طرف صعود کر جائیں گے اور قرآن مجید آسمان کی طرف اُٹھا لیا جائے گا اور خارجی واقعات نے بھی اس بات کی شہادت دی ہے کہ یہ خرابیوں سے پُر زمانہ ہزار سال تک یعنی اس زمانہ تک پھیلا ہوا ہے جس وقت زہریلا سانپ اژدھا کی شکل اختیار کر جائے گا۔ اس سے ہم نے یقینِ تام اور عرفان کے ساتھ سمجھ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ کا تعلق اس مدت سے ہے جو گمراہی، فسق اور سرکشی میں گزرے گی اور اس میں مشرکوں کی تعداد بڑھ جائے گی اور متقی لوگ بہت تھوڑے رہ جائیں گے اور یہ ایک ہزار سال کا عرصہ ہوگا نہ زیادہ اور نہ کم۔ پس اگر تم فکر کرو تو اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور اگر تم ان معنی کو قبول نہ کرو تو تم ہی بتاؤ کہ اس آیت کے ان معنی کے سوا اور کیا معنی ہوں گے کیا تم خیال کرتے ہو کہ قیامت ہزار سال تک رہے گی جو عمر دنیا کے سالوں کی مانند ہوں گے یا قیامت کے دن اتنی ہی مدت میں اعمال کا صعود اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگا اور ان اعمال کا علم اللہ تعالیٰ کو اس سے قبل نہیں ہوگا۔ اے حد سے تجاوز کرنے والو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جو کچھ خارج میں ظاہر ہوا ہے یعنی اس مدت کی

مِمَّا ظَهَرَ فِي الْخَارِجِ. أَعْنِيْ مِقْدَارَ مُدَّةٍ غَلَبَتِ الضَّلَالَةُ فِيْهَا، فَإِنَّكُمْ رَأَيْتُمْ بِأَعْيُنِكُمْ أَنَّ مُدَّةَ زَمَانِ الضَّلَالَةِ وَشِدَّتِهَا وَتَزَايُدِهَا بَعْدَ قُرُوْنِ الْخَيْرِ قَدِ امْتَدَّتْ إِلٰى أَلْفِ سَنَةٍ حَقًّا وَّصِدْقًا. أَتُنْكِرُوْنَ وَأَنْتُمْ تُشَاهِدُوْنَ؟ وَبَدَأَ الْكِذْبُ كَزَرْعٍ، ثُمَّ صَارَ كَشَجَرَةٍ، حَتّٰى ظَهَرَتْ هَيْكَلُ الدَّجَّالِ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ. وَإِنَّ الضَّلَالَةَ وَإِنْ كَانَتْ مِنْ قَبْلُ وَلٰكِنْ مَّا حَدَّتْ قُرُوْنُهَا إِلَّا بَعْدَ هٰذِهِ الْقُرُوْنِ الثَّلَاثَةِ. أَلَا تَقْرَءُوْنَ حَدِيْثَ الْقُرُوْنِ؟ وَقَدْ جَمَعَ هٰذَا الْأَلْفُ كُلَّ ضَلَالَةٍ، وَّ أَنْوَاعَ شِرْكٍ وَّبِدْعَةٍ، وَأَقْسَامَ فِسْقٍ وَّمَعْصِيَةٍ، وَأُضِيْعَ فِيْهِ حُقُوْقُ اللّٰهِ وَحُقُوْقُ الْعِبَادِ وَحُقُوْقُ الْمَخْلُوْقِ، وَانْفَتَحَتْ أَبْوَابُ الْاِرْتِدَادِ. فَبِأَيِّ دَلِيْلٍ بَعْدَ ذَالِكَ تُؤْمِنُوْنَ؟ وَفُتِحَتْ يَأْجُوْجُ وَمَأْجُوْجُ، وَتَرَوْنَ أَنَّهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ. وَمَا خَرَجَا إِلَّا بَعْدَ الْقُرُوْنِ الثَّلَاثَةِ، وَمَا كَمُلَ إِقْبَالُهُمَا إِلَّا عِنْدَ اٰخِرِ حِصَّةِ هٰذَا الْأَلْفِ، وَكُمِّلَ الْأَلْفُ مَعَ تَكْمِيْلِ سَطْوَتِهِمَا، وَإِنَّ فِيْهَا لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَدَبَّرُوْنَ، وَإِنَّ الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِهٰذَا السِّرِّ الْمَكْتُوْمِ. وَيَقُوْلُ إِنَّ يَأْجُوْجَ وَمَأْجُوْجَ قَدْ حُبِسَا وَصُفِّدَا إِلٰى

مقدار جس میں گمراہی غالب آ گئی اس سے بڑھ کر اور کون سی دلیل ہوگی۔ تم نے اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ لیا ہے کہ گمراہی اور اس کی شدت اور ترقی کا زمانہ خیر القرون سے ایک ہزار سال تک یقینی اور حتمی طور پر پھیلا ہوا ہے کیا تم اس کو دیکھتے ہوئے اس کا انکار کر سکتے ہو جھوٹ ایک چھوٹے سے پودہ کی طرح پھوٹا اور پھر بڑھتے بڑھتے ایک تناور درخت بن گیا حتی کہ تمہاری نگاہوں کے سامنے دجال کا وجود بھی ظاہر ہو گیا گو گمراہی پہلے بھی موجود تھی لیکن اس کی صدیاں تین صدیوں کے بعد مقدر تھیں کیا تم ان تین صدیوں سے تعلق رکھنے والی حدیث نہیں پڑھتے اور یہ ہزار سال ہر قسم کی گمراہی، ہر نوع کا شرک و بدعت اور ہر قسم کا فسق اور معصیت اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے اور ان ہزار سال میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ضائع کیا گیا اور ارتداد کے دروازے کھل گئے ۔ پھر تم اس کے سوا کس دلیل پر ایمان لاؤ گے۔ اور یاجوج و ماجوج آزاد کر دیئے گئے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ ہر اونچی جگہ سے پھلانگتے ہوئے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ اور یہ دونوں ان تین صدیوں کے بعد ہی نکلے ہیں اور ان دونوں کا آنا اس ہزار سال کے آخر میں ہی مکمل ہوا ہے اور یہ ہزار سال ان کے غلبہ کی تکمیل کے ساتھ ہی پورا ہوا ہے اور اس میں تدبر کرنے والوں کے لئے ایک نشان ہے اور قرآن کریم اس سربستہ راز کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ. ثُمَّ يُفْتَحَانِ فِيْ أَيَّامِ غُرُوْبِ شَمْسِ الصَّلَاحِ وَزَمَانِ الضَّلَالَاتِ، كَمَا أَنْتُمْ تَرَوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْأَيَّامِ وَتُشَاهِدُوْنَ. وَكَفٰى الطَّالِبِيْنَ هٰذَا الْقَدْرُ مِنَ الْبَيَانِ، وَأَرٰى أَنِّيْ أَكْمَلْتُ مَا أَرَدْتُّ وَأَتْمَمْتُ الْحُجَّةَ عَلٰى أَهْلِ الْعُدْوَانِ.

(خطبہ الہامیہ، روحانی خزائن جلد ۱۶ صفحہ ۳۳۱ تا ۳۳۴)

یاجوج اور ماجوج ایک مقررہ وقت تک مقید اور پابہ زنجیر کر دیئے گے ہیں اور پھر ان کو نیکی کے سورج کے غروب ہونے اور گمراہی کے زمانہ میں آزاد کر دیا جائے گا جیسا کہ تم ان دنوں دیکھ رہے ہو اور طالبوں کے لئے اس قدر بیان ہی کافی ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ میں نے اپنے ارادہ کو پورا کر دیا ہے اور زیادتی کرنے والوں پر حجت پوری کر دی ہے۔ (ترجمہ از مرتب)

قَدْ صَرَّحَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ۔ وَبَيَّنَ حَقَّ التَّبْيِيْنِ اَنَّ اَيَّامَ الضَّلَالَةِ بَعْدَ اَيَّامِ دَعْوَةِ الْقُرْاٰنِ هِيَ اَلْفُ سَنَةٍ۔ وَّبَعْدَهَا يُبْعَثُ مَسِيْحُ الرَّحْمٰنِ فَانْقَطَعَتِ الْخُصُوْمَةُ بِهٰذَا التَّعْيِيْنِ الْمُبِيْنِ لَاسِيَّمَا اِذَا اُلْحِقَ بِهٖ مَا جَآءَ ذِكْرُ اَلْفِ سَنَةٍ فِيْ كُتُبِ النَّبِيِّيْنَ السَّابِقِيْنَ۔ فَفَكِّرْ ثُمَّ فَكِّرْ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ۔

(خطبہ الہامیہ، روحانی خزائن جلد ۱۶ صفحہ ۳۳۱ حاشیہ)

ترجمہ از مرتب۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کو صراحت سے اور وضاحت سے بیان کر دیا ہے کہ گمراہی کا زمانہ دعوتِ قرآن کے زمانہ کے بعد ایک ہزار سال کا زمانہ ہے اور اس کے بعد مسیح موعود مبعوث ہوگا اور اس بیّن تعیین کے بعد خصوصاً جب اس کے ساتھ گذشتہ انبیاء کی کتب میں ایک ہزار سال کے ذکر کو ملا لیا جائے جھگڑا ختم ہو جاتا ہے پس تو فکر کر اور پھر فکر کر یہاں تک کہ تجھے یقین حاصل ہو جائے۔ (ترجمہ از مرتب)

اس میں کیا شک ہے کہ جس زمانہ کے آثار انجیل ظاہر کرتی ہے اسی زمانہ کی دانیال بھی خبر دیتا ہے اور انجیل کی پیشگوئی دانیال کی پیشگوئی کو قوت دیتی ہے کیونکہ وہ سب باتیں اس زمانہ میں وقوع میں آ گئی ہیں اور ساتھ ہی یہود و نصاریٰ کی وہ پیشگوئی جو بائبل میں سے استنباط کی گئی ہے اس کی موید ہے اور وہ یہ کہ مسیح موعود آدم کی تاریخ پیدائش سے چھٹے ہزار کے آخر میں پیدا ہوگا چنانچہ قمری حساب کے رو سے جو اصل حساب اہل کتاب کا ہے میری ولادت چھٹے ہزار کے آخر میں تھی اور چھٹے ہزار کے آخر میں مسیح موعود کا پیدا ہونا ابتدا سے ارادۂ الٰہی میں مقرر تھا کیونکہ مسیح موعود خاتم الخلفاء ہے اور آخر کو اول سے مناسبت چاہیے اور چونکہ حضرت آدم بھی چھٹے دن کے آخر میں پیدا کئے گئے ہیں اس لئے بلحاظ مناسبت ضروری تھا کہ آخری خلیفہ جو آخری آدم ہے وہ بھی

چھٹے ہزار کے آخر میں پیدا ہو۔ وجہ یہ کہ خدا کے سات دنوں میں سے ہر ایک دن ہزار برس کے برابر ہے جیسا کہ خود وہ فرماتا ہے اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ اور احادیث صحیحہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح موعود چھٹے ہزار میں پیدا ہوگا۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۲۰۸، ۲۰۹)

ایک دن خدا کے نزدیک تمہارے ہزار سال کے برابر ہے پس جبکہ خدا تعالیٰ کی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ دن سات ہیں پس اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ انسانی نسل کی عمر سات ہزار سال ہے جیسا کہ خدا نے میرے پر ظاہر کیا ہے کہ سورۃ العصر کے عدد جس قدر حساب جمل کی رو سے معلوم ہوتے ہیں اسی قدر زمانہ نسلِ انسان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک تک بحساب قمری گزر چکا تھا کیونکہ خدا نے حساب قمری رکھا ہے اور اس حساب سے ہماری اس وقت تک نسلِ انسانی کی عمر چھ ہزار برس تک ختم ہو چکی ہے اور اب ہم ساتویں ہزار میں ہیں اور یہ ضرور تھا کہ مثیلِ آدم جس کو دوسرے لفظوں میں مسیح موعود کہتے ہیں چھٹے ہزار کے آخر میں پیدا ہو جو جمعہ کے دن کے قائم مقام ہے جس میں آدم پیدا ہوا اور ایسا ہی خدا نے مجھے پیدا کیا پس اس کے مطابق چھٹے ہزار میں میری پیدائش ہوئی اور یہ عجیب اتفاق ہوا کہ میں معمولی دنوں کی رو سے بھی جمعہ کے دن پیدا ہوا تھا۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۴۵۷، ۴۵۸)

قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۲﴾

تفسیر معالم کے صفحہ ۱۶۲ میں زیر تفسیر آیت یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ لکھا ہے کہ علی بن طلحہ ابنِ عباس سے روایت کرتے ہیں کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ اِنِّیْ مُمِیْتُكَ یعنی میں تجھ کو مارنے والا ہوں۔ اس پر دوسرے اقوال اللہ تعالیٰ کے دلالت کرتے ہیں قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ (السجدۃ: ۱۲)۔ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ طَیِّبِیْنَ (النحل: ۳۳)۔ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ (النحل: ۲۹)۔ غرض حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا اعتقاد یہی تھا کہ حضرت عیسیٰ فوت ہو چکے ہیں۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۲۲۴، ۲۲۵)

توفی کے لفظ سے موت اور قبضِ روح ہی مراد ہے۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۲۶۹)

تمام قرآن شریف میں توفی کے معنی یہ ہیں کہ روح کو قبض کرنا اور جسم کو بیکار چھوڑ دینا جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے کہ قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۲۴)

بہت سی اور آیتیں قرآن شریف کی ہیں جن سے ببداہت یہی معلوم ہوتا ہے کہ رفع الی اللہ اور رجوع الی اللہ کے الفاظ ہمیشہ فوت ہی کے لئے آیا کرتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ یعنی وہ فرشتہ تمہیں وفات دے گا جو تم پر موکل ہے اور پھر تم اپنے رب کی طرف واپس کئے جاؤ گے۔

(براہینِ احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۳۸۵ حاشیہ)

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۸

کوئی نفس نیکی کرنے والا نہیں جانتا کہ وہ کیا کیا نعمتیں ہیں جو اس کے لئے مخفی ہیں۔ سو خدا نے ان تمام نعمتوں کو مخفی قرار دیا جن کا دنیا کی نعمتوں میں نمونہ نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دنیا کی نعمتیں ہم پر مخفی نہیں ہیں اور دودھ اور انار اور انگور وغیرہ کو ہم جانتے ہیں۔ اور ہمیشہ یہ چیزیں کھاتے ہیں سو اس سے معلوم ہوا کہ وہ چیزیں اور ہیں اور ان کو ان چیزوں سے صرف نام کا اشتراک ہے۔ پس جس نے بہشت کو دنیا کی چیزوں کا مجموعہ سمجھا۔ اس نے قرآن شریف کا ایک حرف بھی نہیں سمجھا۔

اس آیت کی شرح میں جو ابھی میں نے ذکر کی ہے ہمارے سید و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بہشت اور اس کی نعمتیں وہ چیزیں ہیں جو نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ دلوں میں کبھی گزریں۔ حالانکہ ہم دنیا کی نعمتوں کو آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں اور کانوں سے بھی سنتے ہیں اور دل میں بھی وہ نعمتیں گزرتی ہیں۔ پس جبکہ خدا اور رسول اس کا ان چیزوں کو ایک نرالی چیزیں بتلاتا ہے تو ہم قرآن سے دور جا پڑتے ہیں۔ اگر یہ گمان کریں کہ بہشت میں بھی دنیا کا ہی دودھ ہوگا جو گائیوں اور بھینسوں سے دوہا جاتا ہے۔ گویا دودھ دینے والے جانوروں کے وہاں ریوڑ کے ریوڑ موجود ہوں گے اور درختوں پر شہد کی مکھیوں نے بہت سے چھتے لگائے ہوئے ہوں گے اور فرشتے تلاش کر کے وہ شہد نکالیں گے اور نہروں میں ڈالیں گے کیا ایسے خیالات اس تعلیم سے کچھ مناسبت رکھتے ہیں جس میں یہ آیتیں موجود ہیں کہ دنیا نے ان چیزوں کو کبھی نہیں دیکھا اور وہ چیزیں روح کو روشن کرتی ہیں اور خدا کی معرفت بڑھاتی ہیں اور روحانی غذائیں ہیں۔ گو ان غذاؤں کا تمام نقشہ جسمانی رنگ پر ظاہر کیا گیا ہے مگر ساتھ ساتھ بتایا گیا ہے کہ ان کا سرچشمہ روح اور راستی ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۹۷، ۳۹۸)

خدا کے چھپانے میں بھی ایک عظمت ہوتی ہے اور خدا کا چھپانا ایسا ہے جیسے کہ جنت کی نسبت فرمایا ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (کوئی جی نہیں جانتا کہ کیسی کیسی قُرَّةِ اَعْيُنٍ ان کے لئے پوشیدہ رکھی گئی ہے) دراصل چھپانے میں بھی ایک قسم کی عزت ہوتی ہے جیسے کھانا لایا جاتا ہے تو اس پر دستر خوان وغیرہ ہوتا ہے تو یہ ایک عزت کی علامت ہوتی ہے۔

(البدر جلد اول نمبر ۱۱ مورخہ ۹؍جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۶)

وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۲﴾

ایسے وقت میں جبکہ شرارت انتہاء کو پہنچتی ہے اور قطعی فیصلہ کا وقت آجاتا ہے تو مخالفوں کے حق میں انبیاء علیہم السلام کی بھی دعا قبول نہیں ہوتی۔ دیکھو حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کے وقت اپنے بیٹے کنعان کے لئے جو کافروں اور منکروں سے تھا دعا کی اور قبول نہ ہوئی (دیکھو سورہ ہود رکوع ۴) اور ایسا ہی جب فرعون ڈوبنے لگا تو خدا پر ایمان لایا مگر قبول نہ ہوا۔

ہاں اس خاص وقت سے پہلے اگر رجوع کیا جاوے تو البتہ قبول ہوتا ہے۔ وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ یعنی جب خفیف سے آثار عذاب کے ظاہر ہوں تو اس وقت کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۴۲۷)

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآىِٕهٖ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۴﴾

أَعِيْسٰى حَيٌّ وَّمَاتَ الْمُصْطَفٰى تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى! اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ وَإِذَا ثَبَتَ أَنَّ الْأَنْبِيَآءَ كُلَّهُمْ أَحْيَآءٌ فِي السَّمَاوَاتِ، فَأَيُّ خُصُوْصِيَّةٍ ثَابِتَةٌ لِّحَيَاةِ الْمَسِيْحِ أَهُوَ يَأْكُلُ وَيَشْرَبُ وَهُمْ لَا يَأْكُلُوْنَ وَلَا

کیا عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے؟ یہ تقسیم ناقص ہے انصاف کرو جو تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ تمام کے تمام انبیاء آسمانوں میں زندہ ہیں تو حیاتِ مسیح علیہ السلام کے لئے کون سی خصوصیت ثابت ہے؟ کیا آپ کھاتے اور پیتے ہیں اور باقی انبیاء نہیں کھاتے اور نہیں پیتے بلکہ کلیم اللہ علیہ السلام

يَشْرَبُوْنَ؟ بَلْ حَيَاةُ كَلِيْمِ اللّٰهِ ثَابِتٌ بِنَصِّ الْقُرْآنِ الْكَرِيْمِ. أَلَا تَقْرَأُ فِي الْقُرْاٰنِ مَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَزَّوَجَلَّ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ، وَأَنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ نَزَلَتْ فِيْ مُوْسٰى، فَهِيَ دَلِيْلٌ صَرِيْحٌ عَلٰى حَيَاةِ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ، لِأَنَّهٗ لَقِيَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَالْأَمْوَاتُ لَا يُلَاقُوْنَ الْأَحْيَآءَ . وَلَا تَجِدُ مِثْلَ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ فِيْ شَأْنِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ، نَعَمْ جَآءَ ذِكْرُ وَفَاتِهٖ فِيْ مَقَامَاتٍ شَتّٰى، فَتَدَبَّرْ فَإِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَدَبِّرِيْنَ.

(حمامۃ البشریٰ، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۲۱۹، ۲۲۰)

کی زندگی قرآن کریم سے ثابت ہے۔ کیا تو قرآن کریم میں خدا تعالیٰ کا یہ قول نہیں پڑھتا کہ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ اور تو جانتا ہے کہ یہ آیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں نازل ہوئی ہے اور یہ حیاتِ موسیٰ علیہ السلام پر صریح دلیل ہے کیونکہ آپ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور مردے ان لوگوں سے ملاقات نہیں کرتے جو زندہ ہوں اور تجھے اس قسم کی آیات عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں نہیں ملیں گی ہاں ان کی وفات کا ذکر مختلف مقامات پر آیا ہے پس تو تدبر کر۔ اللہ تعالیٰ تدبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

(ترجمہ از مرتب)

یہ تمام شہادتیں (جن کا ذکر حضور پہلے فرما چکے ہیں۔ ناقل) اگر ان (مسیح علیہ السلام۔ ناقل) کے مرنے کو ثابت نہیں کرتیں تو پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوئی نبی بھی فوت نہیں ہوا سب بجسمِ عنصری آسمان پر جا بیٹھے ہیں کیونکہ اس قدر شہادتیں ان کی موت پر ہمارے پاس موجود نہیں بلکہ حضرت موسیٰ کی موت خود مشتبہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان کی زندگی پر یہ آیتِ قرآنی گواہ ہے یعنی یہ کہ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ اور ایک حدیث بھی گواہ ہے کہ موسیٰ ہر سال دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ خانہ کعبہ کے حج کرنے کو آتا ہے۔

(تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۱۰۱)

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَ اَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ۝۲۸

کیا انہوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ہمارا یہی دستور اور طریق ہے کہ ہم خشک زمین کی طرف پانی روانہ کر دیا کرتے ہیں پھر اس سے کھیتی نکالتے ہیں تا ان کے چارپائے اور خود وہ کھیتی کو کھاویں اور مرنے سے بچ

جائیں۔سو تم کیوں نظر غور سے ملاحظہ نہیں کرتے تا تم اس بات کو سمجھ جاؤ کہ وہ کریم ورحیم خدا کہ جو تم کو جسمانی موت سے بچانے کے لئے شدتِ قحط اور امساکِ باراں کے وقت بارانِ رحمت نازل کرتا ہے وہ کیوں کر شدتِ ضلالت کے وقت جو روحانی قحط ہے زندگی کا پانی نازل کرنے سے جو اس کا کلام ہے تم سے دریغ کرے۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۳۴)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ   بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تفسیر سورۃ الاحزاب

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَکُمُ الّٰٓیِٔۡ تُظٰہِرُوْنَ مِنْہُنَّ اُمَّہٰتِکُمْ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَکُمْ اَبْنَآءَکُمْ ؕ ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاہِکُمْ ؕ وَ اللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَ ہُوَ یَہْدِی السَّبِیْلَ ۝۵ اُدْعُوْہُمْ لِاٰبَآئِہِمْ ہُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰہِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَہُمْ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ وَ مَوَالِیْکُمْ ؕ وَ لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ فِیْمَاۤ اَخْطَاْتُمْ بِہٖ ۙ وَ لٰکِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُکُمْ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝۶

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کرنے کے متعلق آریہ صاحبان نے یہ اعتراض کیا کہ متبنّٰی اگر اپنی جورو کو طلاق دے دیوے تو متبنّٰی بنانے والے کا اس عورت سے نکاح جائز نہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں)

خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں پہلے ہی یہ حکم فرما دیا تھا کہ تم پر صرف ان بیٹوں کی عورتیں حرام ہیں جو تمہارے صلبی بیٹے ہیں۔ جیسا کہ یہ آیت ہے وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ یعنی (النساء: ۲۴) تم پر فقط ان بیٹوں کی جوروان حرام ہیں جو تمہاری پشت اور تمہارے نطفہ سے ہوں۔ پھر جبکہ پہلے سے یہی قانون تعلیم قرآنی میں خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہو چکا ہے اور یہ زینب کا قصہ ایک مدت بعد اس کے ظہور

میں آیا۔ تو اب ہر یک سمجھ سکتا ہے کہ قرآن نے یہ فیصلہ اسی قانون کے مطابق کیا جو اس سے پہلے منضبط ہو چکا تھا۔ قرآن کھولو اور دیکھو کہ زینب کا قصہ آخری حصہ قرآن میں ہے مگر یہ قانون کہ متبنّٰی کی جورو حرام نہیں ہو سکتی یہ پہلے حصہ میں ہی موجود ہے اور اس وقت کا یہ قانون ہے کہ جب زینب کا زید سے ابھی نکاح بھی نہیں ہوا تھا تم آپ ہی قرآن شریف کو کھول کر ان دونوں مقاموں کو دیکھ لو اور ذرہ شرم کو کام میں لاؤ۔

اور پھر بعد اس کے سورۃ الاحزاب میں فرمایا مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی خدا تعالیٰ نے کسی کے پیٹ میں دو دل نہیں بنائے پس اگر تم کسی کو کہو کہ تو میرا دل ہے تو اس کے پیٹ میں دو دل نہیں ہو جائیں گے دل تو ایک ہی رہے گا اسی طرح جس کو تم ماں کہہ بیٹھے وہ تمہاری ماں نہیں بن سکتی اور اسی طرح خدا نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو حقیقت میں تمہارے بیٹے نہیں کر دیا۔ یہ تو تمہارے منہ کی باتیں ہیں اور خدا سچ کہتا ہے اور سیدھی راہ دکھلاتا ہے تم اپنے منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کے نام سے پکارو یہ تو قرآنی تعلیم ہے مگر چونکہ خدا تعالیٰ کو منظور تھا کہ اپنے پاک نبی کا نمونہ اس میں قائم کر کے پورانی رسم کی کراہت کو دلوں سے دور کر دے سو یہ نمونہ خدا تعالیٰ نے قائم کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام آزاد کردہ کی بیوی کی اپنے خاوند سے سخت ناسازش ہو گئی آخر طلاق تک نوبت پہنچی۔ پھر جب خاوند کی طرف سے طلاق مل گئی تو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیوند نکاح کر دیا۔ اور خدا تعالیٰ کے نکاح پڑھنے کے یہ معنے نہیں کہ زینب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایجاب قبول نہ ہوا اور جبراً خلاف مرضی زینب کے اس کو گھر میں آباد کر لیا یہ تو ان لوگوں کی بدذاتی اور ناحق کا افترا ہے جو خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتے بھلا اگر وہ سچے ہیں تو اس افترا کا حدیث صحیح یا قرآن سے ثبوت تو دیں۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اسلام میں نکاح پڑھنے والے کو یہ منصب نہیں ہوتا کہ جبراً نکاح کر دے بلکہ نکاح پڑھنے سے پہلے فریقین کی رضامندی ضروری ہوتی ہے۔ اب خلاصہ یہ کہ صرف منہ کی بات سے نہ تو بیٹا بن سکتا ہے نہ ماں بن سکتی ہے۔ مثلاً ہم آریوں سے پوچھتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی شخص غصہ میں آکر یا کسی دھوکہ سے اپنی عورت کو ماں کہہ بیٹھے تو کیا اس کی عورت اس پر حرام ہو جائے گی اور طلاق پڑ جائے گی اور خود یہ خیال بالبداہت باطل ہے کیونکہ طلاق تو آریوں کے مذہب میں کسی طور سے پڑ ہی نہیں سکتی خواہ اپنی بیوی کو نہ ایک دفعہ بلکہ ہزار دفعہ ماں کہہ دیں یا دادی کہہ دیں۔ تو پھر

جبکہ صرف منہ کے کہنے سے کوئی عورت ماں یا دادی نہیں بن سکتی تو پھر صرف منہ کی بات سے کوئی غیر کا نطفہ بیٹا کیوں کر بن سکتا ہے اور کیوں کر قبول کیا جاتا ہے کہ درحقیقت بیٹا ہو گیا اور اس کی عورت اپنے پر حرام ہو گئی خدا کے کلام میں اختلاف نہیں ہو سکتا پس بلا شبہ یہ بات صحیح ہے کہ اگر صرف منہ کی بات سے ایک آریہ کی عورت اس کی ماں نہیں بن سکتی تو اسی طرح صرف منہ کی بات سے غیر کا بیٹا بیٹا بھی نہیں بن سکتا۔

(آریہ دھرم، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۵۸ تا ۶۰)

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ﴿۱۱﴾

اسلام کی لڑائیاں ایسے طور سے نہیں ہوئیں کہ جیسے ایک زبردست بادشاہ کمزور لوگوں پر چڑھائی کر کے ان کو قتل کر ڈالتا ہے بلکہ صحیح نقشہ ان لڑائیوں کا یہ ہے کہ جب ایک مدت دراز تک خدا تعالیٰ کا پاک نبی اور اس کے پیرو مخالفوں کے ہاتھ سے دکھ اُٹھاتے رہے چنانچہ ان میں سے کئی قتل کئے گئے اور کئی برے برے عذابوں سے مارے گئے یہاں تک کہ ہمارے نبی صلعم کے قتل کرنے کے لئے منصوبہ کیا گیا اور یہ تمام کامیابیاں ان کے بتوں کے معبود برحق ہونے پر حمل کی گئیں اور ہجرت کی حالت میں بھی آنحضرت صلعم کو امن میں نہ چھوڑا گیا بلکہ خود آٹھ پڑاؤ تک چڑھائی کر کے خود جنگ کرنے کے لئے آئے تو اس وقت ان کے حملہ کے روکنے کے لئے اور نیز ان لوگوں کو امن میں لانے کے لئے جو ان کے ہاتھ میں قیدیوں کی طرح تھے اور نیز اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے کہ ان کے معبود جن کی تائید پر یہ سابقہ کامیابیاں حمل کی گئیں ہیں لڑائیاں کرنے کا حکم ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے.... اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ۔

(جنگِ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۴۴، ۲۴۵)

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴿۱۲﴾

انبیاء و رسل کے سوانح پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درمیان میں ہمیشہ مکروہات آجایا کرتے ہیں۔ طرح طرح کی ناکامیاں پیش آتی ہیں۔ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا سے معلوم ہوتا ہے کہ حد درجہ کی ناکامی کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن یہ شکست اور ہزیمت نہیں ہوا کرتی ابتلاء میں مامور کا صبر و استقلال اور جماعت

کی استقامت اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے۔ وہ خود فرماتا ہے كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ (المجادلة : ۲۲) لفظ كَتَبَ سنت اللہ پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ اپنے رسولوں کو ضرور ہی غلبہ دیا کرتا ہے۔ درمیانی دشواریاں کچھ شے نہیں ہوتی اگر چہ وہ ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ (التوبة :۱۱۸) کا مصداق ہی کیوں نہ ہو۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۹ مورخہ یکم مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

زلزلہ کا لفظ ظاہر معنوں کے سوا دوسرے معنوں پر بھی بولا گیا ہے جیسا کہ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۴؍ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۲﴾

میں ..... تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ بہت سے لوگ ہیں جو اپنے تراشے ہوئے وظائف اور اَوراد کے ذریعہ سے ان کمالات کو حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو طریق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار نہیں کیا وہ محض فضول ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر منعم علیہ کی راہ کا سچا تجربہ کار اور کون ہوسکتا ہے جن پر نبوت کے بھی سارے کمالات ختم ہو گئے۔ آپ نے جو راہ اختیار کیا ہے وہ بہت ہی صحیح اور اقرب ہے اس راہ کو چھوڑ کر اَور ایجاد کرنا خواہ وہ بظاہر کتنا ہی خوش کرنے والا معلوم ہوتا ہو میری رائے میں ہلاکت ہے اور خدا تعالیٰ نے مجھ پر ایسا ہی ظاہر کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے اتباع سے خدا ملتا ہے اور آپ کے اتباع کو چھوڑ کر خواہ کوئی ساری عمر ٹکریں مارتا رہے گوہرِ مقصود اس کے ہاتھ میں نہیں آسکتا چنانچہ سعدیؒ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی ضرورت بتاتا ہے۔

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا ولیکن میفزائے بر مصطفیٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ کو تو نہ چھوڑو۔ میں دیکھتا ہوں کہ قسم قسم کے وظیفے لوگوں نے ایجاد کر لئے ہیں۔ الٹے سیدھے لٹکتے ہیں اور جوگیوں کی طرح راہبانہ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں لیکن یہ سب بے فائدہ ہیں انبیاء علیہم السلام کی یہ سنت نہیں کہ وہ الٹے سیدھے لٹکتے رہیں یا نفی اثبات کے ذکر کریں اور ارّہ کے ذکر کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسوہ حسنہ فرمایا لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلو ایک ذرہ بھر بھی ادھر یا ادھر ہونے کی

کوشش نہ کرو۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۱ مورخہ ۳۱؍ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۴﴾

یہ لوگ جو ایمان لائے دو قسم کے ہیں۔ پہلے تو وہ ہیں جو جاں نثاری کے عہد کو پورا کر چکے اور خدا کی راہ میں شہید ہو گئے اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو شہادت کے منتظر ہیں اور چاہتے ہیں کہ خدا کی راہ میں جانیں دیں اور انہوں نے اپنی بات میں ذرا بھی ردوبدل نہیں کی اور اپنے عہد پر قائم رہے۔
(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۳۸)

شیعہ سب وشتم تو کرتے ہیں مگر ان (صحابہؓ۔ناقل) کا کام دیکھو کہ جیسے خدا کی مرضی تھی ویسے ہی اسلام کو پھیلا کر دکھا دیا۔ خوب جانتے تھے کہ بیویاں مریں گی۔ بچے ذبح ہوں گے اور ہر ایک قسم کی تکلیف شدید ہوگی مگر پھر بھی خدا کے کام سے منہ نہ پھیرا یہی فقرہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک جماعت وہ ہے کہ اپنا نَحب (ذمہ) ادا کر چکے ہیں جیسے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ کیسا سرٹیفکیٹ ہے کہ بعض نے میری راہ پر جان دی۔ ایک جان وہ ہے جس پر عیسائی بھڑک رہے ہیں اور پیچھے سے معلوم ہوا کہ وہ بھی نہیں دی گئی۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷؍ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۳)

دنیا میں جس قدر انبیاء آئے ہیں... ان میں ایک کشش ہوتی ہے جس سے لوگ ان کی طرف کھچے چلے آتے ہیں اور جب دعا کی جاتی ہے وہ کشش کے ذریعہ سے زہریلے مادہ پر جو لوگوں کے اندر ہوتا ہے اثر کرتی ہے اور اس روحانی مریض کو تسلی اور تسکین بخشتی ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو کہ بیان میں ہی نہیں آسکتی۔ اور اصل مغز شریعت کا یہی ہے کہ وہ کشش طبیعت میں پیدا ہو جاوے۔ سچی تقویٰ اور استقامت بغیر اس صاحبِ کشش کی موجودگی کے پیدا نہیں ہو سکتے اور نہ اس کے سوا قوم بنتی ہے یہی کشش ہے جو کہ دلوں میں قبولیت ڈالتی ہے اس کے بغیر ایک غلام اور نوکر بھی اپنے آقا کی خاطر خواہ فرمانبرداری نہیں کرسکتا اور اسی کے نہ ہونے کی وجہ سے نوکر اور غلام جن پر بڑے انعام و اکرام کئے گئے ہوں آخر کار نمک حرام نکل جاتے ہیں بادشاہوں کی ایک تعدادِ کثیر ایسے غلاموں کے ہاتھ سے ذبح ہوتی رہی لیکن کیا کوئی ایسی نظیر انبیاء میں دکھلا سکتا ہے کہ کوئی نبی اپنے کسی غلام یا مرید سے قتل ہوا ہے؟ مال اور زر اور کوئی اور ذریعہ دل کو اس

طرح سے قابو نہیں کر سکتا جس طرح سے یہ کشش قابو کرتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ کیا بات تھی کہ جس کے ہونے سے صحابہؓ نے اس قدر صدق دکھایا اور انہوں نے نہ صرف بت پرستی اور مخلوق پرستی ہی سے منہ موڑا بلکہ درحقیقت ان کے اندر سے دنیا کی طلب ہی مسلوب ہوگئی اور وہ خدا کو دیکھنے لگ گئے۔ وہ نہایت سرگرمی سے خدا کی راہ میں ایسے فدا تھے کہ گویا ہر ایک ان میں ابراہیم تھا۔ انہوں نے کامل اخلاص سے خدا کا جلال ظاہر کرنے کے لئے وہ کام کئے جس کی نظیر بعد اس کے کبھی پیدا نہیں ہوئی اور خوشی سے دین کی راہ میں ذبح ہونا قبول کیا بلکہ بعض صحابہؓ نے جو یکلخت شہادت نہ پائی تو ان کو خیال گزرا کہ شاید ہمارے صدق میں کچھ کسر ہے جیسے کہ اس آیت میں اشارہ ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ یعنی بعض تو شہید ہو چکے تھے اور بعض منتظر تھے کہ کب شہادت نصیب ہو۔ اب دیکھنا چاہیے کہ کیا ان لوگوں کو دوسروں کی طرح حوائج نہ تھے اور اولاد کی محبت اور دوسرے تعلقات نہ تھے؟ مگر اس کشش نے ان کو ایسا مستانہ بنا دیا تھا کہ دین کو ہر ایک شے پر مقدم کیا ہوا تھا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۶ مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸۱، ۳۸۲)

اہلِ اسلام میں اب صرف الفاظ پرستی رہ گئی ہے اور وہ انقلاب جسے خدا چاہتا ہے وہ بھول گئے ہیں اس لئے انہوں نے توبہ کو بھی الفاظ تک محدود کر دیا ہے لیکن قرآن شریف کا منشاء یہ ہے کہ نفس کی قربانی پیش کی جاوے مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ دلالت کرتا ہے کہ وہ توبہ یہ ہے جو انہوں نے کی اور مَنْ يَّنْتَظِرُ بتلاتا ہے کہ وہ یہ توبہ ہے جو انہوں نے کر کے دکھلائی ہے اور وہ منتظر ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۱، ۴۲ مورخہ ۲۹ اکتوبر و ۸ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۲۲)

صحابہؓ کرام کی وہ پاک جماعت تھی جو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی الگ نہیں ہوئے اور وہ آپؐ کی راہ میں جان دینے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے بلکہ دریغ نہیں کیا۔ ان کی نسبت آیا ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ یعنی بعض اپنا حق ادا کر چکے اور بعض منتظر ہیں کہ ہم بھی اس راہ میں مارے جاویں۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و عظمت معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہاں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے روشن ثبوت ہیں۔ اب کوئی شخص ان ثبوتوں کو ضائع کرتا ہے تو وہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ضائع کرنا چاہتا ہے۔ پس وہی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی قدر کر سکتا ہے جو صحابہ کرامؓ کی قدر کرتا ہے جو صحابہ کرامؓ کی قدر نہیں کرتا وہ

ہرگز ہرگز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر نہیں کرتا۔ وہ اس دعویٰ میں جھوٹا ہے اگر کہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہوں کیونکہ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہو اور پھر صحابہؓ سے دشمنی۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۷ مورخہ ۲۴ رفروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

قرآن شریف نے صحابہؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ یعنی بعض صحابہؓ میں سے ایسے ہیں جو اپنی جان دے چکے ہیں اور بعض ابھی منتظر ہیں جب تک اس مقام پر انسان نہیں پہنچتا بامراد نہیں ہوسکتا۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۸، ۱۹ مورخہ ۸ و ۱۶ رمئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۰)

خدا کے مرسلین اور مامورین کبھی بزدل نہیں ہوا کرتے بلکہ سچے مومن بھی بزدل نہیں ہوتے بزدلی ایمان کی کمزوری کی نشانی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم پر مصیبتوں نے بار بار حملے کئے مگر انہوں نے کبھی بزدلی نہیں دکھائی۔ خدا تعالیٰ ان کی نسبت فرماتا ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا یعنی جس ایمان پر انہوں نے کمرِ ہمت باندھی تھی اس کو بعض نے تو نبھا دیا اور بعض منتظر ہیں کہ کب موقع ملے اور سرخرو ہوں اور انہوں نے کبھی کم ہمتی اور بزدلی نہیں دکھائی۔

(بدر جلد ۱ نمبر ۸ مورخہ ۲۵ رمئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

خدا تعالیٰ نے صحابہؓ کی تعریف میں کیا خوب فرمایا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ مومنوں میں ایسے مرد ہیں جنہوں نے اس وعدہ کو سچا کر دکھایا جو انہوں نے خدا کے ساتھ کیا تھا۔ سو ان میں سے بعض اپنی جانیں دے چکے اور بعض جانیں دینے کو طیار بیٹھے ہیں۔ صحابہؓ کی تعریف میں قرآن شریف سے آیات اکٹھی کی جائیں تو اس سے بڑھ کر کوئی اسوہ حسنہ نہیں۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۲۰ مورخہ ۱۷ راگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

صحابہؓ یہ چاہتے تھے کہ خدا تعالیٰ کو راضی کریں خواہ اس راہ میں کیسی ہی سختیاں اور تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔ اگر کوئی مصائب اور مشکلات میں نہ پڑتا اور اسے دیر ہوتی تو وہ روتا اور چلاتا تھا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ ان ابتلاؤں کے نیچے خدا تعالیٰ کی رضا کا پروانہ اور خزانہ مخفی ہے۔ ؎

ہر بلاکیں قومِ راحق دادہ است زیر آں گنجِ کرم بنہادہ است

قرآن شریف ان کی تعریف سے بھرا ہوا ہے اسے کھول کر دیکھو۔ صحابہؓ کی زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا عملی ثبوت تھا۔ صحابہؓ جس مقام پر پہنچے تھے اس کو قرآن شریف میں اس طرح پر بیان فرمایا

ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ یعنی بعض ان میں سے شہادت پا چکے اور انہوں نے گویا اصل مقصود حاصل کر لیا اور بعض اس انتظار میں ہیں اور چاہتے ہیں کہ شہادت نصیب ہو۔صحابہؓ دنیا کی طرف نہیں جھکے اور عمریں لمبی ہوں اور اس قدر مال و دولت ملے اور یوں بے فکری اور عیش کے سامان ہوں میں جب صحابہؓ کے اس نمونہ کو دیکھتا ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی اور کمال فیضان کا بے اختیار اقرار کرنا پڑتا ہے کہ کس طرح پر آپ نے ان کی کایا پلٹ دی اور انہیں بالکل رو بخدا کر دیا۔(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّ بَارِكْ وَ سَلِّمْ)۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۸ مورخہ ۳۱/اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

صحابہؓ کے دلی ارادے اور نفسانی جذبات بالکل دور ہو گئے تھے۔ان کا اپنا کچھ رہا ہی نہیں تھا۔کوئی خواہش تھی نہ آرزو بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو اور اس لئے وہ خدا کی راہ میں بکریوں کی طرح ذبح ہو گئے۔قرآن شریف ان کی اس حالت کے متعلق فرماتا ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔

یہ حالت انسان کے اندر پیدا ہو جانا آسان بات نہیں کہ وہ خدا کی راہ میں جان دینے کو آمادہ ہو جاوے مگر صحابہؓ کی حالت بتاتی ہے کہ انہوں نے اس فرض کو ادا کیا۔جب انہیں حکم ہوا کہ اس راہ میں جان دے دو پھر وہ دنیا کی طرف نہیں جھکے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۱ مورخہ ۱۰/جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

یہ امر سنت اللہ کے خلاف ہے کہ پھونک مار کر ولی بنا دیا جاوے۔اگر یہی سنت ہوتی تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے اور اپنے جاں نثار صحابہؓ کو پھونک مار کر ہی ولی بنا دیتے۔ان کو امتحان میں ڈلوا کر ان کے سر نہ کٹواتے اور خدا تعالیٰ ان کی نسبت یہ نہ فرماتا مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔پس جب دنیا بغیر مشکلات اور محنت کے ہاتھ نہیں آتی تو عجب بیوقوف ہے وہ انسان جو دین کو حلوائے بے دود سمجھتا ہے۔یہ تو سچ ہے کہ دین سہل ہے مگر ہر نعمت مشقت کو چاہتی ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۷/جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

صحابہؓ کی جو تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی وہ اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ان کی نسبت فرماتا ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ اور پھر ان کی نسبت رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ (التوبۃ:۱۰۰) فرمایا۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۷ موخہ ۳۱/جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

صحابہؓ کے زمانہ پر اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ابتدا سے فیصلہ کر لیا ہوا تھا کہ اگر

خدا کی راہ میں جان دینی پڑ جائے تو پھر دے دیں گے۔انہوں نے تو خدا کی راہ میں مرنے کو قبول کیا ہوا تھا جتنے صحابہؓ جنگوں میں جاتے تھے کچھ تو شہید ہو جاتے تھے اور کچھ واپس آ جاتے تھے اور جو شہید ہو جاتے تھے ان کے اقرباء پھر ان سے خوش ہوتے تھے کہ انہوں نے خدا کی راہ میں جان دی اور جو بچے آتے تھے وہ اس انتظار میں رہتے تھے اور شاکی رہتے کہ شاید ہم میں کوئی کمی رہ گئی جو ہم جنگ میں شہید نہیں ہوئے اور وہ اپنے ارادوں کو مضبوط رکھتے تھے اور خدا کے لئے جان دینے کو تیار رہتے تھے جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

آنحضرت صلعم کے صحابہؓ ایک لاکھ سے متجاوز تھے میرا ایمان ہے کہ ان میں سے کسی کا بھی ملونی والا ایمان نہ تھا۔ایک بھی ان میں سے ایسا نہ تھا جو کچھ دین کے لئے ہو اور کچھ دنیا کے لئے بلکہ وہ سب کے سب خدا کی راہ میں جان دینے کے لئے تیار تھے جیسے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۵ مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۷)

وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۴﴾

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا یعنی اے اہل بیت خدا تمہیں ایک امتحان کے ذریعہ سے پاک کرنا چاہتا ہے جیسا کہ حق ہے پاک کرنے کا۔

(مجموعہ اشتہارات جلد ۱ صفحہ ۱۷۷)

جہاں یہ آیت ہے وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں ہی کا ذکر ہے۔سارے مفسر اس پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ امہات المؤمنین کی صفت اس جگہ بیان فرماتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے اَلطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ (النور: ۲۷) یہ آیت چاہتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والے طیبات ہوں۔ ہاں اس میں صرف بیبیاں ہی شامل نہیں بلکہ آپؐ کے گھر کی رہنے والی ساری عورتیں شامل ہیں اور اس لئے اس

میں بنت بھی داخل ہوسکتی ہے بلکہ ہے اور جب فاطمہ رضی اللہ عنہا داخل ہوئیں تو حسنین ؓ بھی داخل ہوئے۔ پس اس سے زیادہ یہ آیت وسیع نہیں ہوسکتی تھی۔ جتنی وسیع ہوسکتی تھی ہم نے کردی کیونکہ قرآن شریف ازواج کو مخاطب کرتا ہے اور بعض احادیث نے حضرت فاطمہ اور حسنین کو مطہرین میں داخل کیا ہے۔ پس ہم نے دونو کو یکجا جمع کرلیا۔

شیعہ نے ازواجِ مطہرات کو سب وشتم سے یاد کیا ہے اور چونکہ خدا تعالیٰ کو معلوم تھا کہ یہ لوگ ایسا کریں گے۔ اس لئے قبل از وقت ان کی براءت کردی۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ /اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

اہلِ بیت جو ایک پاک گروہ اور بڑا عظیم الشان گھرانا تھا اس کے پاک کرنے کے واسطے بھی اللہ نے خود فرمایا کہ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا مَیں ہی ناپاکی اور نجاست کو دور کروں گا اور خود ہی ان کو پاک کیا تو بھلا اور کون ہے جو خود بخود پاک صاف ہونے کی توفیق رکھتا ہو پس لازمی ہے کہ اس سے دعا کرتے رہو اور اسی کے آستانہ پر گرے رہو ساری توفیقیں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ /اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم سے اے اہلِ بیت ناپاکی دور کردے اور تم کو بالکل پاک کردے۔
(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۴ مورخہ ۳۱ /جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۷)

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآئِمِيْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۶﴾

وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ...... سچے مرد اور سچی عورتیں بڑے بڑے اجر پائیں گے۔
(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۶۱)

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۷﴾

کسی مومن یا مومنہ کو جائز نہیں ہے کہ جب خدا اور اس کا رسول ؐ کوئی حکم کرے تو ان کو اس حکم کے رد

کرنے میں اختیار ہو اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ حق سے بہت دور جا پڑا ہے یعنی نجات سے بے نصیب رہا کیونکہ نجات اہلِ حق کے لئے ہے۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۲۹)

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۳۸﴾

جو لوگ متبنّٰی کرتے ہیں ان کا یہ دعویٰ سراسر لغو اور باطل ہے کہ وہ حقیقت میں بیٹا ہو جاتا ہے اور بیٹوں کے تمام احکام اس کے متعلق ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قانونِ قدرت اس بیہودہ دعوے کو رد کرتا ہے اس لئے کہ جس کا نطفہ ہوتا ہے اسی کے اعضاء میں سے بچہ کے اعضاء حصہ لیتے ہیں اسی کے قویٰ کے مشابہ اس کے قویٰ ہوتے ہیں اور اگر وہ انگریزوں کی طرح سفید رنگ رکھتا ہے تو یہ بھی اس سفیدی سے حصہ لیتا ہے اگر وہ حبشی ہے تو اس کو بھی اس سیاہی کا بخرہ ملتا ہے اگر وہ آتشک زدہ ہے تو یہ بیچارہ بھی اسی بلا میں پھنس جاتا ہے۔ غرض جس کا حقیقت میں نطفہ ہے اسی کے آثار بچہ میں ظاہر ہوتے ہیں جیسے گیہوں سے گیہوں پیدا ہوتی ہے اور چنے سے چنا نکلتا ہے۔ پس اس صورت میں ایک کے نطفہ کو اس کے غیر کا بیٹا قرار دینا واقعاتِ صحیحہ کے مخالف ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف منہ کے دعوے سے واقعاتِ حقیقیہ بدل نہیں سکتے۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ میں نے سم الفار کے ایک ٹکڑہ کو طباشیر کا ٹکڑہ سمجھ لیا تو وہ اس کے کہنے سے طباشیر نہیں ہو جائے گا اور اگر وہ اس وہم کی بناء پر اسے کھائے گا تو ضرور مرے گا۔ جس حالت میں خدا نے زید کو بکر کے نطفہ سے پیدا کر کے بکر کا بیٹا بنا دیا تو پھر کسی انسان کی فضول گوئی سے وہ خالد کا بیٹا نہیں بن سکتا۔ اور اگر بکر اور خالد ایک مکان میں اکٹھے بیٹھے ہوں اور اس وقت حکمِ حاکم پہنچے کہ زید جس کا حقیقت میں بیٹا ہے اس کو پھانسی دیا جائے تو اس وقت خالد فی الفور عذر کر دے گا کہ زید حقیقت میں بکر کا بیٹا ہے میرا اس سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی شخص کے دو باپ تو نہیں ہو سکتے پس اگر متبنّٰی بنانے والا حقیقت میں باپ ہو گیا ہے تو یہ فیصلہ ہونا چاہیے کہ اصلی باپ کس دلیل سے لا دعویٰ کیا گیا ہے۔

غرض اس سے زیادہ کوئی بات بھی بیہودہ نہیں کہ خدا کی بنائی ہوئی حقیقتوں کو بدل ڈالنے کا قصد کریں۔

اب جاننا چاہیے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں پہلے ہی یہ حکم فرما دیا تھا کہ تم پر صرف ان بیٹوں کی عورتیں حرام ہیں جو تمہارے صلبی بیٹے ہیں جیسا کہ یہ آیت ہے وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ (النساء : ۲۴) یعنی تم پہ فقط ان بیٹوں کی جوروئیں حرام ہیں جو تمہاری پشت اور تمہارے نطفہ سے ہوں پھر جبکہ پہلے سے یہی قانون تعلیمِ قرآنی میں خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہو چکا ہے اور یہ زینب کا قصہ ایک مدت بعد اس کے ظہور میں آیا۔ تو اب ہر یک سمجھ سکتا ہے کہ قرآن نے یہ فیصلہ اسی قانون کے مطابق کیا جو اس سے پہلے منضبط ہو چکا تھا۔ قرآن کھولو اور دیکھو کہ زینب کا قصہ آخری حصہ قرآن میں ہے مگر یہ قانون کہ متبنّٰی کی جورو حرام نہیں ہو سکتی یہ پہلے حصہ میں ہی موجود ہے اور اس وقت کا یہ قانون ہے کہ جب زینب کا زید سے ابھی نکاح بھی نہیں ہوا تھا۔ تم آپ ہی قرآن شریف کو کھول کر ان دونوں مقاموں کو دیکھ لو .... اور دوسری جز جس پر اعتراض کی بنیاد رکھی گئی ہے یہ ہے کہ زینب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول نہیں کیا تھا صرف زبردستی خدا تعالیٰ نے حکم دے دیا۔ اس کے جواب میں ابھی ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ ایک نہایت بدذاتی کا افترا ہے جس کا ہماری کتابوں میں نام و نشان نہیں۔ اگر سچے ہیں تو قرآن یا حدیث میں سے دکھلا دیں۔ کیسی بے ایمان قوم ہے کہ جھوٹ بولنے سے شرم نہیں کرتی۔ اگر افترا نہیں تو ہمیں بتلا دیں کہاں لکھا ہے۔ کیا قرآن شریف میں یا بخاری اور مسلم میں۔ قرآن شریف کے بعد بالاستقلال وثوق کے لائق ہماری دو ہی کتابیں ہیں ایک بخاری اور ایک مسلم۔ سو قرآن یا بخاری اور مسلم سے اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ نکاح زینب کے خلافِ مرضی پڑھا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس حالت میں زینب زید سے جو آنحضرتؐ کا غلام آزاد تھا راضی نہ تھی اور اسی بناء پر زید نے تنگ آ کر طلاق دی تھی اور زینب نے خود آنحضرتؐ کے گھر میں ہی پرورش پائی تھی اور آنحضرتؐ کے اقارب میں سے اور ممنونِ منت تھی تو زینب کے لئے اس سے بہتر اور کون سی مراد اور کون سی فخر کی جگہ تھی کہ غلام کی قید سے نکل کر اس شاہِ عالم کے نکاح میں آوے جو خدا کا پیغمبر اور خاتم الانبیاء اور ظاہری بادشاہت اور ملک داری میں بھی دنیا کے تمام بادشاہوں کا سرتاج تھا جس کے رعب سے قیصر اور کسریٰ کانپتے تھے۔ دیکھو تمہارے ہندوستان کے راجوں نے محض فخر حاصل کرنے کے لئے مغلیہ خاندان کے بادشاہوں کو باوجود ہندو ہونے کے لڑکیاں دیں اور آپ درخواستیں دے کر اور تمنا کر کے اس سعادت کو حاصل کیا اور اپنے مذہبی قوانین کی بھی کچھ رعایت نہ رکھی بلکہ اپنے گھروں میں ان لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھایا اور اسلام کا طریق

سکھایا اور مسلمان بنا کر بھیجا حالانکہ یہ تمام بادشاہ اس عالیشان جناب کے آگے ہیچ تھے جس کے آگے دنیا کے بادشاہ جھکے ہوئے تھے۔ کیا کوئی عقل قبول کر سکتی ہے کہ ایک ایسی عورت جو اس ذلت سے تنگ آ گئی تھی جو اس کا خاوند ایک غلام آزادہ کردہ ہے وہ اس غلام سے آزاد ہونے بعد اس شہنشاہ کو قبول نہ کرے جس کے پاؤں پر دنیا کے بادشاہ گرتے تھے بلکہ دیکھ کر رعب کو برداشت نہیں کر سکتے تھے چنانچہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ملک کا بادشاہ گرفتا ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو پیش کیا گیا اور وہ ڈر کر بید کی طرح کانپتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس قدر خوف مت کر۔ میں کیا ہوں ایک بڑھیا کا بیٹا ہوں جو باسی گوشت کھایا کرتی تھی۔ سو ایسا خاوند جو دنیا کا بھی بادشاہ اور آخرت کا بھی بادشاہ ہو وہ اگر فخر کی جگہ نہیں تو اور کون ہوسکتا ہے اور زینب وہ تھی جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کے ساتھ آپ کی شادی کی تھی اور آپؐ کی دست پروردہ تھیں اور ایک یتیم لڑکی آپؐ کے عزیزوں میں سے تھی جس کو آپؐ نے پالا تھا وہ دیکھتی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں عزت کے تخت پر بیٹھی ہیں اور میں ایک غلام کی جورو ہوں اسی وجہ سے دن رات تکرار رہتا تھا اور قرآن شریف بیان فرماتا ہے کہ آنحضرتؐ اس رشتہ سے طبعاً نفرت رکھتے تھے اور روز کی لڑائی دیکھ کر جانتے تھے کہ اس کا انجام ایک دن طلاق ہے۔ چونکہ یہ آیتیں پہلے سے وارد ہو چکی تھیں کہ منہ بولا بیٹا دراصل بیٹا نہیں ہوسکتا تھا اس لئے آنحضرتؐ کی فراست اس بات کو جانتی تھی کہ اگر زید نے طلاق دے دی تو غالباً خدا تعالیٰ مجھے اس رشتہ کے لئے حکم کرے گا تا لوگوں کے لئے نمونہ قائم کرے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ قصہ قرآن شریف میں بعینہٖ درج ہے۔

پھر پلید طبع لوگوں نے جن کی بدذاتی ہمیشہ افترا کرنے کی خواہش رکھتی ہے خلافِ واقعہ یہ باتیں بنائیں کہ آنحضرتؐ خود زینب کے خواہشمند ہوئے حالانکہ زینب کچھ دور سے نہیں تھی کوئی ایسی عورت نہیں تھی جس کو آنحضرتؐ نے کبھی نہ دیکھا ہو۔ یہ زینب وہی تو تھی جو آنحضرتؐ کے گھر میں آپؐ کی آنکھوں کے آگے جوان ہوئی اور آپؐ نے خود نہ کسی اور نے اس کا نکاح اپنے غلام آزاد کردہ سے کر دیا اور یہ نکاح اس کو اور اس کے بھائی کو اوائل میں نامنظور تھا اور آپ نے بہت کوشش کی یہاں تک کہ وہ راضی ہوگئی۔ ناراضگی کی یہی وجہ تھی کہ زید غلام آزاد کردہ تھا۔ پھر یہ کس قدر بے ایمانی اور بدذاتی ہے جو واقعاتِ صحیحہ کو چھوڑ کر افترا کئے جائیں۔ قرآن موجود بخاری، مسلم ہے نکالو کہاں سے یہ بات نکلتی ہے کہ آنحضرتؐ زینب کے نکاح کو خود اپنے لئے چاہتے تھے۔ کیا آپؐ نے زید کو کہا تھا کہ تو طلاق دے دے تا میرے نکاح میں آوے بلکہ آپؐ تو

بار بار طلاق دینے سے ہمدردی کے طور پر منع کرتے تھے۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو ہم نے قرآن اور حدیث میں سے لکھی ہیں لیکن اگر کوئی اس کے برخلاف مدعی ہے تو ہماری کتب موصوف سے اپنے دعویٰ کو ثابت کرے ورنہ بے ایمان اور خیانت پیشہ ہے اور یہ بات جو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نکاح پڑھ دیا اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ نکاح میری مرضی کے موافق ہے اور میں نے ہی چاہا ہے کہ ایسا ہو تا مومنوں پر حرج باقی نہ رہے۔

یہ معنے تو نہیں کہ اب زینب کی خلافِ مرضی اس پر قبضہ کرلو ظاہر ہے کہ نکاح پڑھنے والے کا یہ منصب تو نہیں ہوتا کہ کسی عورت کو اس کے خلاف مرضی کے مرد کے حوالہ کر دیوے بلکہ وہ تو نکاح پڑھنے میں ان کی مرضی کا تابع ہوتا ہے سو خدا تعالیٰ کا نکاح یہی ہے کہ زینب کے دل کو اس کی طرف جھکا دیا اور آپ کو فرما دیا کہ ایسا کرنا ہوگا تا امت پر حرج نہ رہے۔ اب بھی اگر کوئی باز نہ آوے تو ہمیں قرآن اور بخاری اور مسلم سے اپنے دعوے کا ثبوت دکھلاوے کیونکہ ہمارے دین کا تمام مدار قرآن شریف پر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث قرآن کی مفسر ہے اور جو قول ان دونوں کے مخالف ہو وہ مردود اور شیطانی قول ہے۔ یوں تو تہمت لگانا سہل ہے مثلاً اگر کسی آریہ کو کوئی کہے کہ تیری والدہ کا تیرے والد سے اصل نکاح نہیں ہوا جبراً اس کو پکڑ لائے تھے اور اس پر کوئی اطمینان بخش ثبوت نہ دے اور مخالفانہ ثبوت کو قبول نہ کرے تو ایسے بدذات کا کیا علاج ہے۔ ایسا ہی وہ شخص بھی اس سے کچھ کم بدذات نہیں جو مقدس اور راستبازوں پر بے ثبوت تہمت لگاتا ہے۔ ایماندار آدمی کا یہ شیوہ ہونا چاہیے کہ پہلے ان کتابوں کا صحیح صحیح حوالہ دے جو مقبول ہوں اور پھر اعتراض کرے ورنہ ناحق کسی مقدس کی بے عزتی کر کے اپنی ناپاکی فطرت کی ظاہر نہ کرے۔

(آریہ دھرم، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۵۵ تا ۶۳)

متبنّٰی کی مطلقہ سے نکاح کرنا زنا نہیں۔ صرف منہ کی بات سے نہ کوئی بیٹا بن سکتا ہے اور نہ کوئی باپ بن سکتا ہے اور نہ ماں بن سکتی ہے مثلاً اگر کوئی عیسائی غصہ میں آکر اپنی بیوی کو ماں کہہ دے تو کیا وہ اس پر حرام ہو جائے گی اور طلاق واقع ہو جائے گی بلکہ وہ بدستور اسی ماں سے مجامعت کرتا رہے گا۔ پس جس شخص نے یہ کہا کہ طلاق بغیر زنا کے نہیں ہو سکتی اس نے خود قبول کرلیا کہ صرف اپنے منہ سے کسی کو ماں یا باپ یا بیٹا کہہ دینا کچھ چیز نہیں ورنہ وہ ضرور کہہ دیتا کہ ماں کہنے سے طلاق پڑ جاتی ہے مگر شاید کہ مسیح کو وہ عقل نہ تھی جو فتح مسیح کو ہے۔ اب تم پر فرض ہے کہ اس بات کا ثبوت انجیل میں سے دو کہ اپنی عورت کو ماں کہنے سے طلاق پڑ جاتی ہے یا یہ کہ اپنے مسیح کی تعلیم کو ناقص مان لو یا یہ ثبوت دو کہ بائبل کی رو سے متبنّٰی فی الحقیقت بیٹا ہو جاتا

اور بیٹے کی طرح وارث ہو جاتا ہے۔ (نور القرآن نمبر ۲، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۳۸۸، ۳۸۹)

الَّذِیۡنَ یُبَلِّغُوۡنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَ یَخۡشَوۡنَہٗ وَ لَا یَخۡشَوۡنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیۡبًا ﴿۴۰﴾

اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر جو اس کے پیغام پہنچاتے ہیں وہ پیغام رسانی میں کسی سے نہیں ڈرتے۔
(جنگِ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۳۵)

وہ ایمان دار بھی ہیں کہ بہادری سے دین کی راہ میں اپنی جانیں دے دیتے ہیں اور کسی سے نہیں ڈرتے۔ (جنگِ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۷۶)

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِکُمۡ وَ لٰکِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا ﴿۴۱﴾

اگر یہ عذر پیش ہو کہ بابِ نبوت مسدود ہے اور وحی جو انبیاء پر نازل ہوتی ہے اس پر مہر لگ چکی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نہ من کل الوجوہ بابِ نبوت مسدود ہوا ہے اور نہ ہر یک طور سے وحی پر مہر لگائی گئی ہے بلکہ جزئی طور پر وحی اور نبوت کا اس امت مرحومہ کے لئے ہمیشہ دروازہ کھلا ہے مگر اس بات کو بحضور دل یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ نبوت جس کا ہمیشہ کے لئے سلسلہ جاری رہے گا نبوتِ تامہ نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں وہ صرف ایک جزئی نبوت ہے جو دوسرے لفظوں میں محدثیت کے اسم سے موسوم ہے جو انسانِ کامل کی اقتداء سے ملتی ہے جو مستجمع جمیع کمالات نبوتِ تامہ ہے یعنی ذاتِ ستودہ صفات حضرت سیدنا و مولانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (توضیح مرام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۶۰)

فَاعۡلَمۡ اَرۡشَدَکَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَنَّ النَّبِیَّ مُحَدَّثٌ وَّالۡمُحَدَّثُ نَبِیٌّ بِاِعۡتِبَارِ حُصُوۡلِ نَوۡعٍ مِّنۡ اَنۡوَاعِ النُّبُوَّۃِ وَ قَدۡ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ لَمۡ یَبۡقَ مِنَ النُّبُوَّۃِ اِلَّا الۡمُبَشِّرَاتُ اَیۡ لَمۡ یَبۡقَ مِنۡ اَنۡوَاعِ

پس جان لے اللہ تعالیٰ تجھے ہدایت دے کہ نبی محدث ہوتا ہے اور محدث نبوت کی انواع میں سے ایک نوع کے حصول کی وجہ سے نبی ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب نبوت میں سے صرف اس کی ایک نوع باقی رہ گئی ہے اور وہ رؤیا

النُّبُوَّتِ اِلَّا نَوْعٌ وَّاحِدٌ وَهِيَ الْمُبَشِّرَاتُ
مِنْ اَقْسَامِ الرُّؤْيَا الصَّادِقَةِ وَالْمُكَاشَفَاتِ
الصَّحِيْحَةِ وَ الْوَحْيُ الَّذِيْ يَنْزِلُ عَلٰى
خَوَاصِّ الْاَوْلِيَآءِ وَالنُّوْرُ الَّذِي يَتَجَلّٰى عَلٰى
قُلُوْبِ قَوْمٍ مُّوْجَعٍ۔ فَانْظُرْ اَيُّهَا النَّاقِدُ
الْبَصِيْرُ اَيُفْهَمُ مِنْ هٰذَا سَدُّ بَابِ النُّبُوَّةِ
عَلٰى وَجْهٍ كُلِّيٍّ بَلِ الْحَدِيْثُ يَدُلُّ عَلٰى اَنَّ
النُّبُوَّةَ التَّامَّةَ الْحَامِلَةَ لِوَحْيِ الشَّرِيْعَةِ قَدِ
انْقَطَعَتْ وَلٰكِنَّ النُّبُوَّةَ الَّتِيْ لَيْسَ فِيْهَا اِلَّا
الْمُبَشِّرَاتُ فَهِيَ بَاقِيَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا
انْقِطَاعَ لَهَا اَبَدًا۔ وَ قَدْ عَلِمْتَ وَ قَرَأْتَ فِيْ
كُتُبِ الْحَدِيْثِ اَنَّ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةَ جُزْءٌ مِّنْ
سِتَّةٍ وَّاَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ اَيْ مِنَ
النُّبُوَّةِ التَّامَّةِ فَلَمَّا كَانَ لِلرُّؤْيَا نَصِيْبًا مِّنْ
هٰذِهِ الْمَرْتَبَةِ فَكَيْفَ الْكَلَامُ الَّذِيْ يُوْحٰى
مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى اِلٰى قُلُوْبِ الْمُحَدَّثِيْنَ
فَاعْلَمْ اَيَّدَكَ اللّٰهُ اَنَّ حَاصِلَ كَلَامِنَا اَنَّ
اَبْوَابَ النُّبُوَّةِ الْجُزْئِيَّةِ مَفْتُوْحَةٌ اَبَدًا وَّلَيْسَ
فِيْ هٰذَا النَّوْعِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ اَوِ الْمُنْذِرَاتُ
مِنَ الْاُمُوْرِ الْمُغِيْبَةِ اَوِ اللَّطَائِفِ الْقُرْاٰنِيَّةِ
وَالْعُلُوْمِ اللَّدُنِّيَّةِ۔ وَ اَمَّا النُّبُوَّةُ الَّتِيْ تَامَّةٌ
كَامِلَةٌ جَامِعَةٌ لِجَمِيْعِ كَمَالَاتِ الْوَحْيِ فَقَدْ
اٰمَنَّا بِانْقِطَاعِهَا مِنْ يَّوْمٍ نَّزَلَ فِيْهِ۔ مَا كَانَ

صادقہ اور مکاشفاتِ صحیحہ کی اقسام میں سے مبشرات ہیں
اور وہ وحی ہے جو خاص خاص اولیاء پر نازل ہوتی ہے اور
وہ وہ نور ہے جو دردمند قوم کے دلوں پر اپنی تجلی فرماتا
ہے۔ پس اے کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے والے ا
ور بصیرت رکھنے والے سن کیا اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے
کہ بابِ نبوت کلی طور پر بند ہے بلکہ حدیث اس بات پر
دلالت کرتی ہے کہ ایسی نبوتِ کاملہ جو وحی شریعت کی
حامل ہو وہ منقطع ہو چکی ہے لیکن ایسی نبوت جس
میں صرف مبشرات ہوں وہ قیامت تک باقی ہے وہ کبھی
منقطع نہیں ہوگی اور تجھے اس بات کا علم ہے اور تو نے
کتبِ حدیث میں بھی یہ پڑھا ہے کہ رؤیا صالحہ نبوت
یعنی نبوتِ تامہ کا چھیالیسواں حصہ ہے۔ پس جب رؤیا
صادقہ کو یہ مرتبہ حاصل ہے تو پھر وہ کلام کتنا عظیم ہوگا جو
خدا تعالیٰ کی طرف سے محدثین کے قلوب پر نازل کیا
جاتا ہے۔ پس جان لے اللہ تعالیٰ تیری مدد فرمائے کہ
ہمارے کلام کا ماحصل یہ ہے کہ نبوت جزئیہ کے
دروازے ہمیشہ کے لئے کھلے ہیں اور اس نوع میں وہ
مبشرات اور منذرات آتی ہیں جو امورِ غیبیہ پر
مشتمل ہوتی ہیں یا لطائفِ قرآنی اور علوم لدنی سے
ان کا تعلق ہوتا ہے لیکن نبوتِ تامہ کاملہ تامہ جو وحی
کے تمام کمالات کی جامع ہے ہم اس کے منقطع ہونے
پر اس دن سے ایمان لاتے ہیں جب سے یہ آیتِ
قرآنی نازل ہوئی مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ

مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ

(توضیح مرام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۶۰، ۶۱)

رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔

(ترجمہ از مرتب)

کیوں کر ممکن تھا کہ خاتم النبیین کے بعد کوئی اور نبی اسی مفہوم تام اور کامل کے ساتھ جو نبوت تامہ کی شرائط میں سے ہے آسکتا۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ ایسے نبی کی نبوت تامہ کے لوازم جو وحی اور نزول جبرئیل ہے اس کے وجود کے ساتھ لازم ہونی چاہیے کیونکہ حسبِ تصریح قرآن کریم رسول اسی کو کہتے ہیں جس نے احکام وعقائد دین جبرئیل کے ذریعہ سے حاصل کئے ہوں لیکن وحی نبوت پر تو تیرہ سو برس سے مہر لگ گئی ہے کیا یہ مہر اس وقت ٹوٹ جائے گی اور اگر کہو کہ مسیح ابنِ مریم نبوت تامہ سے معزول کر کے بھیجا جائے گا تو اس سزا کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بے استحقاق معبود قرار دیا گیا تھا سو خدائے تعالیٰ نے چاہا کہ اس کی سزا میں نبوت سے اس کو الگ کر دیا جائے اور وہ زمین پر آ کر دوسروں کے پیرو بنیں اَوروں کے پیچھے نماز پڑھیں اور امامِ اعظم کی طرح صرف اجتہاد سے کام لیں اور حنفی الطریق ہو کر حنفی مذہب کی تائید کریں لیکن یہ جواب معقول نہیں ہے خدائے تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس الزام سے ان کو بری کر دیا ہے اور ان کی نبوت کو ایک دائمی نبوت قرار دیا ہے۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۳۸۷)

خاتم النبیین کے بعد مسیح ابن مریم رسول کا آنا فسادِ عظیم کا موجب ہے۔ اس سے یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ وحیِ نبوت کا سلسلہ پھر جاری ہو جائے گا اور یا یہ قبول کرنا پڑے گا کہ خدائے تعالیٰ مسیح ابنِ مریم کو لوازمِ نبوت سے الگ کر کے اور محض ایک امتی بنا کر بھیجے گا اور یہ دونوں صورتیں ممتنع ہیں۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۳۹۳)

خاتم النبیین ہونا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی دوسرے نبی کے آنے سے مانع ہے۔ ہاں ایسا نبی جو مشکوٰۃ نبوت محمدیہ سے نور حاصل کرتا ہے اور نبوتِ تامہ نہیں رکھتا جس کو دوسرے لفظوں میں محدث بھی کہتے ہیں وہ اس تحدید سے باہر ہے کیونکہ وہ بباعث اتباع اور فنافی الرسول ہونے کے جناب ختم المرسلین کے وجود میں ہی داخل ہے جیسے جز کل میں داخل ہوتی ہے۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۱۰، ۴۱۱)

اگرچہ ایک ہی دفعہ وحی کا نزول فرض کیا جائے اور صرف ایک ہی فقرہ حضرت جبرئیل لاویں اور پھر چپ ہو جاویں یہ امر بھی ختمِ نبوت کا منافی ہے کیونکہ جب ختمیت کی مہر ہی ٹوٹ گئی اور وحیِ رسالت پھر نازل ہونی

شروع ہوگئی تو پھر تھوڑا یا بہت نازل ہونا برابر ہے۔ ہر یک دانا سمجھ سکتا ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ صادق الوعد ہے اور جو آیت خاتم النبیین میں وعدہ دیا گیا ہے اور جو حدیثوں میں بتصریح بیان کیا گیا ہے کہ اب جبرئیل بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کے لئے وحیِ نبوت کے لانے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ تمام باتیں سچ اور صحیح ہیں تو پھر کوئی شخص بحیثیت رسالت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہرگز نہیں آ سکتا۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۱۱، ۴۱۲)

یہ بات مستلزم محال ہے کہ خاتم النبیین کے بعد پھر جبرئیل علیہ السلام کی وحیِ رسالت کے ساتھ زمین پر آمد ورفت شروع ہوجائے اور ایک نئی کتاب اللہ گو مضمون میں قرآن شریف سے توارد رکھتی ہو پیدا ہوجائے اور جو امر مستلزم محال ہو وہ محال ہوتا ہے۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۱۴)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی مرد کا باپ نہیں ہے مگر وہ رسول اللہ ہے اور ختم کرنے والا ہے نبیوں کا۔ یہ آیت بھی صاف دلالت کر رہی ہے کہ بعد ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی رسول دنیا میں نہیں آئے گا۔ پس اس سے بھی بکمال وضاحت ثابت ہے کہ مسیح ابنِ مریم رسول اللہ دنیا میں آنہیں سکتا کیونکہ مسیح ابنِ مریم رسول ہے اور رسول کی حقیقت اور ماہیت میں یہ امر داخل ہے کہ دینی علوم کو بذریعہ جبرئیل حاصل کرے اور ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ اب وحی رسالت تا قیامت منقطع ہے۔ اس سے ضروری طور پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ مسیح ابنِ مریم ہرگز نہیں آئے گا اور یہ امر خود مستلزم اس بات کو ہے کہ وہ مر گیا۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۳۱، ۴۳۲)

قرآن کریم بعد خاتم النبیین کے کسی رسول کا آنا جائز نہیں رکھتا خواہ وہ نیا رسول ہو یا پرانا ہو کیونکہ رسول کو علمِ دین بتوسط جبرئیل ملتا ہے اور بابِ نزول جبرائیل بہ پیرایہ وحی رسالت مسدود ہے اور یہ بات خود ممتنع ہے کہ دنیا میں رسول تو آوے مگر سلسلہ وحی رسالت نہ ہو۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۵۱۱)

محدَّث نبی بالقوّہ ہوتا ہے اور اگر باب نبوت مسدود نہ ہوتا تو ہر یک محدَّث اپنے وجود میں قوت اور استعداد نبی ہوجانے کی رکھتا تھا اور اسی قوت اور استعداد کے لحاظ سے محدَّث کا حمل نبی پر جائز ہے یعنی کہہ سکتے ہیں کہ اَلْمُحَدَّثُ نَبِیٌّ جیسا کہ کہہ سکتے ہیں کہ اَلْعِنَبُ خَمْرٌ نَظْرًا عَلَى الْقُوَّةِ وَالْاِسْتِعْدَادِ وَ مَثَلُ هٰذَا الْحَمْلِ شَائِعٌ مُّتَعَارَفٌ فِيْ عِبَارَاتِ الْقَوْمِ وَ قَدْ جَرَتِ الْمُحَاوَرَاتُ عَلٰى ذَالِكَ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلٰى كُلِّ ذَكِيٍّ عَالِمٍ مُّطَّلِعٍ عَلٰى كُتُبِ الْاَدَبِ وَالْكَلَامِ وَالتَّصَوُّفِ اور اسی حمل کی طرف اشارہ ہے جو

اللہ جلّ شانہٗ نے اس قراءت کو جو وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ وَّ لَا مُحَدَّثٍ ہے مختصر کر کے قراءت ثانی میں صرف یہ الفاظ کافی قرار دیئے کہ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ ۔
(آئینہ کمالاتِ اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۲۳۸، ۲۳۹)

مَا كَانَ اللّٰهُ اَنۡ يُّرۡسِلَ نَبِيًّا بَعۡدَ نَبِيِّنَا خَاتَمِ النَّبِيِّيۡنَ۔ وَ مَا كَانَ اَنۡ يُّحۡدِثَ سِلۡسِلَةَ النُّبُوَّةِ ثَانِيًا بَعۡدَ انۡقِطَاعِهَا وَ يَنۡسَخَ بَعۡضَ اَحۡكَامِ الۡقُرۡاٰنِ وَ يَزِيۡدَ عَلَيۡهَا وَ يُخۡلِفَ وَعۡدَهٗ وَ يَنۡسٰى اِكۡمَالَهُ الۡفُرۡقَانَ وَ يُحۡدِثَ الۡفِتَنَ فِي الدِّيۡنِ الۡمَتِيۡنِ۔ اَلَا تَقۡرَءُوۡنَ فِيۡ اَحَادِيۡثِ الۡمُصۡطَفٰى سَلَّمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَ صَلّٰى۔ اَنَّ الۡمَسِيۡحَ يَكُوۡنُ اَحَدًا مِّنۡ اُمَّتِهٖ وَ يَتَّبِعُ جَمِيۡعَ اَحۡكَامِ مِلَّتِهٖ وَ يُصَلِّيۡ مَعَ الۡمُصَلِّيۡنَ۔
(آئینہ کمالاتِ اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۳۷۷)

اللہ تعالیٰ ہمارے نبی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں بھیجے گا نہ سلسلہ نبوت کے منقطع ہونے کے بعد اسے دوبارہ جاری کرے گا اور نہ ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ قرآن کریم کے بعض احکام کو منسوخ کرے یا ان میں اضافہ کرے اور اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کرے اور بھول جائے کہ وہ قرآن مجید کو کامل کر چکا ہے اور دینِ متین میں فتنے پیدا ہونے کی راہ کھول دے۔ کیا تم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نہیں پڑھتے کہ آنے والا مسیح آپ کی ہی امت کا ایک فرد ہوگا اور آپ کے دین کے تمام احکام کی اتباع کرے گا اور مسلمانوں کے طریق پر نماز ادا کرے گا۔ (ترجمہ از مرتب)

قرآن کریم میں ایک جگہ رسل کے لفظ کے ساتھ بھی مسیح موعود کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ سوال کہ ان ہی الفاظ کے ساتھ جو احادیث میں آئے ہیں کیوں قرآن میں ذکر نہیں کیا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ تا پڑھنے والوں کو دھوکا نہ لگ جاوے کہ مسیح موعود سے مراد درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں جن پر انجیل نازل ہوئی تھی اور ایسا ہی دجال سے کوئی خاص مفسد مراد ہے سو خدا تعالیٰ نے فرقان حمید میں ان تمام شبہات کو دور کر دیا۔ اس طرح پر کہ اول نہایت تصریح اور توضیح سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کی خبر دی جیسا کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيۡتَنِيۡ كُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِيۡبَ عَلَيۡهِمۡ (المائدۃ: ۱۱۸) سے ظاہر ہے اور پھر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم الانبیاء ہونا بھی ظاہر کر دیا جیسا کہ فرمایا وَ لٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۔
(شہادۃ القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۶۱)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم محض اُمّیوں کے لئے نہیں بھیجے گئے بلکہ ہر یک رُتبہ اور طبقہ کے انسان اُن کی اُمّت

میں داخل ہیں۔ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف:۱۵۹) پس اس آیت سے ثابت ہے کہ قرآن کریم ہر یک استعداد کی تکمیل کے لئے نازل ہوا ہے اور درحقیقت آیت وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ میں بھی اِسی کی طرف اشارہ ہے۔

(کرامات الصادقین، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۶۱)

جیسا کہ یہ عقیدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر چڑھنے کا قرآن شریف کے بیان سے مخالف ہے ایسا ہی اُن کے آسمان سے اُترنے کا عقیدہ بھی قرآن کے بیان سے منافات کلی رکھتا ہے کیونکہ قرآن شریف جیسا کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ (المائدۃ:۱۱۸) اور آیت قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (اٰلِ عمران:۱۴۵) میں حضرت عیسیٰ کو مار چکا ہے۔ ایسا ہی آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (المائدۃ:۴) اور آیت وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ میں صریح نبوت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر چکا ہے اور صریح لفظوں میں فرما چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں جیسا کہ فرمایا ہے وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ لیکن وہ لوگ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ دنیا میں واپس لاتے ہیں اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ بدستور اپنی نبوت کے ساتھ دنیا میں آئیں گے اور برابر پینتالیس برس تک اُن پر جبرئیل علیہ السلام وحی نبوت لے کر نازل ہوتا رہے گا۔ اب بتلاؤ کہ اُن کے عقیدہ کے موافق ختم نبوت اور ختم وحی نبوت کہاں باقی رہا بلکہ ماننا پڑا کہ خاتم الانبیاء حضرت عیسیٰ ہیں۔

(تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۱۷۳، ۱۷۴)

إِذَا كَانَ نَبِيُّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاتَمَ الْأَنْبِيَآءِ فَلَا شَكَّ أَنَّهٗ مَنْ اٰمَنَ بِنُزُوْلِ الْمَسِيْحِ الَّذِيْ هُوَ نَبِيٌّ مِّنْ بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ فَقَدْ كَفَرَ بِخَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ۔ فَيَا حَسْرَةً عَلٰى قَوْمٍ يَقُوْلُوْنَ إِنَّ الْمَسِيْحَ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ نَازِلٌ بَعْدَ وَفَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَيَقُوْلُوْنَ إِنَّهٗ يَجِيْئُ وَيَنْسَخُ مِنْ بَعْضِ أَحْكَامِ الْفُرْقَانِ وَيَزِيْدُ عَلَيْهَا وَيَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً وَّهُوَ خَاتَمُ الْمُرْسَلِيْنَ۔

جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں تو وہ شخص جو اس مسیح کے نزول کو مانتا ہے جو بنی اسرائیل کا ایک نبی ہے تو بے شک وہ خاتم النبیین کی نص کا منکر ہو گیا۔ پس افسوس ہے ان لوگوں پر جو یہ کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسیح عیسیٰ بن مریم نازل ہوگا۔ نیز وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ آکر قرآن کریم کے بعض احکام کو منسوخ کرے گا اور بعض پر اضافے کرے گا اور اس پر چالیس سال تک وحی نازل ہوتی رہے گی اور وہ خاتم المرسلین ہوگا حالانکہ

وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ" وَسَمَّاهُ اللّٰهُ تَعَالٰى خَاتَمَ الْأَنْبِيَآءِ فَمِنْ أَيْنَ يَظْهَرُ نَبِيٌّ بَعْدَهٗ؟

(تحفہ بغداد، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۳۴)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور آپؐ کا نام اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء رکھا ہے۔ پھر آپ کے بعد کوئی نبی کیسے آ سکتا ہے۔

(ترجمہ از مرتب)

وَإِنَّ الْأَنْبِيَآءَ لَا يُنْقَلُوْنَ مِنْ هٰذِهِ الدُّنْيَا إِلٰى دَارِ الْاٰخِرَةِ إِلَّا بَعْدَ تَكْمِيْلِ رِسَالَاتٍ قَدْ أُرْسِلُوْا لِتَبْلِيْغِهَا، وَلِكُلِّ بُرْهَةٍ مِّنَ الزَّمَانِ مُنَاسَبَةٌ بِوُجُوْدِ نَبِيٍّ، فَيُرْسَلُ كُلُّ نَبِيٍّ بِرِعَايَةِ الْمُنَاسَبَاتِ، وَإِلٰى هٰذَا إِشَارَةٌ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ. فَلَوْ لَمْ يَكُنْ لِرَسُوْلِنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ كِتَابِ اللّٰهِ الْقُرْاٰنِ مُنَاسَبَةٌ لِّجَمِيْعِ الْأَزْمِنَةِ الْاٰتِيَةِ وَأَهْلِهَا عِلَاجًا وَّمُدَاوَاةً لَمَا أُرْسِلَ ذٰلِكَ النَّبِيُّ الْعَظِيْمُ الْكَرِيْمُ لِإِصْلَاحِهِمْ وَمُدَاوَاتِهِمْ لِلدَّوَامِ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ. فَلَا حَاجَةَ لَنَا إِلٰى نَبِيٍّ بَعْدَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ ، وَقَدْ أَحَاطَتْ بَرَكَاتُهٗ كُلَّ أَزْمِنَةٍ، وَفُيُوْضُهٗ وَارِدَةٌ عَلٰى قُلُوْبِ الْأَوْلِيَآءِ وَالْأَقْطَابِ وَالْمُحَدَّثِيْنَ، بَلْ عَلَى الْخَلْقِ كُلِّهِمْ، وَإِنْ لَّمْ يَعْلَمُوْا أَنَّهَا فَائِضَةٌ مِّنْهُ، فَلَهُ الْمِنَّةُ الْعُظْمٰى عَلَى النَّاسِ أَجْمَعِيْنَ.

(حمامۃ البشریٰ، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۲۴۳، ۲۴۴)

انبیاء کا اس وقت دنیا سے دارُ الآخرت کی طرف انتقال ہوتا ہے جب وہ اس پیغام کی تبلیغ کو مکمل کر لیتے ہیں جس کے لئے انہیں بھیجا گیا تھا۔ اور ہر زمانے کو نبیٔ وقت سے ایک مناسبت ہوتی ہے پس اللہ تعالیٰ ہر نبی کو مناسبت کی رعایت کے ساتھ مبعوث کرتا ہے اس کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ قول اشارہ کرتا ہے وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ اگر ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور خدا کی کتاب قرآن کریم کو تمام آئندہ زمانوں کے لوگوں سے علاج اور مداوات کے لحاظ سے مناسبت نہ ہوتی تو ہمارے یہ عظیم نبی کریم لوگوں کی اصلاح اور ان کے علاج کے لئے قیامت تک کے لئے نہ بھیجے جاتے۔ پس ہمیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور نبی کی ضرورت نہیں کیونکہ آپؐ کی برکات تمام زمانوں پر محیط ہیں اور آپؐ کے فیوض اولیاء، اقطاب اور محدثین بلکہ تمام مخلوق کے قلوب پر جاری ہیں۔ اگرچہ وہ اس بات کا علم نہیں رکھتے کہ یہ فیوض آپؐ ہی کی طرف سے آ رہے ہیں پس آپؐ کا تمام لوگوں پر عظیم احسان ہے۔ (ترجمہ از مرتب)

وَأَمَّا ذِكْرُ نُزُوْلِ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ فَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَّحْمِلَ هٰذَا الْاِسْمَ الْمَذْكُوْرَ فِي الْأَحَادِيْثِ عَلٰى ظَاهِرِ مَعْنَاهُ، لِأَنَّهُ يُخَالِفُ قَوْلَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ أَلَا تَعْلَمُ أَنَّ الرَّبَّ الرَّحِيْمَ الْمُتَفَضِّلَ سَمّٰى نَبِيَّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاتَمَ الْأَنْبِيَآءِ بِغَيْرِ اسْتِثْنَآءٍ، وَفَسَّرَهُ نَبِيُّنَا فِي قَوْلِهٖ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ بِبَيَانٍ وَّاضِحٍ لِّلطَّالِبِيْنَ؟ وَلَوْ جَوَّزْنَا ظُهُوْرَ نَبِيٍّ بَعْدَ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَجَوَّزْنَا انْفِتَاحَ بَابِ وَحْيِ النُّبُوَّةِ بَعْدَ تَغْلِيْقِهَا، وَهٰذَا خُلْفٌ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ. وَكَيْفَ يَجِيْءُ نَبِيٌّ بَعْدَ رَسُوْلِنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدِ انْقَطَعَ الْوَحْيُ بَعْدَ وَفَاتِهٖ وَخَتَمَ اللّٰهُ بِهِ النَّبِيِّيْنَ. أَنَعْتَقِدُ بِأَنَّ عِيْسَى الَّذِيْ أُنْزِلَ عَلَيْهِ الْإِنْجِيْلُ هُوَ خَاتَمُ الْأَنْبِيَآءِ، لَا رَسُوْلُنَا صلعم وَ قَدِ انْقَطَعَ الْوَحْيُ بَعْدَ وَفَاتِهٖ وَ خَتَمَ اللّٰهُ بِهِ النَّبِيِّيْنَ. أَنَعْتَقِدُ أَنَّ ابْنَ مَرْيَمَ يَأْتِيْ وَيَنْسَخُ بَعْضَ أَحْكَامِ الْقُرْاٰنِ وَيَزِيْدُ بَعْضًا، فَلَا يَقْبَلُ الْجِزْيَةَ وَلَا يَضَعُ الْحَرْبَ، وَقَدْ أَمَرَ اللّٰهُ بِأَخْذِهَا وَأَمَرَ بِوَضْعِ الْحَرْبِ بَعْدَ أَخْذِ الْجِزْيَةِ؟ أَلَا تَقْرَأُ اٰيَةَ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ [1]

اور جو عیسیٰ بن مریم کے نزول کا ذکر ہے پس کسی مومن کے لئے جائز نہیں کہ احادیث میں اس نام کو ظاہر پر محمول کرے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے خلاف ہے کہ ہم نے محمدؐ کو کسی مرد کا باپ نہیں بنایا ہاں وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اس محسن رب نے ہمارے نبی کا نام خاتم الانبیاء رکھا ہے اور کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا اور آنحضرتؐ نے طالبوں کے لئے بیان واضح سے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور اگر ہم آنحضرتؐ کے بعد کسی نبی کا ظہور جائز رکھیں تو لازم آتا ہے کہ وحی نبوت کے دروازہ کا انفتاح بھی بند ہونے کے بعد جائز خیال کریں اور یہ باطل ہے جیسا کہ مسلمانوں پر پوشیدہ نہیں اور آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی کیوں کر آوے حالانکہ آپؐ کی وفات کے بعد وحیٔ نبوت منقطع ہوگئی ہے اور آپ کے ساتھ نبیوں کو ختم کر دیا ہے۔ کیا ہم اعتقاد کر لیں کہ ہمارے نبی خاتم الانبیاء نہیں بلکہ عیسیٰ جو صاحبِ انجیل ہے وہ خاتم الانبیاء ہے، یا ہم یہ اعتقاد رکھیں کہ ابنِ مریم آکر قرآن کے بعض احکام کو منسوخ اور کچھ زیادہ کرے گا۔ اور نہ جزیہ لے گا اور نہ جنگ چھوڑے گا حالانکہ اللہ کا ارشاد ہے کہ جزیہ لے لو اور جزیہ لینے کے بعد جنگ چھوڑ دو۔ کیا تو یہ آیت نہیں پڑھتا کہ ذلت کے ساتھ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیویں۔ پس

[1] التوبة:۲۹

فَكَيْفَ يَنْسَخُ الْمَسِيْحُ مُحْكَمَاتِ الْفُرْقَانِ؟ وَكَيْفَ يَتَصَرَّفُ فِي الْكِتَابِ الْعَزِيْزِ وَيَطْمِسُ بَعْضَ أَحْكَامِهِ بَعْدَ تَكْمِيْلِهَا؟ فَأَعْجَبَنِيْ أَنَّهُمْ يَجْعَلُوْنَ الْمَسِيْحَ نَاسِخَ بَعْضِ أَحْكَامِ الْفُرْقَانِ وَلَا يَنْظُرُوْنَ إِلٰى اٰيَةِ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ[1] وَلَا يَتَفَكَّرُوْنَ أَنَّهٗ لَوْ كَانَتْ لِتَكْمِيْلِ دِيْنِ الْإِسْلَامِ حَالَةٌ مُنْتَظَرَةٌ يُرْجٰى ظُهُوْرُهَا بَعْدَ انْقِضَاءِ أُلُوْفٍ مِّنَ السَّنَوَاتِ، لَفَسَدَ مَعْنٰى إِكْمَالِ الدِّيْنِ وَالْفَرَاغِ مِنْ كَمَالِهٖ بِإِنْزَالِ الْقُرْاٰنِ، وَلَكَانَ قَوْلُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ مِنْ نَوْعِ الْكِذْبِ وَخِلَافِ الْوَاقِعَةِ، بَلْ كَانَ الْوَاجِبُ فِيْ هٰذِهِ الصُّوْرَةِ أَنْ يَّقُوْلَ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى إِنِّيْ مَا أَنْزَلْتُ هٰذَا الْقُرْاٰنَ كَامِلًا عَلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ بَلْ سَأُنْزِلُ بَعْضَ اٰيَاتِهٖ عَلٰى عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ، فَيَوْمَئِذٍ يَكْمُلُ الْقُرْاٰنُ وَمَا كَمَلَ إِلٰى هٰذَا الْحِيْنِ۔

(حمامة البشریٰ، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۲۰۰ تا ۲۰۲)

قرآن کے محکمات کو کیونکر مسیح منسوخ کرے گا۔ اور کتابِ عزیز میں کیوں کر تصرف کر کے کچھ احکام کو تکمیل کے بعد مٹا دے گا۔ میں تعجب کرتا ہوں کہ وہ کیوں کر فرقان کے بعض احکام کا مسیح کو ناسخ بتاتے ہیں، اور اس آیت کو نہیں دیکھتے کہ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا ہے، اگر دینِ اسلام کی تکمیل کے لئے کوئی حالتِ منتظرہ ہوتی جو کئی ہزار سال کے گزرنے کے بعد اس کے ظہور کی امید ہوسکتی تو قرآن کے ساتھ اکمالِ دین ہونا فاسد ہوجاتا اور خدا کا یہ کہنا کہ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا ہے جھوٹ اور خلافِ واقعہ ہوجاتا بلکہ اس صورت میں تو واجب تھا کہ یوں کہتا کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کو کامل نہیں اتارا بلکہ آخر زمانہ میں عیسیٰ ابن مریم پر اس کی کچھ آیات اتاروں گا پس اس دن قرآن کامل ہوگا اور ابھی کامل نہیں۔

(ترجمہ از مرتب)

کیا ایسا بد بخت مفتری جو خود رسالت اور نبوت کا دعویٰ کرتا ہے قرآن شریف پر ایمان رکھ سکتا ہے اور کیا ایسا وہ شخص جو قرآن شریف پر ایمان رکھتا ہے۔ اور آیت وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کو خدا کا کلام یقین رکھتا ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسول اور نبی ہوں۔ صاحب انصاف طلب کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس عاجز نے کبھی اور کسی وقت حقیقی طور پر نبوت یا رسالت کا دعویٰ نہیں کیا اور غیر حقیقی طور پر کسی لفظ کو استعمال کرنا اور لغت کے عام معنوں کے لحاظ سے اس کو بول چال میں لانا مستلزم کفر نہیں۔ مگر میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ اس میں عام مسلمانوں کو دھوکہ لگ جانے کا احتمال ہے۔ لیکن وہ

[1] المائدۃ: ۴

مکالمات اور مخاطبات جو اللہ جلّ شانہٗ کی طرف سے مجھ کو ملے ہیں جن میں یہ لفظ نبوت اور رسالت کا بکثرت آیا ہے ان کو میں بوجہ مامور ہونے کے مخفی نہیں رکھ سکتا۔ لیکن بار بار کہتا ہوں کہ ان الہامات میں جو لفظ مُرۡسَلۡ یا رسول یا نبی کا میری نسبت آیا ہے۔ وہ اپنے حقیقی معنوں پر مستعمل نہیں ہے۔ اور اصل حقیقت جس کی میں علی رؤس الاشہاد گواہی دیتا ہوں یہی ہے جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں۔ اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا نہ کوئی پرانا اور نہ کوئی نیا۔ وَمَنۡ قَالَ بَعۡدَ رَسُوۡلِنَا وَسَیِّدِنَا اِنِّیۡ نَبِیٌّ اَوۡ رَسُوۡلٌ عَلٰی وَجۡهِ الۡحَقِیۡقَةِ وَالۡاِفۡتِرَآءِ وَتَرَكَ الۡقُرۡآنَ وَاَحۡکَامَ الشَّرِیۡعَةِ الۡغَرَّاءِ فَهُوَ کَافِرٌ کَذَّابٌ۔ غرض ہمارا مذہب یہی ہے کہ جو شخص حقیقی طور پر نبوت کا دعویٰ کرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن فیوض سے اپنے تئیں الگ کر کے اور اس پاک سرچشمہ سے جدا ہو کر آپ ہی براہ راست نبی اللہ بننا چاہے تو وہ ملحد بے دین ہے اور غالباً ایسا شخص اپنا کوئی نیا کلمہ بنائے گا۔ اور عبادات میں کوئی نئی طرز پیدا کرے گا اور احکام میں کچھ تغیر و تبدل کر دے گا۔ پس بلاشبہ وہ مسیلمہ کذّاب کا بھائی ہے اور اس کے کافر ہونے میں کچھ شک نہیں۔ ایسے خبیث کی نسبت کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ قرآن شریف کو مانتا ہے۔

(انجامِ آتھم، روحانی خزائن جلد ۱۱ صفحہ ۲۷، ۲۸ حاشیہ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مقدسہ ایسے صاف تھے کہ خود اس مطلب کی طرف رہبری کرتے تھے کہ ہرگز اس پیشگوئی میں نبی اسرائیلی کا دوبارہ دنیا میں آنا مراد نہیں ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار فرما دیا تھا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور حدیث لَا نَبِیَّ بَعۡدِیۡ ایسی مشہور تھی کہ کسی کو اس کی صحت میں کلام نہ تھا اور قرآن شریف جس کا لفظ لفظ قطعی ہے اپنی آیت کریمہ وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ سے بھی اس بات کی تصدیق کرتا تھا کہ فی الحقیقت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہو چکی ہے۔ پھر کیوں کر ممکن تھا کہ کوئی نبی نبوت کے حقیقی معنوں کے رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تشریف لاوے۔ اس سے تو تمام تار و پود اسلام درہم برہم ہو جاتا تھا۔ اور یہ کہنا کہ ”حضرت عیسیٰ نبوت سے معطّل ہو کر آئے گا“۔ نہایت بے حیائی اور گستاخی کا کلمہ ہے۔ کیا خدا تعالیٰ کے مقبول اور مقرب نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے اپنی نبوت سے معطّل ہو سکتے ہیں؟ پھر کون سا راہ اور طریق تھا کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں آتے۔ غرض قرآن شریف میں خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خاتم النبیین رکھ کر اور حدیث میں خود آنحضرت نے لَا نَبِیَّ بَعۡدِیۡ فرما کر اس امر کا فیصلہ کر دیا تھا کہ کوئی نبی نبوت کے حقیقی

معنوں کے رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہیں آ سکتا اور پھر اس بات کو زیادہ واضح کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ آنے والا مسیح موعود اسی امت میں سے ہوگا۔ چنانچہ صحیح بخاری کی حدیث اِمَامُكُمْ مِنْكُمْ اور صحیح مسلم کی حدیث فَاَمَّكُمْ مِنْكُمْ جو عین مقام ذکر مسیح موعود میں ہے صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ وہ مسیح موعود اسی امت میں سے ہوگا۔

(کتاب البریہ، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۲۱۷، ۲۱۸ حاشیہ)

مسیح ابنِ مریم کے دوبارہ آنے کو یہ آیت بھی روکتی ہے اور ایسا ہی یہ حدیث بھی کہ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ۔ یہ کیوں کر جائز ہوسکتا ہے کہ باوجودیکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں پھر کسی وقت دوسرا نبی آجائے اور وحی نبوت شروع ہوجائے؟ (ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۴۷)

(حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ اپنے الہام قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کے متعلق فرماتے ہیں کہ)

یہ مقام ہماری جماعت کے لئے سوچنے کا مقام ہے کیونکہ اس میں خداوندِ قدیر فرماتا ہے کہ خدا کی محبت اسی سے وابستہ ہے کہ تم کامل طور پر پیرو ہو جاؤ اور تم میں ایک ذرہ مخالفت باقی نہ رہے اور اس جگہ جو میری نسبت کلامِ الٰہی میں رسول اور نبی کا لفظ اختیار کیا گیا ہے کہ یہ رسول اور نبی اللہ ہے یہ اطلاق مجاز اور استعارہ کے طور پر ہے کیونکہ جو شخص خدا سے براہِ راست وحی پاتا ہے اور یقینی طور پر خدا اس سے مکالمہ کرتا ہے جیسا کہ نبیوں سے کیا اس پر رسول یا نبی کا لفظ بولنا غیر موزوں نہیں ہے بلکہ یہ نہایت فصیح استعارہ ہے اسی وجہ سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور انجیل اور دانی ایل اور دوسرے نبیوں کی کتابوں میں بھی جہاں میرا ذکر کیا گیا ہے وہاں میری نسبت نبی کا لفظ بولا گیا ہے۔ (اربعین نمبر ۳ روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۴۱۳ حاشیہ)

اگر یہ کہا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو خاتم النبیین ہیں پھر آپ کے بعد اور نبی کس طرح آ سکتا ہے۔ اس کا جواب یہی ہے کہ بے شک اُس طرح سے تو کوئی نبی نیا ہو یا پُرانا نہیں آ سکتا جس طرح سے آپ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آخری زمانہ میں اُتارتے ہیں اور پھر اس حالت میں اُن کو نبی بھی مانتے ہیں بلکہ چالیس برس تک سلسلہ وحی نبوت کا جاری رہنا اور زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ جانا آپ لوگوں کا عقیدہ ہے۔ بے شک ایسا عقیدہ تو معصیت ہے اور آیت وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ اور حدیث لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ اس عقیدہ کے کذب صریح ہونے پر کامل شہادت ہے۔ لیکن ہم اس قسم کے عقائد کے

سخت مخالف ہیں اور ہم اس آیت پر سچا اور کامل ایمان رکھتے ہیں جو فرمایا کہ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ اور اس آیت میں ایک پیشگوئی ہے جس کی ہمارے مخالفوں کو خبر نہیں اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیشگوئیوں کے دروازے قیامت تک بند کر دیئے گئے اور ممکن نہیں کہ اب کوئی ہندو یا یہودی یا عیسائی یا کوئی رسمی مسلمان نبی کے لفظ کو اپنی نسبت ثابت کر سکے۔ نبوت کی تمام کھڑکیاں بند کی گئیں مگر ایک کھڑکی سیرت صدیقی کی کھلی ہے یعنی فنافی الرسول کی۔ پس جو شخص اس کھڑکی کی راہ سے خدا کے پاس آتا ہے اس پر ظلّی طور پر وہی نبوت کی چادر پہنائی جاتی ہے جو نبوت محمدی کی چادر ہے۔ اس لئے اس کا نبی ہونا غیرت کی جگہ نہیں کیونکہ وہ اپنی ذات سے نہیں بلکہ اپنے نبی کے چشمہ سے لیتا ہے اور نہ اپنے لئے بلکہ اسی کے جلال کے لئے۔ اس لئے اس کا نام آسمان پر محمد اور احمد ہے۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ محمد کی نبوت آخر محمد کو ہی ملی گو بروزی طور پر مگر نہ کسی اور کو۔ پس یہ آیت کہ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ اس کے معنے یہ ہیں کہ لَيْسَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِ الدُّنْيَا وَلٰكِنْ هُوَ اَبٌ لِرِجَالِ الْاٰخِرَةِ لِاَنَّهٗ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ وَلَا سَبِيْلَ اِلٰى فُيُوْضِ اللّٰهِ مِنْ غَيْرِ تَوَسُّطِهٖ غرض میری نبوت اور رسالت باعتبار محمد اور احمد ہونے کے ہے نہ میرے نفس کے رو سے اور یہ نام بحیثیت فنافی الرسول مجھے ملا لہٰذا خاتم النبیین کے مفہوم میں فرق نہ آیا لیکن عیسیٰؑ کے اُترنے سے ضرور فرق آئے گا۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ نبی کے معنے لغت کے رو سے یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے اطلاع پا کر غیب کی خبر دینے والا۔ پس جہاں یہ معنے صادق آئیں گے نبی کا لفظ بھی صادق آئے گا۔ اور نبی کا رسول ہونا شرط ہے کیونکہ اگر وہ رسول نہ ہو تو پھر غیب مصفّٰی کی خبر اس کو مل نہیں سکتی اور یہ آیت روکتی ہے لَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (الجن: ۲۸)۔ اب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان معنوں کے رو سے نبی سے انکار کیا جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہ اُمت مکالمات و مخاطبات الٰہیہ سے بے نصیب ہے کیونکہ جس کے ہاتھ پر اخبار غیبیہ منجانب اللہ ظاہر ہوں گے بالضرورت اس پر مطابق آیت لَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ (الجن: ۲۷) کے مفہوم نبی کا صادق آئے گا۔ اسی طرح جو خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجا جائے گا اسی کو ہم رسول کہیں گے۔ فرق درمیان یہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک ایسا نبی کوئی نہیں جس پر جدید شریعت نازل ہو یا جس کو بغیر توسط آنجناب اور ایسی فنافی الرسول کی حالت کے جو آسمان پر اس کا نام محمد اور احمد رکھا جائے یونہی نبوت کا لقب عنایت کیا جائے وَمَنِ ادَّعٰى

فَقَدْ كَفَرَ ۔اس میں اصل بھید یہی ہے کہ خاتم النبیّین کا مفہوم تقاضا کرتا ہے کہ جب تک کوئی پردہ مغایرت کا باقی ہے اس وقت تک اگر کوئی نبی کہلائے گا تو گویا اس مہر کو توڑنے والا ہوگا جو خاتم النبیّین پر ہے لیکن اگر کوئی شخص اُسی خاتم النبیّین میں ایسا گم ہو کہ بباعث نہایت اتحاد اور نفی غیریت کے اسی کا نام پا لیا ہو اور صاف آئینہ کی طرح محمدی چہرہ کا اس میں انعکاس ہو گیا ہو تو وہ بغیر مُہر توڑنے کے نبی کہلائے گا کیونکہ وہ محمد ہے گو ظلّی طور پر۔ پس باوجود اس شخص کے دعویٰ نبوت کے جس کا نام ظلّی طور پر محمد اور احمد رکھا گیا پھر بھی سیدنا محمدؐ خاتم النبیّین ہی رہا کیونکہ یہ محمد ثانی اُسی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر اور اسی کا نام ہے مگر عیسیٰ بغیر مُہر توڑنے کے آ نہیں سکتا۔ (ایک غلطی کا ازالہ، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۲۰۷ تا ۲۰۹)

نبوت کے معنے اظہار امرِ غیب ہے اور نبی ایک لفظ ہے جو عربی اور عبرانی میں مشترک ہے یعنی عبرانی میں اسی لفظ کو نابی کہتے ہیں اور یہ لفظ نابا سے مشتق ہے جس کے یہ معنے ہیں خدا سے خبر پا کر پیشگوئی کرنا اور نبی کے لئے شارع ہونا شرط نہیں ہے یہ صرف موہبت ہے جس کے ذریعہ سے امورِ غیبیہ کھلتے ہیں۔

(ایک غلطی کا ازالہ، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۲۰۹، ۲۱۰)

ان معنوں سے کہ میں نے اپنے رسول مقتدا سے باطنی فیوض حاصل کر کے اور اپنے لئے اس کا نام پا کر اس کے واسطہ سے خدا کی طرف سے علم غیب پایا ہے رسول اور نبی ہوں مگر بغیر کسی جدید شریعت کے۔ اس طور کا نبی کہلانے سے میں نے کبھی انکار نہیں کیا بلکہ انہی معنوں سے خدا نے مجھے نبی اور رسول کر کے پکارا ہے سو اب بھی میں ان معنوں سے نبی اور رسول ہونے سے انکار نہیں کرتا۔ اور میرا یہ قول کہ ’’من نیستم رسول و نیاوردہ اَم کتاب‘‘ اس کے معنے صرف اس قدر ہیں کہ میں صاحب شریعت نہیں ہوں۔ ہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے اور ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ میں باوجود نبی اور رسول کے لفظ کے ساتھ پکارے جانے کے خدا کی طرف سے اطلاع دیا گیا ہوں کہ یہ تمام فیوض بِلاواسطہ میرے پر نہیں ہیں بلکہ آسمان پر ایک پاک وجود ہے جس کا روحانی افاضہ میرے شامل حال ہے یعنی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس واسطہ کو ملحوظ رکھ کر اور اس میں ہو کر اور اس کے نام محمد اور احمد سے مسمّٰی ہو کر میں رسول بھی ہوں اور نبی بھی ہوں یعنی بھیجا گیا بھی اور خدا سے غیب کی خبریں پانے والا بھی۔ اور اس طور سے خاتم النبیّین کی مُہر محفوظ رہی کیونکہ میں نے انعکاسی اور ظلّی طور پر محبت کے آئینہ کے ذریعہ سے وہی نام پایا۔ اگر کوئی شخص اس وحی الٰہی پر ناراض ہو کہ کیوں خدا تعالیٰ نے میرا نام نبی اور رسول رکھا ہے تو یہ اس کی حماقت ہے کیونکہ میرے نبی اور

رسول ہونے سے خدا کی مُہر نہیں ٹوٹتی۔ (ایک غلطی کا ازالہ، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۲۱۰، ۲۱۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو درحقیقت خاتم النبیّین تھے مجھے رسول اور نبی کے لفظ سے پکارے جانا کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ اور نہ اس سے مہر ختمیت ٹوٹتی ہے کیونکہ میں بارہا بتلا چکا ہوں کہ میں بموجب آیت وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (الجمعة: ۴) بروزی طور پر وہی نبی خاتم الانبیاء ہوں اور خدا نے آج سے بیس برس پہلے براہین احمدیہ میں میرا نام محمد اور احمد رکھا ہے اور مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی وجود قرار دیا ہے پس اس طور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے میں میری نبوت سے کوئی تزلزل نہیں آیا کیونکہ ظل اپنے اصل سے علیحدہ نہیں ہوتا اور چونکہ میں ظلی طور پر محمد ہوں صلی اللہ علیہ وسلم پس اس طور سے خاتم النبیّین کی مُہر نہیں ٹوٹی کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت محمد تک ہی محدود رہی یعنی بہرحال محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی نبی رہا نہ اور کوئی یعنی جبکہ میں بروزی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور بروزی رنگ میں تمام کمالات محمدی مع نبوت محمدیہ کے میرے آئینہ ظلیت میں منعکس ہیں تو پھر کون سا الگ انسان ہوا جس نے علیحدہ طور پر نبوت کا دعویٰ کیا۔ (ایک غلطی کا ازالہ، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۲۱۲)

اللہ تعالیٰ نے اپنی کلام پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی کے باپ ہونے کی نفی کی ہے لیکن بروز کی خبر دی ہے۔ اگر بروز صحیح نہ ہوتا تو پھر آیت وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ میں اُس موعود کے رفیق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کیوں ٹھہرتے اور نفی بروز سے اس آیت کی تکذیب لازم آتی ہے جسمانی خیال کے لوگوں نے کبھی اُس موعود کو حسن کی اولاد بنایا اور کبھی حسین کی اور کبھی عباس کی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف یہ مقصود تھا کہ وہ فرزندوں کی طرح اس کا وارث ہوگا، اس کے نام کا وارث، اس کے خلق کا وارث، اس کے علم کا وارث، اس کی روحانیت کا وارث اور ہر ایک پہلو سے اپنے اندر اس کی تصویر دکھلائے گا اور وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ سب کچھ اس سے لے گا اور اس میں فنا ہو کر اس کے چہرہ کو دکھائے گا۔ پس جیسا کہ ظلی طور پر اُس کا نام لے گا، اُس کا خلق لے گا، اُس کا علم لے گا ایسا ہی اس کا نبی لقب بھی لے گا کیونکہ بروزی تصویر پوری نہیں ہوسکتی جب تک کہ یہ تصویر ہر ایک پہلو سے اپنے اصل کے کمال اپنے اندر نہ رکھتی ہو۔ پس چونکہ نبوت بھی نبی میں ایک کمال ہے اس لئے ضروری ہے کہ تصویر بروزی میں وہ کمال بھی نمودار ہو۔ تمام نبی اس بات کو مانتے چلے آئے ہیں کہ وجود بروزی اپنے اصل کی پوری تصویر ہوتی ہے یہاں تک کہ نام بھی ایک ہو جاتا ہے۔ پس اس صورت میں ظاہر ہے کہ جس طرح بروزی طور پر محمد اور احمد نام رکھے جانے سے دو محمد اور

دو احمد نہیں ہو گئے اسی طرح بروزی طور پر نبی یا رسول کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خاتم النبیّین کی مُہر ٹوٹ گئی کیونکہ وجود بروزی کوئی الگ وجود نہیں۔ اس طرح پر تو محمد کے نام کی نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ہی محدود رہی۔ تمام انبیاء علیہم السلام کا اس پر اتفاق ہے کہ بروز میں دوئی نہیں ہوتی کیونکہ بروز کا مقام اس مضمون کا مصداق ہوتا ہے کہ

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد زیں من دیگرم تو دیگری

لیکن اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں آئے تو بغیر خاتم النبیّین کی مُہر توڑنے کے کیوں کر دنیا میں آسکتے ہیں۔ غرض خاتم النبیّین کا لفظ ایک الٰہی مُہر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر لگ گئی ہے اب ممکن نہیں کہ کبھی یہ مُہر ٹوٹ جائے ہاں یہ ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ ایک دفعہ بلکہ ہزار دفعہ دنیا میں بروزی رنگ میں آجائیں اور بروزی رنگ میں اور کمالات کے ساتھ اپنی نبوت کا بھی اظہار کریں اور یہ بروز خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک قرار یافتہ عہد تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (الجمعۃ:۴) اور انبیاء کو اپنے بروز پر غیرت نہیں ہوتی کیونکہ وہ انہی کی صورت اور انہی کا نقش ہے لیکن دوسرے پر ضرور غیرت ہوتی ہے دیکھو حضرت موسیٰ نے معراج کی رات جب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مقام سے آگے نکل گئے تو کیوں کر رو رو کر اپنی غیرت ظاہر کی۔ تو پھر جس حالت میں خدا تو فرمائے کہ تیرے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا اور پھر اپنے فرمودہ کے برخلاف عیسیٰ کو بھیج دے تو پھر کس قدر یہ فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دلآزاری کا موجب ہوگا۔ غرض بروزی رنگ کی نبوت سے ختم نبوت میں فرق نہیں آتا اور نہ مُہر ٹوٹتی ہے لیکن کسی دوسرے نبی کے آنے سے اسلام کی بیخ کنی ہو جاتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس میں سخت اہانت ہے کہ عظیم الشان کام دجال کشی کا عیسیٰ سے ہوا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آیت کریمہ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ نعوذ باللہ اس سے جھوٹی ٹھہرتی ہے۔ اور اس آیت میں ایک پیشگوئی مخفی ہے اور وہ یہ کہ اب نبوت پر قیامت تک مُہر لگ گئی ہے اور بجز بروزی وجود کے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ہے کسی میں یہ طاقت نہیں جو کھلے کھلے طور پر نبیوں کی طرح خدا سے کوئی علم غیب پاوے اور چونکہ وہ بروز محمدی جو قدیم سے موعود تھا وہ میں ہوں اس لئے بروزی رنگ کی نبوت مجھے عطا کی گئی اور اس نبوت کے مقابل پر اب تمام دنیا بے دست و پا ہے کیونکہ نبوت پر مُہر ہے۔ ایک بروز محمدی جمیع کمالات محمدیہ کے ساتھ

آخری زمانہ کے لئے مقدر تھا سو وہ ظاہر ہو گیا اب بجز اس کھڑکی کے اور کوئی کھڑکی نبوت کے چشمہ سے پانی لینے کے لئے باقی نہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ بروزی طور کی نبوت اور رسالت سے ختمیت کی مُہر نہیں ٹوٹتی اور حضرت عیسیٰ کے نزول کا خیال جو مستلزم تکذیب آیت وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ہے وہ ختمیت کی مُہر کو توڑتا ہے اور اس فضول اور خلاف عقیدہ کا تو قرآن شریف میں نشان نہیں اور کیوں کر ہو سکتا کہ وہ آیت ممدوحہ بالا کے صریح برخلاف ہے لیکن ایک بروزی نبی اور رسول کا آنا قرآن شریف سے ثابت ہو رہا ہے جیسا کہ آیت وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ سے ظاہر ہے۔ (ایک غلطی کا ازالہ، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۲۱۳ تا ۲۱۶)

اِس نکتہ کو یاد رکھو کہ مَیں رسول اور نبی نہیں ہوں۔ یعنی باعتبار نئی شریعت اور نئے دعوے اور نئے نام کے۔ اور مَیں رسول اور نبی ہوں یعنی باعتبار ظلیت کاملہ کے مَیں وہ آئینہ ہوں جس میں محمدی شکل اور محمدی نبوت کا کامل انعکاس ہے۔ اگر مَیں کوئی علیحدہ شخص نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہوتا تو خدا تعالیٰ میرا نام محمد اور احمد اور مصطفیٰ اور مجتبیٰ نہ رکھتا اور نہ خاتم الانبیاء کی طرح خاتم الاولیاء کا مجھ کو خطاب دیا جاتا بلکہ مَیں کسی علیحدہ نام سے آتا۔ لیکن خدا تعالیٰ نے ہر ایک بات میں وجودِ محمدی میں مجھے داخل کر دیا یہاں تک کہ یہ بھی نہ چاہا کہ یہ کہا جائے کہ میرا کوئی الگ نام ہو یا کوئی الگ قبر ہو کیونکہ ظل اپنے اصل سے الگ ہو ہی نہیں سکتا اور ایسا کیوں کہا گیا اس میں راز یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جانتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس نے خاتم الانبیاء ٹھیرایا ہے اور پھر دونوں سلسلوں کا تقابل پُورا کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ موسوی مسیح کے مقابل پر محمدی مسیح بھی شانِ نبوت کے ساتھ آوے تا اس نبوت عالیہ کی کسر شان نہ ہو اس لئے خدا تعالیٰ نے میرے وجود کو ایک کامل ظلّیت کے ساتھ پیدا کیا اور ظلّی طور پر نبوت محمدی اس میں رکھ دی تا ایک معنے سے مجھ پر نبی اللہ کا لفظ صادق آوے اور دوسرے معنوں سے ختم نبوت محفوظ رہے۔

(نزول المسیح، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۳۸۱، ۳۸۲ حاشیہ)

قرآن نے تو امام حسین کو رتبہ ابنیّت کا بھی نہیں دیا بلکہ نام تک مذکور نہیں اُن سے تو زید ہی اچھا رہا جس کا نام قرآن شریف میں موجود ہے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا کہنا قرآن شریف کے نصّ صریح کے برخلاف ہے جیسا کہ آیت مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ سے سمجھا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت امام حسین رجال میں سے تھے عورتوں میں سے تو نہیں تھے حق تو یہ ہے کہ اس آیت نے اس تعلق کو جو امام حسین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بوجہ پسر دختر ہونے کے تھا نہایت ہی ناچیز کر دیا ہے تو پھر اس قدر

اُن کو آسمان پر چڑھانا کہ وہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل ہیں۔ یہ قرآن شریف پر بھی تقدم ہے ہر ایک کو فضیلت وہ دینی چاہیئے کہ قرآن سے ثابت ہے قرآن تو ان کی ابنیت کی بھی نفی کرتا ہے مگر یہاں حضرات شیعہ تمام انبیاء کا انہیں کو شفیع ٹھہراتے ہیں یہ کیسی فضولی ہے یہ قول کس قدر حیا سے دُور ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام امام حسین کے ہی طفیلی ہیں اگر وہ نہ ہوتے تو تمام نبیوں کا نجات پانا مشکل بلکہ غیر ممکن تھا۔

(نزول المسیح، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۴۲۳، ۴۲۴)

قرآن شریف پر شریعت ختم ہوگئی مگر وحی ختم نہیں ہوئی کیونکہ وہ سچے دین کی جان ہے جس دین میں وحی الٰہی کا سلسلہ جاری نہیں وہ دین مردہ ہے اور خدا اس کے ساتھ نہیں۔

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۴ حاشیہ)

یادرہے کہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ آخری کتاب اور آخری شریعت قرآن ہے اور بعد اس کے قیامت تک ان معنوں سے کوئی نبی نہیں ہے جو صاحبِ شریعت ہو یا بلاواسطہ متابعت آنحضرت صلعم وحی پا سکتا ہو بلکہ قیامت تک یہ دروازہ بند ہے اور متابعت نبوی سے نعمتِ وحی حاصل کرنے کے لئے قیامت تک دروازے کھلے ہیں۔ وہ وحی جو اتباع کا نتیجہ ہے کبھی منقطع نہیں ہوگی مگر نبوت شریعت والی یا نبوت مستقلہ منقطع ہو چکی ہے وَلَا سَبِيْلَ اِلَيْهَا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَمَنْ قَالَ اِنِّيْ لَسْتُ مِنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَادَّعٰى اَنَّهٗ نَبِيٌّ صَاحِبُ الشَّرِيْعَةِ اَوْ مِنْ دُوْنِ الشَّرِيْعَةِ وَلَيْسَ مِنَ الْاُمَّةِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ رَجُلٍ غَمَرَهُ السَّيْلُ الْمُنْهَمِرُ فَاَلْقَاهُ وَرَآءَهٗ وَلَمْ يُغَادِرْ حَتّٰى مَاتَ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جس جگہ یہ وعدہ فرمایا ہے کہ آنحضرت صلعم خاتم الانبیاء ہیں اُسی جگہ یہ اشارہ بھی فرما دیا ہے کہ آنجناب اپنی روحانیت کی رُو سے اُن صلحاء کے حق میں باپ کے حکم میں ہیں جن کی بذریعہ متابعت تکمیل نفوس کی جاتی ہے اور وحی الٰہی اور شرف مکالمات کا ان کو بخشا جاتا ہے۔ جیسا کہ وہ جلّ شانہٗ قرآن شریف میں فرماتا ہے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مَردوں میں سے کسی کا باپ نہیں ہے مگر وہ رسول اللہ ہے اور خاتم الانبیاء ہے۔ اب ظاہر ہے کہ لٰكِنْ کا لفظ زبان عرب میں استدراک کے لئے آتا ہے یعنی تدارک مافات کے لئے۔ سو اِس آیت کے پہلے حصّہ میں جو امر فوت شدہ قرار دیا گیا تھا یعنی جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے نفی کی گئی تھی وہ جسمانی طور سے کسی مرد کا باپ ہونا تھا۔ سو لٰكِنْ کے لفظ کے ساتھ ایسے فوت شدہ امر کا اِس طرح تدارک کیا

گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء ٹھہرایا گیا جس کے یہ معنی ہیں کہ آپ کے بعد براہِ راست فیوض نبوت منقطع ہو گئے۔ اور اب کمال نبوت صرف اُسی شخص کو ملے گا جو اپنے اعمال پر اتباع نبوی کی مہر رکھتا ہوگا اور اِس طرح پر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا اور آپ کا وارث ہوگا۔ غرض اِس آیت میں ایک طور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ ہونے کی نفی کی گئی اور دوسرے طور سے باپ ہونے کا اثبات بھی کیا گیا تا وہ اعتراض جس کا ذکر آیت اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (الکوثر : ۴) میں ہے دُور کیا جائے۔ ماحصل اِس آیت کا یہ ہوا کہ نبوت گو بغیر شریعت ہو۔ اِس طرح پر تو منقطع ہے کہ کوئی شخص براہِ راست مقامِ نبوت حاصل کر سکے لیکن اِس طرح پر ممتنع نہیں کہ وہ نبوت چراغ نبوت محمدیہ سے مکتسب اور مستفاض ہو یعنی ایسا صاحب کمال ایک جہت سے تو امّتی ہو اور دوسری جہت سے بوجہ اکتساب انوارِ محمدیہ نبوت کے کمالات بھی اپنے اندر رکھتا ہو اور اگر اِس طور سے بھی تکمیل نفوس مستعدہ اُمّت کی نفی کی جائے تو اِس سے نعوذ باللہ آنحضرت صلعم دونوں طور سے ابتر ٹھہرتے ہیں نہ جسمانی طور پر کوئی فرزند نہ روحانی طور پر کوئی فرزند اور معترض سچا ٹھہرتا ہے جو آنحضرت صلعم کا نام ابتر رکھتا ہے۔

اب جبکہ یہ بات طے پا چکی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت مستقلہ جو براہِ راست ملتی ہے۔ اس کا دروازہ قیامت تک بند ہے اور جب تک کوئی امّتی ہونے کی حقیقت اپنے اندر نہیں رکھتا اور حضرت محمدؐ کی غلامی کی طرف منسوب نہیں تب تک وہ کسی طور سے آنحضرت صلعم کے بعد ظاہر نہیں ہوسکتا۔

(ریویو بر مباحثہ بٹالوی چکڑالوی، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۱۳ تا ۲۱۵)

إِنَّا مُسْلِمُوْنَ نُؤْمِنُ بِكِتَابِ اللهِ الْفُرْقَانِ. وَنُؤْمِنُ بِأَنَّ سَيِّدَنَا مُحَمَّدًا نَبِيُّهٗ وَ رَسُوْلُهٗ. وَأَنَّهٗ جَآءَ بِخَيْرِ الْأَدْيَانِ. وَنُؤْمِنُ بِأَنَّهٗ خَاتَمُ الْأَنْبِيَآءِ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ. إِلَّا الَّذِيْ رُبِّيَ مِنْ فَيْضِهٖ وَأَظْهَرَهٗ وَعْدُهٗ. وَلِلّٰهِ مُكَالَمَاتٌ وَّ مُخَاطَبَاتٌ مَعَ أَوْلِيَآئِهٖ فِيْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ. وَإِنَّهُمْ يُعْطَوْنَ

ہم مسلمان ہیں اور ہم خدا تعالیٰ کی کتاب فرقانِ مجید پر ایمان لاتے ہیں اور یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے نبی اور اس کے رسول ہیں اور یہ کہ آپ بہترین دین لے کر آئے اور اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ آپؐ خاتم الانبیاء ہیں اور آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں مگر وہی جس کی تربیت آپؐ کے فیضان سے ہوئی ہو اور جس کا ظہور آپ کی پیشگوئی کے مطابق ہوا اور اللہ تعالیٰ اس امت کے اولیاء کو اپنے مکالمات اور مخاطبات سے مشرف کرتا ہے اور انہیں انبیاء کے

صِبْغَةَ الْأَنْبِيَآءِ وَلَيْسُوْا نَبِيِّيْنَ فِي الْحَقِيْقَةِ، فَإِنَّ الْقُرْاٰنَ أَكْمَلَ وَطَرَ الشَّرِيْعَةِ، وَلَا يُعْطَوْنَ إِلَّا فَهْمَ الْقُرْاٰنِ، وَلَا يَزِيْدُوْنَ عَلَيْهِ وَلَا يَنْقُصُوْنَ مِنْهُ، وَمَنْ زَادَ أَوْ نَقَصَ فَأُولٰئِكَ مِنَ الشَّيَاطِيْنِ الْفَجَرَةِ. وَنَعْنِيْ بِخَتْمِ النُّبُوَّةِ خَتْمَ كَمَالَاتِهَا عَلٰى نَبِيِّنَا الَّذِيْ هُوَ أَفْضَلُ رُسُلِ اللّٰهِ وَأَنْبِيَائِهٖ، وَ نَعْتَقِدُ بِأَنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ إِلَّا الَّذِيْ هُوَ مِنْ أُمَّتِهٖ وَمِنْ أَكْمَلِ أَتْبَاعِهٖ، الَّذِيْ وَجَدَ الْفَيْضَ كُلَّهٗ مِنْ رُوْحَانِيَّتِهٖ وَأَضَاءَ بِضِيَائِهٖ . فَهُنَاكَ لَا غَيْرَ وَلَا مَقَامَ الْغَيْرَةِ، وَلَيْسَتْ بِنُبُوَّةٍ أُخْرٰى وَلَا مَحَلَّ لِلْحَيْرَةِ، بَلْ هُوَ أَحْمَدُ تَجَلّٰى فِيْ سَجَنْجَلٍ اٰخَرَ، وَلَا يَغَارُ رَجُلٌ عَلٰى صُوْرَتِهِ الَّتِيْ أَرَاهُ اللّٰهُ فِيْ مِرْاٰةٍ وَّأَظْهَرَ. فَإِنَّ الْغَيْرَةَ لَا تَهِيْجُ عَلَى التَّلَامِذَةِ وَالْأَبْنَآءِ ، فَمَنْ كَانَ مِنَ النَّبِيِّ وَفِي النَّبِيِّ فَإِنَّمَا هُوَ هُوَ، لِأَنَّهٗ فِيْ أَتَمِّ مَقَامِ الْفَنَاءِ ، وَمُصَبَّغٌ بِصِبْغَتِهٖ وَمُرْتَدٍ بِتِلْكَ الرِّدَآءِ ، وَقَدْ وَجَدَ الْوُجُوْدَ مِنْهُ وَبَلَغَ مِنْهُ كَمَالَ النَّشْوِ وَالنَّمَآءِ . وَهٰذَا هُوَ الْحَقُّ الَّذِيْ

رنگ سے رنگین کیا جاتا ہے لیکن وہ حقیقی طور پر نبی نہیں ہوتے کیونکہ قرآن کریم نے شریعت کی تمام ضروریات کو پورا کر دیا ہے اوران کو فہمِ قرآن عطا کیا جاتا ہے لیکن وہ نہ تو قرآن کریم میں کسی قسم کا اضافہ کرتے ہیں اور نہ اس میں کوئی کمی کرتے ہیں اورجس شخص نے قرآن کریم میں کوئی اضافہ کیا یا کوئی حصہ کم کیا تو وہ شیطان فاجر ہے اورختمِ نبوت سے ہم یہ مراد لیتے ہیں کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اللہ تعالیٰ کے سب رسولوں اور نبیوں سے افضل ہیں تمام کمالاتِ نبوت ختم ہو گئے ہیں اور ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپؐ کے بعد نبوت کے مقام پر وہی شخص فائز ہوسکتا ہے جو آپؐ کی امت میں سے ہو اور آپؐ کا کامل پیرو ہو۔ اوراس نے تمام کا تمام فیضان آپؐ ہی کی روحانیت سے پایا ہو اور آپؐ کے نور سے منور ہوا ہو۔ اس مقام میں کوئی غیریت نہیں اور نہ ہی یہ غیرت کی جگہ ہے اور یہ کوئی علیحدہ نبوت نہیں اور نہ ہی یہ مقامِ حیرت ہے بلکہ یہ احمدِ مجتبیٰ ہی ہے جو دوسرے آئینہ میں ظاہر ہوا ہے اور کوئی شخص اپنی تصویر پر جسے اللہ نے آئینہ میں دکھایا ہو غیرت نہیں کھاتا کیونکہ شاگردوں اور بیٹوں پر غیرت جوش میں نہیں آتی۔ پس جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض پا کر اور آپؐ میں فنا ہو کر آئے وہ درحقیقت وہی ہے کیونکہ وہ کامل فنا کے مقام پر ہوتا ہے اور آپ کے رنگ میں ہی رنگین اور آپ کی ہی چادر اوڑھے ہوتا ہے اور آپؐ سے ہی اس نے اپنا روحانی وجود حاصل کیا ہوتا ہے اور آپؐ کے فیض سے ہی اس کا وجود کمال کو پہنچا ہوتا ہے اور یہی وہ حق ہے جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

يَشْهَدُ عَلٰى بَرَكَاتِ نَبِيِّنَا، وَيَرَى النَّاسُ حُسْنَهٗ فِيْ حُلَلِ التَّابِعِيْنَ الْفَانِيْنَ فِيْهِ بِكَمَالِ الْمَحَبَّةِ وَالصَّفَآءِ ، وَمِنَ الْجَهْلِ أَنْ يَّقُوْمَ أَحَدٌ لِلْمِرَآءِ ، بَلْ هٰذَا هُوَ ثُبُوْتٌ مِّنَ اللّٰهِ لِنَفْيِ كَوْنِهٖ أَبْتَرَ، وَلَا حَاجَةَ إِلَى تَفْصِيْلٍ لِّمَنْ تَدَبَّرَ. وَ إِنَّهٗ مَا كَانَ أَبَا أَحَدٍ مِّنَ الرِّجَالِ مِنْ حَيْثُ الْجِسْمَانِيَّةِ، وَلٰكِنَّهٗ أَبٌ مِنْ حَيْثُ فَيْضِ الرِّسَالَةِ لِمَنْ كُمِّلَ فِي الرُّوْحَانِيَّةِ. وَإِنَّهٗ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ وَعَلَمُ الْمَقْبُوْلِيْنَ. وَلَا يَدْخُلُ الْحَضْرَةَ أَبَدًا إِلَّا الَّذِيْ مَعَهٗ نَقْشُ خَاتَمِهٖ، وَاٰثَارُ سُنَّتِهٖ، وَلَنْ يُّقْبَلَ عَمَلٌ وَّلَا عِبَادَةٌ إِلَّا بَعْدَ الْإِقْرَارِ بِرِسَالَتِهٖ، وَالثَّبَاتِ عَلٰى دِيْنِهٖ وَمِلَّتِهٖ. وَقَدْ هَلَكَ مَنْ تَرَكَهٗ وَمَا تَبِعَهٗ فِيْ جَمِيْعِ سُنَنِهٖ، عَلٰى قَدْرِ وُسْعِهٖ وَطَاقَتِهٖ . وَلَا شَرِيْعَةَ بَعْدَهٗ، وَلَا نَاسِخَ لِكِتَابِهٖ وَ وَصِيَّتِهٖ، وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَتِهٖ، وَلَا قَطْرَ كَمُزْنَتِهٖ. وَمَنْ خَرَجَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ، فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْإِيْمَانِ. وَلَنْ يُّفْلِحَ أَحَدٌ حَتّٰى يَتَّبِعَ كُلَّ مَا ثَبَتَ مِنْ نَّبِيِّنَا الْمُصْطَفٰى،

کی برکات پر گواہ ہے اور لوگ نبی کریم کا حسن ان تابعین کے لباس میں دیکھتے ہیں جو اپنے کمال محبت وصفائی کی وجہ سے آپ کے وجود میں فنا ہو گئے اور اس کے خلاف بحث کرنا جہالت ہے کیونکہ یہ تو آپ کے ابتر نہ ہونے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثبوت ہے اور تدبر کرنے والوں کے لئے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں اور آپؐ جسمانی طور پر تو مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اپنی رسالت کے فیضان کی رو سے ہر اس شخص کے باپ ہیں جس نے روحانیت میں کمال حاصل کیا۔ اور آپ تمام انبیاء کے خاتم اور تمام مقبولوں کے سردار ہیں اور اب خدا تعالیٰ کی درگاہ میں وہی شخص داخل ہو سکتا ہے جس کے پاس آپؐ کی مہر کا نقش ہو اور آپؐ کی سنت پر پوری طرح سے عامل ہو اور اب کوئی عمل اور عبادت آپؐ کی رسالت کے اقرار کے بغیر اور آپؐ کے دین پر ثابت قدم رہنے کے بدوں خدا تعالیٰ کے حضور مقبول نہیں ہوگی اور جو آپؐ سے الگ ہو گیا اور اس نے اپنے مقدور اور طاقت کے مطابق آپؐ کی پیروی نہ کی وہ ہلاک ہو گیا۔ آپؐ کے بعد اب کوئی شریعت نہیں آسکتی اور نہ کوئی آپؐ کی کتاب اور آپؐ کے احکام کو منسوخ کر سکتا ہے اور نہ کوئی آپ کے پاک کلام کو بدل سکتا ہے اور کوئی بارش آپؐ کی موسلا دھار بارش کی مانند نہیں ہو سکتی۔ اور جو قرآن کریم کی پیروی سے ذرہ بھر بھی دور ہوا وہ ایمان کے دائرہ سے خارج ہو گیا اور اس وقت تک کوئی شخص ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ ان تمام باتوں کی پیروی نہ کرے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں

وَمَنْ تَرَكَ مِقْدَارَ ذَرَّةٍ مِّنْ وَصَايَاهُ فَقَدْ هَوٰى. وَمَنِ ادَّعَى النُّبُوَّةَ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، وَمَا اعْتَقَدَ بِأَنَّهُ رُبِّيَ مِنْ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ خَيْرِ الْبَرِيَّةِ، وَبِأَنَّهُ لَيْسَ هُوَ شَيْئًا مِّنْ دُوْنِ هٰذِهِ الْأُسْوَةِ، وَأَنَّ الْقُرْاٰنَ خَاتَمُ الشَّرِيْعَةِ، فَقَدْ هَلَكَ وَأَلْحَقَ نَفْسَهُ بِالْكَفَرَةِ الْفَجَرَةِ. وَمَنِ ادَّعَى النُّبُوَّةَ وَلَمْ يَعْتَقِدْ بِأَنَّهُ مِنْ أُمَّتِهٖ، وَبِأَنَّهُ إِنَّمَا وَجَدَ كُلَّ مَا وَجَدَ مِنْ فَيْضَانِهٖ، وَأَنَّهُ ثَمَرَةٌ مِّنْ بُسْتَانِهٖ، وَقَطْرَةٌ مِّنْ تَهْتَانِهٖ، وَشَعْشَعٌ مِّنْ لَمَعَانِهٖ، فَهُوَ مَلْعُوْنٌ وَّلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَعَلٰى أَنْصَارِهٖ وَأَتْبَاعِهٖ وَأَعْوَانِهٖ. لَا نَبِيَّ لَنَا تَحْتَ السَّمَآءِ مِنْ دُوْنِ نَبِيِّنَا الْمُجْتَبٰى، وَلَا كِتَابَ لَنَا مِنْ دُوْنِ الْقُرْاٰنِ، وَكُلُّ مَنْ خَالَفَهُ فَقَدْ جَرَّ نَفْسَهُ إِلَى اللَّظٰى.

(مواہب الرحمن، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۸۵ تا ۲۸۷)

اور جس نے آپؐ کے وصایا میں سے کوئی چھوٹی سی وصیت بھی ترک کر دی تو وہ گمراہ ہو گیا۔ اور جس نے اس امت میں نبوت کا دعویٰ کیا اور یہ اعتقاد نہ رکھا کہ وہ خیر البشر محمد مصطفیٰ کا ہی تربیت یافتہ ہے اور آپؐ کے اسوہ حسنہ کے بغیر ہیچ محض ہے اور یہ کہ قرآن کریم خاتم الشرائع ہے تو وہ ہلاک ہو گیا اور وہ کافروں اور فاجروں میں جاملا اور جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور یہ اعتقاد نہ رکھا کہ وہ آپؐ ہی کی امت میں سے ہے اور یہ کہ جو کچھ اس نے پایا ہے وہ آپؐ ہی کے فیضان سے پایا ہے اور یہ کہ وہ آپؐ ہی کے باغ کا ایک پھل اور آپؐ ہی کی موسلا دھار بارش کا ایک قطرہ اور آپؐ ہی کی روشنی کی ایک کرن ہے تو وہ ملعون ہے اور اس پر اور اس کے ساتھیوں پر اور اس کے اتباع اور مددگاروں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ آسمان کے نیچے محمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہمارا کوئی نبی نہیں اور قرآن کریم کے سوا ہماری کوئی کتاب نہیں اور جس نے بھی اس کی مخالفت کی وہ اپنے آپ کو جہنم کی طرف کھینچ کر لے گیا۔ (ترجمہ از مرتب)

خدا تعالیٰ کا یہ دُعا سکھلانا کہ خدایا ایسا کر کہ ہم وہی یہودی نہ بن جائیں جنہوں نے عیسیٰؑ کو قتل کرنا چاہا تھا صاف بتلا رہا ہے کہ اُمّت محمدیہ میں بھی ایک عیسیٰؑ پیدا ہونے والا ہے۔ ورنہ اس دُعا کی کیا ضرورت تھی۔ اور نیز جبکہ آیات مذکورہ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں بعض علماء مسلمان بالکل علماءِ یہود سے مشابہ ہو جائیں گے اور یہود بن جائیں گے۔ پھر یہ کہنا کہ ان یہودیوں کی اصلاح کے لئے اسرائیلی عیسیٰؑ آسمان سے نازل ہوگا بالکل غیر معقول بات ہے کیونکہ اوّل تو باہر سے ایک نبی کے آنے سے مُہر ختم نبوت ٹوٹتی ہے اور قرآن شریف صریح طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء ٹھیراتا ہے۔ ماسوا اس کے قرآن شریف

کے رُو سے یہ اُمّت خیر الامم کہلاتی ہے۔ پس اس کی اس سے زیادہ بے عزتی اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ یہودی بننے کے لئے تو یہ اُمّت ہو مگر عیسیٰ باہر سے آوے۔ (تذکرۃ الشہادتین، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۱۳، ۱۴)

بلاشبہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم روحانیت قائم کرنے کے لحاظ سے آدم ثانی تھے بلکہ حقیقی آدم وہی تھے جن کے ذریعہ اور طفیل سے تمام انسانی فضائل کمال کو پہنچے اور تمام نیک قوتیں اپنے اپنے کام میں لگ گئیں اور کوئی شاخ فطرت انسانی کی بے بار و بر نہ رہی اور ختم نبوت آپ پر نہ صرف زمانہ کے تاخر کی وجہ سے ہوا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ تمام کمالات نبوت آپ پر ختم ہو گئے۔

(لیکچر سیالکوٹ، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۲۰۷)

تمام نبوتیں اور تمام کتابیں جو پہلے گزر چکیں اُن کی الگ طور پر پیروی کی حاجت نہیں رہی کیونکہ نبوت محمدیہ اُن سب پر مشتمل اور حاوی ہے۔ اور بجز اِس کے سب راہیں بند ہیں۔ تمام سچائیاں جو خدا تک پہنچاتی ہیں اسی کے اندر ہیں نہ اس کے بعد کوئی نئی سچائی آئے گی اور نہ اس سے پہلے کوئی ایسی سچائی تھی جو اس میں موجود نہیں اس لئے اِس نبوت پر تمام نبوتوں کا خاتمہ ہے اور ہونا چاہئے تھا کیونکہ جس چیز کے لئے ایک آغاز ہے اس کے لئے ایک انجام بھی ہے لیکن یہ نبوت محمدیہ اپنی ذاتی فیض رسانی سے قاصر نہیں بلکہ سب نبوتوں سے زیادہ اِس میں فیض ہے اِس نبوت کی پیروی خدا تک بہت سہل طریق سے پہنچا دیتی ہے اور اس کی پیروی سے خدا تعالیٰ کی محبت اور اُس کے مکالمہ مخاطبہ کا اُس سے بڑھ کر انعام مل سکتا ہے جو پہلے ملتا تھا۔ مگر اس کا کامل پیرو صرف نبی نہیں کہلا سکتا کیونکہ نبوت کاملہ تامہ محمدیہ کی اس میں ہتک ہے ہاں اُمّتی اور نبی دونوں لفظ اجتماعی حالت میں اُس پر صادق آسکتے ہیں کیونکہ اس میں نبوت تامہ کاملہ محمدیہ کی ہتک نہیں بلکہ اُس نبوت کی چمک اِس فیضان سے زیادہ تر ظاہر ہوتی ہے اور جب کہ وہ مکالمہ مخاطبہ اپنی کیفیت اور کمیّت کی رو سے کمال درجہ تک پہنچ جائے اور اس میں کوئی کثافت اور کمی باقی نہ ہو۔ اور کھلے طور پر امور غیبیہ پر مشتمل ہو تو وہی دوسرے لفظوں میں نبوت کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ جس پر تمام نبیوں کا اتفاق ہے۔ پس یہ ممکن نہ تھا کہ وہ قوم جس کے لئے فرمایا گیا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (اٰلِ عمران: ۱۱۱) اور جن کے لئے یہ دعا سکھائی گئی کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحۃ: ۶، ۷) اُن کے تمام افراد اس مرتبہ عالیہ سے محروم رہتے اور کوئی ایک فرد بھی اس مرتبہ کو نہ پاتا اور ایسی صورت میں صرف یہی خرابی نہیں تھی کہ اُمّت محمدیہ ناقص اور ناتمام رہتی اور سب کے سب اندھوں کی طرح رہتے بلکہ یہ بھی نقص تھا کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت فیضان پر داغ لگتا تھا اور آپ کی قوت قدسیہ ناقص ٹھہرتی تھی۔ اور ساتھ اس کے وہ دعا جس کا پانچ وقت نماز میں پڑھنا تعلیم کیا گیا تھا اُس کا سکھلانا بھی عبث ٹھہرتا تھا۔ مگر اس کے دوسری طرف یہ خرابی بھی تھی کہ اگر یہ کمال کسی فرد اُمت کو براہ راست بغیر پیروی نور نبوت محمدیہ کے مل سکتا تو ختم نبوت کے معنے باطل ہوتے تھے پس ان دونوں خرابیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے خدا تعالیٰ نے مکالمہ مخاطبہ کاملہ تامہ مطہرہ مقدسہ کا شرف ایسے بعض افراد کو عطا کیا جو فنافی الرسول کی حالت تک اتم درجہ تک پہنچ گئے اور کوئی حجاب درمیان نہ رہا اور امتی ہونے کا مفہوم اور پیروی کے معنے اتم اور اکمل درجہ پر ان میں پائے گئے ایسے طور پر کہ اُن کا وجود اپنا وجود نہ رہا۔ بلکہ اُن کے محویت کے آئینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود منعکس ہو گیا اور دوسری طرف اتم اور اکمل طور پر مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ نبیوں کی طرح اُن کو نصیب ہوا۔

(رسالہ الوصیت، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۱۱، ۳۱۲)

یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ نبوت تشریعی کا دروازہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل مسدود ہے اور قرآن مجید کے بعد اور کوئی کتاب نہیں جو نئے احکام سکھائے یا قرآن شریف کا حکم منسوخ کرے یا اس کی پیروی معطّل کرے بلکہ اس کا عمل قیامت تک ہے۔ (رسالہ الوصیت، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۱۱ حاشیہ)

زبانِ عرب میں لٰکِنْ کا لفظ اِستدراک کے لئے آتا ہے یعنی جو امر حاصل نہیں ہو سکا اس کے حصول کی دوسرے پیرایہ میں خبر دیتا ہے جس کے رُو سے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی نرینہ اولاد کوئی نہیں تھی مگر رُوحانی طور پر آپ کی اولاد بہت ہوگی اور آپ نبیوں کے لئے مُہر ٹھہرائے گئے ہیں۔ یعنی آئندہ کوئی نبوت کا کمال بجز آپ کی پیروی کی مُہر کے کسی کو حاصل نہیں ہوگا۔ غرض اس آیت کے یہ معنے تھے جن کو اُلٹا کر نبوت کے آئندہ فیض سے انکار کر دیا گیا۔ حالانکہ اس انکار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سراسر مذمّت اور منقصت ہے۔ کیونکہ نبی کا کمال یہ ہے کہ وہ دوسرے شخص کو ظلّی طور پر نبوت کے کمالات سے متمتّع کر دے اور رُوحانی امور میں اس کی پوری پرورش کر کے دکھلاوے۔ اِسی پرورش کی غرض سے نبی آتے ہیں اور ماں کی طرح حق کے طالبوں کو گود میں لے کر خدا شناسی کا دودھ پلاتے ہیں۔ پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ دودھ نہیں تھا تو نعوذ باللہ آپ کی نبوت ثابت نہیں ہو سکتی۔ مگر خدا تعالیٰ نے تو قرآن شریف میں آپ کا نام سراج منیر رکھا ہے جو دوسروں کو روشن کرتا ہے اور اپنی روشنی کا اثر ڈال کر دوسروں کو اپنی مانند بنا دیتا ہے۔ اور اگر نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں فیض روحانی نہیں تو پھر دنیا میں

آپ کا مبعوث ہونا ہی عبث ہوا۔ اور دوسری طرف خدا تعالیٰ بھی دھوکا دینے والا ٹھہرا جس نے دُعا تو یہ سکھلائی کہ تم تمام نبیوں کے کمالات طلب کرو مگر دل میں ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا کہ یہ کمالات دیئے جائیں گے۔ بلکہ یہ ارادہ تھا کہ ہمیشہ کے لئے اندھا رکھا جائے گا۔

(چشمہ مسیحی، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۸۸، ۳۸۹)

اگر تمام کفار رُوئے زمین دعا کرنے کے لئے ایک طرف کھڑے ہوں اور ایک طرف صرف میں اکیلا اپنے خدا کی جناب میں کسی امر کے لئے رجوع کروں تو خدا میری ہی تائید کرے گا مگر نہ اس لئے کہ سب سے میں ہی بہتر ہوں بلکہ اس لئے کہ میں اُس کے رسول پر دلی صدق سے ایمان لایا ہوں اور جانتا ہوں کہ تمام نبوتیں اُس پر ختم ہیں اور اُس کی شریعت خاتم الشرائع ہے مگر ایک قسم کی نبوت ختم نہیں یعنی وہ نبوت جو اُس کی کامل پیروی سے ملتی ہے اور جو اُس کے چراغ میں سے نور لیتی ہے وہ ختم نہیں کیونکہ وہ محمدی نبوت ہے یعنی اُس کا ظل ہے اور اُسی کے ذریعہ سے ہے اور اُسی کا مظہر ہے اور اُسی سے فیضیاب ہے۔ خدا اُس شخص کا دشمن ہے جو قرآن شریف کو منسوخ کی طرح قرار دیتا ہے اور محمدی شریعت کے برخلاف چلتا ہے اور اپنی شریعت چلانا چاہتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہیں کرتا بلکہ آپ کچھ بننا چاہتا ہے۔ مگر خدا اُس شخص سے پیار کرتا ہے جو اس کی کتاب قرآن شریف کو اپنا دستور العمل قرار دیتا ہے اور اُس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو درحقیقت خاتم الانبیاء سمجھتا ہے اور اس کے فیض کا اپنے تئیں محتاج جانتا ہے پس ایسا شخص خدا تعالیٰ کی جناب میں پیارا ہو جاتا ہے اور خدا کا پیار یہ ہے کہ اُس کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اُس کو اپنے مکالمہ مخاطبہ سے مشرف کرتا ہے اور اُس کی حمایت میں اپنے نشان ظاہر کرتا ہے اور جب اُس کی پیروی کمال کو پہنچتی ہے تو ایک ظلّی نبوت اُس کو عطا کرتا ہے جو نبوت محمدیہ کا ظل ہے یہ اس لئے کہ تا اسلام ایسے لوگوں کے وجود سے تازہ رہے اور تا اسلام ہمیشہ مخالفوں پر غالب رہے۔ نادان آدمی جو دراصل دشمن دین ہے اس بات کو نہیں چاہتا کہ اسلام میں سلسلہ مکالمات مخاطبات الٰہیہ کا جاری رہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اسلام بھی اور مردہ مذہبوں کی طرح ایک مردہ مذہب ہو جائے مگر خدا نہیں چاہتا۔ نبوت اور رسالت کا لفظ خدا تعالیٰ نے اپنی وحی میں میری نسبت صدہا مرتبہ استعمال کیا ہے مگر اس لفظ سے صرف وہ مکالمات مخاطبات الٰہیہ مراد ہیں جو بکثرت ہیں اور غیب پر مشتمل ہیں اِس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ ہر ایک شخص اپنی گفتگو میں ایک اصطلاح اختیار کر سکتا ہے لِكُلٍّ اَنْ يَّصْطَلِحَ سو خدا کی یہ اصطلاح ہے جو کثرت مکالمات و مخاطبات کا نام اُس نے نبوت رکھا ہے یعنی ایسے

مکالمات جن میں اکثر غیب کی خبریں دی گئی ہیں اور لعنت ہے اُس شخص پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے علیحدہ ہوکر نبوت کا دعویٰ کرے مگر یہ نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ہے نہ کوئی نئی نبوت اور اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اسلام کی حقانیت دنیا پر ظاہر کی جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی دکھلائی جائے۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۳۹، ۳۴۱)

ہم بارہا لکھ چکے ہیں کہ حقیقی اور واقعی طور پر تو یہ امر ہے کہ ہمارے سیّد و مولیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور آنجناب کے بعد مستقل طور پر کوئی نبوت نہیں اور نہ کوئی شریعت ہے اور اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے تو بلاشبہ وہ بے دین اور مردود ہے لیکن خدا تعالیٰ نے ابتدا سے ارادہ کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات متعدیہ کے اظہار اور اثبات کے لئے کسی شخص کو آنجناب کی پیروی اور متابعت کی وجہ سے وہ مرتبہ کثرت مکالمات اور مخاطبات الٰہیہ بخشے کہ جو اُس کے وجود میں عکسی طور پر نبوت کا رنگ پیدا کردے سو اس طور سے خدا نے میرا نام نبی رکھا یعنی نبوت محمدیہ میرے آئینۂ نفس میں منعکس ہوگئی اور ظلّی طور پر نہ اصلی طور پر مجھے یہ نام دیا گیا تا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض کا کامل نمونہ ٹھہروں۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۴۰ حاشیہ)

نبی کے لفظ سے اس زمانہ کے لئے صرف خدا تعالیٰ کی یہ مراد ہے کہ کوئی شخص کامل طور پر شرف مکالمہ اور مخاطبہ الٰہیہ حاصل کرے اور تجدید دین کے لئے مامور ہو۔ یہ نہیں کہ وہ کوئی دوسری شریعت لاوے کیونکہ شریعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی پر نبی کے لفظ کا اطلاق بھی جائز نہیں جب تک اس کو امّتی بھی نہ کہا جائے جس کے یہ معنی ہیں کہ ہر ایک انعام اُس نے آنحضرتؐ کی پیروی سے پایا ہے نہ براہِ راست۔ (تجلیات الٰہیہ، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۴۰۱ حاشیہ)

اب بجز محمدی نبوت کے سب نبوتیں بند ہیں شریعت والا نبی کوئی نہیں آسکتا اور بغیر شریعت کے نبی ہوسکتا ہے مگر وہی جو پہلے امّتی ہو۔ پس اِسی بنا پر مَیں اُمتی بھی ہوں اور نبی بھی۔ اور میری نبوت یعنی مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ظلّ ہے اور بجز اس کے میری نبوت کچھ بھی نہیں وہی نبوت محمدؐیہ ہے جو مجھ میں ظاہر ہوئی ہے۔ اور چونکہ مَیں محض ظلّ ہوں اور امّتی ہوں اس لئے آنجنابؐ کی اِس سے کچھ کسرِ شان نہیں۔ اور یہ مکالمہ الٰہیہ جو مجھ سے ہوتا ہے یقینی ہے۔ اگر مَیں ایک دم کے لئے بھی اِس میں شک کروں تو کافر ہو جاؤں اور میری آخرت تباہ ہو جائے۔ وہ کلام جو میرے پر نازل ہوا یقینی اور قطعی ہے۔ اور

جیسا کہ آفتاب اور اس کی روشنی کو دیکھ کر کوئی شک نہیں کرسکتا کہ یہ آفتاب اور یہ اس کی روشنی ہے ایسا ہی مَیں اس کلام میں بھی شک نہیں کرسکتا جو خدا تعالیٰ کی طرف سے میرے پر نازل ہوتا ہے اور مَیں اس پر ایسا ہی ایمان لاتا ہوں جیسا کہ خدا کی کتاب پر۔ یہ تو ممکن ہے کہ کلام الٰہی کے معنے کرنے میں بعض مواضع میں ایک وقت تک مجھ سے خطا ہو جائے۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ مَیں شک کروں کہ وہ خدا کا کلام نہیں۔ اور چونکہ میرے نزدیک نبی اُسی کو کہتے ہیں جس پر خدا کا کلام یقینی و قطعی بکثرت نازل ہو جو غیب پر مشتمل ہو اس لئے خدا نے میرا نام نبی رکھا مگر بغیر شریعت کے۔ شریعت کا حامل قیامت تک قرآن شریف ہے۔

(تجلیات الٰہیہ، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۴۱۲)

وَ إِنْ قَالَ قَائِلٌ كَيْفَ يَكُوْنُ نَبِيٌّ مِّنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ وَقَدْ خَتَمَ اللهُ عَلَى النُّبُوَّةِ؟ فَالْجَوَابُ. إِنَّهٗ عَزَّ وَجَلَّ مَا سَمّٰى هٰذَا الرَّجُلَ نَبِيًّا إِلَّا لِإِثْبَاتِ كَمَالِ نُبُوَّةِ سَيِّدِنَا خَيْرِ الْبَرِيَّةِ، فَإِنَّ ثُبُوْتَ كَمَالِ النَّبِيِّ لَا يَتَحَقَّقُ إِلَّا بِثُبُوْتِ كَمَالِ الْأُمَّةِ، وَمِنْ دُوْنِ ذَالِكَ ادِّعَاءٌ مَحْضٌ لَا دَلِيْلَ عَلَيْهِ عِنْدَ أَهْلِ الْفِطْنَةِ. وَلَا مَعْنٰى لِخَتْمِ النُّبُوَّةِ عَلٰى فَرْدٍ مِّنْ غَيْرِ أَنْ تُخْتَتَمَ كَمَالَاتُ النُّبُوَّةِ عَلٰى ذَالِكَ الْفَرْدِ، وَمِنَ الْكَمَالَاتِ الْعُظْمٰى كَمَالُ النَّبِيِّ فِي الْإِفَاضَةِ، وَهُوَ لَا يَثْبُتُ مِنْ غَيْرِ نَمُوْذَجٍ يُّوْجَدُ فِي الْأُمَّةِ. ثُمَّ مَعَ ذَالِكَ ذَكَرْتُ غَيْرَ مَرَّةٍ أَنَّ اللهَ مَا أَرَادَ مِنْ نُّبُوَّتِيْ إِلَّا كَثْرَةَ الْمُكَالَمَةِ وَالْمُخَاطَبَةِ، وَهُوَ مُسَلَّمٌ عِنْدَ أَكَابِرِ أَهْلِ السُّنَّةِ. فَالنِّزَاعُ لَيْسَ إِلَّا

اگر کوئی یہ کہے کہ اس امت میں نبی کیسے آسکتا ہے جب کہ اللہ نے نبوت پر مہر لگا دی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ عز وجل نے آنے والے موعود کا نام نبی ہمارے آقا خیر البشر کی نبوت کے کمال کو ثابت کرنے کے لئے رکھا ہے کیونکہ آپ کا کمال امت کے کمال کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتا۔ اس کے سوا کمال کا دعویٰ محض دعویٰ ہی ہے جس پر عقلمندوں کے نزدیک کوئی دلیل نہیں اور کسی فرد پر نبوت کے ختم ہونے کے معنے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتے کہ اس پر کمالاتِ نبوت ختم ہو گئے ہیں اور بڑے بڑے کمالات میں سے نبی کا بڑا کمال اس کی قوتِ افاضہ ہے جو امت میں پائے جانے والے نمونہ کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کئی دفعہ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک میری نبوت سے مراد صرف کثرتِ مکالمہ مخاطبہ ہے اور یہ بات اکابر اہلِ سنت کے نزدیک بھی مسلم ہے پس نزاع صرف لفظی ہی ہے۔ اے اربابِ عقل وخرد!

نِزَاعًا لَفْظِيًّا. فَلَا تَسْتَعْجِلُوْا يَا أَهْلَ الْعَقْلِ وَالْفِطْنَةِ. وَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰى مَنِ ادَّعٰى خِلَافَ ذَالِكَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ، وَّمَعَهَا لَعْنَةُ النَّاسِ وَالْمَلَائِكَةِ.

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۶۳۷ حاشیہ)

جلد بازی سے کام نہ لو۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف کچھ بھی دعویٰ کرے تو اس پر خدا تعالیٰ کی لعنت ہے اور اسی طرح خدا تعالیٰ کی لعنت کے ساتھ ہی فرشتوں اور سب لوگوں کی بھی لعنت ہے۔ (ترجمہ از مرتب)

وَالنُّبُوَّةُ قَدِ انْقَطَعَتْ بَعْدَ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، وَلَا كِتَابَ بَعْدَ الْفُرْقَانِ الَّذِيْ هُوَ خَيْرُ الصُّحُفِ السَّابِقَةِ، وَلَا شَرِيْعَةَ بَعْدَ الشَّرِيْعَةِ الْمُحَمَّدِيَّةِ، بَيْدَ أَنِّيْ سُمِّيْتُ نَبِيًّا عَلٰى لِسَانِ خَيْرِ الْبَرِيَّةِ، وَذَالِكَ أَمْرٌ ظِلِّيٌّ مِّنْ بَرَكَاتِ الْمُتَابَعَةِ، وَمَا أَرٰى فِيْ نَفْسِيْ خَيْرًا، وَوَجَدْتُ كُلَّ مَا وَجَدْتُ مِنْ هٰذِهِ النَّفْسِ الْمُقَدَّسَةِ. وَمَا عَنَى اللّٰهُ مِنْ نُّبُوَّتِيْ إِلَّا كَثْرَةَ الْمُكَالَمَةِ وَالْمُخَاطَبَةِ، وَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰى مَنْ أَرَادَ فَوْقَ ذَالِكَ، أَوْ حَسِبَ نَفْسَهٗ شَيْئًا، أَوْ أَخْرَجَ عُنُقَهٗ مِنَ الرِّبْقَةِ النَّبَوِيَّةِ. وَإِنَّ رَسُوْلَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ، وَعَلَيْهِ انْقَطَعَتْ سِلْسِلَةُ الْمُرْسَلِيْنَ. فَلَيْسَ حَقُّ أَحَدٍ أَنْ يَّدَّعِيَ النُّبُوَّةَ بَعْدَ رَسُوْلِنَا الْمُصْطَفٰى عَلَى الطَّرِيْقَةِ الْمُسْتَقِلَّةِ، وَمَا بَقِيَ بَعْدَهٗ إِلَّا كَثْرَةُ الْمُكَالَمَةِ، وَهُوَ بِشَرْطِ الْاِتِّبَاعِ لَا بِغَيْرِ مُتَابَعَةِ خَيْرِ الْبَرِيَّةِ. وَوَاللّٰهِ، مَا

نبوت ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگئی اور قرآن کریم کے سوا ہماری کوئی کتاب نہیں۔ جو سب سابقہ کتب میں سے بہتر ہے اور شریعتِ محمدیہ کے سوا ہماری کوئی شریعت نہیں۔ ہاں بے شک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے میرا نام نبی رکھا گیا ہے اور یہ آپ کی کامل پیروی کی برکات میں سے ایک ظلی امر ہے۔ میں اپنے نفس میں کوئی خوبی نہیں پاتا اور جو کچھ بھی میں نے پایا ہے وہ اس مقدس ذات سے پایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک میری نبوت سے مراد صرف کثرتِ مکالمہ ومخاطبہ ہے اور جو اس سے زیادہ کا دعویٰ کرے یا اپنے نفس کو کچھ اہمیت دے یا اپنی گردن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوئے سے نکال دے اس پر خدا کی لعنت ہے اور ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور ان پر رسولوں کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے اور کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوتِ مستقلہ کا دعویٰ کرے اَب صرف کثرتِ مکالمہ باقی ہے اور وہ بھی اتباعِ نبوی کے ساتھ مشروط ہے اس کے سوا نہیں۔ اور اللہ کی قسم! مجھے یہ

حَصَلَ لِیْ هٰذَا الْمَقَامُ إِلَّا مِنْ أَنْوَارِ اتِّبَاعِ الْأَشِعَّةِ الْمُصْطَفَوِيَّةِ. وَسُمِّيْتُ نَبِيًّا مِّنَ اللهِ عَلٰى طَرِيْقِ الْمَجَازِ لَا عَلٰى وَجْهِ الْحَقِيْقَةِ. فَلَا تَهِيْجُ هٰهُنَا غَيْرَةُ اللهِ وَلَا غَيْرَةُ رَسُوْلِهٖ، فَإِنِّيْ أُرَبّٰى تَحْتَ جَنَاحِ النَّبِيِّ، وَقَدَمِيْ هٰذِهٖ تَحْتَ الْأَقْدَامِ النَّبَوِيَّةِ. ثُمَّ مَا قُلْتُ مِنْ نَّفْسِيْ شَيْئًا، بَلِ اتَّبَعْتُ مَا أُوْحِيَ إِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ. وَمَا أَخَافُ بَعْدَ ذَالِكَ تَهْدِيْدَ الْخَلِيْقَةِ، وَكُلُّ أَحَدٍ يُّسْأَلُ عَنْ عَمَلِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يَخْفٰى عَلَى اللهِ خَافِيَةٌ.

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۶۸۸، ۶۸۹)

مقام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار کی شعاعوں کی پیروی سے ہی ملا ہے اور اللہ تعالیٰ نے میرا نام مجازی طور پر نبی رکھا ہے نہ کہ حقیقی طور پر۔ پس یہاں اللہ تعالیٰ کی غیرت یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیرت کے بھڑکنے کا کوئی مقام نہیں کیونکہ میری تربیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پروں کے نیچے ہوئی ہے اور میرا قدم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوشِ قدم کی متابعت میں ہے اور میں نے کوئی بات اپنے پاس سے نہیں کہی بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو میری طرف وحی کی اور اس کی پیروی کی ہے اور اس کے بعد میں مخلوق کی دھمکیوں سے نہیں ڈرتا اور قیامت کے دن ہر شخص اپنے عمل کے متعلق جواب دِہ ہوگا اور اللہ پر کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ (ترجمہ از مرتب)

نبی کے معنے صرف یہ ہیں کہ خدا سے بذریعہ وحی خبر پانے والا ہو اور شرفِ مکالمہ اور مخاطبہ الٰہیہ سے مشرف ہو۔ شریعت کا لانا اس کے لئے ضروری نہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ صاحبِ شریعت رسول کا متبع نہ ہو۔ پس ایک امتی کو ایسا نبی قرار دینے سے کوئی محذور لازم نہیں آتا بالخصوص اس حالت میں کہ وہ امتی اپنے اس نبی متبوع سے فیض پانے والا ہو بلکہ فساد اس حالت میں لازم آتا ہے کہ اس امت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک مکالماتِ الٰہیہ سے بے نصیب قرار دیا جائے۔ وہ دین، دین نہیں ہے اور نہ وہ نبی، نبی ہے جس کی متابعت سے انسان خدا تعالیٰ سے اس قدر نزدیک نہیں ہوسکتا کہ مکالماتِ الٰہیہ سے مشرف ہوسکے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۳۰۶)

کوئی شخص اس جگہ نبی ہونے کے لفظ سے دھوکا نہ کھاوے میں بار بار لکھ چکا ہوں کہ یہ وہ نبوت نہیں ہے جو ایک مستقل نبوت کہلاتی ہے۔ کوئی مستقل نبی امتی نہیں کہلا سکتا مگر میں امتی ہوں۔ پس یہ صرف خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک اعزازی نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے حاصل ہوا تا حضرت عیسیٰؑ سے تکمیل مشابہت ہو۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۳۶۰ حاشیہ)

میں مفصلہ ذیل امور کا مسلمانوں کے سامنے صاف صاف اقرار اس خانہ خدا مسجد میں کرتا ہوں کہ میں جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کا قائل ہوں اور جو شخص ختمِ نبوت کا منکر ہو اس کو بے دین اور دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں ایسا ہی میں ملائکہ اور معجزات اور لیلۃ القدر وغیرہ کا قائل ہوں۔

(مجموعہ اشتہارات جلد اوّل صفحہ ۲۳۲)

یہ الزام جو میرے ذمہ لگایا جاتا ہے کہ گویا میں ایسی نبوت کا دعویٰ کرتا ہوں جس سے مجھے اسلام سے کچھ تعلق باقی نہیں رہتا اور جس کے یہ معنی ہیں کہ میں مستقل طور پر اپنے تئیں ایسا نبی سمجھتا ہوں کہ قرآن شریف کی پیروی کی کچھ حاجت نہیں رکھتا اور اپنا علیحدہ کلمہ اور علیحدہ قبلہ بناتا ہوں اور شریعتِ اسلام کو منسوخ کی طرح قرار دیتا ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقتداء اور متابعت سے باہر جاتا ہوں۔ یہ الزام صحیح نہیں ہے بلکہ ایسا دعویٰ نبوت کا میرے نزدیک کفر ہے اور نہ آج سے بلکہ اپنی ہر ایک کتاب میں ہمیشہ میں یہی لکھتا آیا ہوں کہ اس قسم کی نبوت کا مجھے کوئی دعویٰ نہیں اور یہ سراسر میرے پر تہمت ہے اور جس بناء پر میں اپنے تئیں نبی کہلاتا ہوں وہ صرف اس قدر ہے کہ میں خدا تعالیٰ کی ہم کلامی سے مشرف ہوں اور وہ میرے ساتھ بکثرت بولتا اور کلام کرتا ہے اور میری باتوں کا جواب دیتا ہے اور بہت سی غیب کی باتیں میرے پر ظاہر کرتا اور آئندہ زمانوں کے وہ راز میرے پر کھولتا ہے کہ جب تک انسان کو اس کے ساتھ خصوصیت کا قرب نہ ہو دوسرے پر وہ اسرار نہیں کھولتا اور انہیں امور کی کثرت کی وجہ سے اس نے میرا نام نبی رکھا ہے سو میں خدا کے حکم کے موافق نبی ہوں اور اگر میں اس سے انکار کروں تو میرا گناہ ہوگا اور جس حالت میں خدا میرا نام نبی رکھتا ہے تو میں کیوں کر اس سے انکار کرسکتا ہوں میں اس پر قائم ہوں اس وقت تک جو اس دنیا سے گزر جاؤں مگر میں ان معنوں سے نبی نہیں ہوں کہ گویا میں اسلام سے اپنے تئیں الگ کرتا ہوں یا اسلام کا کوئی حکم منسوخ کرتا ہوں میری گردن اس جوئے کے نیچے ہے جو قرآن شریف نے پیش کیا اور کسی کو مجال نہیں کہ ایک نقطہ یا ایک شوشہ قرآن شریف کا منسوخ کر سکے۔ سو میں صرف اس وجہ سے نبی کہلاتا ہوں کہ عربی اور عبرانی زبان میں نبی کے یہ معنے ہیں کہ خدا سے الہام پا کر بکثرت پیشگوئی کرنے والا، اور بغیر کثرت کے یہ معنی تحقیق نہیں ہو سکتے جیسا کہ صرف ایک پیسہ سے کوئی مالدار نہیں کہلا سکتا۔ سو خدا نے اپنے کلام کے ذریعہ سے بکثرت مجھے علمِ غیب عطا کیا ہے اور ہزار ہا نشان میرے ہاتھ پر ظاہر کئے ہیں اور کر رہا ہے۔ میں خودستائی سے نہیں مگر خدا کے فضل اور اس کے وعدہ کی بناء پر کہتا ہوں کہ اگر تمام دنیا ایک طرف ہو اور ایک طرف صرف میں کھڑا کیا جاؤں اور

کوئی ایسا امر پیش کیا جائے جس سے خدا کے بندے آزمائے جاتے ہیں تو مجھے اس مقابلہ میں خدا غلبہ دے گا اور ہر ایک پہلو کے مقابلہ میں خدا میرے ساتھ ہوگا اور ہر ایک میدان میں وہ مجھے فتح دے گا بس اسی بناء پر خدا نے میرا نام نبی رکھا ہے کہ اس زمانہ میں کثرت مکالمہ مخاطب اللہ اور کثرت اطلاع بر علومِ غیب صرف مجھے ہی عطا کی گئی ہے اور جس حالت میں عام طور پر لوگوں کو خوابیں بھی آتی ہیں اور بعض کو الہام بھی ہوتا ہے اور کسی قدر ملونی کے ساتھ علمِ غیب سے بھی اطلاع دی جاتی ہے مگر وہ الہام مقدار میں نہایت قلیل ہوتا ہے اور اخبارِ غیبیہ بھی اس میں نہایت کم ہوتی ہیں اور باوجود کمی کے مشتبہ اور مکدر اور خیالاتِ نفسانی سے آلودہ ہوتے ہیں تو اس صورت میں عقلِ سلیم خود چاہتی ہے کہ جس کی وحی اور علمِ غیب اس کدورت اور نقصان سے پاک ہو اس کو دوسرے معمولی انسانوں کے ساتھ نہ ملایا جائے بلکہ اس کو کسی خاص نام کے ساتھ پکارا جائے تا کہ اس میں اور اس کے غیر میں امتیاز ہو۔ اس لئے محض مجھے امتیازی مرتبہ بخشنے کے لئے خدا نے میرا نام نبی رکھ دیا اور یہ مجھے ایک عزت کا خطاب دیا گیا ہے تا کہ ان میں اور مجھ میں فرق ظاہر ہو جائے۔ ان معنوں سے میں نبی بھی ہوں اور امتی بھی تا کہ ہمارے سید و آقا کی وہ پیشگوئی پوری ہو کہ آنے والا مسیح امتی بھی ہوگا اور نبی بھی ہوگا ورنہ حضرت عیسٰیؑ جن کے دوبارہ آنے کے بارے میں ایک جھوٹی امید اور جھوٹی طمع لوگوں کو دامنگیر ہے وہ امتی کیوں کر بن سکتے ہیں۔ کیا آسمان سے اتر کر نئے سرے وہ مسلمان ہوں گے اور کیا اس وقت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء نہیں رہیں گے۔ (مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۷۲۵، ۷۲۶)

قرآن کے وقت استعدادیں معقولیت کا رنگ پکڑ گئی تھیں اور توریت کے وقت وحشیانہ حالت تھی۔ آدم سے لے کر زمانہ ترقی کرتا گیا تھا اور قرآن کے وقت دائرہ کی طرح پورا ہو گیا۔ حدیث میں ہے زمانہ مستدیر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ ضرورتیں نبوت کا انجن ہیں ظلمانی راتیں اس نور کو کھینچتی ہیں جو دنیا کو تاریکی سے نجات دے اس ضرورت کے موافق نبوت کا سلسلہ شروع ہوا اور جب قرآن کے زمانہ تک پہنچا تو مکمل ہو گیا۔ اب سب ضرورتیں پوری ہو گئیں۔ اس سے لازم آیا کہ آپ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء تھے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۸۷)

دراصل بات یہ ہے کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود سے انبیاء علیہم السلام کو ایسی ہی نسبت ہے جیسی کہ ہلال کو بدر سے ہوتی ہے۔ ہلال کا وجود ایک تاریکی میں ہوتا ہے لیکن جب وہ اپنے کمال کو

پہنچ کر بدر بن جاتا ہے تو وہ بدر اپنی پہلی حالت ہلال کا مثبت اور مصدق ہو جاتا ہے۔ پس یقیناً سمجھو کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے تو پہلے نبی اور ان کی نبوتوں کے پہلو مخفی رہتے۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۱ مورخہ ۱۰؍جنوری ۱۸۹۹ء صفحہ ۷)

ختمِ نبوت کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں تک دلائل اور معرفت طبعی طور پر ختم ہو جاتے ہیں وہ وہی حد ہے جس کو ختمِ نبوت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ملحدوں کی طرح نکتہ چینی کرنا بے ایمانوں کا کام ہے۔ ہر بات میں بینات ہوتے ہیں اور ان کا سمجھنا معرفتِ کاملہ اور نورِ بصر پر موقوف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے ایمان اور عرفان کی تکمیل ہوئی۔ دوسری قوموں کو روشنی پہنچی۔ کسی اور قوم کو بین اور روشن شریعت نہیں ملی اگر ملتی تو کیا وہ عرب پر اپنا کچھ بھی اثر نہ ڈال سکتی۔ عرب سے وہ آفتاب نکلا کہ اس نے ہر قوم کو روشن کیا اور ہر بستی پر اپنا نور ڈالا۔ یہ قرآن کریم ہی کو فخر حاصل ہے کہ وہ توحید اور نبوت کے مسئلہ میں کل دنیا کے مذاہب پر فتحیاب ہو سکتا ہے۔ یہ فخر کا مقام ہے کہ ایسی کتاب مسلمانوں کو ملی ہے۔ جو لوگ حملہ کرتے ہیں اور تعلیم و ہدایت اسلام پر معترض ہوتے ہیں وہ بالکل کور باطنی اور بے ایمانی سے بولتے ہیں۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۱ مورخہ ۱۰؍جنوری ۱۸۹۹ء صفحہ ۸)

خاتم النبیین کے بڑے معنے یہی ہیں کہ نبوت کے امور کو آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کیا۔ یہ تو موٹے اور ظاہر معنے ہیں۔ دوسرے یہ معنے ہیں کہ کمالاتِ نبوت کا دائرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ قرآن نے ناقص باتوں کا کمال کیا اور نبوت ختم ہو گئی اس لئے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا مصداق اسلام ہو گیا۔ غرض یہ نشاناتِ نبوت ہیں ان کی کیفیت اور کنہ پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اصول صاف اور روشن ہیں اور وہ ثابت شدہ صداقتیں کہلاتی ہیں۔ ان باتوں میں پڑنا مومن کو ضروری نہیں ایمان لانا ضروری ہے اگر کوئی مخالف اعتراض کرے تو ہم اس کو روک سکتے ہیں۔ اگر وہ بند نہ ہو تو ہم اس کو کہہ سکتے ہیں کہ پہلے اپنے جزئی مسائل کا ثبوت دے۔ الغرض مہرِ نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشانِ نبوت میں سے ایک نشان ہے جس پر ایمان لانا ہر مسلمان مومن کو ضروری ہے۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۱ مورخہ ۱۰؍جنوری ۱۸۹۹ء صفحہ ۸، ۹)

ہمیں اللہ تعالیٰ نے وہ نبی دیا جو خاتم المومنین، خاتم العارفین اور خاتم النبیین ہے اور اسی طرح وہ کتاب اس پر نازل کی جو جامع الکتب اور خاتم الکتب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو خاتم النبیین ہیں اور آپؐ پر

نبوت ختم ہوگئی۔تو یہ نبوت اس طرح پر ختم نہیں ہوئی جیسے کوئی گلا گھونٹ کر ختم کر دے۔ایسا ختم قابلِ فخر نہیں ہوتا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہونے سے یہ مراد ہے کہ طبعی طور پر آپؐ پر کمالاتِ نبوت ختم ہوگئے۔یعنی وہ تمام کمالاتِ متفرقہ جو آدم سے لے کر مسیح ابنِ مریمؑ تک نبیوں کو دیئے گئے تھے۔کسی کو کوئی اور کسی کو کوئی۔وہ سب کے سب آنحضرت صلعم میں جمع کر دیئے گئے اور اس طرح پر آپ طبعاً خاتم النبیین ٹھیرے اور ایسا ہی وہ جمیع تعلیمات وصایا اور معارف جو مختلف کتابوں میں چلے آتے ہیں وہ قرآن شریف پر آکر ختم ہوگئے اور قرآن شریف خاتم الکتب ٹھیرا۔

اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مجھ پر اور میری جماعت پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین نہیں مانتے یہ ہم پر افترائے عظیم ہے ہم جس قوت یقین،معرفت اور بصیرت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء مانتے اور یقین کرتے ہیں اس کا لاکھواں حصہ بھی وہ نہیں مانتے اور ان کا ایسا ظرف ہی نہیں ہے۔وہ اس حقیقت اور راز کو جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت میں ہے، سمجھتے ہی نہیں ہیں انہوں نے صرف باپ دادا سے ایک لفظ سنا ہوا ہے اور اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں وہ نہیں جانتے کہ ختمِ نبوت کیا ہوتا ہے اور اس پر ایمان لانے کا مفہوم کیا؟ مگر ہم بصیرتِ تام سے (جس کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء یقین کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ نے ہم پر ختمِ نبوت کی حقیقت کو ایسے طور پر کھول دیا ہے کہ اس عرفان کے شربت سے جو ہمیں پلایا گیا ہے ایک خاص لذت پاتے ہیں جس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا بجز ان لوگوں کے جو اس چشمہ سے سیراب ہوں۔

دنیا کی مثالوں میں سے ہم ختمِ نبوت کی مثال اس طرح پر دے سکتے ہیں کہ جیسے چاند ہلال سے شروع ہوتا ہے اور چودھویں تاریخ پر آکر اس کا کمال ہو جاتا ہے جبکہ اسے بدر کہا جاتا ہے اسی طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر کمالاتِ نبوت ختم ہوگئے۔جو یہ مذہب رکھتے ہیں کہ نبوت زبردستی ختم ہوگئی اور آنحضرتؐ کو یونسؑ بن متی پر بھی ترجیح نہیں دینی چاہیے انہوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہی نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور کمالات کا کوئی علم ہی ان کو نہیں ہے باوجود اس کمزوری فہم اور کمی علم کے ہم کو کہتے ہیں کہ ہم ختمِ نبوت کے منکر ہیں میں ایسے مریضوں کو کیا کہوں اور ان پر کیا افسوس کروں اگر ان کی یہ حالت نہ ہوگئی ہوتی اور حقیقتِ اسلام سے بکلی دور نہ جا پڑے ہوتے تو پھر میرے آنے کی ضرورت کیا تھی؟ ان لوگوں کی ایمانی حالتیں بہت کمزور ہوگئی ہیں اور وہ اسلام کے مفہوم اور مقصد سے محض ناواقف ہیں

ورنہ کوئی وجہ نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ اہلِ حق سے عداوت کرتے جس کا نتیجہ کافر بنا دیتا ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۹ مورخہ ۱۳ ؍مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا یہ بھی ایک پہلو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے اس امت میں بڑی بڑی استعدادیں رکھ دی ہیں یہاں تک کہ عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ كَاَنْبِيَآءِ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ بھی حدیث میں آیا ہے۔ اگرچہ محدثین کو اس پر جرح ہو مگر ہمارا نورِ قلب اس حدیث کو صحیح قرار دیتا ہے۔ اور ہم بغیر چون و چرا اس کو تسلیم کرتے ہیں اور بذریعہ کشف بھی کسی نے اس حدیث کا انکار نہیں کیا بلکہ اگر کی ہے تو تصدیق ہی کی ہے اس حدیث کے یہ معنے نہیں کہ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں جیسے ہیں لیکن علماء کے لفظ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے یہ لوگ الفاظ پر اڑے ہوئے ہیں اور ان کے معنی کی تہ تک نہیں پہنچتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ قرآن شریف کی تفسیر میں آگے نہیں چلتے۔ عالم ربانی سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ صرف ونحو یا منطق میں بے مثل ہو۔ بلکہ عالم ربانی سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے اور اس کی زبان بیہودہ نہ چلے مگر آج یہ زمانہ ایسا آگیا ہے کہ مردہ شو تک بھی اپنے آپ کو علماء کہلاتے ہیں اور اس لفظ کو ذات میں داخل کر لیا ہے اس طرح پر اس لفظ کی بڑی تحقیر ہوئی ہے اور خدا تعالیٰ کے منشاء اور مقصد کے خلاف اس کا مفہوم لیا گیا ہے ورنہ قرآن شریف میں تو علماء کی یہ صفت بیان کی گئی ہے اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اللہ تعالیٰ کے وہ بندے ہیں جو علماء ہیں۔ اب یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ جن لوگوں میں یہ صفات خوف وخشیت اور تقویٰ اللہ کی نہ پائے جاویں وہ ہرگز ہرگز اس خطاب سے پکارے جانے کے قابل نہیں ہیں۔

اصل میں علماء عالم کی جمع ہے اور اس چیز کو کہتے ہیں جو یقینی اور قطعی ہو اور سچا علم قرآن کریم سے ملتا ہے یہ نہ یونانیوں کے فلسفہ سے ملتا ہے نہ حال کے انگلستانی فلسفہ سے بلکہ یہ سچا ایمانی فلسفہ سے حاصل ہوتا ہے اور مومن کا معراج اور کمال یہی ہے کہ وہ علماء کے درجہ پر پہنچے اور وہ حق الیقین کا مقام اسے حاصل ہو جو علم کا انتہائی درجہ ہے لیکن جو شخص علوم حقہ سے بہرہ ور نہیں ہیں اور معرفت اور بصیرت کی راہیں ان پر کھلی ہوئی نہیں ہیں وہ خود عالم کہلائیں مگر علم کی خوبیوں اور صفات سے بالکل بے بہرہ ہیں اور وہ روشنی اور نور جو حقیقی علم سے ملتا ہے اس میں پایا نہیں جاتا بلکہ ایسے لوگ سراسر خسارہ اور نقصان میں ہیں یہ اپنی آخرت دخان اور تاریکی سے بھر لیتے ہیں انہیں کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى

جو اس دنیا میں اندھا ہوتا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا اٹھایا جاوے گا جس کو یہاں علم وبصیرت اور معرفت نہیں دی گئی اسے وہاں کیا علم ملے گا اللہ تعالیٰ کو دیکھنے والی آنکھ اسی دنیا سے لے جانی پڑتی ہے جو یہاں ایسی آنکھ پیدا نہیں کرتا اسے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھے گا۔

لیکن جن لوگوں کو سچی معرفت اور بصیرت دی جاتی ہے اور وہ علم جس کا نتیجہ خشیۃ اللہ ہے عطا کیا جاتا ہے وہ وہ ہیں جن کو اس حدیث میں انبیاء بنی اسرائیل سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے سچے علوم کا منبع اور سرچشمہ قرآن اس امت کو دیا ہے جو شخص ان حقائق و معارف کو پالیتا ہے جو قرآن شریف میں بیان کئے گئے ہیں اور جو حقیقی تقویٰ اور خشیۃ اللہ سے حاصل ہوتے ہیں اسے وہ علم ملتا ہے جو اس کو انبیاء بنی اسرائیل کا مثیل بنا دیتا ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۰ مورخہ ۲۴ ؍مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

چونکہ آپؐ کو خاتم الانبیاء ٹھیرایا تھا اس لئے آپؐ کے وجود میں حرکات وسکنات میں بھی اعجاز رکھ دیئے تھے آپؐ کی طرزِ زندگی کہ الف۔ب تک نہیں پڑھا اور قرآن جیسی بے نظیر نعمت لائے اور ایسا عظیم الشان معجزہ امت کو دیا۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۱۶ مورخہ ۱۷ ؍اپریل ۱۹۰۰ء صفحہ ۴)

ہمارا ایمان ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کامل شریعت لے کر آئے جو نبوت کے خاتم تھے اس لئے زمانہ کی استعدادوں اور قابلیتوں نے ختمِ نبوت کر دیا تھا۔ پس حضور علیہ السلام کے بعد ہم کسی دوسری شریعت کے آنے کے قائل ہرگز نہیں۔ ہاں جیسے ہمارے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم مثیلِ موسیٰ تھے اسی طرح آپ کے سلسلہ کا خاتم جو خاتم الخلفاء یعنی مسیح موعود ہے ضروری تھا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح آتا۔ پس میں وہی خاتم الخلفاء اور مسیح موعود ہوں۔ جیسے مسیح کوئی شریعت لے کر نہ آئے تھے بلکہ شریعتِ موسوی کے احیاء کے لئے آئے تھے میں کوئی جدید شریعت لے کر نہیں آیا اور میرا دل ہرگز نہیں مان سکتا کہ قرآن شریف کے بعد اب کوئی اور شریعت آسکتی ہے کیونکہ وہ کامل شریعت اور خاتم الکتب ہے اسی طرح خدا تعالیٰ نے مجھے شریعتِ محمدی کے احیاء کے لئے اس صدی میں خاتم الخلفاء کے نام سے مبعوث فرمایا ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۰ ؍مئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲، ۳)

کمال نبی کا کمالِ امت کو چاہتا ہے چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تھے صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس لئے آنحضرتؐ پر کمالاتِ نبوت ختم ہوئے۔ کمالاتِ نبوت ختم ہونے کے ساتھ ہی ختمِ نبوت ہوا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۳ مورخہ ۲۴ ؍جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۰، ۱۱)

لاکن اینجا برائے استدراک آمدہ ست چوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیچ کس راپدر نیست پس ہماں اعتراض کہ بر دشمناں کردہ شدہ وگفتہ کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ [1] بر آنحضرت ہم لازم می آید گویا کہ خدا تعالیٰ تصدیق معترض میکند برائے ازالہ ایں وہم فرمودہ است وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ یعنی ہیچ ابدال وقطب و اولیاء بجز ختم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نخواہد شد۔ حکام راہمیں حالت است کہ اگر بر کاغذ مہر سرکاری نشود صحیح نمی دانند ہر کسے راہ کہ الہام و مکالمہ الٰہی میشود از مہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می شود وازیں معنی رسول اللہ صلعم ہمہ را پدر ست در یک معنی نفی نبوت میشود۔ ودر یک معنی اثبات نبوۃ میشود۔ اگر بگوئیم کہ سلسلہ افادات نبوی منقطع شدہ واکنوں کسے راہ الہام ومکالمہ ومخاطبہ الٰہی نمی شود ہمہ اسلام تباہ میشود سلسلہ ما را ایں مثال ست کہ اگر کسے در آئینہ صورت می بیند آنچہ در شیشہ نظر می آید چیزی دیگر نیست ہماں است کہ پیش شیشہ است ایں مردماں دریں آیت کریمہ غور نمی کنند ومن خوب می دانم کہ ایں ہمہ عقیدہ میدارند کہ سلسلہ

اس جگہ لٰكِنْ کا لفظ استدراک کے لئے آیا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے باپ نہیں تو وہی اعتراض جو آپؐ کے دشمنوں پر کیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ تمہارا دشمن اَبْتَر رہے گا۔ یہ اعتراض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی وارد ہوتا ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ اعتراض کرنے والے کی تصدیق کرتا ہے۔ اس وہم کے ازالہ کے لئے فرمایا ہے وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کہ کوئی ابدال، قطب اور ولی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر کے بغیر نہیں ہوگا۔ دنیوی حکام کا یہی دستور ہے کہ اگر کسی کاغذ پر سرکاری مہر نہ ہو تو وہ اسے صحیح نہیں سمجھتے۔ جس شخص کو الہام اور مکالمہ الٰہی ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر سے ہوتا ہے اور ان معنی کی رو سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم سب کے باپ ہیں۔ غرض ایک معنی کے لحاظ سے نبوت کی نفی ہو جاتی ہے اور ایک معنی کے لحاظ سے نبوت کا اثبات ہو جاتا ہے اگر ہم کہیں کہ سلسلہ افاداتِ نبوی منقطع ہو گیا ہے اور اب کسی کو الہام اور مکالمہ ومخاطبہ الٰہی نہیں ہوتا تو اسلام بالکل تباہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے سلسلہ کی یہ مثال ہے کہ اگر کوئی آئینہ میں اپنی صورت دیکھتا ہے تو اسے آئینہ میں جو صورت نظر آتی ہے وہ کوئی دوسری صورت نہیں ہوتی بلکہ وہی ہے جو آئینہ کے سامنے ہے۔ یہ لوگ اس آیہ کریمہ میں غور نہیں کرتے اور میں خوب جانتا ہوں کہ یہ سب یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ مکالماتِ الٰہیہ کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ کلام کے معنے وحی کے ہیں۔ قرآن کریم میں الہام کا ذکر نہیں آیا وحی کا ذکر آیا ہے اور الہام اور

[1] الکوثر: ۴

مکالمات الٰہیہ منقطع شدہ است ۔ کلام بمعنی وحی است درقرآن ہم ذکر الہام نیامدہ بلکہ ذکر وحی آمدہ وقطعیت الہام ووحی یک معنی دارد ونمی پندارند کہ اگر ایں سلسلہ منقطع شود باقی از برکات اسلام چہ می ماند۔ پس ہمیں معنی است کہ گفتم در مثال آئینہ وظل کہ ظل ہمہ نقوشِ اصل در خود دارد وظل نبوت ہمیں طور است البتہ آں نبوت منقطع است کہ بلاتوسل وسلسلہ رسول اللہ آید وہر کسے کہ ازیں انکار می کند کافر میشود واز دین خارج میشود اگر دین بایں طور مردہ است کدام توقع نجات باید داشت اگر انسان اندریں عالم تکمیل معرفت نکند چہ دلیل دارد کہ در روزِ آخرۃ خواہد کرد بجز ایں صورت کہ ما پیش میکنیم دیگر صورت نیست مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى [1] از بسیار مقامات قرآن معلوم میشود کہ این امت خیر امت است پس کدام خیرست کہ در امت موسوی الہام مکالمہ وغیرہ میشدی و در ایں امت نمی شود و کدام مشابہت ایناں را بامت موسوی خواہد بود۔ آنحضرت صلعم تکمیل کنندہ ایں عالم اند یعنی کمال ایں عالم بر رسول اللہ صلعم ختم شدہ و ایں معنی ختمِ نبوت است کہ کسے دیگر نبی نمی شود حتی کہ مہر رسول اللہ

وحی کا انقطاع ایک ہی معنے رکھتا ہے اور وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ اگر یہ سلسلہ منقطع ہو جائے تو اسلام کی برکات میں سے باقی کیا رہ جاتا ہے۔ پس اس کے وہی معنے ہیں جو میں نے آئینہ اور ظل کی مثال میں بیان کئے ہیں کہ ظل اپنے اندر اصل کے تمام نقوش رکھتا ہے اور ظل نبوت بھی اسی طرح ہے۔ البتہ وہ نبوت منقطع ہے جو بلاتوسل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہو اور ہر شخص جو اس کا انکار کرے وہ کافر ہو جاتا ہے اور دین سے خارج ہو جاتا ہے اگر دین اس طرح مردہ ہو چکا ہے تو اس کے ذریعہ نجات کی کس طرح توقع رکھی جا سکتی ہے۔ اگر انسان اس دنیا میں تکمیل معرفت نہ کرے تو اس بات پر کیا دلیل ہے کہ وہ آخرت کے روز یہ تکمیل کر لے گا بجز اس صورت کے جو ہم پیش کرتے ہیں کوئی اور صورت نہیں ہے۔ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى ۔ قرآن کریم کے بہت سے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امت خیر امت ہے۔ پس یہ امت خیر امت کیسے ہوئی کہ امت موسوی میں تو الہام اور مکالمہ کا سلسلہ جاری تھا اور اس امت میں وہ جاری نہیں اور پھر ان کی مشابہت امت موسوی سے کیسے ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم کے تکمیل کنندہ ہیں یعنی اس عالم کا کمال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا اور ختمِ نبوت کے معنے یہ ہیں کہ کوئی اور نبی اس وقت تک نہیں ہوگا حتی کہ اس کی نبوت پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر نہ ہو۔ چنانچہ اس کی مثال ہم دنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ

[1] بنی اسرائیل: ۷۳

صلی اللہ علیہ وسلم بر نبوت اونشود چنانکہ مثال آں دریں دنیا دیدہ بود کہ ہیچ پروانہ سرکاری تصدیق نمی شود حتی کہ مہر سرکاری براو نبود پس ازیں آیت معلوم میشود کہ اللہ تعالیٰ بطور جسمانی نفی ابوت می فرماید و بطور روحانی اثبات نبوت میکند بہر حال ایمان باید آورد کہ برکات و افادات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جاری است اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[1] دریں آیت معنے محبت چیست ایں معنی ہرگز نیست کہ خدا ہر کسے راہ کہ محبت میکند دریں عالم اورا کور میدارد اگر ایں دوناں را عقل بودے میداندے۔ انسان ہماں باشد کہ طالب مغز شود نہ کہ پوست ہمہ ابدال طالب مغز شدہ اند ایمان ہمیں است کہ ایشاں میخواہند کہ چشم آنہا بینا شود نہ کہ کور۔ باعث مغضوب شدن اہلِ اسلام چیست ہمیں کہ از زبان میگویند کہ ایمان آوردیم در دل ہیچ شے نیست وہمیں معنی ایں آیت است مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ[2] وہمیں نابینائی کہ ذکر کردیم موجب فسق و فجور است و برائے ہمیں بینائی خداوند تعالیٰ ایں سلسلہ را قائم کردہ است کہ باز آں بینائی کہ رفتہ است پیدا شود خدا می خواہد کہ ثابت کند کہ آں نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ست و افادہ آں ہم زندہ است اگر

کسی سرکاری پروانہ کی اس وقت تک تصدیق نہیں ہوتی جب تک کہ اس پر سرکاری مہر نہ ہو۔ پس مَا كَانَ مُحَمَّدٌ کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسمانی ابوت کی نفی فرماتا ہے اور روحانی طور پر وہ آپ کی نبوت کو ثابت کرتا ہے۔ بہر حال اس بات پر ایمان لانا چاہیے کہ رسول کریم صلی اللہ علی وسلم کے برکات اور افادات جاری ہیں اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اس آیت میں محبت کے کیا معنی ہیں؟ اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ جس شخص سے خدا محبت کرے اس عالم میں وہ اسے اندھا رکھتا ہے۔ اگر ان دون ہمت لوگوں کو عقل ہوتی تو وہ اس بات کو ضرور جان لیتے کہ انسان وہی ہوتا ہے جو مغز کا طالب ہو نہ کہ پوست کا۔ تمام ابدال مغز کے طالب تھے اور ہمارا ایمان ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کی آنکھ بینا ہو نہ کہ اندھی۔ اہلِ اسلام کا مغضوب علیہم ہوجانا کیا ہے؟ یہی ہے کہ وہ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کے دل میں ایمان کا ذرہ بھی نہیں اور یہی معنے اس آیت کے ہیں کہ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ اور یہی نابینائی جس کا ہم نے ذکر کیا ہے موجبِ فسق و فجور ہے اور اسی بینائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے کہ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ بینائی جو معدوم ہوگئی تھی اسے دوبارہ پیدا کرے۔ خدا چاہتا ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور آپ کی قوتِ افاضہ بھی زندہ ہے۔ اگر یہ نہ

[1] اٰلِ عمران: ۳۲ [2] الحج: ۷۵

ایں نبود کدام فرق در نصاریٰ و اسلام است آں مردہ و ایں ہم مردہ۔ آں قصہ و حکایت است ایں ہم قصہ و حکایت است اندریں صورۃ فیصلہ چگونہ شود خدا تعالیٰ ارادہ فرماید کہ آں برکات سماویہ بنماید و اگر مردے مثل آں (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) نمی آید چگونہ بنماید ایں ہمہ کار خدا است ما بندگانیم و ہیچ امید فتح و شکست نداریم او خوب میداند کہ کدام شوریدہ است بہر مصلحتی کہ خواہد کرد۔

(البدر جلد ا نمبر ۵،۶ مورخہ ۲۸ر نومبر و ۵ر دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۷)

ہوتا تو نصرانیت اور اسلام میں کیا فرق رہ جاتا۔ وہ بھی مردہ اور یہ بھی مردہ۔ وہ بھی قصہ کہانی اور یہ بھی قصہ کہانی۔ اس صورت میں فیصلہ کس طرح ہو۔ خدا تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ وہ برکاتِ سماوی کو ظاہر کرے۔ اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسا آدمی نہیں آتا تو ان کے برکات کو کیسے دکھائے گا۔ یہ سب کام خدا کا ہے ہم سب اس کے بندے ہیں ہمیں فتح و شکست کی کوئی امید نہیں وہ خوب جانتا ہے کہ کون شوریدہ سر ہے وہ اپنی مصلحت کی خاطر جو چاہے گا کرے گا۔ (ترجمہ از مرتب)

براہین میں ایسے الہامات موجود ہیں جن میں نبی یا رسول کا لفظ آیا ہے چنانچہ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى اور جَرِيُّ اللّٰهِ فِيْ حُلَلِ الْاَنْبِيَآءِ وغیرہ۔ ان پر غور نہیں کرتے اور پھر افسوس یہ نہیں سمجھتے کہ ختمِ نبوت کی مہر مسیح اسرائیلی کے آنے سے ٹوٹتی ہے یا خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے۔ ختمِ نبوت کا انکار وہ لوگ کرتے ہیں جو مسیح اسرائیلی کو آسمان سے اتارتے ہیں اور ہمارے نزدیک تو کوئی دوسرا آیا ہی نہیں نہ نیا نبی نہ پرانا نبی بلکہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی چادر دوسرے کو پہنائی گئی ہے اور وہ خود ہی آئے ہیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۴۴ مورخہ ۳۰ر نومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

یہ جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو فرمایا اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (الکوثر : ۲) اس وقت کی بات ہے کہ ایک کافر نے کہا کہ آپؐ کی اولاد نہیں ہے معلوم نہیں اس نے ابتر کا لفظ بولا تھا جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (الکوثر ۴)۔ تیرا دشمن ہی بے اولا د رہے گا۔

روحانی طور پر جو لوگ آئیں گے وہ آپؐ ہی کی اولاد سمجھے جائیں گے اور وہ آپؐ کے علوم و برکات کے وارث ہوں گے اور اس سے حصہ پائیں گے۔ اس آیت کو مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کے ساتھ ملا کر پڑھو تو حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد بھی نہیں تھی تو پھر معاذ اللہ آپؐ ابتر ٹھہرتے ہیں جو آپؐ کے اعداء کے لئے ہے اور

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰكَ الۡکَوۡثَرَ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو روحانی اولاد کثیر دی گئی ہے پس اگر ہم یہ اعتقاد نہ رکھیں کہ کثرت کے ساتھ آپؐ کی روحانی اولاد ہوئی ہے تو اس پیشگوئی کے بھی منکر ٹھہریں گے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ رمئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

یقیناً یاد رکھو کہ کوئی شخص سچا مسلمان نہیں ہوسکتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع نہیں بن سکتا جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین یقین نہ کرلے۔ جب تک ان محدثات سے الگ نہیں ہوتا اور اپنے قول اور فعل سے آپ کو خاتم النبیین نہیں مانتا کچھ نہیں۔ سعدی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا ولیکن میفزائے بر مصطفیٰ

ہمارا مدعا جس کے لئے خدا تعالیٰ نے ہمارے دل میں جوش ڈالا ہے یہی ہے کہ صرف صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قائم کی جائے جو ابدالآباد کے لئے خدا نے قائم کی ہے اور تمام جھوٹی نبوتوں کو پاش پاش کر دیا جائے جو ان لوگوں نے اپنی بدعتوں کے ذریعہ قائم کی ہیں۔ ان ساری گدیوں کو دیکھ لو اور عملی طور پر مشاہدہ کرو کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت پر ہم ایمان لائے ہیں یا وہ۔

یہ ظلم اور شرارت کی بات ہے کہ ختمِ نبوت سے خدا تعالیٰ کا اتنا ہی منشاء قرار دیا جائے کہ منہ سے ہی خاتم النبیین مانو اور کرتوتیں وہی کرو جو تم خود پسند کرو اور اپنی ایک الگ شریعت بنالو۔ بغدادی نماز، معکوس نماز وغیرہ ایجاد کی ہوئی ہے۔ کیا قرآن شریف یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں بھی اس کا کہیں پتہ لگتا ہے اور ایسا ہی ’’یَا شَیۡخ عَبۡدَ الۡقَادِرِ جَیۡلَانِیِّ شَیۡئًا لِلّٰہِ‘‘ کہنا اس کا ثبوت بھی کہیں قرآن شریف سے ملتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تو شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وجود بھی نہ تھا پھر یہ کس نے بتایا تھا۔ شرم کرو کیا شریعتِ اسلام کی پابندی اور التزام اسی کا نام ہے؟ اب خود ہی فیصلہ کرو کہ کیا ان باتوں کو مان کر اور ایسے عمل رکھ کر تم اس قابل ہو کہ مجھے الزام دو کہ میں نے خاتم النبیین کی مہر کو توڑا ہے؟ اصل اور سچی بات یہی ہے کہ اگر تم اپنی مساجد میں بدعات کو دخل نہ دیتے اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی نبوت پر ایمان لا کر آپ کے طرزِ عمل اور نقشِ قدم کو اپنا امام بنا کر چلتے تو پھر میرے آنے ہی کی کیا ضرورت ہوتی۔ تمہاری ان بدعتوں اور نئی نبوتوں نے ہی خدا تعالیٰ کی غیرت کو تحریک دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر میں ایک شخص کو مبعوث کرے جو ان جھوٹی نبوتوں کے بت کو توڑ کر نیست و نابود کرے پس اسی کام کے لئے خدا نے مجھے مامور کرکے بھیجا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰ راگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۵، ۶)

خاتم النبیین کے معنے یہ ہیں کہ آپؐ کی مہر کے بغیر کسی کی نبوت تصدیق نہیں ہوسکتی۔ جب مہر لگ جاتی ہے تو وہ کاغذ سند ہوجاتا ہے اور مصدقہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر اور تصدیق جس نبوت پر نہ ہو وہ صحیح نہیں ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

یہ کہتے ہیں کہ خدا نے میرا نام نبی رکھا۔ یہ بالکل سچی بات ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چشمہ افادات مانتے ہیں۔ ایک چراغ اگر ایسا ہو جس سے کوئی دوسرا روشن نہ ہو وہ قابلِ تعریف نہیں ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم ایسا نور مانتے ہیں کہ آپ سے دوسرے روشنی پاتے ہیں۔

یہ جو خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ یہ بالکل درست ہے۔ خدا تعالیٰ نے آپؐ کی جسمانی ابوت کی نفی کی لیکن آپؐ کی روحانی ابوت کا استثنا کیا ہے اگر یہ مانا جاوے جیسا کہ ہمارے مخالف کہتے ہیں کہ آپؐ کا نہ کوئی جسمانی بیٹا ہے نہ روحانی تو پھر اس طرح پر معاذ اللہ یہ لوگ آپؐ کو ابتر ٹھیراتے ہیں مگر ایسا نہیں۔ آپؐ کی شان تو یہ ہے کہ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَ انْحَرْ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔ اللہ تعالیٰ نے ختمِ نبوت کی آیت میں فرمایا ہے کہ جسمانی طور پر آپؐ اَب نہیں مگر روحانی سلسلہ آپؐ کا جاری ہے لٰكِنْ جبر مافات کے لئے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ آپؐ خاتم ہیں آپؐ کی مہرِ نبوت کا سلسلہ چلتا ہے۔

ہم خود بخود نہیں بن گئے خدا تعالیٰ نے اپنے وعدوں کے موافق جو بنایا وہ بن گئے یہ اس کا فعل اور فضل ہے يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ خدا نے جو وعدے نبیوں سے کئے تھے ان کا ظہور ہوا ہے۔ براہین میں یہ الہام اس وقت سے درج ہے وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ۔ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا۔ وغیرہ اس قسم کے بیسیوں الہام ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی ارادہ فرمایا ہوا تھا۔ اس میں ہمارا کچھ تصرف نہیں۔ کیا جس وقت اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے یہ وعدے فرمائے ہم حاضر تھے۔ جس طرح خدا تعالیٰ مرسل بھیجتا ہے اسی طرح اس نے یہاں اپنے وعدہ کو پورا کیا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰، ۱۱)

ختمِ نبوت بھی ایک عجیب علمی سلسلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ختمِ نبوت کو بھی قائم رکھتا ہے اور اسی کے استفادہ سے ایک سلسلہ جاری کرتا ہے۔ یہ تو ایک علمی بات ہے مگر کجا یہ کہ اس سلسلہ کو الٹ پلٹ کر دوسرے نبی کو لایا جاوے حالانکہ خدا تعالیٰ کی حکمت اور ارادہ نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا نبی آوے قطع نظر اس کے کہ وہ شریعت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ خواہ شریعت نہ بھی رکھتا ہو تب بھی ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی دوسرا نبی

آپؐ کے سوا اور آپؐ کے استفادہ سے الگ ہو کر نہیں آ سکتا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱/ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

جسمانی طور پر جس قدر ترقیات آج تک ہوئی ہیں کیا وہ پہلے زمانوں میں تھیں؟ اسی طرح روحانی ترقیات کا سلسلہ ہے کہ وہ ہوتے ہوتے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا۔ خاتم النبیین کے یہی معنے ہیں۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۴ مورخہ ۲۱/ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۰)

ختمِ نبوت پر محی الدین ابنِ عربی کا یہی مذہب ہے کہ تشریعی نبوت ختم ہو چکی ورنہ ان کے نزدیک مکالمہ الٰہی اور نبوت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس میں علماء کو بہت غلطی لگی ہے۔ خود قرآن میں النَّبِيّٖن جس پر ال پڑا ہے موجود ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ جو نبوت نئی شریعت لانے والی تھی وہ اب ختم ہو گئی ہے ہاں اگر کوئی شخص نئی شریعت کا دعویٰ کرے تو کافر ہے اور اگر سرے سے مکالمہ الٰہی سے انکار کیا جاوے تو پھر اسلام تو ایک مردہ مذہب ہوگا اور اس میں اور دوسرے مذاہب میں کوئی فرق نہ رہے گا کیونکہ مکالمہ کے بعد اور کوئی ایسی بات نہیں رہتی کہ وہ ہو تو اسے نبی کہا جاوے نبوت کی علامت مکالمہ ہے لیکن اب اہلِ اسلام نے جو یہ اپنا مذہب قرار دیا ہے کہ اب مکالمہ کا دروازہ بند ہے اس سے تو یہ ظاہر ہے کہ خدا کا بڑا قہر اسی امت پر ہے اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحۃ: ۶،۷) کی دعا ایک بڑا دھوکہ ہوگی۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۶ مورخہ ۲۷/ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۲)

ختم نبوت کے یہی معنے ہیں کہ نبوت کی ساری خوبیاں اور کمالات تجھ پر ختم ہو گئے اور آئندہ کے لئے کمالاتِ نبوت کا باب بند ہو گیا کہ کوئی نبی مستقل طور پر نہ آئے گا۔

نبی عربی اور عبرانی دونوں زبانوں میں مشترک لفظ ہے جس کے معنے ہیں خدا سے خبر پانے والا اور پیشگوئی کرنے والا جو لوگ براہِ راست خدا سے مکالمہ کرتے اور اس سے خبریں پاتے تھے وہ نبی کہلاتے تھے اور یہ گویا اصطلاح ہو گئی تھی۔ مگر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو بند کر دیا ہے اور مہر لگا دی ہے کہ کوئی نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جب تک آپؐ کی امت میں داخل نہ ہو اور آپؐ کے فیض سے مستفیض نہ ہو وہ خدا سے مکالمہ کا شرف نہیں پا سکتا جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں داخل نہ ہو۔ اگر کوئی ایسا ہے کہ وہ بدوں اس امت میں داخل ہونے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض پانے کے بغیر کوئی شرف مکالمہ الٰہی حاصل کر سکتا ہے تو اسے میرے

سامنے پیش کرو۔

یہی ایک آیت زبردست دلیل ہے اس امر پر جو ہم کہتے کہ حضرت عیسٰیؑ دوبارہ نہیں آویں گے بلکہ آنے والا اس امت میں سے ہوگا۔ کیونکہ وہ نبی ہوں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص نبوت کا فیضان حاصل کرسکتا ہی نہیں جب تک وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفاضہ نہ کرے جو صاف لفظوں میں یہ ہے کہ آپؐ کی امت میں داخل نہ ہو۔ اب خاتم النبیین والی آیت تو صریح روکتی ہے پھر وہ کس طرح آ سکتے ہیں۔ یا ان کو نبوت سے معزول کرو اور ان کی یہ ہتک اور بے عزتی روا رکھو اور یا یہ کہ پھر ماننا پڑے گا کہ آنے والا اسی امت میں سے ہوگا۔

نبی کی اصطلاح مستقل نبی پر بولی جاتی ہے مگر اب خاتم النبیین کے بعد یہ مستقل نبوت رہی ہی نہیں۔ اسی لئے کہا ہے۔

خارقے کز ولی مسموع است معجزہ آں نبی متبوع است

اس بات کو خوب غور سے یاد رکھو کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبوت کا شرف پہلے سے حاصل ہے تو کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ پھر آئیں اور اپنی نبوت کو کھودیں۔ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مستقل نبی کو روکتی ہے البتہ یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو بڑھانے والا ہے کہ ایک شخص آپؐ ہی کی امت سے آپؐ ہی کے فیض سے وہ درجہ حاصل کرتا ہے جو ایک وقت مستقل نبی کو حاصل ہوسکتا تھا لیکن اگر وہ خود ہی آئیں تو پھر صاف ظاہر ہے کہ پھر اس خاتم الانبیاء والی آیت کی تکذیب لازم آتی ہے اور خاتم الانبیاء حضرت مسیح ٹھہریں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آنا بالکل غیر مستقل ٹھہر جاوے گا کیونکہ آپ پہلے بھی آئے اور ایک عرصہ کے بعد آپ رخصت ہوگئے اور حضرت مسیح آپ سے پہلے بھی رہے اور آخر پر بھی وہی رہے۔ غرض اس عقیدہ کے ماننے سے کہ خود ہی حضرت مسیح آنے والے ہیں بہت سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں اور ختمِ نبوت کا انکار کرنا پڑتا ہے جو کفر ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳، ۴)

وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کے معنے ہی ان کے نزدیک یہی ہیں کہ الہام کا دروازہ آپؐ کے بعد ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا اور آپؐ کے بعد آپؐ کی امت سے یہ برکت کہ کسی کو مکالمات اور مخاطبات ہوں بالکل اُٹھ گئی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہر صدی اس امر کی منتظر ہوتی ہے کہ اس امت میں سے چند افراد یا

کوئی ایک فرد ضرور خدا کی ہمکلا می سے مشرف ہوں گے۔ اسلام پر سے گرد وغبار کو دور کر کے پھر اسلام کے روشن چہرے کو چمکا کر دکھایا کریں۔ ان لوگوں سے اگر پوچھا جاوے کہ تمہارے پاس سچائی کی دلیل ہی کون سی ہے؟ کوئی معجزات یا خارق عادت تمہارے پاس نہیں تو دوسروں کا حوالہ دیں گے خود خالی اور محروم ہیں۔ صحابہؓ آنحضرت کے پاس رہ کر اور آپؐ کی صحبت کی برکت سے آنحضرتؐ کے ہی رنگ میں رنگین ہو گئے تھے اور ان کے ایمانوں کے واسطے آنحضرت کی پیشگوئیاں اور معجزات کثرت سے دیکھنے اور ہر وقت مشاہدہ کرنے سے ان کے ایمانوں کا تزکیہ اور تربیت ہوتی گئی اور آخر کار ترقی کرتے کرتے وہ کمال تمام تک پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگین ہو گئے مگر ان لوگوں کے ایمانوں کو مضبوط کرنے کے واسطے اگر ان سے پوچھا جاوے تو کیا ہے؟ تیرہ سو برس کا حوالہ دیں گے کہ اس وقت یہ معجزات اور خارق عادت ظاہر ہوا کرتے تھے۔ پیشگوئیاں بھی تھیں مگر اب کچھ بھی نہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

نبوت جو اللہ تعالیٰ نے اب قرآن شریف میں آنحضرت کے بعد حرام کی ہے اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اب اس امت کو کوئی خیر و برکت ملے گی ہی نہیں اور نہ اس کو شرفِ مکالمات اور مخاطبات ہوگا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت کی مہر کے سوائے اب کوئی نبوت نہیں چل سکے گی۔ اس امت کے لوگوں پر جو نبی کا لفظ نہیں بولا گیا اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ حضرت موسیٰ کے بعد تو نبوت ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ ابھی آنحضرت جیسے عالیجناب اولوالعزم صاحبِ شریعت کمال آنے والے تھے اسی وجہ سے ان کے واسطے یہ لفظ جاری رکھا گیا مگر آنحضرتؐ کے بعد چونکہ ہر ایک قسم کی نبوت بجز آنحضرتؐ کی اجازت کے بند ہو چکی تھی اس واسطے ضروری تھا کہ اس کی عظمت کی وجہ سے وہ لفظ نہ بولا جاتا۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جسمانی طور سے آپؐ کی اولاد کی نفی بھی کی ہے اور ساتھ ہی روحانی طور سے اثبات بھی کیا ہے کہ روحانی طور سے آپ باپ بھی ہیں اور روحانی نبوت اور فیض کا سلسلہ آپؐ کے بعد جاری رہے گا اور وہ آپ میں سے ہو کر جاری ہوگا نہ الگ طور سے۔ وہ نبوت چل سکے گی جس پر آپؐ کی مہر ہوگی۔ ورنہ اگر نبوت کا دروازہ بالکل بند سمجھا جاوے تو نعوذ باللہ اس سے تو انقطاعِ فیض لازم آتا ہے اور اس میں تو نحوست ہے اور نبیؐ کی ہتکِ شان ہوتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس امت کو یہ جو کہا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ (اٰلِ عمران :۱۱۱) یہ جھوٹ تھا نعوذ باللہ۔ اگر یہ معنے کئے جاویں کہ آئندہ کے واسطے نبوت کا دروازہ ہر طرح سے بند ہے تو پھر

خیر الامۃ کی بجائے شر الامم ہوئی یہ امت۔ جب اس کو اللہ تعالیٰ سے مکالمات اور مخاطبات کا شرف بھی نصیب نہ ہوا تو یہ تو كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (الانعام:۱۸۰) ہوئی اور بہائم سیرت اسے کہنا چاہیے نہ یہ کہ خیر الامم۔ اور پھر سورۃ فاتحہ کی دعا بھی لغو جاتی ہے۔ اس میں جو لکھا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحۃ:۶،۷) تو سمجھنا چاہیے کہ ان پہلوں کے پلاؤ زردے مانگنے کی دعا سکھائی ہے! اور ان کی جسمانی لذات اور انعامات کے مورث ہونے کی خواہش کی گئی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور اگر یہی معنے ہیں تو باقی رہ بھی کیا گیا جس سے اسلام کا علو ثابت ہووے۔ اس طرح تو ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ آنحضرت کی قوت قدسی کچھ بھی نہ تھی اور آپؐ حضرت موسیٰ سے مرتبہ میں گرے ہوئے تھے کہ ان کے بعد تو ان کی امت میں سے سینکڑوں نبی آئے مگر آپؐ کی امت سے خدا تعالیٰ کو نفرت ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ مکالمہ بھی نہ کیا کیونکہ جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے آخر اس سے کلام تو کیا ہی جاتا ہے۔

نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا سلسلہ جاری ہے مگر آپؐ میں سے ہو کر اور آپؐ کی مہر سے۔ اور فیضان کا سلسلہ جاری ہے کہ ہزاروں اس امت سے مکالمات اور مخاطبات کے شرف سے مشرف ہوئے اور انبیاء کے خصائص ان میں موجود ہوتے رہے ہیں۔ سینکڑوں بڑے بڑے بزرگ گزرے ہیں جنہوں نے ایسے دعوے کئے چنانچہ حضرت عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہی کی ایک کتاب فتوح الغیب کو ہی دیکھ لو ورنہ اللہ تعالیٰ جو فرماتا ہے کہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل:۷۳) اگر خدا نے خود ہی اس امت کو اعمیٰ بنایا تھا تو عجب ہے خود ہی اسے اعمیٰ بنایا اور خود ہی اعمیٰ کے واسطے زجر اور توبیخ ہے کہ آخرت میں بھی اعمیٰ ہوگی۔ اس امت بیچاری کے کیا اختیار۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ ایک شخص کسی کو کہے کہ اگر تو اس مکان سے گر جاوے گا تو تجھے قید کر دیا جاوے گا مگر پھر خود ہی اسے دھکا دے دے۔

گویا نبوت کا سلسلہ بند کر کے فرمایا کہ تجھے مکالمات اور مخاطبات سے بے بہرہ کیا گیا اور تو بہائم کی طرح زندگی بسر کرنے کے واسطے بنائی گئی اور دوسری طرف کہتا ہے کہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ اب بتاؤ کہ اس تناقض کا کیا جواب ہے؟ ایک طرف تو کہا کہ خیر امت اور دوسری جگہ کہہ دیا کہ تو اعمیٰ ہے۔ آخرت میں بھی اعمیٰ ہوگی نعوذ باللہ۔ کیسے غلط عقیدے بنائے گئے ہیں۔

اور اگر کوئی باہر سے اس کی اصلاح کے واسطے آ گیا تو بھی مشکل۔ اس امت کے نبی کی ہتکِ شان اور قوم کی بھی ناک کٹی ہوئی کہ اس میں گویا کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اصلاح کرنے کے قابل ہو سکے اور کسی کو یہ

شرفِ مکالمہ عطا نہیں کیا جا سکتا اور اس پر بس نہیں بلکہ آنحضرت پر اعتراض آتا ہے کہ ایسے بڑے نبی ہو کر ان کی امت ایسی کمزور اور گئی گزری ہے۔ ایسا نہیں۔ بلکہ بات یوں ہے کہ آنحضرت کے بعد بھی آپؐ کی امت میں نبوت ہے اور نبی ہیں مگر لفظِ نبی کا بوجہ عظمتِ نبوت استعمال نہیں کیا جاتا لیکن برکات اور فیوض موجود ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

اگر غور سے دیکھا جاوے تو ہمارے نبی کریمؐ کو آپ کے بعد کسی دوسرے کے نبی نہ کہلانے سے شوکت ہے اور حضرت موسیٰؑ کے بعد اور لوگوں کے بھی نبی کہلانے سے ان کی کسرِ شان۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ بھی ایک نبی تھے اور ان کے بعد ہزاروں اور نبی بھی آئے تو ان کی نبوت کی خصوصیت اور عظمت کوئی نہیں ثابت ہوتی برعکس اس کے آنحضرتؐ کی ایک عظمت اور آپؐ کی نبوت کے لفظ کا پاس اور ادب کیا گیا ہے کہ آپ کے بعد کسی دوسرے کو اس نام سے کسی طرح بھی شریک نہ کیا گیا۔ اگرچہ آنحضرتؐ کی امت میں بھی ہزاروں بزرگ نبوت کے نور سے منور تھے اور ہزاروں کو انوارِ نبوت کا حصہ عطا ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہوتا ہے مگر چونکہ آنحضرتؐ کا نام خاتم الانبیاء رکھا گیا تھا اس لئے خدا نے نہ چاہا کہ کسی دوسرے کو بھی یہ نام دے کر آپؐ کی کسرِ شان کی جاوے۔ آنحضرتؐ کی امت میں سے ہزار ہا انسانوں کو نبوت کا درجہ ملا اور نبوت کے آثار اور برکات ان کے اندر موجزن تھے مگر نبی کا نام اُن پر صرف شانِ نبوت آنحضرتؐ اور سدِ باب نبوت کی خاطر ان کو اس نام سے ظاہراً ملقب نہ کیا گیا مگر دوسری طرف چونکہ آنحضرتؐ کے فیوض اور روحانی برکات کا دروازہ بند بھی نہ کیا گیا تھا اور نبوت کے انوار جاری بھی تھے جیسا کہ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ سے نکلتا ہے کہ آنحضرتؐ کی مہر اور اذن سے اور آپؐ کے نور سے نورِ نبوت جاری بھی ہے اور یہ سلسلہ بند بھی نہیں ہوا۔ یہ بھی ضروری تھا کہ اسے ظاہراً بھی شائع کیا جاوے......... اور اس طرح سے دونوں امور کا لحاظ نہایت حکمت اور کمال لطافت سے رکھ لیا گیا۔ ادھر یہ کہ آنحضرتؐ کی کسرِ شان بھی نہ ہو اور ادھر موسوی سلسلہ سے مماثلت بھی پوری ہو جاوے۔ تیرہ سو برس تک نبوت کے لفظ کا اطلاق تو آپؐ کی نبوت کی عظمت کے پاس سے نہ کیا اور اس کے بعد اب مدت دراز کے گزرنے سے لوگوں کے چونکہ اعتقاد اس امر پر پختہ ہو گئے تھے کہ آنحضرتؐ ہی خاتم الانبیاء ہیں اور اب اگر کسی دوسرے کا نام نبی رکھا جاوے تو اس سے آنحضرتؐ کی شان میں کوئی فرق بھی نہیں آتا اس واسطے اب نبوت کا لفظ مسیح کے لئے ظاہراً بھی بول دیا۔ یہ ٹھیک اسی طرح سے ہے جیسے آپؐ نے پہلے فرمایا تھا کہ قبروں کی زیارت نہ کیا کرو اور پھر فرما دیا کہ اچھا اب

کرلیا کرو۔ پہلے منع کرنا بھی حکمت رکھتا تھا کہ لوگوں کے خیالات ابھی تازہ تازہ بت پرستی سے ہٹے تھے تا وہ پھر اسی عادت کی طرف عود نہ کریں۔ پھر جب دیکھا کہ اب ان کے ایمان کمال کو پہنچ گئے ہیں اور کسی قسم کے شرک و بدعت کو ان کے ایمان میں راہ نہیں تو اجازت دے دی۔ بالکل اسی طرح یہ امر ہے۔ پہلے تیرہ سو برس اس عظمت کے واسطے نبوت کا لفظ نہ بولا اگرچہ صفتی رنگ میں صفتِ نبوت اور انوارِ نبوت موجود تھے اور حق تھا کہ ان لوگوں کو نبی کہا جاوے مگر خاتم الانبیاء کی نبوت کی عظمت کے پاس کی وجہ سے وہ نام نہ دیا گیا۔ مگر اب وہ خوف نہ رہا تو آخری زمانہ میں مسیح موعود کے واسطے نبی اللہ کا لفظ فرمایا۔ آپؐ کے جانشینوں اور آپؐ کی امت کے خادموں پر صاف صاف نبی اللہ بولنے کے واسطے دو امور مدنظر رکھنے ضروری تھے اول عظمت آنحضرتؐ اور دوم عظمت اسلام۔ سو آنحضرتؐ کی عظمت کے پاس کی وجہ سے ان لوگوں پر ۱۳۰۰ برس تک نبی کا لفظ نہ بولا گیا تا کہ آپؐ کی ختمِ نبوت کی ہتک نہ ہو کیونکہ اگر آپؐ کے بعد ہی آپؐ کی امت کے خلیفوں اور صلحاء لوگوں پر نبی کا لفظ بولا جانے لگتا جیسے حضرت موسیٰؑ کے بعد لوگوں پر بولا جاتا رہا تو اس میں آپؐ کی ختمِ نبوت کی ہتک تھی اور کوئی عظمت نہ تھی۔ سو خدا نے ایسا کیا کہ اپنی حکمت اور لطف سے آپؐ کے بعد ۱۳۰۰ برس تک اس لفظ کو آپؐ کی امت پر سے اٹھا دیا تا آپؐ کی نبوت کی عظمت کا حق ادا ہو جاوے اور پھر چونکہ اسلام کی عظمت چاہتی تھی کہ اس میں بھی بعض ایسے افراد ہوں جن پر آنحضرتؐ کے بعد لفظ نبی اللہ بولا جاوے اور تا پہلے سلسلہ سے اس کی مماثلت پوری ہو۔ آخری زمانہ میں مسیح موعود کے واسطے آپؐ کی زبان سے نبی اللہ کا لفظ نکلوا دیا اور اس طرح پر نہایت حکمت اور بلاغت سے دو متضاد باتوں کو پورا کیا اور موسوی سلسلہ کی مماثلت بھی قائم رکھی اور عظمت اور نبوت آنحضرتؐ بھی قائم رکھی۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

خاتم النبیین کی آیت بتلا رہی ہے کہ جسمانی نسل کا انقطاع ہے نہ کہ روحانی نسل کا۔ اس لئے جس ذریعہ سے وہ نبوت کی نفی کرتے ہیں اسی سے نبوت کا اثبات ثابت ہے۔ آنحضرت کی چونکہ کمال عظمت خدا تعالیٰ کو منظور تھی اس لئے لکھ دیا کہ آئندہ نبوت آپؐ کی اتباع کی مہر سے ہوگی اور اگر یہ معنے ہوں کہ نبوت ختم ہے تو اس سے خدا تعالیٰ کے فیضان کے بخل کی بو آتی ہے ہاں یہ معنے ہیں ہر ایک قسم کا کمال آنحضرتؐ پر ختم ہوا اور پھر آئندہ آپؐ کی مہر سے وہ کمال آپؐ کی امت کو ملا کریں گے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۷؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۹)

اس امت میں سابقہ مجددین اور مامورین کا نبی نہ پکارا جانا آنحضرتؐ کی شان اور عظمت کو ثابت کرتا ہے

جس کا فخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی ہے موسیٰؑ کو ہرگز نہیں ہے کیونکہ جب موسیٰؑ کے بعد نبی کہلانے والے بار بار آئے اور صدہا ہزار ہا آئے تو اس سے موسیٰؑ کی کسرِ شان ہوئی کہ جو خطاب ان کا تھا وہی اوروں کو کثرت سے ملا۔ موسیٰؑ کے بارے میں خاتم النبیین کا لفظ استعمال نہیں ہوا مگر آنحضرتؐ کے حق میں ہوا ہے اس لئے خدا نے اس امت میں یوں کیا کہ بہت سے ایسے پیدا کئے جن کو شرفِ مکالمہ تو دیا مگر آنحضرتؐ کی شان اور عظمت کے لحاظ سے لفظ نبی کا ان کے حق میں نہ رکھا لیکن اگر اس امت میں کوئی بھی نبی نہ پکارا جاتا تو مماثلتِ موسوی کا پہلو بہت ناقص ٹھہرتا اور من وجہ امتِ موسوی کو ایک فضیلت ہو جاتی اس لئے یہ خطاب آنحضرت نے خود اپنی زبانِ مبارک سے ایک شخص کو دے دیا جس نے مسیح ابن مریم ہو کر دنیا میں آنا تھا کیونکہ اس جگہ دو پہلو مدنظر تھے ایک ختمِ نبوت کا، اسے اس طرح نبھایا کہ جو نبی کے لفظ کی کثرت موسوی سلسلہ میں تھی اسے اڑا دیا۔ دوسری مشابہت اسے اس طرح سے پورا کیا کہ ایک کو نبی کا خطاب دے دیا۔ تکمیلِ مشابہت کے لئے اس لفظ کا ہونا ضروری تھا سو پورا ہو گیا اور جو مصلحت یہاں مدِ نظر تھی وہ موسوی سلسلہ میں نہیں تھی کیونکہ موسیٰؑ خاتمِ نبوت نہیں تھے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۷؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۲)

نبوت کے معنے مکالمہ کے ہیں جو غیب کی خبر دیوے وہ نبی ہے۔ اگر آئندہ نبوت کو باطل قرار دو گے تو پھر یہ امت خیرِ امت نہ رہے گی بلکہ کالانعام ہو گی۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۷؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۹)

خدا جس سے پیار کرتا ہے تو اس سے بلا مکالمہ نہیں رہتا۔ آنحضرتؐ کی اتباع سے جب انسان کو خدا پیار کرنے لگتا ہے تو اس سے کلام کرتا ہے، غیب کی خبریں اس پر ظاہر کرتا ہے۔ اسی کا نام نبوت ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۳)

نبوت کا لفظ ہمارے الہامات میں دو شرطیں رکھتا ہے اول یہ اس کے ساتھ شریعت نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ بواسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

ہم اگر نبی کا لفظ اپنے لئے استعمال کرتے ہیں تو ہم ہمیشہ وہ مفہوم لیتے ہیں جو کہ ختمِ نبوت کا مخلّ نہیں ہے اور جب اس کی نفی کرتے ہیں تو وہ معنے مراد ہوتے ہیں جو ختمِ نبوت کے مخلّ ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۷)

معرفتِ تام انبیاؤں کو سوائے وحی کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جس غرض کے لئے انسان اسلام قبول کرتا ہے اس کا مغز یہی ہے کہ اس کی اتباع سے وحی ملے۔ اور پھر اگر وحی منقطع ہوئی مانی بھی جاوے تو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی منقطع ہوئی نہ اس کے اظلال وآثار بھی منقطع ہوئے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۴؍ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۵۸)

خوب یاد رکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں یعنی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نئی شریعت، نئی کتاب نہ آئے گی۔ نئے احکام نہ آئیں گے۔ یہی کتاب اور یہی احکام رہیں گے۔ جو الفاظ میری کتاب میں نبی یا رسول کے میری نسبت پائے جاتے ہیں اس میں ہرگز یہ منشاء نہیں ہے کہ کوئی نئی شریعت یا نئے احکام سکھائے جاویں بلکہ منشاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی ضرورتِ حقہ کے وقت کسی کو مامور کرتا ہے تو ان معنوں سے کہ مکالماتِ الٰہیہ کا شرف اس کو دیتا ہے اور غیب کی خبریں اس کو دیتا ہے اس پر نبی کا لفظ بولا جاتا ہے اور وہ مامور نبی کا خطاب پاتا ہے یہ معنی نہیں ہیں کہ نئی شریعت دیتا ہے یا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو نعوذ باللہ منسوخ کرتا ہے بلکہ یہ جو کچھ اسے ملتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سچی اور کامل اتباع سے ملتا ہے اور بغیر اس کے مل سکتا ہی نہیں۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱ مورخہ ۱۰؍جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو سب انبیاء علیہم السلام سے افضل اور بہتر تھے یہاں تک کہ آپؐ پر سلسلہ نبوت اللہ تعالیٰ نے ختم کر دیا یعنی تمام کمالاتِ نبوت آپؐ پر طبعی طور پر ختم ہو گئے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۴؍ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

کہتے ہیں کہ یہ دروازہ مکالمات ومخاطبات کا اس وجہ سے بند ہو گیا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم النبیین ہیں اس لئے آپؐ کے بعد یہ فیض اور فضل بند ہو گیا مگر ان کی عقل اور علم پر افسوس آتا ہے کہ یہ نادان اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اگر ختمِ نبوت کے ساتھ ہی اگر معرفت اور بصیرت کے دروازے بھی بند ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (معاذ اللہ) خاتم النبیین تو کجا نبی بھی ثابت نہ ہوں گے کیونکہ نبی کی آمد اور بعثت تو اس غرض کے لئے ہوتی ہے تا کہ اللہ تعالیٰ پر ایک یقین اور بصیرت پیدا ہو اور ایسا ایمان ہو جو لذیذ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے تصرفات اور اس کی قدرتوں اور صفات کی تجلی کو انسان مشاہدہ کرے۔ اور اس کا ذریعہ بھی مکالمات و مخاطبات اور خوارق عادات ہیں لیکن جب یہ دروازہ ہی بند ہو گیا تو پھر اس بعثت سے فائدہ کیا ہوا؟

میں بڑے افسوس سے کہتا ہوں کہ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہرگز ہرگز قدر نہیں کی اور آپؐ کی شانِ عالی کو بالکل نہیں سمجھا ورنہ اس قسم کے بیہودہ خیالات یہ نہ تراشتے۔ اس آیت کے اگر یہ معنے

جو یہ پیش کرتے ہیں تسلیم کر لئے جاویں تو پھر گویا آپؐ کو نعوذ باللہ ابتر ماننا ہوگا کیونکہ جسمانی اولاد کی نفی تو قرآن شریف کرتا ہے اور روحانی کی یہ نفی کرتے ہیں تو پھر باقی کیا رہا؟

اصل بات یہ ہے کہ اس آیت سے اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشان کمال اور آپؐ کی قوتِ قدسیہ کا زبردست اثر بیان کرتا ہے کہ آپؐ کی روحانی اولاد اور روحانی تاثیرات کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ آئندہ اگر کوئی فیض اور برکت کسی کو مل سکتی ہے تو اسی وقت اور حالت میں مل سکتی ہے جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع میں کھویا جاوے اور فنا فی الرسول کا درجہ حاصل کر لے بدوں اس کے نہیں۔ اور اگر اس کے سوا کوئی شخص ادعائے نبوت کرے تو وہ کذاب ہوگا۔ اس لئے نبوت مستقلہ کا دروازہ بند ہوگیا اور کوئی ایسا نبی جو بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور ورزش شریعت اور فنا فی الرسول ہونے کے مستقل نبی صاحبِ شریعت ہو، نہیں آسکتا۔ ہاں فنا فی الرسول اور آپؐ کے امتی اور کامل متبعین کے لئے یہ دروازہ بند نہیں کیا گیا اس لئے براہین میں یہ الہام درج ہے کُلُّ بَرَكَةٍ مِّنْ مُّحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَبَارَكَ مَنْ عَلَّمَ وَ تَعَلَّمَ یعنی یہ مخاطبات اور مکالمات کا شرف جو مجھے دیا گیا ہے یہ محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا طفیل ہے اور اسی لئے یہ آپؐ ہی سے ظہور میں آرہے ہیں۔ جس قدر تاثیرات اور برکات وانوار ہیں وہ آپؐ ہی کے ہیں۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۸ مورخہ ۳۱/اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

کہتے ہیں کہ دعویٰ نبوت ہے میں کہتا ہوں یہ تو نری لفظی نزاع ہے۔ نبی تو خبر دینے والے کو کہتے ہیں۔ اب جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے مخاطبات اور مکالمات ہوتے ہوں اس کا کیا نام رکھا جاوے گا اور یہ نبوت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی طفیل اور اتباع کا نتیجہ ہے میں اس کو کفر اور لعنت سمجھتا ہوں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفاضہ کئے بغیر کوئی شخص نبوت کے چشمہ سے حصہ لیتا ہے اور مستقل نبوت کا مدعی ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۰/نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

یہ ایک مسلم بات ہے کہ کسی چیز کا خاتمہ اس کی علتِ غائی کے اختتام پر ہوتا ہے۔ جیسے کتاب کے جب کل مطالب بیان ہو جاتے ہیں تو اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے اسی طرح پر رسالت اور نبوت کی علت غائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوئی اور یہی ختم نبوت کے معنے ہیں کیونکہ یہ ایک سلسلہ ہے جو چلا آیا ہے اور کامل انسان پر آکر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ (ٹریکٹ نمبر ۱ حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدۃ الوجود پر ایک خط صفحہ ۱۷، ۱۸)

(خاتم النبیین۔ ناقل) کے یہ معنے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی صاحبِ شریعت نہیں

آوے گا اور یہ کہ کوئی ایسا نبی آپؐ کے بعد نہیں آسکتا جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر اپنے ساتھ نہ رکھتا ہو۔

رئیس المتصوفین حضرت ابنِ عربیؒ کہتے ہیں کہ نبوت کا بند ہو جانا اور اسلام کا مرجانا ایک ہی بات ہے۔ دیکھو حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں تو عورتوں کو بھی الہام ہوتا تھا چنانچہ خود حضرت موسیٰؑ کی ماں سے بھی خدا نے کلام کیا ہے۔ وہ دین ہی کیا ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ اس کے برکات اور فیوض آگے نہیں بلکہ پیچھے رہ گئے ہیں۔ اگر اب بھی خدا اسی طرح سنتا ہے جس طرح پہلے زمانہ میں سنتا تھا اور اسی طرح سے دیکھتا ہے جس طرح پہلے دیکھتا تھا تو کیا وجہ ہے کہ جب پہلے زمانہ میں سننے اور دیکھنے کی طرح صفتِ تکلم بھی موجود تھی تو اب کیوں مفقود ہو گئی۔ اگر ایسا ہی ہے تو کیا اندیشہ نہیں کہ کسی وقت خدا کی صفت سننے اور دیکھنے کی بھی معزول ہو جاوے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۲ مورخہ ۱۰؍مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

میرا دعویٰ صرف یہ ہے کہ موجودہ مفاسد کے باعث خدا نے مجھے بھیجا ہے اور میں اس امر کا اخفاء نہیں کر سکتا کہ مجھے مکالمہ مخاطبہ کا شرف عطا کیا گیا ہے اور خدا مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے اور کثرت سے ہوتا ہے۔ اسی کا نام نبوت ہے مگر حقیقی نبوت نہیں۔ نباء ایک عربی لفظ ہے جس کے معنے ہیں خبر کے۔ اب جو شخص کوئی خبر خدا سے پاکر خلق پر ظاہر کرے گا اس کو عربی میں نبی کہیں گے۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے الگ ہو کر کوئی دعویٰ نہیں کرتا یہ تو نزاع لفظی ہے۔ کثرت مکالمہ مخاطبہ کو دوسرے الفاظ میں نبوت کہا جاتا ہے۔

دیکھو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ قول کہ قُوْلُوْا اَنَّهٗ خَاتَمُ النَّبِيّٖنَ وَلَا تَقُوْلُوْا لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ اس امر کی صراحت کرتا ہے۔ نبوت اگر اسلام میں موقوف ہو چکی ہے۔ تو یقیناً جانو کہ اسلام بھی مر گیا اور پھر کوئی امتیازی نشان بھی نہیں ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۴؍جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۲)

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓىِٕكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۝۴۴

خدا اور اس کے فرشتے مومنوں پر درود بھیجتے ہیں تا خدا ان کو ظلمت سے نور کی طرف نکالے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۴۶۹)

وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا یعنی خدا کی رحیمیت صرف ایمانداروں سے خاص ہے جس سے کافر کو یعنی بے ایمان اور سرکش کو حصہ نہیں۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۴۵۱ حاشیہ)

وَهُوَ فَيْضُ صِفَةِ الرَّحِيْمِيَّةِ وَلَا يَنْزِلُ هٰذَا الْفَيْضُ اِلَّا عَلَى النَّفْسِ الَّتِيْ سَعٰى سَعْيَهَا لِكَسْبِ الْفُيُوْضِ الْمُتَرَقَّبَةِ وَلِذَالِكَ يَخْتَصُّ بِالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَطَاعُوْا رَبًّا كَرِيْمًا كَمَا صُرِّحَ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا۔

فیضِ رحیمیت اسی شخص پر نازل ہوتا ہے جو فیوضِ مترقبہ کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے اسی لئے یہ ان لوگوں سے خاص ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے رب کریم کی اطاعت کی جیسے اللہ تعالیٰ کے اس قول وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا میں تصریح کی گئی ہے۔(ترجمہ از مرتب)

(اعجاز المسیح، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۱۳۶، ۱۳۷)

وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝۴۷

انبیاء جملہ سلسلہ متفاوتہ فطرتِ انسانی کے وہ افراد عالیہ ہیں جن کو اس کثرت اور کمال سے نورِ باطنی عطا ہوا ہے کہ گویا وہ نورِ مجسم ہو گئے ہیں اسی جہت سے قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نور اور سراجِ منیر رکھا ہے جیسا فرمایا ہے قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (المائدۃ:۱۶) وَ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا یہی حکمت ہے کہ نورِ وحی جس کے لئے نورِ فطرتی کا کامل اور عظیم الشان ہونا شرط ہے صرف انبیاء کو ملا اور انہیں سے مخصوص ہوا۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۱۹۶ حاشیہ)

وَ كَذَالِكَ لَفْظُ الْمَنَارَةِ الَّتِيْ جَآءَ فِي الْحَدِيْثِ فَاِنَّهٗ يَعْنِيْ بِهٖ مَوْضَعَ نُوْرٍ وَّ قَدْ يُطْلَقُ عَلٰى عِلْمٍ يُّهْتَدٰى بِهٖ فَهٰذِهٖ اِشَارَةٌ اِلٰى أَنَّ الْمَسِيْحَ الْاٰتِيْ يُعْرَفُ بِأَنْوَارٍ تَسْبِقُ دَعْوَاهُ فَهِيَ تَكُوْنُ لَهٗ كَعِلْمٍ بِهٖ يَهْتَدُوْنَ۔ وَ نَظِيْرُهٗ فِي الْقُرْاٰنِ قَوْلُهٗ تَعَالٰى وَ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا۔

حدیث میں جو لفظ منارہ آیا ہے اس سے نور کی جگہ مراد ہے اور کبھی اس کا اطلاق اس نشانِ راہ پر ہوتا ہے جس سے راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ پس یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آنے والا مسیح اپنے دعویٰ سے پہلے ظاہر ہونے والے انوار کی وجہ سے پہچانا جائے گا اور وہ اس کے لئے ایسی علامات کی مانند ہوں گے جس کے ذریعہ لوگ ہدایت پائیں گے اور اس کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہے جیسے فرمایا وَ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا۔ (ترجمہ از مرتب)

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۴۵۷، ۴۵۸)

وہ خدا کی طرف بلانے والا ہے اور وہ ایک روشن چراغ ہے جو اپنی ذات میں روشن اور دوسروں کو روشنی پہنچاتا ہے۔ (تریاق القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۲۶۲)

وہ خدا کی طرف بلاتا تھا اور شرک سے دور کرتا تھا اور وہ ایک چراغ تھا زمین پر روشنی پھیلانے والا۔
(نزول المسیح، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۵۰۲)

ایک گاؤں میں ننوا گھر تھے اور صرف ایک گھر میں چراغ جلتا تھا تب جب لوگوں کو معلوم ہوا تو وہ اپنے اپنے چراغ لے کر آئے اور سب نے اس چراغ سے اپنے چراغ روشن کئے۔ اسی طرح ایک روشنی سے کثرت ہو سکتی ہے۔ اسی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ کر کے فرماتا ہے وَدَاعِيًا إِلَى اللهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا۔
(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۴۲۵)

خدا کی طرف سے روحانی اصلاح کے لئے مقرر ہونے والے لوگ چراغ کی طرح ہوتے ہیں اسی واسطے قرآن شریف میں آپؐ کا نام دَاعِيًا إِلَى اللهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا آیا ہے دیکھو کسی اندھیرے مکان میں جہاں سو پچاس آدمی ہوں اگر ان میں سے ایک کے پاس چراغ روشن ہو تو سب کو اس کی طرف رغبت ہوگی اور چراغ ظلمت کو پاش پاش کر کے اجالا اور نور کر دے گا۔

اس جگہ آپؐ کا نام چراغ رکھنے میں ایک اور باریک حکمت یہ ہے کہ ایک چراغ سے ہزاروں لاکھوں چراغ روشن ہو سکتے ہیں اور اس میں کوئی نقص بھی نہیں آتا۔ چاند سورج میں یہ بات نہیں اس سے مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور اطاعت کرنے سے ہزاروں لاکھوں انسان اس مرتبہ پر پہنچیں گے اور آپؐ کا فیض خاص نہیں بلکہ عام اور جاری ہوگا۔ غرض یہ سنت اللہ ہے کہ ظلمت کی انتہا کے وقت اللہ تعالیٰ اپنی بعض صفات کی وجہ سے کسی انسان کو اپنی طرف سے علم اور معرفت دے کر بھیجتا ہے اور اس کے کلام میں تاثیر اور اس کی توجہ میں جذب اور اس کی دعائیں مقبول ہوتی ہیں مگر وہ انہی کو جذب کرتے ہیں اور انہی پر ان کی تاثیرات اثر کرتی ہیں جو اس انتخاب کے لائق ہوتے ہیں دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سِرَاجًا مُّنِيرًا ہے مگر ابوجہل نے کہاں قبول کیا؟ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۴؍جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۱)

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۴۸﴾

كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ..... یعنی خدا اپنے کاموں کا آپ ہی وکیل ہے کسی دوسرے کو پوچھ پوچھ کر احکام

جاری نہیں کرتا۔ (ست بچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۲۸)

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ﴿۵۷﴾

خدا اور اس کے سارے فرشتے اس نبی کریمؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایماندارو تم بھی اس پر درود بھیجو اور نہایت اخلاص اور محبت سے سلام کرو۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۷۱ حاشیہ نمبر ۱۱)

اللہ اور تمام فرشتے اس کے اس نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اے وے لوگو جو ایماندار ہو تم بھی اس پر درود اور سلام بھیجو۔ (ست بچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۲۷)

دُنیا میں کروڑ ہا ایسے پاک فطرت گزرے ہیں اور آگے بھی ہوں گے لیکن ہم نے سب سے بہتر اور سب سے اعلیٰ اور سب سے خوب تر اس مرد خدا کو پایا ہے جس کا نام ہے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ان قوموں کے بزرگوں کا ذکر تو جانے دو جن کا حال قرآن شریف میں تفصیل سے بیان نہیں کیا گیا صرف ہم اُن نبیوں کی نسبت اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور دوسرے انبیاء سو ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں نہ آتے اور قرآن شریف نازل نہ ہوتا اور وہ برکات ہم بچشم خود نہ دیکھتے جو ہم نے دیکھ لئے تو ان تمام گذشتہ انبیاء کا صدق ہم پر مشتبہ رہ جاتا کیونکہ صرف قصوں سے کوئی حقیقت حاصل نہیں ہوسکتی اور ممکن ہے کہ وہ قصے صحیح نہ ہوں اور ممکن ہے کہ وہ تمام معجزات جو اُن کی طرف منسوب کئے گئے ہیں وہ سب مبالغات ہوں کیونکہ اب ان کا نام ونشان نہیں بلکہ ان گذشتہ کتابوں سے تو خدا کا پتہ بھی نہیں لگتا اور یقیناً سمجھ نہیں سکتے کہ خدا بھی انسان سے ہمکلام ہوتا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے یہ سب قصے حقیقت کے رنگ میں آ گئے۔ اب ہم نہ قال کے طور پر بلکہ حال کے طور پر اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ مکالمہ الٰہیہ کیا چیز ہوتا ہے اور خدا کے نشان کس طرح ظاہر ہوتے ہیں اور کس طرح دعائیں قبول ہو جاتی ہیں اور یہ سب کچھ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے پایا اور جو کچھ قصوں کے طور پر غیر قومیں بیان کرتی ہیں وہ سب کچھ ہم نے دیکھ لیا۔ پس ہم نے ایک ایسے نبی کا دامن پکڑا ہے جو خدا نما ہے کسی نے یہ شعر بہت ہی اچھا

کہا ہے ؎

محمدؐ عربی بادشاہ ہر دوسرا کرے ہے روح قدس جس کے در کی دربانی
اُسے خدا تو نہیں کہہ سکوں پہ کہتا ہوں کہ اُس کی مرتبہ دانی میں ہے خدا دانی

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۰۱، ۳۰۲)

ہمارے سید و مولیٰ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی صدق و وفا دیکھئے آپ نے ہر ایک قسم کی بدتحریک کا مقابلہ کیا۔ طرح طرح کے مصائب و تکالیف اٹھائے لیکن پرواہ نہ کی۔ یہی صدق و وفا تھا جس کے باعث اللہ تعالیٰ نے فضل کیا۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے تمام فرشتے رسول پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم درود و سلام بھیجو نبی پر۔ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے اعمال ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف یا اوصاف کی تحدید کرنے کے لئے کوئی لفظِ خاص نہ فرمایا۔ لفظ تو مل سکتے تھے لیکن خود استعمال نہ کئے۔ یعنی آپؐ کے اعمالِ صالحہ کی تعریف تحدید سے بیروں تھی۔ اس قسم کی آیت کسی اور نبی کی شان میں استعمال نہ کی۔ آپؐ کی روح میں وہ صدق وصفا تھا اور آپؐ کے اعمال خدا کی نگاہ میں اس قدر پسندیدہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے یہ حکم دیا کہ آئندہ لوگ شکرگزاری کے طور پر درود بھیجیں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۰، ۵۱)

اللہ تعالیٰ کا بے انتہا شکر ہے کہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم آیا اور بت پرستوں سے اس نے نجات دی۔ یہی وہ راز ہے کہ یہ درجہ صرف صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان احسانوں کے معاوضہ میں ملا کہ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعاتِ پیش آمدہ کی اگر معرفت ہو اور اس بات پر پوری اطلاع ملے کہ اس وقت دنیا کی کیا حالت تھی اور آپؐ نے آکر کیا کیا تو انسان وجد میں آکر اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کہہ اُٹھتا ہے۔ میں سچ سچ کہتا ہوں یہ خیالی اور فرضی بات نہیں ہے قرآن شریف اور دنیا کی تاریخ اس امر کی پوری شہادت دیتی ہے کہ نبی کریم نے کیا کیا ورنہ وہ کیا بات تھی جو آپ کے لئے مخصوصاً فرمایا گیا اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کسی دوسرے نبی کے لئے یہ صدا نہیں

آئی۔ پوری کامیابی پوری تعریف کے ساتھ یہی ایک انسان دنیا میں آیا جو محمد کہلایا صلی اللہ علیہ وسلم۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲ مورخہ ۱۷؍جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

قبولیت دعا کے تین ہی ذریعے ہیں اول اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ (اٰلِ عمران: ۳۲)۔ دوم يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ تیسرا موہبت الٰہی۔

(ٹریکٹ نمبر ۱ بعنوان حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدۃ الوجود پر ایک خط صفحہ ۲۲)

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَاۤ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۱﴾ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚۛ اَيْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿۶۲﴾

جیسے روشنی میں سیہ دل چور نہیں ٹھہر سکتا ایسے ہی اس مقام میں جو تجلیات وانوارِ الٰہی کا مرکز ہو کوئی سیہ دل خائن بہت مدت نہیں ٹھہر سکتا اسی لئے فرمایا قرآن مجید میں لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَاۤ اِلَّا قَلِيْلًا (نہ پڑوس میں رہیں گے تیرے مگر چند دن)

(بدر جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۵؍اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

یہودیوں کی مقدس کتاب اور اسلام کی مقدس کتاب کی رو سے یہ عقیدہ متفق علیہ مانا گیا ہے کہ جو شخص ایسا ہو کہ خدا کی کتابوں میں اس پر ملعون کا لفظ بولا گیا ہو۔ وہ ہمیشہ کے لئے خدا تعالیٰ کی رحمت سے محروم اور بے نصیب ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں یہی اشارہ ہے مَلْعُوْنِيْنَ ۚۛ اَيْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا یعنی زنا کار اور زنا کاری کی اشاعت کرنے والے جو مدینہ میں ہیں یہ لعنتی ہیں یعنی ہمیشہ کے لئے خدا کی رحمت سے رد کئے گئے اس لئے یہ اس لائق ہیں کہ جہاں ان کو پاؤ قتل کر دو۔ پس اس آیت میں اس بات کی طرف یہ عجیب اشارہ ہے کہ لعنتی ہمیشہ کے لئے ہدایت سے محروم ہوتا ہے اور اس کی پیدائش ہی ایسی ہوتی ہے جس پر جھوٹ اور بدکاری کا جوش غالب رہتا ہے اور اسی بنا پر قتل کرنے کا حکم ہوا کیونکہ جو قابلِ علاج نہیں اور مرضِ متعدی رکھتا ہے اس کا مرنا بہتر ہے۔

(تریاق القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۲۳۷، ۲۳۸)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَ كَانَ

عِنۡدَ اللّٰہِ وَجِیۡهًا ﴿۷۰﴾

خدا نے اس کو ان الزامات سے بری کیا جو اس پر لگائے گئے تھے اور خدا کے نزدیک وہ وجیہ ہے۔
(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۶۱۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ قُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِیۡدًا ﴿۷۱﴾

زبان کو صدق وصواب پر قائم رکھنے کے لئے تاکید فرمائی اور کہا قُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِیۡدًا یعنی وہ بات منہ پر لاؤ جو بالکل راست اور نہایت معقولیت میں ہو اور لغو اور فضول اور جھوٹ کا اس میں سرِ مو دخل نہ ہو۔
(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۲۰۹، ۲۱۰ حاشیہ)

اے وے لوگو جو ایمان لائے ہو خدا سے ڈرو اور وہ باتیں کیا کرو جو سچی اور راست اور حق اور حکمت پر مبنی ہوں۔
(ست بچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۳۱)

لغو باتیں مت کیا کرو محل اور موقع کی بات کیا کرو۔
(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۷)

جب بات کرو تو حکمت اور معقولیت سے کرو اور لغو گوئی سے بچو۔
(لیکچر لاہور، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۱۵۷)

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَّحۡمِلۡنَهَا وَ اَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَ حَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا ﴿۷۲﴾ لِّیُعَذِّبَ اللّٰہُ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَ الۡمُنٰفِقٰتِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ وَ الۡمُشۡرِکٰتِ وَ یَتُوۡبَ اللّٰہُ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۷۳﴾

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ...... اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا یعنی ہم نے اپنی امانت کو جس سے مراد عشق ومحبتِ الٰہی اور مورد ابتلا ہو کر پھر پوری اطاعت کرنا ہے۔ آسمان کے تمام فرشتوں اور زمین کی تمام مخلوقات اور پہاڑوں پر پیش کیا جو بظاہر قوی ہیکل چیزیں تھیں سو ان سب چیزوں نے اس امانت کے اُٹھانے سے انکار کر دیا اور اس کی عظمت کو دیکھ کر ڈر گئیں مگر انسان نے اس کو اُٹھا لیا کیونکہ انسان میں یہ دو

خوبیاں تھیں ایک یہ کہ وہ خدائے تعالیٰ کی راہ میں اپنے نفس پر ظلم کرسکتا تھا دوسری یہ خوبی کہ وہ خدائے تعالیٰ کی محبت میں اس درجہ تک پہنچ سکتا تھا جو غیر اللہ کو بکلی فراموش کردے۔

(توضیح مرام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۷۵، ۷۶)

ظلومیت... ایک نہایت قابلِ تعریف جو ہر انسان میں ہے جو فرشتوں کو بھی نہیں دیا گیا اور اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جل شانہ فرماتا ہے وَ حَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ؕ إِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا یعنی انسان میں ظلومیت اور جہولیت کی صفت تھی اس لئے اس نے اس امانت کو اُٹھالیا جس کو وہی شخص اٹھا سکتا ہے جس میں اپنے نفس کی مخالفت اور اپنے نفس پر سختی کرنے کی صفت ہو۔ غرض یہ صفتِ ظلومیت انسان کے مراتبِ سلوک کا ایک مرکب اور اس کے مقاماتِ قرب کے لئے ایک عظیم الشان ذریعہ اس کو عطا کیا گیا ہے جو بوجہ مجاہدات شاقہ کے اوائل حال میں نارِ جہنم کی شکل پر تجلّی کرتا ہے لیکن آخر نعماء جنت تک پہنچا دیتا ہے اور درحقیقت قرآن کریم کے دوسرے مقام میں جو یہ آیت ہے وَ إِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا (مریم : ۷۲، ۷۳) یہ بھی درحقیقت صفتِ محمودہ ظلومیت کی طرف ہی اشارہ کرتی ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۴۲، ۱۴۳)

ظلومیت کی صفت جو مومن میں ہے یہی اس کو خدا تعالیٰ کا پیارا بنا دیتی ہے اور اسی کی برکت سے مومن بڑے بڑے مراحل سلوک کے طے کرتا اور نا قابل برداشت تلخیاں اور طرح طرح کی دوزخوں کی جلن اور حرقت اپنے لئے بخوشی خاطر قبول کر لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جس جگہ انسان کی اعلیٰ درجہ کی مدح بیان کی ہے اور اس کو فرشتوں پر بھی ترجیح دی ہے اس مقام میں اس کی یہی فضیلت پیش کی ہے کہ وہ ظلوم اور جہول ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَ حَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ؕ إِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ یعنی اُس امانت کو جو ربوبیت کا کامل ابتلا ہے جس کو فقط عبودیت کاملہ اٹھا سکتی ہے انسان نے اٹھالیا کیونکہ وہ ظلوم اور جہول تھا یعنی خدا تعالیٰ کے لئے اپنے نفس پر سختی کرسکتا تھا اور غیر اللہ سے اس قدر دور ہوسکتا تھا کہ اس کی صورت علمی سے بھی اس کا ذہن خالی ہو جاتا تھا۔ واضح ہو کہ ہم سخت غلطی کریں گے اگر اس جگہ ظلوم کے لفظ سے کافر اور سرکش اور مشرک اور عدل کو چھوڑنے والا مراد لیں گے کیونکہ یہ ظلوم جہول کا لفظ اس جگہ اللہ جلّ شانہٗ نے انسان کے لئے مقام مدح میں استعمال کیا ہے نہ مقام ذم میں اور اگر نعوذ باللہ یہ مقام ذم میں ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ سب سے بدتر انسان ہی تھا جس نے خدا تعالیٰ کی پاک امانت کو اپنے سر پر اٹھالیا اور اس کے حکم کو مان

لیا۔ بلکہ نعوذ باللہ یوں کہنا پڑے گا کہ سب سے زیادہ ظالم اور جاہل انبیاء اور رسول تھے جنہوں نے سب سے پہلے اس امانت کو اٹھا لیا حالانکہ اللہ جلّ شانہٗ آپ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا ہے پھر وہ سب سے بدتر کیوں کر ہوا اور انبیاء کو سید العادلین قرار دیا ہے پھر وہ ظلوم وجہول دوسرے معنوں کی رو سے کیوں کر کہلاویں۔ ماسوا اس کے ایسا خیال کرنے میں خدا تعالیٰ پر بھی اعتراض لازم آتا ہے کہ اس کی امانت جو وہ دینی چاہتا تھا وہ کوئی خیر اور صلاحیت اور برکت کی چیز نہیں تھی بلکہ شر اور فساد کی چیز تھی کہ شریر اور ظالم نے اس کو قبول کیا اور نیکوں نے اس کو قبول نہ کیا مگر کیا خدا تعالیٰ کی نسبت یہ بدظنی کرنا جائز ہے کہ جو چیز اس کے چشمہ سے نکلے اور جس کا نام وہ اپنی امانت رکھے جو پھر اسی کی طرف ردّ ہونے کے لائق ہے وہ درحقیقت نعوذ باللہ خراب اور پلید چیز ہو جس کو بجز ایسے ظلوم کے جو درحقیقت سرکش اور نافرمان اور نعمت عدل سے بکلّی بے نصیب ہے کوئی دوسرا قبول نہ کر سکے۔ افسوس کہ ایسے مکروہ خیالوں والے کچھ بھی خدا تعالیٰ کی عظمت نگہ نہیں رکھتے وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ امانت اگر سراسر خیر ہے تو اس کا قبول کر لینا ظلم میں کیوں داخل ہے اور اگر امانت خود شر اور فساد کی چیز ہے تو پھر وہ خدا تعالیٰ کی طرف کیوں منسوب کی جاتی ہے۔ کیا خدا تعالیٰ نعوذ باللہ فساد کا مبدا ہے اور کیا جو چیز اس کے پاک چشمہ سے نکلتی ہے اس کا نام فساد اور شر رکھنا چاہیئے؟ ظلمت ظلمت کی طرف جاتی ہے اور نور نور کی طرف سو امانت نور تھی اور انسان ظلوم جہول بھی ان معنوں کر کے جو ہم بیان کر چکے ہیں ایک نور ہے اس لئے نور نے نور کو قبول کر لیا۔ وہ اعلیٰ درجہ کا نور جو انسان کو دیا گیا یعنی انسان کامل کو وہ ملایک میں نہیں تھا نجوم میں نہیں تھا قمر میں نہیں تھا آفتاب میں بھی نہیں تھا وہ زمین کے سمندروں اور دریاؤں میں بھی نہیں تھا۔ وہ لعل اور یاقوت اور زمرد اور الماس اور موتی میں بھی نہیں تھا غرض وہ کسی چیز ارضی اور سماوی میں نہیں تھا صرف انسان میں تھا یعنی انسان کامل میں جس کا اتم اور اکمل اور اعلیٰ اور ارفع فرد ہمارے سیّد و مولیٰ سیّد الانبیاء سیّد الاحیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ سو وہ نور اس انسان کو دیا گیا اور حسب مراتب اس کے تمام ہم رنگوں کو بھی یعنی ان لوگوں کو بھی جو کسی قدر وہی رنگ رکھتے ہیں اور امانت سے مراد انسان کامل کے وہ تمام قویٰ اور عقل اور علم اور دل اور جان اور حواس اور خوف اور محبت اور عزت اور وجاہت اور جمیع نعماء روحانی و جسمانی ہیں جو خدا تعالیٰ انسان کامل کو عطا کرتا ہے اور پھر انسان کامل برطبق آیت اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا (النساء: ۵۹)۔ اس ساری امانت کو جناب الٰہی کو واپس دے دیتا ہے یعنی اس میں فانی ہو کر اس کی راہ میں وقف کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم مضمون حقیقتِ اسلام

میں بیان کر چکے ہیں اور یہ شان اعلیٰ اور اکمل اور اتم طور پر ہمارے سید ہمارے مولیٰ ہمارے ہادی نبی امی صادق مصدوق محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی تھی جیسا کہ خود خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۔ (الانعام : ۱۶۳، ۱۶۴) وَ اَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ (الانعام : ۱۵۴)۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (اٰلِ عمران : ۳۲)۔ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْہِیَ لِلّٰہِ (اٰلِ عمران : ۲۱)۔ وَ اُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (المؤمن : ۶۷)۔ یعنی ان کو کہہ دے کہ میری نماز اور میری پرستش میں جدوجہد اور میری قربانیاں اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا سب خدا کے لئے اور اس کی راہ میں ہے۔ وہی خدا جو تمام عالموں کا رب ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں اوّل المسلمین ہوں یعنی دنیا کی ابتداء سے اس کے اخیر تک میرے جیسا اور کوئی کامل انسان نہیں جو ایسا اعلیٰ درجہ کا فنا فی اللہ ہو جو خدا تعالیٰ کی ساری امانتیں اس کو واپس دینے والا ہو۔ اس آیت میں ان نادان موحدوں کا ردّ ہے جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسرے انبیاء پر فضیلت کلی ثابت نہیں اور ضعیف حدیثوں کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ مجھ کو یونس بن متیؑ سے بھی زیادہ فضیلت دی جائے۔ یہ نادان نہیں سمجھتے کہ اگر وہ حدیث صحیح بھی ہو تب بھی وہ بطور انکسار اور تذلل ہے جو ہمیشہ ہمارے سیّد صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی ہر ایک بات کا ایک موقع اور محل ہوتا ہے اگر کوئی صالح اپنے خط میں احقر عباد اللہ لکھے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ شخص درحقیقت تمام دنیا یہاں تک کہ بت پرستوں اور تمام فاسقوں سے بدتر ہے اور خود اقرار کرتا ہے کہ وہ احقر عباد اللہ ہے کس قدر نادانی اور شرارت نفس ہے۔

غور سے دیکھنا چاہیئے کہ جس حالت میں اللہ جلّ شانہٗ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اول المسلمین رکھتا ہے اور تمام مطیعوں اور فرمانبرداروں کا سردار ٹھہراتا ہے اور سب سے پہلے امانت کو واپس دینے والا آنحضرت صلعم کو قرار دیتا ہے تو پھر کیا بعد اس کے کسی قرآن کریم کے ماننے والے کو گنجائش ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اعلیٰ میں کسی طرح کا جرح کر سکے۔ خدا تعالیٰ نے آیت موصوفہ بالا میں اسلام کے لئے کئی مراتب رکھ کر سب مدارج سے اعلیٰ درجہ وہی ٹھہرایا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت کو

عنایت فرمایا۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ مَا اَعْظَمَ شَاْنُكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ۔

موسیٰ و عیسیٰ ہمہ خیلِ تواند جملہ درین راہ طفیلِ تواند

پھر بقیہ ترجمہ یہ ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ اپنے رسول کو فرماتا ہے کہ ان کو کہہ دے کہ میری راہ جو ہے وہی راہ سیدھی ہے سو تم اس کی پیروی کرو اور اَور راہوں پر مت چلو کہ وہ تمہیں خدا تعالیٰ سے دور ڈال دیں گی۔ ان کو کہہ دے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو آؤ میرے پیچھے پیچھے چلنا اختیار کرو یعنی میرے طریق پر جو اسلام کی اعلیٰ حقیقت ہے قدم مارو تب خدا تعالیٰ تم سے بھی پیار کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ ان کو کہہ دے کہ میری راہ یہ ہے کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ اپنا تمام وجود خدا تعالیٰ کو سونپ دوں اور اپنے تئیں ربّ العالمین کے لئے خالص کرلوں یعنی اس میں فنا ہو کر جیسا کہ وہ ربّ العالمین ہے میں خادم العالمین بنوں اور ہمہ تن اسی کا اور اسی کی راہ کا ہو جاؤں۔ سو میں نے اپنا تمام وجود اور جو کچھ میرا تھا خدا تعالیٰ کا کر دیا ہے اب کچھ بھی میرا نہیں جو کچھ میرا ہے وہ سب اس کا ہے۔ اور یہ وسوسہ کہ ایسے معنے آیت ظلوم وجہول کے کس نے متقدمین سے کئے ہیں اور کون اہل زبان میں سے ظلم کے ایسے معنے بھی کرتا ہے اس وہم کا جواب یہ ہے کہ ہمیں بعد کلام اللہ کے کسی اور سند کی ضرورت نہیں۔ کلام الٰہی کے بعض مقامات بعض کی شرح ہیں۔ پس جس حالت میں خدا تعالیٰ نے بعض متقیوں کا نام بھی ظالم رکھا ہے اور مراتب ثلاثہ تقویٰ سے پہلا مرتبہ تقویٰ کا ظلم کو ہی ٹھہرایا ہے تو اس سے ہم نے قطعی اور یقینی طور پر سمجھ لیا کہ اس ظلم کے لفظ سے وہ ظلم مراد نہیں ہے جو تقویٰ سے دور اور کفار اور مشرکین اور نافرمانوں کا شعار ہے بلکہ وہ ظلم مراد ہے جو سلوک کے ابتدائی حالات میں متقیوں کے لئے شرط متحتم ہے یعنی جذبات نفسانی پر حملہ کرنا اور بشریت کی ظلمت کو اپنے نفس سے کم کرنے کے لئے کوشش کرنا جیسا کہ اس دوسری آیت میں بھی کم کرنے کے معنی ہیں اور وہ یہ ہے وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا (الکھف : ۳۴)۔ اَیْ وَ لَمْ تَنْقُصْ دیکھو قاموس اور صحاح اور صراح جو ظلم کے معنے کم کرنے کے بھی لکھے ہیں اور اس آیت کے یہی معنے کئے ہیں یعنی وَ لَمْ تَنْقُصْ۔

ماسوا اس کے اس معنے کے کرنے میں یہ عاجز متفرد نہیں بڑے بڑے محقق اور فضلاء نے جو اہل زبان تھے یہی معنے کئے ہیں چنانچہ منجملہ ان کے صاحب فتوحات مکیہ ہیں جو اہل زبان بھی ہیں وہ اپنی ایک تفسیر میں جو مصر کے چھاپہ میں چھپ کر شائع ہوئی ہے یہی معنے کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے زیر تفسیر آیت وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ یہی معنے لکھے ہیں کہ یہ ظلوم وجہول مقام مدح میں ہے اور اس سے

مطلب یہی ہے کہ انسان مومن احکام الٰہی کی بجا آوری میں اپنے نفس پر اس طور سے ظلم کرتا ہے جو نفس کے جذبات اور خواہشوں کا مخالف ہو جاتا ہے اور اس سے اس کے جوشوں کو گھٹاتا ہے اور کم کرتا ہے۔اور صاحب تفسیر حسینی خواجہ محمد پارسا کی تفسیر سے نقل کرتے ہیں کہ آیت کے یہ معنی ہیں کہ انسان نے اس امانت کو اس لئے اٹھالیا کہ وہ ظلوم تھا یعنی اس بات پر قادر تھا کہ اپنے نفس اور اس کی خواہشوں سے باہر آجائے یعنی جذبات نفسانی کو کم بلکہ معدوم کر دیوے اور ہویت مطلقہ میں گم ہو جائے اور انسان جہول تھا اس لئے کہ اس میں یہ قوت ہے کہ غیر حق سے بکلی غافل اور نادان ہو جائے اور بقول لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ نفی ماسویٰ کی کر دیوے اور ابن جریر بھی جو رئیس المفسرین ہے اس آیت کی شرح میں لکھتا ہے کہ ظلوم اور جہول کا لفظ محل مدح میں ہے نہ ذم میں غرض اکابر اور محققین جن کی آنکھوں کو خدا تعالیٰ نے نور معرفت سے منور کیا تھا وہ اکثر اسی طرف گئے ہیں کہ اس آیت کے بجز اس کے اور کوئی معنے نہیں ہو سکتے کہ انسان نے خدا تعالیٰ کی امانت کو اٹھا کر ظلوم اور جہول کا خطاب مدح کے طور پر حاصل کیا نہ ذم کے طور پر چنانچہ ابن کثیر نے بھی بعض روایات اسی کی تائید میں لکھی ہیں اور اگر ہم اس تمام آیت پر کہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ایک نظر غور کی کریں تو یقینی طور پر معلوم ہوگا کہ وہ امانت جو فرشتوں اور زمین اور پہاڑوں اور تمام کواکب پر عرض کی گئی تھی اور انہوں نے اٹھانے سے انکار کیا تھا وہ جس وقت انسان پر عرض کی گئی تھی تو بلاشبہ سب سے اول انبیاء اور رسولوں کی روحوں پر عرض کی گئی ہو گی کیونکہ وہ انسانوں کے سردار اور انسانیت کے حقیقی مفہوم کے اول المستحقین ہیں پس اگر ظلوم اور جہول کے معنے یہی مراد لئے جائیں جو کافر اور مشرک اور پکے نافرمان کو کہتے ہیں تو پھر نعوذ باللہ سب سے پہلے انبیاء کی نسبت اس نام کا اطلاق ہوگا۔لہٰذا یہ بات نہایت روشن اور بدیہی ہے کہ ظلوم اور جہول کا لفظ اس جگہ محل مدح میں ہے اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کے حکم کو مان لیا جاوے اور اس سے منہ پھیرنا موجب معصیت نہیں ہو سکتا یہ تو عین سعادت ہے تو پھر ظلوم اور جہول کے حقیقی معنی جو اِبا اور سرکشی کو مستلزم ہیں کیوں کر اس مقام کے مناسب حال ہو سکتے ہیں جو شخص قرآن کریم کی اسالیب کلام کو بخوبی جانتا ہے اُس پر یہ پوشیدہ نہیں کہ بعض اوقات وہ کریم و رحیم جلّشانہ اپنے خواص عباد کے لئے ایسا لفظ استعمال کر دیتا ہے کہ بظاہر بدنما ہوتا ہے مگر معناً نہایت محمود اور تعریف کا کلمہ ہوتا ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ نے اپنے نبی کریم کے حق میں فرمایا وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضُّحٰی : ۸) اب ظاہر ہے کہ ضال کے معنے

مشہور اور متعارف جو اہل لغت کے منہ پر چڑھے ہوئے ہیں گمراہ کے ہیں جس کے اعتبار سے آیت کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے (اے رسول اللہ) تجھ کو گمراہ پایا اور ہدایت دی۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی گمراہ نہیں ہوئے اور جو شخص مسلمان ہو کر یہ اعتقاد رکھے کہ کبھی آنحضرت صلعم نے اپنی عمر میں ضلالت کا عمل کیا تھا تو وہ کافر بے دین اور حد شرعی کے لائق ہے بلکہ آیت کے اِس جگہ وہ معنی لینے چاہیے جو آیت کے سیاق اور سباق سے ملتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اللہ جلّشانہ نے پہلے آنحضرت صلعم کی نسبت فرمایا اَلَمۡ یَجِدۡكَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی وَ وَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰی (الضُّحٰی:۷،۸،۹)۔ یعنی خدا تعالیٰ نے تجھے یتیم اور بیکس پایا اور اپنے پاس جگہ دی اور تجھ کو ضال (یعنی عاشق وجہ اللہ) پایا پس اپنی طرف کھینچ لایا اور تجھے درویش پایا پس غنی کر دیا۔ ان معنوں کی صحت پر یہ ذیل کی آیتیں قرینہ ہیں جو ان کے بعد آتی ہیں یعنی یہ کہ فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡهَرۡ وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ وَ اَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ (الضُّحٰی:۱۰،۱۱،۱۲) کیونکہ یہ تمام آیتیں لف نشر مرتب کے طور پر ہیں اور پہلی آیتوں میں جو مدعا مخفی ہے دوسری آیتیں اس کی تفصیل اور تصریح کرتی ہیں مثلاً پہلے فرمایا اَلَمۡ یَجِدۡكَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی اس کے مقابل پر یہ فرمایا فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡهَرۡ یعنی یاد کر کہ تو بھی یتیم تھا اور ہم نے تجھ کو پناہ دی ایسا ہی تو بھی یتیموں کو پناہ دے۔ پھر بعد اس آیت کے فرمایا وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی اِس کے مقابل پر یہ فرمایا وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ یعنی یاد کر کہ تو بھی ہمارے وصال اور جمال کا سائل اور ہمارے حقائق اور معارف کا طالب تھا سو جیسا کہ ہم نے باپ کی جگہ ہو کر تیری جسمانی پرورش کی ایسا ہی ہم نے استاد کی جگہ ہو کر تمام دروازے علوم کے تجھ پر کھول دیئے اور اپنے لقا کا شربت سب سے زیادہ عطا فرمایا اور جو تو نے مانگا سب ہم نے تجھ کو دیا سو تو بھی مانگنے والوں کو ردمت کر اور ان کو مت جھڑک اور یاد کر کہ تو عائل تھا اور تیری معیشت کے ظاہری اسباب بکلّی منقطع تھے سو خدا خود تیرا متولّی ہوا اور غیروں کی طرف حاجت لے جانے سے تجھے غنی کر دیا۔ نہ تو والد کا محتاج ہوا نہ والدہ کا نہ استاد کا اور نہ کسی غیر کی طرف حاجت لے جانے کا بلکہ یہ سارے کام تیرے خدا تعالیٰ نے آپ ہی کر دیئے اور پیدا ہوتے ہی اس نے تجھ کو آپ سنبھال لیا۔ سو اس کا شکر بجالا اور حاجت مندوں سے تو بھی ایسا ہی معاملہ کر۔ اب ان تمام آیات کا مقابلہ کر کے صاف طور پر کھلتا ہے کہ اس جگہ ضَالّ کے معنے گمراہ نہیں ہے بلکہ انتہائی درجہ کے تعشق کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ حضرت یعقوب کی نسبت اسی کے مناسب یہ آیت ہے اِنَّكَ لَفِیۡ ضَلٰلِكَ الۡقَدِیۡمِ (یوسف:۹۶)۔ سو یہ دونوں لفظ ظلم اور ضلالت اگرچہ ان معنوں پر بھی آتے ہیں کہ کوئی شخص

جادہ اعتدال اور انصاف کو چھوڑ کر اپنے شہوات غضبیہ یا بہیمیہ کا تابع ہوجاوے۔لیکن قرآن کریم میں عشاق کے حق میں بھی آئے ہیں جو خدا تعالیٰ کے راہ میں عشق کی مستی میں اپنے نفس اور اس کے جذبات کو پیروں کے نیچے کچل دیتے ہیں۔اسی کے مطابق حافظ شیرازی کا یہ شعر ہے۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

اس دیوانگی سے حافظ صاحب حالت تعشق اور شدت حرص اطاعت مراد لیتے ہیں۔غرض ان آیتوں کی حقیقت واقعی یہی ہے جو خدا تعالیٰ نے میرے پر کھولی اور میں ہرگز ایسے معنی نہیں کروں گا جن سے ایک طرف تو یہ لازم آوے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ پاک امانت نہیں تھی بلکہ کوئی فساد کی بات تھی جو ایک مفسد ظالم نے قبول کر لی اور نیکوں نے اس کو قبول نہ کیا اور دوسری طرف تمام مقدس رسولوں اور نبیوں کو جو اول درجہ پر امانت کے محمل ہیں ظالم ٹھہرایا جاوے۔اور میں بیان کر چکا ہوں کہ دراصل امانت اور اسلام کی حقیقت ایک ہی ہے اور امانت اور اسلام دراصل محمود چیز ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ کا دیا ہوا اسی کو واپس دیا جاوے جیسے امانت واپس دی جاتی ہے پس جس نے ایک محمود اور پسندیدہ چیز کو قبول کر لیا اور خدا تعالیٰ کے حکم سے منہ نہ پھیرا اور اس کی مرضی کو اپنی مرضی پر مقدم رکھا وہ لائق مذمت کیوں ٹھہرے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس آیت کے آگے خدا تعالیٰ فرماتا ہے لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ وَ يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔یعنی انسان نے جو امانت اللہ کو قبول کر لیا تو اس سے یہ لازم آیا جو منافقین اور منافقات اور مشرکین اور مشرکات جنہوں نے صرف زبان سے قبول کیا اور عملاً اس کے پابند نہیں ہوئے وہ معذب ہوں اور مومنین اور مومنات جنہوں نے امانت کو قبول کر کے عملاً پابندی بھی اختیار کی وہ مورد رحمت الٰہی ہوں۔یہ آیت بھی صاف اور صریح طور پر بول رہی ہے کہ آیت موصوفہ میں ظلوم وجہول سے مراد مومن ہیں جن کی طبیعتوں اور استعدادوں نے امانت کو قبول کر لیا اور پھر اس پر کاربند ہوگئے کیونکہ صاف ظاہر ہے کہ مشرکوں اور منافقوں نے کامل طور پر قبول نہیں کیا اور حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ میں جو انسان کے لفظ پر الف لام ہے وہ بھی درحقیقت تخصیص کے لئے ہے جس سے خدا تعالیٰ کا یہ منشاء ثابت ہوتا ہے کہ تمام انسانوں نے اس امانت کو کامل طور پر قبول نہیں کیا صرف مومنوں نے قبول کیا ہے اور منافقوں اور مشرکوں کی فطرتوں میں گو ایک ذرّہ استعداد کا موجود تھا مگر بوجہ نقصان استعداد وہ کامل طور پر اس پیارے لفظ ظلوم اور جہول سے حصہ نہ لے سکے اور جن کو بڑی قوت ملی تھی وہ کامل طور پر اس نعمت کو لے

گئے۔ انہوں نے اس امانت کے قبول کرنے کا صرف اپنی زبان سے اقرار نہیں کیا بلکہ اپنے اعمال اور افعال میں ثابت کر کے دکھلا دیا اور جو امانت لی تھی کمال دیانت کے ساتھ اس کو واپس دے دیا۔

بالآخر یہ بھی واضح رہے کہ جہول کا لفظ بھی ظلوم کے لفظ کی طرح ان معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جو اتقا اور اصطفا کے مناسب حال ہیں کیونکہ اگر جاہلیت کا حقیقی مفہوم مراد ہو جو علوم اور عقائد صحیحہ سے بے خبری اور ناراست اور بے ہودہ باتوں میں مبتلا ہونا ہے تو یہ تو صریح متقیوں کی صفت کے برخلاف ہے کیونکہ حقیقی تقویٰ کے ساتھ جاہلیت جمع نہیں ہوسکتی۔ حقیقی تقویٰ اپنے ساتھ ایک نور رکھتی ہے جیسا کہ اللہ جلّشانہ فرماتا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (الانفال: ۳۰)۔ وَ یَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ (الحدید: ۲۹)۔ یعنی اے ایمان لانے والو اگر تم متقی ہونے پر ثابت قدم رہو اور اللہ تعالیٰ کے لئے اتقاء کی صفت میں قیام اور استحکام اختیار کرو تو خدا تعالیٰ تم میں اور تمہارے غیروں میں فرق رکھ دے گا وہ فرق یہ ہے کہ تم کو ایک نور دیا جائے گا جس نور کے ساتھ تم اپنی تمام راہوں میں چلو گے یعنی وہ نور تمہارے تمام افعال اور اقوال اور قویٰ اور حواس میں آ جائے گا تمہاری عقل میں بھی نور ہوگا اور تمہاری ایک اٹکل کی بات میں بھی نور ہوگا اور تمہاری آنکھوں میں بھی نور ہوگا اور تمہارے کانوں اور تمہاری زبانوں اور تمہارے بیانوں اور تمہاری ہر ایک حرکت اور سکون میں نور ہوگا اور جن راہوں میں تم چلو گے وہ راہ نورانی ہو جائیں گی۔ غرض جتنی تمہاری راہیں تمہارے قویٰ کی راہیں تمہارے حواس کی راہیں ہیں وہ سب نور سے بھر جائیں گی اور تم سراپا نور میں ہی چلو گے۔

اب اس آیت سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ تقویٰ سے جاہلیت ہرگز جمع نہیں ہوسکتی ہاں فہم اور ادراک حسب مراتب تقویٰ کم و بیش ہوسکتا ہے اسی مقام سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بڑی اور اعلیٰ درجہ کی کرامت جو اولیاء اللہ کو دی جاتی ہے جن کو تقویٰ میں کمال ہوتا ہے وہ یہی دی جاتی ہے کہ ان کے تمام حواس اور عقل اور فہم اور قیاس میں نور رکھا جاتا ہے اور ان کی قوت کشفی نور کے پانیوں سے ایسی صفائی حاصل کر لیتی ہے کہ جو دوسروں کو نصیب نہیں ہوتی ان کے حواس نہایت باریک بین ہو جاتے ہیں اور معارف اور دقائق کے پاک چشمے ان پر کھولے جاتے ہیں اور فیض سائغ ربانی ان کے رگ و ریشہ میں خون کی طرح جاری ہو جاتا ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۵۷ تا ۱۷۹)

آیت وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ بھی دلالت کر رہی ہے کہ خدا کا حقیقی مطیع انسان ہی ہے جو اپنی اطاعت کو محبت اور عشق تک پہنچاتا ہے اور خدا کی بادشاہت کو ہزارہا بلاؤں کو سر پر لے کر زمین پر ثابت کرتا ہے۔ پس یہ

طاعت جو در دِدل سے ملی ہوئی ہے فرشتے اس کو کب بجالا سکتے ہیں۔

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۴۰ حاشیہ)

ہم نے اپنی امانت کو جو امانت کی طرح واپس دینی چاہیے تمام زمین و آسمان کی مخلوق پر پیش کیا پس سب نے اس امانت کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈرے کہ امانت کے لینے سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو مگر انسان نے اس امانت کو اپنے سر پر اٹھالیا کیونکہ وہ ظلوم اور جہول تھا۔ یہ دونوں لفظ انسان کے لئے محلِ مدح میں ہیں نہ محل مذمت میں اور ان کے معنے یہ ہیں کہ انسان کی فطرت میں ایک صفت تھی کہ وہ خدا کے لئے اپنے نفس پر ظلم اور سختی کر سکتا تھا اور ایسا خدا تعالیٰ کی طرف جھک سکتا تھا کہ اپنے نفس کو فراموش کر دے۔ اس لئے اس نے منظور کیا کہ اپنے تمام وجود کو امانت کی طرح پاوے اور پھر خدا کی راہ میں خرچ کر دے۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۲۳۹)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تفسیر سورۃ سبا

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ؕ یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَ الطَّیْرَ ۚ وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ ۙ﴿۱۱﴾

اے پہاڑو اور اے پرندو میرے اس بندہ کے ساتھ وجد اور رقت سے میری یاد کرو۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۹۳)

تدابیر مشہودہ سے الگ ہو کر جو فعل ہوتا ہے اس میں اعجازی رنگ ہوتا ہے۔ معجزات جن باتوں میں صادر ہوتے ہیں ان میں سے بہت سے افعال ایسے ہوتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی ان میں شریک ہوتے ہیں مگر نبی ان تدابیر اور اسباب سے الگ ہو کر وہی فعل کرتا ہے اس لئے وہ معجزہ ہوتا ہے اور یہی بات یہاں سلیمانؑ کے قصہ میں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کیا لوگ قصائد نہ کہتے تھے؟ کہتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کلامِ فصیح و بلیغ پیش کیا تو وہ جوڑ توڑ کا نتیجہ نہ تھا بلکہ وحی سے تھا۔ اس لئے معجزہ تھا کہ درمیان اسبابِ عادیہ نہ تھے۔ آپؐ نے کوئی تعلیم نہ پائی تھی اور بدوں کوشش کے وہ کلام آپؐ نے پیش کیا۔ غرض اسی طرح پر لوہا نرم کرنے کا معجزہ ہے کہ اس میں اسبابِ عادیہ نہ تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے اور معنی بھی ہوں مشکلات صعب سے بھی مراد لوہا ہوتا ہے۔ وہ حضرت سلیمانؑ پر آسان ہو گئیں مگر اصل اعجاز کا کسی حال میں ہم انکار نہیں کرتے ورنہ اگر خدا تعالیٰ کی ان قدرتوں پر ایمان نہ ہو تو پھر خدا کو کیا مانا ہم اس کو خارق عادت

نہیں مان سکتے جو قرآن شریف کے بیان کردہ قانونِ قدرت کے خلاف ہو۔
(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۴﴾

بعض خام خیال کوتاہ فہم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ ہر ایک آدمی کو جہنم میں ضرور جانا ہوگا یہ غلط ہے ہاں اس میں شک نہیں کہ تھوڑے ہیں جو جہنم کی سزا سے بالکل محفوظ ہیں اور یہ تعجب کی بات نہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۶؍ستمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۶)

خوش قسمت وہی انسان ہے جو ایسے مردانِ خدا کے پاس رہ کر (جن کو اللہ تعالیٰ اپنے وقت پر بھیجتا ہے) اس غرض اور مقصد کو حاصل کرلے جس کے لئے وہ آتے ہیں۔ ایسے لوگ اگرچہ تھوڑے ہوتے ہیں لیکن ہوتے ضرور ہیں۔ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔ اگر تھوڑے نہ ہوتے تو پھر بے قدری ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ سونا چاندی، لوہے اور ٹین کی طرح عام نہیں ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۴ مورخہ ۳۱؍جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ کہ شاکر اور سمجھدار بندے ہمیشہ کم ہوتے ہیں جو کہ حقیقی طور پر قرآن پر چلنے والے ہیں اور خدا تعالیٰ نے ان کو اپنی محبت اور تقویٰ عطا کیا ہے۔ وہ خواہ قلیل ہوں مگر اصل میں وہی سوادِ اعظم ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۶ مورخہ ۱۷؍فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

اللہ تعالیٰ کثرت اور تعداد کے رعب میں نہیں آتا قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔ دیکھو حضرت نوحؑ کے وقت کس قدر مخلوق غرقِ آب ہوئی اور ان کے بالمقابل جو لوگ بچ گئے ان کی تعداد کس قدر تھی۔
(بدر جلد ۲ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۶؍اپریل ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۱۵﴾

سلیمان کی موت پر دلالت کرنے والا کوئی امر نہ تھا۔ یہ ساری شرارت گویا دابۃ الارض کی تھی کہ اس نے عصا کھا لیا اور وہ گر پڑا خدا تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سچ ہے۔ یہ قصے اور داستانیں نہیں ہیں بلکہ یہ حقائق

اور معارف ہیں۔ اسلام راستی کا عصا تھا جو اپنے سہارے کھڑا تھا اور اس کے سامنے کوئی آریہ، ہندو، عیسائی دم نہ مار سکتا تھا لیکن جب سے یہ دابۃ الارض پیدا ہوئے اور انہوں نے قرآن کو چھوڑ کر موضوع روایتوں پر اپنا انحصار رکھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف سے اسلام پر حملے ہونے شروع ہو گئے۔ دابۃ الارض کے معنے اصل میں یہ ہیں کہ ایک دیمک ہوتی ہے جس میں کوئی خیر نہیں جو لکڑی اور مٹی وغیرہ کو کھا جاتی ہے۔ اس میں فنا کا مادہ ہے اور اچھی چیز کو فنا کرنا چاہتی ہے اس میں آتشی مادہ ہے۔ اب اس کا مطلب یہ ہے کہ دابۃ الارض اس وقت کے علماء ہیں جو جھوٹے معنے کرتے ہیں اور اسلام پر جھوٹے الزام لگاتے ہیں.... غرض عصائے اسلام جس کے ساتھ اسلام کی شوکت اور رعب تھا اور جس کے ساتھ امن اور سلامتی تھی اس دابۃ الارض نے گرا دیا ہے۔ پس جیسے وہ دابۃ الارض تھا یہ اس سے بدتر ہیں۔ اس سے تو صرف ملک میں فتنہ پڑا تھا مگر ان سے دین میں فساد پیدا ہوا اور ایک لاکھ سے زائد لوگ مرتد ہو گئے۔.... یہ بات بہت درست ہے کہ اسلام اپنی ذات میں کامل، بے عیب اور پاک مذہب ہے لیکن نادان دوست اچھا نہیں ہوتا اس دابۃ الارض نے اسلام کو نادان دوست بن کر جو صدمہ اور نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی بہت ہی مشکل ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۰؍ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

یہ مسلمان دابۃ الارض ہیں اور اس لئے اس کے مخالف ہیں جو آسمان سے آتا ہے۔ جو زمینی بات کرتا ہے وہ دابۃ الارض ہے۔ خدا تعالیٰ نے ایسا ہی فرمایا تھا۔ روحانی امور کو وہی دریافت کرتے ہیں جن میں مناسبت ہو چونکہ ان میں مناسبت نہ تھی اس لئے انہوں نے عصائے دین کو کھا لیا جیسے سلیمان کے عصا کو کھا لیا تھا۔ اور اس سے آگے قرآن شریف میں لکھا ہے کہ جب جنوں کو یہ پتہ لگا تو انہوں نے سرکشی اختیار کی۔ اسی طرح پر عیسائی قوم نے جب اسلام کی یہ حالت دیکھی یعنی اس دابۃ الارض نے اس عصاء راستی کو کمزور کر دیا تو ان قوموں کو اس پر وار کرنے کا موقع دے دیا۔ جنّ وہ ہے جو چھپ کر وار کرے اور پیار کے رنگ میں دشمنی کرتے ہیں وہی پیار جو حوا سے آ کر نحاش نے کیا تھا۔ اس پیار کا انجام وہی ہونا چاہیے جو ابتداء میں ہوا۔ آدم پر اسی سے مصیبت آئی۔ اس وقت گویا وہ خدا سے بڑھ کر خیر خواہ ہو گیا۔ اسی طرح پر یہ بھی وہی حیاتِ ابدی پیش کرتے ہیں جو شیطان نے کی تھی اس لئے قرآن شریف نے اول اور آخر کو اسی پر ختم کیا۔ اس میں سر یہ تھا کہ تا بتایا جاوے کہ ایک آدم آخر میں بھی آنے والا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۷؍ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ قرآن شریف سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب تک انسان میں روحانیت پیدا

نہ ہو یہ زمین کا کیڑا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱؍اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾

ہم ایسے نبی کے وارث ہیں جو رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ اور كَآفَّةً لِّلنَّاسِ کے لئے رسول ہو کر آیا۔ جس کی کتاب کا خدا محافظ اور جس کے حقائق معارف سب سے بڑھ کر ہیں پھر ان معارف اور حقائق کو پانے والا کیوں کم ہے؟ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّ لَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۱﴾

تمہارے لئے ٹھیک ایک برس کی میعاد ہے نہ اس سے تم تاخیر کر سکو گے نہ تقدیم۔
(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۴۴۳)

یوم سے مراد اس جگہ برس ہے چنانچہ بائبل میں بھی یہ محاورہ پایا جاتا ہے سو پورے برس کے بعد بدر کی لڑائی کا عذاب مکہ والوں پر نازل ہوا جو پہلی لڑائی تھی۔
(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۴۴۳ حاشیہ)

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ؕ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۴﴾

قرآن شریف کی اعلیٰ درجہ کی تاثیروں کو بھی دیکھئے کہ کس قوت سے اس نے وحدانیتِ الٰہی کو اپنے سچے متبعین کے دلوں میں بھرا ہے اور کس عجیب طور سے اس کی عالیشان تعلیموں نے صدہا سالوں کی عاداتِ راسخہ اور ملکاتِ ردیہ کا قلع و قمع کر کے اور ایسی رسومِ قدیمہ کو کہ جو طبیعتِ ثانی کی طرح ہو گئیں تھیں دلوں کے رگ و ریشہ سے اُٹھا کر وحدانیت الٰہی کا شربت عذب کروڑ ہا لوگوں کو پلا دیا ہے۔ وہی ہے جس نے اپنا کارِ نمایاں اور نہایت عمدہ اور دیرپا نتائج دکھلا کر اپنی بے نظیر تاثیر کی دوبدو شہادت سے بڑے بڑے معاندوں سے اپنی

لاثانی فضیلتوں کا اقرار کرایا یہاں تک کہ سخت بے ایمانوں اور سرکشوں کے دلوں پر بھی اس کا اس قدر اثر پڑا کہ جس کو انہوں نے قرآن شریف کی عظمتِ شان کا ایک ثبوت سمجھا اور بے ایمانی پر اصرار کرتے کرتے آخر اس قدر انہیں بھی کہنا پڑا کہ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۲۱۳، ۲۱۴ حاشیہ نمبر ۱۱)

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ مَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيْدُ ۝۵۰

عقل اس بات پر قطع واجب کرتی ہے کہ آئندہ بھی کسی نوع کا تغیر اور تبدل قرآن شریف میں واقع ہونا ممتنع اور محال ہے اور مسلمانوں کا پھر شرک اختیار کرنا اس جہت سے ممتنعات میں سے ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس بارے میں بھی پیشینگوئی کر کے آپ فرما دیا ہے مَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيْدُ یعنی شرک اور مخلوق پرستی جس قدر دور ہو چکی ہے پھر وہ نہ اپنی کوئی نئی شاخ نکالے گی اور نہ اسی پہلی حالت پر عود کرے گی۔ سو اس پیشین گوئی کی صداقت بھی اظہر من الشّمس ہے کیونکہ باجود منقضی ہونے زمانہ دراز کے اب تک ان قوموں اور ان ملکوں میں کہ جن سے مخلوق پرستی معدوم کی گئی تھی پھر شرک اور بت پرستی نے توحید کی جگہ نہیں لی اور آئندہ بھی عقل اس پیشین گوئی کی سچائی پر کامل یقین رکھتی ہے کیونکہ جب اوائل ایام میں کہ مسلمانوں کی تعداد بھی قلیل تھی تعلیم توحید میں کچھ تزلزل واقع نہیں ہوا بلکہ روز بروز ترقی ہوتی گئی تو اب کہ جماعت اس موحد قوم کی بیس کروڑ سے بھی کچھ زیادہ ہے کیوں کر تزلزل ممکن ہے۔ علاوہ اس کے زمانہ بھی وہ آ گیا ہے کہ مشرکین کی طبیعتیں بہ باعث متواتر استماع تعلیم فرقانی اور دائمی صحبت اہلِ توحید کے کچھ کچھ توحید کی طرف میل کرتی جاتی ہیں۔ جدھر دیکھو دلائل وحدانیت کے بہادر سپاہیوں کی طرح شرک کے خیالی اور وہمی برجوں پر گولہ اندازی کر رہے ہیں اور توحید کے قدرتی جوش نے مشرکوں کے دلوں پر ایک ہلچل ڈال رکھی ہے اور مخلوق پرستی کی عمارت کا بودا ہونا عالی خیال لوگوں پر ظاہر ہوتا جاتا ہے اور وحدانیتِ الٰہی کی پُرزور بندوقیں شرک کے بدنما جھونپڑوں کو اڑاتی جاتی ہیں۔ پس ان تمام آثار سے ظاہر ہے کہ اب اندھیرا شرک کا ان اگلے دنوں کی طرح پھیلنا کہ جب تمام دنیا نے مصنوع چیزوں کی ٹانگ صانع کی ذات اور صفات میں پھنسا رکھی تھی ممتنع اور محال ہے اور جب کہ فرقانِ مجید کے اصول حقہ کا محرف اور مبدل ہو جانا یا پھر ساتھ اس کے تمام خلقت پر تاریکی شرک اور مخلوق پرستی کا بھی چھا جانا عند العقل محال اور ممتنع ہوا تو نئی شریعت اور نئے الہام کے نازل

ہونے میں بھی امتناعِ عقلی لازم آیا کیونکہ جو امر مستلزم محال ہو وہ بھی محال ہوتا ہے پس ثابت ہوا کہ آنحضرتؐ حقیقت میں خاتم الرسل ہیں۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۱۰۲، ۱۰۳ حاشیہ)

ان کو کہہ کہ حق آ گیا اور باطل بعد اس کے نہ اپنی کوئی نئی شاخ نکالے گا جس کا ردقرآن میں موجود نہ ہو اور نہ اپنی پہلی حالت پر عود کرے گا۔ (براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۴۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

وَّ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَ اَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾

جو مجھ سے دور ہو اس کی دعا کیوں کر سنوں۔ یہ گویا عام قانونِ قدرت کے نظارہ سے ایک سبق دیا ہے۔ یہ نہیں کہ خدا سن نہیں سکتا۔ وہ تو دل کے مخفی در مخفی ارادوں اور اُن ارادوں سے بھی واقف ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوئے مگر یہاں انسان کو قربِ الٰہی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جیسے دور کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اسی طرح پر جو شخص غفلت اور فسق و فجور میں مبتلا رہ کر مجھ سے دور ہوتا جاتا ہے جس قدر وہ دور ہوتا ہے اسی قدر حجاب اور فاصلہ اس کی دعاؤں کی قبولیت میں ہوتا جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۴۴ مورخہ ۱۰؍دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

وَ حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿۵۵﴾

فاسق انسان دنیا کی زندگی میں ہوا ہوس کا ایک جہنم اپنے اندر رکھتا ہے اور ناکامیوں میں اس جہنم کی سوزشوں کا احساس کرتا ہے پس جبکہ اپنی فانی شہوات سے دور ڈالا جائے گا اور ہمیشہ کی ناامیدی طاری ہو گی تو خدا تعالیٰ ان حسرتوں کو جسمانی آگ کے طور پر اس پر ظاہر کرے گا جیسا کہ فرماتا ہے۔ وَ حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ یعنی ان میں اور ان کی خواہشوں کی چیزوں میں جدائی ڈالی جائے گی اور یہی عذاب کی جڑھ ہو گی ....اس جگہ یاد رکھنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ اپنی طرف سے بندہ پر کوئی مصیبت نہیں ڈالتا بلکہ وہ انسان کے اپنے برے کام اس کے آگے رکھ دیتا ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۰۹، ۴۱۰)

جس چیز سے انسان پیار کرتا ہے اس سے اگر جدا کیا جائے تو یہی اس کے لئے ایک عذاب ہو جاتا ہے اور جس چیز سے اگر پیار کرے اگر وہ میسر آ جائے تو یہی اس کی راحت کا موجب ہو جاتا ہے۔ وَ حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۴۲۳)

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تفسیر سورۃ فاطر

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۹

کیا ان لوگوں کے لئے جو حق کو قبول نہیں کرتے تو حسرتیں کھا کھا کر اپنی جان دے گا۔ سو قوم کی راہ میں جان دینے کا حکیمانہ طریق یہی ہے کہ قوم کی بھلائی کے لئے قانونِ قدرت کی مفید راہوں کے موافق اپنی جان پر سختی اُٹھاویں اور مناسب تدبیروں کے بجالانے سے اپنی جان ان پر فدا کر دیں نہ یہ کہ قوم کو سخت بلا یا گمراہی میں دیکھ کر اور خطرناک حالت میں پا کر اپنے سر پر پتھر مار لیں یا دو تین رتی اسٹرکنیا کھا کر اس جہاں سے رخصت ہو جائیں اور پھر گمان کریں کہ ہم نے اپنی اس حرکتِ بیجا سے قوم کو نجات دے دی ہے یہ مردوں کا کام نہیں ہے زنانہ خصلتیں ہیں اور بے حوصلہ لوگوں کا ہمیشہ سے یہی طریق ہے کہ مصیبت کو قابلِ برداشت نہ پا کر جھٹ پٹ خودکشی کی طرف دوڑتے ہیں۔ ایسی خودکشی کی گو بعد میں کتنی ہی تاویلیں کی جائیں مگر یہ حرکتِ بلاشبہ عقل اور عقلمندوں کا ننگ ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۴۹)

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ

وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَ مَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ۝۱۱

اسی رحمٰن کی طرف کلماتِ طیبہ صعود کرتے ہیں۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۶۱ حاشیہ در حاشیہ)

ہمارا بھی تو یہی مذہب ہے کہ مقدس لوگوں کو موت کے بعد ایک نورانی جسم ملتا ہے اور وہی نور جو وہ ساتھ رکھتے ہیں جسم کی طرح اُن کے لئے ہو جاتا ہے سو وہ اس کے ساتھ آسمان کی طرف اُٹھائے جاتے ہیں اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جلّ شانُہٗ فرماتا ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ یعنی پاک روحیں جو نورانی الوجود ہیں خدائے تعالیٰ کی طرف صعود کرتی ہیں اور عمل صالح اُن کا رفع کرتا ہے یعنی جس قدر عمل صالح ہو اُسی قدر روح کا رفع ہوتا ہے۔

اس جگہ خدائے تعالیٰ نے روح کا نام کلمہ رکھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ درحقیقت تمام ارواح کلمات اللہ ہی ہیں جو ایک لایُدرک بھید کے طور پر جس کی تہ تک انسان کی عقل نہیں پہنچ سکتی روحیں بن گئی ہیں۔ اسی بناء پر اس آیت کا مضمون بھی ہے وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ (النسآء:۱۷۲)۔ اور چونکہ یہ سِرّ ربوبیت ہے اس لئے کسی کی مجال نہیں کہ اس سے بڑھ کر کچھ بول سکے کہ کلمات اللہ ہی بحکم و باذن ربی لباس روح کا پہن لیتے ہیں اور ان میں وہ تمام طاقتیں اور قوتیں اور خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو روحوں میں پائی جاتی ہیں اور پھر چونکہ ارواح طیّبہ فنا فی اللہ ہونے کی حالت میں اپنے تمام قویٰ چھوڑ دیتی ہیں اور اطاعت الٰہی میں فانی ہو جاتی ہیں تو گویا پھر وُہ روح کی حالت سے باہر آ کر کلمۃ اللہ ہی بن جاتی ہیں جیسا کہ ابتدا میں وہ کلمۃ اللہ تھے۔ سو کلمۃ اللہ کے نام سے ان پاک روحوں کو یاد کرنا اُن کے اعلیٰ درجہ کے کمال کی طرف اشارہ ہے سو انہیں نور کا لباس ملتا ہے اور اعمال صالحہ کی طاقت سے اُن کا خدائے تعالیٰ کی طرف رفع ہوتا ہے۔ اور ہمارے ظاہر بین علما اپنے محدود خیالات کی وجہ سے کلمات طیّبہ سے مراد محض عقائد یا اذکار و اشغال رکھتے ہیں اور اعمال صالحہ سے مراد بھی اذکار و خیرات وغیرہ ہیں۔ تو گویا وہ اس تاویل سے علّت اور معلول کو ایک کر دیتے ہیں۔ اگرچہ کلمات طیّبہ بھی خدائے تعالیٰ کی طرف ہی رجوع کرتے ہیں لیکن عارفوں کے لئے یہ بطنی معنے ہیں جن پر قرآن کریم کے دقیق اشارات مشتمل ہیں۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۳۴۳ تا ۳۴۴)

اور پاک کلمے اس کی طرف چڑھتے ہیں۔ (اربعین، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۳۶۸)

میں اپنی جماعت کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ ضرورت ہے اعمالِ صالحہ کی۔ خدا تعالیٰ کے حضور اگر کوئی چیز جا سکتی ہے تو وہ یہی اعمالِ صالحہ ہیں اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۸ مورخہ ۳۱؍جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲، ۳)

وَ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ؕ وَ اِنۡ تَدۡعُ مُثۡقَلَۃٌ اِلٰی حِمۡلِہَا لَا یُحۡمَلۡ مِنۡہُ شَیۡءٌ وَّ لَوۡ کَانَ ذَا قُرۡبٰی ؕ اِنَّمَا تُنۡذِرُ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَیۡبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ؕ وَ مَنۡ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفۡسِہٖ ؕ وَ اِلَی اللّٰہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۹﴾

حدیث ہے جو بخاری کے صفحہ ۱۷۲ میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ زخم کاری سے مجروح ہوئے تو صہیب رضی اللہ عنہ روتے ہوئے ان کے پاس گئے کہ ہائے میرے بھائی۔ ہائے میرے دوست۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اے صہیب مجھ پر تو روتا ہے کیا تجھے یاد نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میت پر اس کے اہل کے رونے سے عذاب کیا جاتا ہے۔ پھر جب حضرت عمرؓ وفات پا گئے تو ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب حال حدیث پیش کرنے کا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو سنایا تو انہوں نے کہا کہ خدا عمرؓ پر رحم کرے بخدا کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا بیان نہیں فرمایا کہ مومن پر اس کے اہل کے رونے سے عذاب کیا جاتا ہے اور فرمایا کہ تمہارے لئے قرآن کافی ہے۔ اللہ جل شانہ فرماتا ہے لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی۔ یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ نے باوجود محدود علم کے فقط اس لئے قسم کھائی کہ اگر اس حدیث کے ایسے معنے کئے جائیں کہ خواہ نخواہ ہر یک میت اس کے اہل کے رونے سے معذب ہوتی ہے تو یہ حدیث قرآن کے مخالف اور معارض ٹھہرے گی۔ اور جو حدیث قرآن کے مخالف ہو وہ قبول کے لائق نہیں۔

(الحق مباحثہ لدھیانہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۱۰۹ حاشیہ)

صحیح بخاری کی کتاب الجنائز صفحہ ۱۷۲ میں صاف لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حدیث اِنَّ الۡمَیِّتَ یُعَذَّبُ بِبَعۡضِ بُکَآءِ اَہۡلِہٖ کو قرآن کریم کی اس آیت سے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی معارض ومخالف پا کر حدیث کی یہ تاویل کر دی کہ یہ مومنوں کے متعلق نہیں بلکہ کفار کے متعلق ہے جو متعلقین کے جزع فزع پر راضی تھے بلکہ وصیت کر جاتے تھے۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۶۰۹)

وَ مَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۳﴾

نور اور حیات سے مراد روح القدس ہے کیونکہ اس سے ظلمت دور ہوتی ہے اور وہ دلوں کو زندہ کرتا ہے اسی لئے اس کا نام روح القدس ہے یعنی پاکی کی روح جس کے داخل ہونے سے ایک پاک زندگی حاصل ہوتی ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۹۹)

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ؕ وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۲۵﴾

اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ یعنی کوئی ملک آباد نہیں جس میں پیغمبر اور مصلح نہیں گزرا۔

(سرمہ چشم آریہ، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۲۹۳)

کوئی بستی اور کوئی آباد ملک نہیں جس میں پیغمبر نہیں بھیجا گیا۔ (نسیم دعوت، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۴۲۸)

میرا یہ مذہب نہیں ہے کہ اسلام کے سوائے باقی سب مذاہب کی بنیاد ہی جھوٹ پر رکھی گئی ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ وہ خدا جو تمام مخلوق کا خدا ہے وہ سب پر نظر رکھتا ہے اور جیسا وہ سب کی جسمانی ضروریات کو پورا کر رہا ہے ایسا ہی روحانی ضروریات کو بھی پورا کرتا ہے۔ یہ سچ نہیں کہ دنیا کی ابتداء سے اس نے صرف ایک قوم کو ہی چن لیا ہے اور دوسروں کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ کبھی کسی قوم پر وہ وقت آجاتا ہے اور کبھی کسی پر۔ میں یہ باتیں کسی کو خوش کرنے کے لئے نہیں کہتا بلکہ خدا تعالیٰ نے مجھ پر ظاہر کیا ہے کہ راجہ رام چندر اور کرشن جی وغیرہ بھی خدا کے راستباز بندے تھے اور اس سے سچا تعلق رکھتے تھے۔ میں اس شخص سے بیزار ہوں جو ان کی نندیا یا توہین کرتا ہے۔ اس کی مثال کنوئیں کے مینڈک کی سی ہے جو سمندر کی وسعت سے ناواقف ہے۔ جہاں تک ان لوگوں کے صحیح سوانح معلوم ہوتے ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے خدا کی راہ میں بڑے بڑے مجاہدات کئے اور کوشش کی کہ اسی راہ کو پائیں جو خدائے تعالیٰ تک پہنچنے کی حقیقی راہ ہے جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ راستباز نہ تھے وہ قرآن شریف کے خلاف کہتا ہے کیونکہ اس میں فرمایا ہے اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ یعنی کوئی قوم اور امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی نذیر نہ آیا ہو۔ پس اس میں شک نہیں کہ ابتداء میں ان تمام مذاہب کی بنیاد حق اور راستی پر تھی مگر مرورِ زمانہ سے ان میں

طرح طرح کی غلطیاں داخل ہوگئیں یہاں تک کہ اصل حقیقت انہیں غلطیوں کے نیچے چھپ گئی۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ نمبر ۱۰ صفحہ ۳۵۲)

خدا تعالیٰ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ کوئی آبادبستی اور ملک نہیں جس میں اس نے کوئی نبی نہ بھیجا ہو جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ یعنی کوئی ایسی امت نہیں جس میں خدا کا کوئی نبی نہ آیا ہو مگر ہم اس عقیدہ کو سمجھ نہیں سکتے کہ باوجود خدا کے وسیع بلاد اور اقالیم کے جو سب اس کی ہدایت کے محتاج ہیں اور سب اس کے بندے ہیں پھر بھی خدا تعالیٰ کا قدیم سے آریہ ورت سے ہی تعلق رہا اور دوسری قومیں اس کی براہِ راست ہدایت سے محروم رہی ہیں۔ خدا کا موجودہ قانون بھی ہم اس کے برخلاف پاتے ہیں وہ دوسرے ممالک میں اب اپنی وحی اور الہام سے اپنے وجود کا پتہ دیتا ہے اپنے بندوں کی نسبت خدا کی طرف سے یہ پکش پات اور طرفداری اس کی ذات کی طرف منسوب نہیں ہوسکتی۔ جو شخص اس کی طرف دل اور جان سے رجوع کرے وہ بھی اس کی طرف رجوع برحمت کرتا ہے۔ خواہ ہندی ہو خواہ عربی وہ کسی کو ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اس کی رحمت عام ہے کسی خاص ملک سے محدود نہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ جسمانی طور پر بھی خدا تعالیٰ کی نعمتیں ہر ایک جگہ پائی جاتی ہیں۔ ہر ایک ملک میں پانی موجود ہے جیسا کہ آریہ ورت میں موجود ہے ہر ایک ملک میں اناج موجود ہے جیسا کہ آریہ ورت میں موجود ہے۔ ہر ایک ملک میں وہ نعمتیں موجود ہیں جیسا کہ آریہ ورت میں موجود ہیں تو پھر جبکہ خدا نے جسمانی طور پر اپنے فیضان میں کسی قوم اور ملک سے فرق نہیں کیا تو کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ روحانی طور پر اس نے فرق کیا ہے۔ اس کے سب بندے ہیں کیا کالے اور کیا گورے اور کیا ہندی اور کیا عربی۔ پس یہ غیر محدود صفات والا خدا کسی تنگ دائرہ میں محدود نہیں ہوسکتا اور اس کو محدود کرنا تنگ ظرفی اور نادانی ہے۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۳۰۳، ۳۰۴)

کوئی قوم نہیں جس میں ڈرانے والا نبی نہیں بھیجا گیا۔ یہ اس لئے کہ تا ہر ایک قوم میں ایک گواہ ہو کہ خدا موجود ہے اور وہ اپنے نبی دنیا میں بھیجا کرتا ہے۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۹۰)

جیسا کہ خدا ہر ایک ملک کے باشندوں کے لئے ان کے مناسبِ حال ان کی جسمانی تربیت کرتا آیا ہے ایسا ہی اس نے ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم کو روحانی تربیت سے بھی فیضاب کیا ہے جیسا کہ وہ قرآن شریف میں ایک جگہ فرماتا ہے وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ کوئی ایسی قوم نہیں جس میں کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا گیا.... خدا کا فیض عام ہے جو تمام قوموں اور تمام ملکوں اور تمام زمانوں پر محیط ہو رہا ہے یہ اس لئے ہوا

کہ تا کسی قوم کو شکایت کرنے کا موقع نہ ملے اور یہ نہ کہیں کہ خدا نے فلاں فلاں قوم پر احسان کیا مگر ہم پر نہ کیا یا فلاں قوم کو اس کی طرف سے کتاب ملی تا وہ اس سے ہدایت پاویں مگر ہم کو نہ ملی یا فلاں زمانہ میں وہ اپنی وحی اور الہام اور معجزات کے ساتھ ظاہر ہوا مگر ہمارے زمانہ میں مخفی رہا۔ پس اس نے عام فیضان دکھلا کر ان تمام اعتراضات کو دفع کر دیا اور اپنے ایسے وسیع اخلاق دکھلائے کہ کسی قوم کو اپنے جسمانی اور روحانی فیضوں سے محروم نہیں رکھا اور نہ کسی زمانہ کو بے نصیب ٹھہرایا۔ (پیغامِ صلح، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۴۴۲)

کوئی قوم اور امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی نذیر نہ آیا ہو۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۷ر ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

(اس سوال کے جواب میں کہ زردشت نبی تھا یا نہیں فرمایا)

ہم تو یہی کہیں گے کہ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ خدا کے کل رسولوں پر ہمارا ایمان ہے ..... اتنے کروڑ مخلوقات پیدا ہوتی رہی اور کروڑ ہا لوگ مختلف ممالک میں آباد رہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ خدا تعالیٰ نے ان کو یونہی چھوڑ دیا ہو اور کسی نبی کے ذریعہ سے ان پر اتمامِ حجت نہ کی ہو۔ آخر ان میں رسول آتے ہی رہے ہیں ممکن ہے کہ یہ بھی انہیں میں سے ایک رسول ہوں مگر ان کی تعلیم کا صحیح صحیح پتہ اب نہیں لگ سکتا کیونکہ زمانہ دراز گزر جانے سے تحریف لفظی اور معنوی کے سبب بعض باتیں کچھ کا کچھ بن گئی ہیں۔ حقیقی طور پر محفوظ رہنے کا وعدہ تو صرف قرآن مجید کے لئے ہی ہے۔ مومن کو سوءِ ظن کی نسبت نیک ظن کی طرف جانا چاہیے۔ قرآن مجید میں وَ اِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ لکھا ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ وہ بھی ایک رسول ہوں۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

قرآن شریف سے صاف طور سے ثابت ہے کہ ہندوستان میں بھی نبی گزرے ہیں چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ اِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ اور حضرت کرشنؑ بھی انہیں انبیاء میں سے ایک تھے جو خدا کی طرف سے مامور ہو کر خلق اللہ کی ہدایت اور توحید قائم کرنے کو اللہ کی طرف سے آئے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک قوم میں نبی آئے ہیں یہ بات الگ ہے کہ ان کے نام ہمیں معلوم نہ ہوں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۷ مورخہ ۶؍ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

کوئی قوم اور بستی نہیں جس میں کوئی نبی نہیں گزرا۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۷۶)

ہمارے اصول کی رو سے وہ (اللہ تعالیٰ۔ ناقل) رب العالمین ہے اور اس نے اناج، ہوا، پانی، روشنی

وغیرہ سامان تمام مخلوق کے واسطے بنائے ہیں۔ اسی طرح سے وہ ہر ایک زمانہ میں ہر ایک قوم کی اصلاح کے واسطے وقتاً فوقتاً مصلح بھیجتا رہا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ہے وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ خدا تمام دنیا کا خدا ہے کسی خاص قوم سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۶ مورخہ ۲؍جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝۲۹

خدا سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو اہلِ علم ہیں۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۰۰)

اللہ جلّشانہ سے وہ لوگ ڈرتے ہیں جو اس کی عظمت اور قدرت اور احسان اور حسن اور جمال پر علم کامل رکھتے ہیں۔ خشیت اور اسلام درحقیقت اپنے مفہوم کے رو سے ایک ہی چیز ہے کیونکہ کمال خشیت کا مفہوم اسلام کے مفہوم کو مستلزم ہے۔ پس اس آیتِ کریمہ کے معنوں کا مآل اور ماحصل یہی ہوا کہ اسلام کے حصول کا وسیلہ کاملہ یہی علم عظمت ذات وصفاتِ باری ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۸۵)

انسان کی خاصیت اکثر اور اغلب طور پر یہی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نسبت علم کامل حاصل کرنے سے ہدایت پالیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ہاں جو لوگ شیطانی سرشت رکھتے ہیں وہ اس قاعدہ سے باہر ہیں۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۲۲ حاشیہ)

علم سے مراد منطق یا فلسفہ نہیں ہے بلکہ حقیقی علم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے عطا کرتا ہے یہ علم اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذریعہ ہوتا ہے (اور اس سے۔ ناقل) خشیت الٰہی پیدا ہوتی ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اگر علم سے اللہ تعالیٰ کی خشیت میں ترقی نہیں ہوتی تو یاد رکھو کہ وہ علم ترقی معرفت کا ذریعہ نہیں ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۰؍جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

عالمِ ربانی سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ صرف ونحو یا منطق میں بے مثل ہو بلکہ عالمِ ربانی سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے اور اس کی زبان بیہودہ نہ چلے مگر آج یہ زمانہ ایسا آ گیا ہے کہ مردہ شو تک بھی اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں اور اس لفظ کو ذات میں داخل کر لیا ہے اس طرح پر اس لفظ کی بڑی تحقیر ہوئی ہے اور خدا تعالیٰ کے منشاء اور مقصد کے خلاف اس کا مفہوم لیا گیا ہے ورنہ قرآن شریف میں تو علماء کی یہ

صفت بیان کی گئی ہے اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اللہ تعالیٰ کے وہ بندے ہیں۔ جو علماء ہیں اب یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ جن لوگوں میں یہ صفات خوف وخشیت اور تقوی اللہ کی نہ پائی جاویں وہ ہرگز ہرگز اس خطاب سے پکارے جانے کے قابل نہیں ہیں۔

اصل میں علماء عالم کی جمع ہے اور (علم۔ ناقل) اس چیز کو کہتے ہیں جو یقینی اور قطعی ہو اور سچا علم قرآن کریم سے ملتا ہے یہ نہ یونانیوں کے فلسفہ سے ملتا ہے نہ حال کے انگلستانی فلسفہ سے بلکہ یہ سچا ایمانی فلسفہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اور مومن کا معراج اور کمال یہی ہے کہ وہ علماء کے درجہ پر پہنچے اور وہ حق الیقین کا مقام اسے حاصل ہو جو علم کا انتہائی درجہ ہے لیکن جو شخص علومِ حقہ سے بہرہ ور نہیں ہیں اور معرفت اور بصیرت کی راہیں ان پر کھلی ہوئی نہیں ہیں وہ خود عالم کہلائیں مگر علم کی خوبیوں اور صفات سے بالکل بے بہرہ ہیں اور وہ روشنی اور نور جو حقیقی علم سے ملتا ہے ان میں پایا نہیں جاتا بلکہ ایسے لوگ سراسر خسارہ اور نقصان میں ہیں۔ یہ اپنی آخرت دخان اور تاریکی سے بھر لیتے ہیں.... جن لوگوں کو سچی معرفت اور بصیرت دی جاتی ہے اور وہ علم جس کا نتیجہ خشیت اللہ ہے عطا کیا جاتا ہے وہ وہ ہیں جن کو..... حدیث میں انبیاء بنی اسرائیل سے تشبیہ دی گئی ہے

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۰ مورخہ ۲۴؍مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

یاد رکھو لغزش ہمیشہ نادان کو آتی ہے شیطان کو جو لغزش آئی وہ علم کی وجہ سے نہیں بلکہ نادانی سے آئی۔ اگر وہ علم میں کمال رکھتا تو لغزش نہ آتی۔ قرآن شریف میں علم کی مذمت نہیں بلکہ اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا اور نیم ملاں خطرہ ایمان مشہور مثل ہے۔ پس میرے مخالفوں کو علم نے ہلاک نہیں کیا بلکہ جہالت نے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۷؍جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

علماء کے لفظ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ عالم وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا یعنی بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اس کے بندوں میں سے وہی عالم ہیں۔ ان میں عبودیت تامہ اور خشیت اللہ اس حد تک پیدا ہوتی ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ سے ایک علم اور معرفت سیکھتے ہیں اور اسی سے فیض پاتے ہیں اور یہ مقام اور درجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع اور آپؐ سے پوری محبت سے ملتا ہے یہاں تک کہ انسان بالکل آپؐ کے رنگ میں رنگین ہو جاوے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۰؍نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

تقویٰ اور خدا ترسی علم سے پیدا ہوتی ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ

الْعُلَمٰٓؤُا یعنی اللہ تعالیٰ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو عالم ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی علم خشیت اللہ کو پیدا کر دیتا ہے اور خدا تعالیٰ نے علم کو تقویٰ سے وابستہ کیا ہے کہ جو شخص پورے طور پر عالم ہوگا اس میں ضرور خشیت اللہ پیدا ہوگی۔ علم سے مراد میری دانست میں علم القرآن ہے اس سے فلسفہ، سائنس یا اور علوم مروجہ مراد نہیں کیونکہ ان کے حصول کے لئے تقویٰ اور نیکی کی شرط نہیں بلکہ جیسے ایک فاسق فاجر ان کو سیکھ سکتا ہے ویسے ہی ایک دیندار بھی۔ لیکن علم القرآن بجز متقی اور دیندار کے کسی دوسرے کو دیا ہی نہیں جاتا۔ پس اس جگہ علم سے مراد علم القرآن ہی ہے جس سے تقویٰ اور خشیت پیدا ہوتی ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲ مورخہ ۱۷؍ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۳۳﴾

بعض مسلمانوں میں سے ایسے ہیں جن پر نفسانی جذبات غالب ہیں اور بعض درمیانی حالت کے ہیں اور بعض وہ ہیں کہ انتہاء کمالاتِ ایمانیہ تک پہنچ گئے ہیں پھر اگر اللہ تعالیٰ نے برعایت اس طبقہ مسلمانوں کے جو ضعیف اور بزدل اور ناقص الایمان ہیں یہ فرما دیا کہ کسی جان کے خطرہ کی حالت میں اگر وہ دل میں اپنے ایمان پر قائم رہیں اور زبان سے گو اس ایمان کا اقرار نہ کریں تو ایسے آدمی معذور سمجھے جاویں گے مگر ساتھ اس کے یہ بھی تو فرما دیا کہ وہ ایماندار بھی ہیں کہ بہادری سے دین کی راہ میں اپنی جانیں دیتے ہیں اور کسی سے نہیں ڈرتے۔ (جنگِ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۷۶)

بنی آدم کی فطرتیں مختلف ہیں۔ بعض لوگ ظالم ہیں جن کے نورِ فطرتی کو قویٰ بہیمیہ یا غضبیہ نے دبایا ہوا ہے بعض درمیانی حالت میں ہیں بعض نیکی اور رجوع الی اللہ میں سبقت لے گئے ہیں۔

(براہینِ احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۱۸۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

ایک وہ گروہ ہے جن پر شیطانی ظلمت غالب ہے اور روح القدس کی چمک کم ہے اور دوسری وہ گروہ ہے جو روح القدس کی چمک اور شیطانی ظلمت ان میں مساوی ہیں اور تیسری وہ گروہ ہے جن پر روح القدس کی چمک غالب آ گئی ہے اور خیر محض ہو گئی ہیں۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۹۷)

قرآن کریم کے اتارنے سے اللہ جلّشانہٗ کا یہ مقصد تھا کہ وہ تمام بنی آدم اور تمام زمانوں اور تمام

استعدادوں کی اصلاح اور تکمیل اور تربیت کر سکے اور اسلام کی پوری شکل اور پوری عظمت بنی آدم پر ظاہر ہو اور اس کے ظہور کا وقت بھی آ پہنچا تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے قرآن مجید کو تمام قوموں اور تمام زمانوں کے لئے جو قیامت تک آنے والے تھے ایک کامل اور جامع قانون کی طرح نازل فرمایا اور ہر یک درجہ کی استعداد کے لئے افادہ اور افاضہ کا دروازہ کھول دیا جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ فَمِنۡہُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِہٖ ۚ وَ مِنۡہُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَ مِنۡہُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَیۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَضۡلُ الۡکَبِیۡرُ۔ یعنی پھر ہم نے اپنی کتاب کا ان لوگوں کو وارث کیا جو ہمارے بندوں میں سے برگزیدہ ہیں اور وہ تین گروہ ہیں (۱) ایک اُن میں سے ظالموں کا گروہ جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں یعنی اکراہ اور جبر سے نفس امّارہ کو خدا تعالیٰ کی راہ پر چلاتے ہیں اور نفس سرکش کی مخالفت اختیار کر کے مجاہدات شاقہ میں مشغول ہیں۔ (۲) دوسری میانہ حالت آدمیوں کا گروہ جو بعض خدمتیں خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے نفس سرکش سے باکراہ اور جبر لیتے ہیں اور بعض للّٰہی کاموں کی بجا آوری میں نفس ان کا بخوشی خاطر تابع ہو جاتا ہے اور ذوق اور محبت اور ارادت سے ان کاموں کو بجالاتا ہے غرض وہ لوگ کچھ تو تکلف اور مجاہدہ سے خدا تعالیٰ کے حکموں پر چلتے ہیں اور کچھ طبعی جوش اور دلی شوق سے بغیر کسی تکلف کے اپنے رب جلیل کی فرمانبرداری ان سے صادر ہوتی ہے یعنی ابھی پوری موافقت اللہ جلّشانہ کے ارادوں اور خواہشوں سے ان کو حاصل نہیں اور نہ نفس کی جنگ اور مخالفت سے بکلّی فراغت بلکہ بعض سلوک کی راہوں میں نفس موافق اور بعض راہوں میں مخالف ہے۔ (۳) تیسری سابق بالخیرات اور اعلیٰ درجہ کے آدمیوں کا گروہ ہے یعنی وہ گروہ جو نفس امّارہ پر بکلّی فتحیاب ہو کر نیکیوں میں آگے نکل جانے والے ہیں جن کے نفوس کی سرکشی اور امارگی بکلّی دور ہوگئی ہے اور خدا تعالیٰ کے احکام سے اور اس کی شریعت کی تمام راہوں سے اور اس کی تمام قضا و قدر سے اور اس کی تمام مرضی اور مشیت کی باتوں سے وہ طبعاً پیار کرتے ہیں نہ کسی تکلف اور بناوٹ سے اور کوئی دقیقہ اطاعت اور فرمانبرداری کا اٹھا نہیں رکھتے اور اللہ جلّشانہ کی فرمانبرداری ان کی طبیعت کی جزو اور ان کی جان کی راحت ہو جاتی ہے کہ بغیر اس کے وہ جی ہی نہیں سکتے اور ان کا نفس کمال ذوق اور شوق اور لذت اور شدّتِ میلان اور خوشی سے بھرے ہوئے انشراح کے ساتھ خدا تعالیٰ کی اطاعت بجالاتا ہے اور اس بات کی طرف وہ کسی وقت اور کسی محل اور کسی حکم الٰہی یا مشیت الٰہی کی نسبت محتاج نہیں ہوتے کہ اپنے نفس سے باکراہ اور جبر کام لیں بلکہ اُن کا نفس نفسِ مطمئنہ ہو جاتا ہے اور جو خدا تعالیٰ کا ارادہ وہ ان کا ارادہ اور جو اس کی مرضی وہ ان کی

مرضی ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کے حکموں اور مشیئتوں سے ایسا پیار کرتے ہیں کہ جیسا خدا تعالیٰ ان امور سے پیار کرتا ہے اسی وجہ سے وہ خدا تعالیٰ کے امتحانوں کے وقت پیچھے نہیں ہٹتے بلکہ چند قدم آگے رکھ دیتے ہیں۔ پھر بعد اس کے اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے کہ ان تینوں گروہوں پر میرا بڑا فضل ہے یعنی ظالم بھی مورد فضل اور برگزیدہ اور خدا تعالیٰ کے پیارے بندے ہیں اور ایسا ہی مقتصد بھی اور سابق بالخیرات تو خود ظاہر ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ اس آیت میں اللہ جلشانہ نے ظالموں کو بھی اپنے برگزیدہ بندے اور مورد فضل قرار دے دیا ہے اور ان کو اپنے ان پیارے اور چنے ہوئے اور قابلِ تحسین لوگوں میں شمار کرلیا ہے جن سے وہ بہت ہی خوش ہے حالانکہ قرآن کریم اس مضمون سے بھرا پڑا ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ ظالموں سے پیار نہیں کرتا اور عدل کو چھوڑنے والے کبھی مورد فضل نہیں ہو سکتے۔ پس اس دلیل سے بہ بداہت معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں ظالموں کے گروہ سے مراد وہ گروہ نہیں ہے جو خدا تعالیٰ کا سرکش اور نافرمان اور مشرک اور کافر اور طریق عدل اور راستی کو چھوڑنے والا اور خدا تعالیٰ کی مخالفت کو اختیار کرنے والا ہے کیونکہ ایسے لوگوں کو تو قرآن کریم مردود اور مورد غضب ٹھہراتا ہے اور صاف کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ ظالموں اور معتدین کو جو طریق عدل اور انصاف چھوڑ دیتے ہیں دوست نہیں رکھتا پھر وہ لوگ مورد فضل کیوں کر ٹھہر سکتے ہیں اور کیوں کر ان کا نام مصطفی اور برگزیدہ اور چنا ہوا رکھا جا سکتا ہے۔ سو ان یقینی اور قطعی دلائل سے ہمیں ماننا پڑا کہ اس جگہ ظالم کا لفظ کسی مذموم معنی کے لئے استعمال نہیں ہوا بلکہ ایک ایسے محمود اور قابل تعریف معنوں کے لئے استعمال ہوا ہے جو درجہ سابق بالخیرات سے حصہ لینے کے مستحق اور اس درجہ فاضلہ کے چھوٹے بھائی ہیں اور وہ معنے بجز اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتے کہ ظالم سے مراد اس قسم کے لوگ رکھے جائیں کہ جو خدا تعالیٰ کے لئے اپنے نفس مخالف پر جبر اور اکراہ کرتے ہیں اور نفس کے جذبات کم کرنے کے لئے دن رات مجاہدات شاقہ میں مشغول ہیں کیونکہ یہ تو لغت کی رو سے بھی ثابت ہے کہ ظالم کا لفظ بغیر کسی اور لحاظ کے فقط کم کرنے کے لئے بھی آیا ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام میں فرماتا ہے وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا اَیْ وَلَمْ تَنْقُصْ اور خدا تعالیٰ کی راہ میں نفس کے جذبات کو کم کرنا بلا شبہ ان معنوں کی رو سے ایک ظلم ہے ماسوا اس کے ہم ان کتب لغت کو جو صدہا برس قرآن کریم کے بعد اپنے زمانہ کے محاورات کے موافق طیار ہوئی ہیں قرآن مجید کا حکم نہیں ٹھہرا سکتے۔ قرآن کریم اپنی لغات کے لئے آپ متکفل ہے اور اس کی بعض آیات بعض دوسری آیات کی شرح کرتی ہیں یہ بات ظاہر ہے کہ اصطفاء کا عزت بخش لفظ کبھی دوسرے ظالموں کے حق میں خدا تعالیٰ نے

استعمال نہیں کیا بلکہ ان کو مردود اور مخذول اور مورد غضب ٹھہرایا ہے مگر اس جگہ ظالم کو اپنا برگزیدہ قرار دیا اور مورد فضل ٹھہرایا ہے اور اس آیت سے صاف ثابت ہو رہا ہے کہ جیسے مقتصد اس لئے برگزیدہ ہے کہ مقتصد ہے اور سابق بالخیرات اس لئے برگزیدہ ہے کہ وہ سابق بالخیرات ہے۔ اسی طرح ظالم بھی اس لئے برگزیدہ ہے کہ وہ ظالم ہے۔ پس کیا اب اس ثبوت میں کچھ کسر رہ گئی کہ اس جگہ ظلم سے مراد وہ ظلم ہے جو خدا تعالیٰ کو پیارا معلوم ہوتا ہے یعنی خدا تعالیٰ کے لئے اپنے نفس پر اکراہ اور جبر کرنا اور نفس کے جذبات کو اللہ جلّشانہ کے راضی کرنے کی غرض سے کم کر دینا اور گھٹا دینا اور اس قسم کے ظالموں کا قرآن کریم کے دوسرے مقامات میں توابین بھی نام ہے جن سے اللہ جلّشانہ پیار کرتا ہے۔ غرض ایسا خیال کرنا نعوذ باللہ سخت دھوکا ہے کہ ان ظالموں سے جو اس آیت میں درج ہیں وہ ظالم مراد لئے جائیں جو خدا تعالیٰ کے سخت نافرمان ہیں اور شرک اور کفر اور فسق کو اختیار کرنے والے اور اس پر راضی ہوجانے والے اور ہدایت کی راہوں سے بغض رکھنے والے ہیں بلکہ وہ ظالم مراد ہیں جو باوجود نفس کے سخت جذبات کے پھر افتاں خیزاں خدا تعالیٰ کی طرف دوڑتے ہیں۔ اس پر ایک اور قرینہ یہ ہے کہ اللہ جلّشانہ نے قرآن کریم کے نزول کی علت غائی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ قرار دی ہے اور قرآن کریم سے رشد اور ہدایت اور فیض حاصل کرنے والے بالتخصیص متقیوں کو ہی ٹھہرایا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرۃ : ۳)۔ پس اس علّت غائی پر نظر ڈال کر یقینی اور قطعی طور پر یہ بات فیصلہ پا جاتی ہے کہ ظالم کا لفظ اس آیت میں ایسے شخص کی نسبت ہرگز اطلاق نہیں پایا کہ جو عمداً نافرمان اور سرکش اور طریق عدل کو چھوڑنے والا اور شرک اور بے ایمانی کو اختیار کرنے والا ہو۔ کیونکہ ایسا آدمی تو بلاشبہ دائرہ اتقا سے خارج ہے اور اس لائق ہرگز نہیں ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ قسم متقیوں میں اس کو داخل کیا جائے مگر آیت ممدوحہ میں ظالم کو متقیوں اور مومنوں کے گروہ میں نہ صرف داخل ہی کیا ہے بلکہ متقیوں کا سردار اور ان میں سے برگزیدہ ٹھہرا دیا ہے۔ پس اس سے جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں ثابت ہوا کہ یہ ظالم ان ظالموں میں سے نہیں ہیں جو دائرہ اتقا سے بکلی خارج ہیں بلکہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو ظلمت معصیت میں مبتلا تو ہیں مگر بااین ہمہ خدا تعالیٰ سے سرکش نہیں ہیں بلکہ اپنے سرکش نفس سے کشتی کرتے رہتے ہیں اور تکلف اور تصنع سے اور جس طرح بن پڑے حتی الوسع نفس کے جذبات سے رکنا چاہتے ہیں مگر کبھی نفس غالب ہوجاتا ہے اور معصیت میں ڈال دیتا ہے اور کبھی وہ غالب آجاتے ہیں اور رو رو کر اس سیہ دھبے کو دھوڈالتے ہیں اور یہ صفت جو ان میں موجود ہوتی ہے دراصل مذموم نہیں

ہے بلکہ محمود اور ترقیات غیر متناہیہ کا مرکب اور مجاہدات شاقہ کا ذریعہ ہے اور درحقیقت یہی صفت مخالفت نفس کی جو دوسرے لفظوں میں ظلومیّت کے اسم سے بھی موسوم ہے ایک نہایت قابلِ تعریف جوہر انسان میں ہے جو فرشتوں کو بھی نہیں دیا گیا اور اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جلّشانہ فرماتا ہے وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (الاحزاب : ۷۳)۔ یعنی انسان میں ظلومیت اور جہولیت کی صفت تھی اس لئے اس نے اس امانت کو اٹھالیا۔ جس کو وہی شخص اٹھا سکتا ہے جس میں اپنے نفس کی مخالفت اور اپنے نفس پر سختی کرنے کی صفت ہو۔ غرض یہ صفت ظلومیت انسان کے مراتب سلوک کا ایک مرکب اور اس کے مقامات قرب کے لئے ایک عظیم الشان ذریعہ اس کو عطا کیا گیا ہے جو بوجہ مجاہدات شاقہ کے اوائل حال میں نار جہنم کی شکل پر تجلّی کرتا ہے لیکن آخر نعماء جنت تک پہنچا دیتا ہے اور درحقیقت قرآن کریم کے دوسرے مقام میں جو یہ آیت ہے وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا (مریم : ۷۳)۔ یہ بھی درحقیقت صفت محمودۂ ظلومیت کی طرف ہی اشارہ کرتی ہے اور ترجمہ آیت یہ ہے کہ تم میں سے کوئی بھی ایسا نفس نہیں جو آگ میں وارد نہ ہو یہ وہ وعدہ ہے جو تیرے رب نے اپنے پر امر لازم اور واجب الاداٹھہرا رکھا ہے پھر ہم اس آگ میں وارد ہونے کے بعد متقیوں کو نجات دے دیتے ہیں اور ظالموں کو یعنی ان کو جو مشرک اور سرکش ہیں جہنم میں زانو پر گرے ہوئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس جگہ الظالمین پر جو الف لام آیا ہے۔ وہ فائدہ تخصیص کا دیتا ہے اور اس سے غرض یہ ہے کہ ظالم دو قسم کے ہیں۔

(۱) ایک متقی ظالم جن کی نجات کا وعدہ ہے اور جو خدا تعالیٰ کے پیارے ہیں۔ اور جو آیت فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ میں ناجیوں میں شمار کئے گئے ہیں۔

(۲) دوسرے مشرک اور کافر اور سرکش ظالم جو جہنم میں گرائے جائیں گے اور اس آیت میں بیان فرمایا کہ متقی بھی اس نار کی مس سے خالی نہیں ہیں۔ اس بیان سے مراد یہ ہے کہ متقی اسی دنیا میں جو دارالابتلا ہے انواع اقسام کے پیرایہ میں بڑی مردانگی سے اس نار میں اپنے تئیں ڈالتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے لئے اپنی جانوں کو ایک بھڑکتی ہوئی آگ میں گراتے ہیں اور طرح طرح کے آسمانی قضاء و قدر بھی نار کی شکل میں ان پر وارد ہوتے ہیں وہ ستائے جاتے اور دکھ دیئے جاتے ہیں اور اس قدر بڑے بڑے زلزلے ان پر آتے ہیں کہ ان کے ماسوا کوئی ان زلازل کی برداشت نہیں کرسکتا اور حدیث صحیح میں ہے کہ تپ بھی جو مومن کو آتا ہے وہ نار جہنم میں سے ہے اور مومن بوجہ تپ اور دوسری تکالیف کے نار کا حصہ اسی عالم میں لے لیتا ہے اور ایک

دوسری حدیث میں ہے کہ مومن کے لئے اس دنیا میں بہشت دوزخ کی صورت میں متمثل ہوتا ہے یعنی خدا تعالیٰ کی راہ میں تکالیف شاقہ جہنم کی صورت میں اس کو نظر آتی ہیں پس وہ بطیبِ خاطر اس جہنم میں وارد ہو جاتا ہے تو معاً اپنے تئیں بہشت میں پاتا ہے۔ اسی طرح اور بھی احادیث نبویہ بکثرت موجود ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ مومن اسی دنیا میں نار جہنم کا حصہ لے لیتا ہے اور کافر جہنم میں بجبر واکراہ گرایا جاتا ہے لیکن مومن خدا تعالیٰ کے لئے آپ آگ میں گرتا ہے۔ ایک اور حدیث اسی مضمون کی ہے جس میں لکھا ہے کہ ایک حصہ نار کا ہر یک بشر کے لئے مقدر ہے چاہے تو وہ اس دنیا میں اس آگ کو اپنے لئے خدا تعالیٰ کی راہ میں قبول کر لیوے اور چاہے تو تنعّم اور غفلت میں عمر گزارے اور آخرت میں اپنے تنعّم کا حساب دیوے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۲۸ تا ۱۴۶)

چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک ازلی کافر جو بے قیدی اور اباحت کی زندگی کو چاہتے ہیں اور تین قسم کے مومن۔ ظالم لنفسہٖ۔ مقتصد۔ سابق بالخیرات۔ پہلی قسم کے مومن وہ ہیں جو ظالم ہیں یعنی ان پر کچھ کچھ جذباتِ نفس غالب آجاتے ہیں، دوسرے میانہ رو، اور تیسرے خیر مجسم۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۷؍مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

جب انبیاء علیہم السلام مامور ہو کر دنیا میں آتے ہیں تو لوگ تین ذریعوں سے ہدایت پاتے ہیں یہ اس لئے کہ تین ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں؛ ظالم، مقتصد اور سابق الخیرات۔

اول درجے کے لوگ تو سابق بالخیرات ہوتے ہیں جن کو دلائل اور معجزات کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ وہ ایسے صاف دل اور سعید ہوتے ہیں کہ مامور کے چہرہ ہی کو دیکھ کر اس کی صداقت کے قائل ہو جاتے ہیں اور اس کے دعویٰ کو ہی سن کر اس کو برنگِ دلیل سمجھ لیتے ہیں ان کی عقل ایسی لطیف واقع ہوئی ہوتی ہے کہ وہ انبیاء کی ظاہری صورت اور ان کی باتوں کو سن کر قبول کر لیتے ہیں۔ دوسرے درجہ کے لوگ مقتصدین کہلاتے ہیں جو ہوتے تو سعید ہیں مگر ان کو دلائل کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ شہادت سے مانتے ہیں۔

تیسرے درجہ کے لوگ جو ظالمین ہیں ان کی طبیعت اور فطرت کچھ ایسی وضع پر واقع ہوتی ہے کہ وہ بجز مار کھانے اور سختی کے مانتے ہی نہیں۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴؍مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

دنیا میں ہمیشہ انسانوں کے تین طبقے ہوتے ہیں۔ سابق بالخیرات، مقتصد اور ظالم۔ سابقین کو نشانات اور معجزات کی ضرورت نہیں ہوتی وہ تو قرائن اور حالاتِ موجودہ سے پہچان لیتے ہیں۔ مقتصدین کو کچھ حصہ روشن دماغی

کا ملا ہوا ہوتا ہے اور کچھ تاریکی کا۔ اس لئے وہ دلائل اور معجزات کے محتاج ہوتے ہیں۔ مگر تیسرا طبقہ جو ظالمین کا ہوتا ہے وہ چونکہ بہت ہی غبی اور بلید ہوتے ہیں۔ بجز مار کھانے کے وہ نہیں مانتے۔ یہ ایک قسم کا جبر ہوتا ہے جو ہر مذہبِ حق میں پایا جاتا ہے کیونکہ ظالمین بجز اس کے سمجھ نہیں سکتے۔ حضرت مسیحؑ کے لئے طیطاوس رومی کا اتفاق ہو گیا۔ موسیٰؑ کی قوم جو پہلے ہی سے مزدوریوں اور فرعون کی سختیوں سے نالاں تھی اس نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو قبول کر لینا اپنی نجات کا موجب سمجھا اور پھر بھی اللہ تعالیٰ ان کی اصلاح کے لئے وقتاً فوقتاً ان پر عذاب بھیجتا رہا۔ کبھی طاعون، کبھی زلزلے۔ مختلف طریق پر انہیں منوایا اور اسی طرح ہوتا رہا ہے۔

غرض یہ ایک سنت اللہ ہے کہ ظالمین کو اللہ تعالیٰ اس طریق پر سمجھاتا ہے کیوں؟ یہ فرقہ زیادہ بھی ہوتا ہے اور غبی بھی۔ اس وقت بھی یہ فرقہ زیادہ ہے۔ جو نشانات خدا نے ظاہر کئے ان پر بھی جرح کرتے ہیں۔ کسوف خسوف کی حدیث کو مجروح قرار دے دیا لیکھرام کی پیشگوئی پر اعتراض کر دیا۔ ہر نشان جو ظاہر ہوتا ہے اعتراض کر دیتے ہیں مگر خدا تو سب کا مرشد ہے اس لئے تیسری صورت اور آخری حجت اختیار کی ہے جو طاعون ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱/مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

مومن کی جو تقسیم قرآن شریف میں کی گئی ہے اس کے تین ہی درجے اللہ تعالیٰ نے رکھے ہیں ظالم، مقتصد، سابق بالخیرات۔ یہ ان کے مدارج ہیں ورنہ اسلام کے اندر یہ داخل ہیں۔ ظالم وہ ہوتا ہے کہ ابھی اس میں بہت غلطیاں اور کمزوریاں ہیں اور مقتصد وہ ہوتا ہے کہ نفس اور شیطان سے اس کی جنگ ہوتی ہے مگر کبھی یہ غالب آجاتا ہے اور کبھی مغلوب ہوتا ہے۔ کچھ غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور صلاحیت بھی۔ اور سابق بالخیرات وہ ہوتا ہے جو ان دونوں درجوں سے نکل کر مستقل طور پر نیکیاں کرنے میں سبقت لے جاوے اور بالکل صلاحیت ہی ہو۔ نفس اور شیطان کو مغلوب کر چکا ہو۔ قرآن شریف ان سب کو مسلمان ہی کہتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰/نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

مقتصد سے مراد نفسِ لوامہ والے ہیں اور یہ تکالیف نفسِ لوامہ تک ہوتی ہیں کہ اس میں انسان کے ساتھ کشاکش نفسِ امارہ کی ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ راحت اور آرام کی یہ بات اختیار کر اور لوامہ وہ نہیں کرتا اس وقت انسان مجاہدہ کرتا ہے اور نفسِ امارہ کو زیر کرتا ہے اور اسی طرح جنگ ہوتی رہتی ہے حتیٰ کہ امارہ شکست کھا جاتا ہے اور پھر نفسِ مطمئنہ رہ جاتا ہے ...... اس آیت میں ظالم سے مراد نفسِ امارہ والے اور مقتصد سے مراد لوامہ والے اور سابق بالخیرات سے مراد مطمئنہ والے ہیں۔ پوری تبدیلی زندگی میں جب تک نہ

آوے تب تک جنگ رہتی ہے اور لوامہ تک یہ جنگ ہے جب یہ ختم ہوئی تو پھر دارالنعیم میں آجاتا ہے۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۷ مورخہ ۱۲؍دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۱)

ظالم سے مراد وہ لوگ ہیں جو کہ نفسِ امارہ کے تابع ہیں کہ جس راہ پر نفس نے ڈالا اسی راہ پر چل پڑے اور وہ صُمٌّۢ بُكْمٌ کی طرح ہوتے ہیں اور ان کی مثال بہائم کی ہے اس لئے کسی مد میں نہیں آسکتے اور یہ کثرت سے ہوتے ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳ مورخہ ۶؍فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰)

مومنوں کے تین طبقے ہیں ایک وہ جو ٹھوکر کھانے کے لائق ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو میانہ رو۔ کسی ٹھوکر سے بچتے اور ڈرتے رہتے ہیں۔ تیسرے وہ جو ہر ایک ٹھوکر سے ایسے بچ کر نکل جاتے ہیں جیسے کہ سانپ اپنی کینچلی (سے)۔ وہ ہر ایک خیر کے لئے دوڑتے اور ہر ایک شر سے بھاگتے ہیں ..... قسم اول ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ۔ دوئم مُقْتَصِدٌ۔ سوم سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷؍جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۷)

سب لوگ ایک طبقہ کے نہیں ہوتے۔ خدا تعالیٰ بھی قرآن شریف میں مومنوں کے طبقات بیان کرتا ہے مِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ کہ بعض ان میں سے اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض میانہ رو اور بعض سبقت کرنے والے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲۶ مورخہ ۸؍جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

اسلام میں انسان کے تین طبقے رکھے ہیں۔ ظالم لنفسہٖ۔ مقتصد۔ سابق بالخیرات۔ ظالم لنفسہٖ تو وہ ہوتے ہیں جو نفسِ امارہ کے پنجے میں گرفتار ہوں اور ابتدائی درجے پر ہوتے ہیں۔ جہاں تک ان سے ممکن ہوتا ہے وہ سعی کرتے ہیں کہ اس حالت سے نجات پائیں۔

مقتصد وہ ہوتے ہیں جن کو میانہ رو کہتے ہیں۔ ایک درجہ تک وہ نفسِ امارہ سے نجات پا جاتے ہیں لیکن پھر بھی کبھی کبھی اس کا حملہ ان پر ہوتا ہے اور وہ اس حملہ کے ساتھ ہی نادم بھی ہوتے ہیں پورے طور پر ابھی نجات نہیں پائی ہوتی۔

مگر سابق بالخیرات وہ ہوتے ہیں کہ ان سے نیکیاں ہی سرزد ہوتی ہیں اور وہ سب سے بڑھ جاتے ہیں ان کی حرکات وسکنات طبعی طور پر اس قسم کی ہو جاتی ہیں کہ ان سے افعالِ حسنہ ہی کا صدور ہوتا ہے گویا ان کے نفسِ امارہ پر بالکل موت آجاتی ہے اور وہ مطمئنہ حالت میں ہوتے ہیں۔ ان سے اس طرح پر نیکیاں عمل میں آتی ہیں گویا وہ ایک معمولی امر ہے۔ اس لئے ان کی نظر میں بعض اوقات وہ امر بھی گناہ ہوتا ہے جو اس حد

تک دوسرے اس کو نیکی ہی سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی معرفت اور بصیرت بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو صوفی کہتے ہیں حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ ۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۰؍نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵، ۶)

تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو ظالم لنفسہٖ کہلاتے ہیں ان کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ خواہشِ نفس ان پر غالب ہوتی ہے اور وہ گویا پنجہ نفس میں گرفتار ہوتے ہیں۔ دوم وہ لوگ ہیں جو مقتصد یعنی میانہ رو کہلاتے ہیں یعنی کبھی نفس ان پر غالب ہو جاتا ہے اور کبھی وہ نفس پر غالب ہو جاتے ہیں اور پہلی حالت سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ لیکن تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو پنجہ نفس سے بکلی رہائی پا لیتے ہیں اور وہ سابق بالخیرات کہلاتے ہیں یعنی نیکی کرنے میں سب سے سبقت لے جاتے ہیں اور وہ محض خدا ہی کے لئے ہو جاتے ہیں۔ ان میں علمی اور عملی قوت آ جاتی ہے۔ ایسے لوگ خدمتِ دین کے لئے مفید اور کار آمد ہوتے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲ مورخہ ۱۷؍جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

فطرتاً انسان تین قسم کے ہوتے ہیں ایک فطرتاً ظالم لنفسہٖ دوسرے مقتصد یعنی کچھ نیکی سے بہرہ ور اور کچھ برائی سے آلودہ سوم برے کاموں سے متنفر اور سابق بالخرات۔ پس یہ آخری سلسلہ ایسا ہوتا ہے کہ اجتبیٰ اور اصطفیٰ اس کے مراتب پر پہنچتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کا گروہ ایسے پاک سلسلہ میں سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ جاری ہے دنیا ایسے لوگوں سے خالی نہیں۔

(حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدت الوجود پر ایک خط صفحہ ۲۲)

پہلی دونوں صفات ادنیٰ ہیں سابق بالخیرات بننا چاہیے۔ ایک ہی مقام پر ٹھیر جانا کوئی اچھی صفت نہیں ہے۔ دیکھو ٹھیرا ہوا پانی آخر گندہ ہو جاتا ہے۔ کیچڑ کی صحبت کی وجہ سے بد بودار اور بدمزہ ہو جاتا ہے۔ چلتا پانی ہمیشہ عمدہ، ستھرا اور مزیدار ہوتا ہے اگرچہ اس میں بھی نیچے کیچڑ ہو مگر کیچڑ اس پر کچھ اثر نہیں کر سکتا۔ یہی حال انسان کا ہے کہ ایک ہی مقام پر ٹھیر نہیں جانا چاہیے یہ حالت خطرناک ہے ہر وقت قدم آگے ہی رکھنا چاہیے۔ نیکی میں ترقی کرنی چاہیے ورنہ خدا انسان کی مدد نہیں کرتا اور اس طرح سے انسان بے نور ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ آخر کار بعض اوقات ارتداد ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے انسان دل کا اندھا ہو جاتا ہے۔ خدا کی نصرت انہی کے شاملِ حال ہوتی ہے جو ہمیشہ نیکی میں آگے ہی آگے قدم رکھتے ہیں ایک جگہ نہیں ٹھیر جاتے اور وہی ہیں جن کا انجام بخیر ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۶ مورخہ ۲؍مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔ ہم نے کتاب کا وارث اپنے بندوں میں سے ان کو بنایا جن کو ہم نے چن لیا۔ یعنی ان لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جیسے ایک مکان کی کل کھڑکیاں کھلی ہیں کہ کوئی گوشہ تاریکی کا اس میں نہیں اور روشنی خوب صاف اور کھلی آ رہی ہے۔ اسی طرح ان کے مکالمہ کا حال ہوتا ہے.... کہ اجلیٰ اور بہت کثرت سے ہوتا ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۶ مورخہ ۲۷؍فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۲)

دعا وہ ہوتی ہے جو کہ خدا کے پیارے کرتے ہی ورنہ یوں تو خدا تعالیٰ ہندوؤں کی بھی سنتا ہے اور بعض ان کی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں مگر ان کا نام ابتلاء ہے دعا نہیں۔ مثلاً اگر خدا سے کوئی روٹی مانگے تو کیا نہ دے گا؟ اس کا وعدہ ہے مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ کتے بلی بھی تو اکثر پیٹ پالتے ہیں۔ کیڑوں مکوڑوں کو بھی رزق ملتا ہے مگر اِصْطَفَيْنَا کا لفظ خاص موقعوں کے لئے ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴ مورخہ ۱۳؍فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۸)

خدا تعالیٰ نے بھی اپنے بندوں میں امتیاز رکھا ہے جیسے کہ فرمایا ہے فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ ..... ضروری بات یہ ہے کہ تم لوگ ان باتوں کی طرف متوجہ نہ ہو اور تقویٰ اور طہارت میں ترقی کرو تمہارا معاملہ اور حساب خدا سے الگ ہے اور مخالف لوگوں کا حساب الگ ہے جنہوں نے قسم کھائی ہے کہ کیسی ہی سچی بات کیوں نہ ہو مگر وہ قبول نہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ بھی ان کی نسبت یہی فرماتا ہے کہ یہ لوگ قیامت کو ہی قبول کریں گے۔ ان کی بناوٹ ہی اس قسم کی ہے کہ عمدہ شے یا بات جو پیش کی جاوے وہ ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اگر بدبودار بات ہو تو خوش ہوتے ہیں۔ قرآن شریف، احادیث اور عقلی دلائل اور نشان پیش کئے مگر یہ لوگ ان کی پروا نہیں کرتے۔ صرف ایک بات کو نشانہ بناتے ہیں۔ پس جب کہ خدا نے نہ چاہا کہ ایک مذہب ہو تو ہم کیا کر سکتے ہیں مگر جن لوگوں کو خدا نے فہمِ سلیم عطا کیا ہے ان کو چاہیے کہ وہ شکر کریں کیونکہ فائدہ اُٹھانے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو خدا نے خود پاک کیا۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۴، ۳۵ مورخہ ۱۰ تا ۱۷؍اکتوبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

تین قسم کے مومن ہوتے ہیں۔ ایک تو ظالم لنفسہٖ ہوتے ہیں۔ ان میں گناہ کی آلائش موجود ہوتی ہے بعض میانہ رو اور بعض سراسر نیک ہوتے ہیں۔ اب ہمیں کیا معلوم ہے کہ کون کس درجہ اور مقام پر ہے۔ ہر ایک شخص کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ الگ معاملہ ہے جیسا کوئی اس سے تعلق رکھتا ہے ویسا ہی وہ اس سے معاملہ کرتا ہے جو لوگ کامل الایمان ہیں میں یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسے امتیاز دے گا کیونکہ مومن اور کافر کے

درمیان ایک فرقان رکھا جاتا ہے قرآن شریف میں مومن سے وہ مراد نہیں ہے کہ صرف زبان تک ہی اس کی قیل وقال محدود ہو اور صبح وہ ایمان کا کام کرے تو شام کو کفر کا کرے۔ ایک لقمہ وہ تریاق کا کھاتا ہے اور دوسرا زہر کا بھی کھا لیتا ہے ایسے شخص کو وہ فرقان اور امتیاز جو مومن کے لئے مقرر کیا گیا ہے نہیں دیا جاتا۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

ایماندار تین قسم کے ہیں (۱) اول وہ جو ظالم ہیں یعنی انواع واقسام کے گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور گنہ کا پلہ ان کا بھاری ہوتا ہے (۲) دوسرے وہ جو میانہ رو ہیں یعنی کچھ تو گنہ کرتے ہیں اور کچھ نیک اعمال اور دونوں حالتوں میں مساوی ہوتے ہیں (۳) اور تیسرے درجہ کے وہ لوگ ہیں جو عمدہ اخلاق اور عمدہ اعمال میں سبقت لے جاتے ہیں.... غرض ایمان لانے والوں کے تین درجے ہیں ظالم[۱]، مقتصد[۲]، سابق بالخیرات[۳]۔ ظالم ہونے کی حالت میں انسان اپنی بداعمالی کی حالت کو محسوس کر لیتا ہے اور مقتصد ہونے کی حالت میں نیکی کے بجالانے کی توفیق پاتا ہے مگر پورے طور پر بجا نہیں لاسکتا اور سابق بالخیرات ہونے کی حالت میں جہاں تک اس کی فطرت کی طاقت ہے پورے طور پر نیکی بجالاتا ہے اور نیک اعمال کے بجالانے میں آگے سے آگے دوڑتا ہے اور اس درجہ پر انسان کو خدا تعالیٰ کی عظمت اور جلال اور قدرت کا اس قدر علم ہو جاتا ہے کہ گویا وہ اس کو دیکھتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ خود اس کو اپنے خارق عادت تصرفات کے ساتھ راہ دکھا دیتا ہے۔ روح القدس کی تائید جو مومن کے شاملِ حال ہوتی ہے وہ محض خدا تعالیٰ کا انعام ہوتا ہے جو ان کو ملتا ہے جو سچے دل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن شریف پر ایمان لاتے ہیں وہ کسی مجاہدہ سے نہیں ملتا محض ایمان سے ملتا ہے اور مفت ملتا ہے صرف یہ شرط ہے کہ ایسا شخص ایمان میں صادق ہو اور قدم استوار اور امتحان کے وقت صابر ہو۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۴۲۴ تا ۴۲۶)

قرآن مجید میں ہے فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ ۔ ہم تینوں طبقوں کے لوگوں کو مسلمان کہتے ہیں مگر ان کو کیا کہیں جو مومن کو کافر کہیں۔ جو ہمیں کافر کہیں گے ہم انہیں بھی اس وقت تک ان کے ساتھ سمجھیں گے جب تک کہ وہ ان سے الگ ہونے کا اعلان بذریعہ اشتہار نہ کریں اور ساتھ ہی نام بنام یہ نہ لکھیں کہ ہم ان مکفّرین کو بموجب حدیث صحیح کافر سمجھتے ہیں۔

(البدر جلد ۷ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۱۴ رمئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۲۰)

اِسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَ لَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ

يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۴﴾

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے یہودیوں کو یہ جواب ملا ہے کہ ایلیا نبی کے دوبارہ آنے سے یوحنا نبی یعنی یحییٰ کا آنا مراد تھا تو ایک دیندار آدمی سمجھ سکتا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم کا دوبارہ آنا بھی اسی طرز سے ہوگا کیونکہ یہ وہی سنت اللہ ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔

(ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۲۷۹)

اہل اللہ کے دو ہی کام ہوتے ہیں جب کسی بلا کے آثار دیکھتے ہیں تو دعا کرتے ہیں لیکن جب دیکھتے ہیں کہ قضا وقدر اس طرح پر ہے تو صبر کرتے ہیں جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بچوں کی وفات پر صبر کیا جن میں سے ایک بچہ ابراہیم بھی تھا جبکہ خدا تعالیٰ نے یہ دو تقسیمیں رکھ دی ہیں اور یہ اس کی سنت ٹھہر چکی ہے اور یہ بھی اس نے فرمایا ہے لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا پھر کس قدر غلطی ہے جو انسان اس کے خلاف چاہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۳)

سارے نشانات عام لوگوں کے خیالات کے موافق کبھی پورے نہیں ہوا کرتے ہیں تو پھر انبیاء کے وقت اختلاف اور انکار کیوں ہو؟ یہودیوں سے پوچھو کہ کیا وہ مانتے ہیں کہ مسیحؑ کے آنے کے وقت سارے نشانات پورے ہو چکے تھے؟ نہیں۔ یاد رکھو! قانونِ قدرت اور سنت اللہ اس معاملہ میں یہی ہے جو میں پیش کرتا ہوں لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۱؍فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

خدا تعالیٰ اپنی سنت کو نہیں بدلا کرتا جیسے قرآن شریف میں ہے وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا اور جو انسان ذرا سی بھی نیکی کرتا ہے تو خدا اسے ضائع نہیں کرتا۔ اسی طرح جو ذرہ بھر بدی کرتا ہے اس پر بھی خدا تعالیٰ مؤاخذہ کرتا ہے۔ پس جب یہ حالت ہے تو گناہ سے بہت بچنا چاہیے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۴ مورخہ ۲۴؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۸)

خدا تعالیٰ ایک تبدیلی چاہتا ہے اور وہ پاکیزہ تبدیلی ہے جب تک وہ تبدیلی نہ ہو عذابِ الٰہی سے رستگاری اور مخلصی نہیں ملتی۔ یہ خدا تعالیٰ کا ایک قانون اور سنت ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے ہی یہ فیصلہ کر دیا ہے وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا سنت اللہ میں کوئی تبدیلی نہیں

ہوتی ۔پس جو شخص چاہتا ہے کہ آسمان میں اس کے لئے تبدیلی ہو یعنی وہ ان عذابوں اور دکھوں سے رہائی پائے جو شامتِ اعمال نے اس کے لئے تیار کئے ہیں اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے اندر تبدیلی کرے۔ جب وہ خود تبدیلی کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے موافق جو اس نے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرّعد : ۱۲) میں کیا ہے اس کے عذاب اور دکھ کو بدلا دیتا ہے اور دکھ کو سکھ سے تبدیل کر دیتا ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۷؍ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

تزکیہ ءنفس بجز فضلِ خدا میسر نہیں آ سکتا یہ خدا تعالیٰ کا اٹل قانون ہے۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا اور اس کا قانون جو جاذبِ فضل کے واسطے ہمیشہ سے مقرر ہے وہ یہی ہے کہ اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جاوے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۴؍مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿۴۶﴾

اور اگر خدا ان لوگوں سے ان کے گناہوں کا مؤاخذہ کرتا تو زمین پر ایک بھی زندہ نہ چھوڑتا۔
(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۵۱، ۶۵۲)

خدا اگر لوگوں کے اعمال پر جو اپنے اختیار سے کرتے ہیں ان کو پکڑتا تو کوئی زمین پر چلنے والا نہ چھوڑتا۔
(جنگِ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۳۱)